Title — IBLEES-O-AADAM.

Author — Parvez.

Publisher — Islam Post Books (Karachi).

Date — 1954.

Pages — 376.

Subject —

آیات کو پھیر پھیر کر لانے سے مفہوم کی وضاحت کرتے جانا۔ قرآن کا یہ اسلوب کس قدر بلیغ اور بلند ہے، اس کی تشریح کا یہ موقع نہیں۔ اس وقت مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ اس کا اندازِ بیان، عام انسانی تصانیف سے مختلف ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جس انداز سے قرآن نے اپنی تعلیم کو پیش کیا ہے اسے سمجھنے کے لئے قرآن پر اتنا عبور ضروری ہے کہ جو بات آپ کے سامنے آئے اس کے متعلق آپ کو معلوم ہو کہ اس کا مزید ذکر کس کس جگہ آیا ہے۔ جب وہ تمام مقامات بیک وقت آپ کے سامنے آجائیں تو بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے۔ لیکن ایک سے (جس نے اپنے ذوق سے قرآن کا مطالعہ شروع کیا ہی) یہ توقع کرنا کہ اسے قرآن پر اس قدر عبور حاصل ہوگا، صحیح نہیں۔ نہ ہی وہ اس کا انتظار کر سکتا ہے کہ اسے قرآن پر اس قدر عبور حاصل ہو جائے تو پھر وہ قرآن کو سمجھے۔

یہ تھی وہ بنیادی دشواری جس کی بنا پر یہ نوجوان طبقہ شکایت کرتا تھا کہ ان کی سمجھ میں قرآن نہیں آتا۔ میں نے ان کی اس دشواری کا احساس کیا اور اس کا حل سوچا تو وہ اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ میں خود ان کے لئے محنت کر کے ان کے سامنے قرآن کی تعلیم کو اس انداز میں پیش کر دوں جس انداز میں وہ عام تصانیف کو پڑھنے کے عادی ہیں۔ چنانچہ اس کے لئے میں نے سینکڑوں ابواب اور ہزاروں عنوانات تجویز کئے اور ہر عنوان کے تحت، قرآن کی تعلیم کو ایک مربوط اور خود مکتفی (self-contained) مقالہ کی شکل میں مرتب کر دیا۔ پھر ان عنوانات کو مختلف ابواب کے تحت ترتیب دیا اور ان ابواب کو مختلف مجلدات میں تقسیم کیا۔ اس طرح قرآن کا ایسا دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) تیار ہو گیا کہ آپ کے ذہن میں کوئی سوال آئے، اس کے متعلق قرآن کی تمام و کمال تعلیم ایک مربوط مضمون کی شکل میں آپ کے سامنے آجائے۔ اس انسائیکلوپیڈیا کا نام ہے معارف القرآن۔

معارف القرآن کی پہلی جلد ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی تھی جس کا عنوان تھا اللہ۔ (اس کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں)۔ دوسری جلد ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی تھی جس میں آدم، ابلیس، وحی و رسالت سے متعلق مباحث آگئے تھے۔ تیسری جلد تاریخ رسالت پر مشتمل تھی جس میں حضرت عیسیٰ تک تمام انبیاء کا تذکار جلیلہ تھا۔ یہ بھی ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد چوتھی جلد ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی جو حضور نبی اکرم کی سیرت طیبہ پر مشتمل ہے۔ بجز چوتھی جلد کے (جس کا نام معراج انسانیت ہے) پہلی تین جلدوں کا الگ الگ نام نہیں تھا بلکہ وہ معارف القرآن جلد اول۔ دوم و سوم کے نام ہی سے متعارف تھیں یہ تینوں جلدیں مدت سے نایاب ہو چکی تھیں اور ان کے تقاضے روز بروز بڑھتے چلے جاتے تھے۔ میں اس دوران میں قرآن ہی کے سلسلہ میں، اور اہم امور میں مصروف رہا۔ جس کی وجہ سے ان کی دوبارہ اشاعت کی باری نہ آسکی۔ لیکن اب ان کے تقاضوں نے صورت اختیار کر لی کہ اس کے لئے وقت نکالنا ناگزیر ہو گیا۔

اس دوران میں احباب کی طرف سے جو مشورے موصول ہوئے ان میں اس بات پر زور دیا گیا تھا

کہ معارف القرآن کی پہلی جلد وہ ہونی چاہیئے جسے جلد دوم قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ ان کے خیال میں اس میں وہ اہم مباحث تھے جن کے سمجھے بغیر باقی مسائلِ حیات بآسانی سمجھ میں نہیں آسکتے۔ دوسرے یہ کہ ان مجلدات کو اس قدر ضخیم نہیں ہونا چاہیئے۔ چنانچہ ان مشوروں کے پیشِ نظر میں نے سب سے پہلے جلد دوم پر نظرِ ثانی کی اور یہ جلد اب ابلیس و آدم کے عنوان سے آپ کے سامنے ہے۔ اس کے بعد باقی مجلدات بھی، اسی طرح نظرِ ثانی کے بعد رفتہ رفتہ کم ضخامت میں شائع ہوتی جائیں گی۔ الگ نام رکھنے کی ضرورت اس لئے لاحق ہوئی کہ معارف القرآن کی ہر جلد اپنی جگہ مکمل ہوتی ہے اور اپنے مفہوم کی وضاحت کے لئے دوسری جلدوں کی محتاج نہیں ہوتی۔ جس طرح انسائیکلوپیڈیا کی ہر جلد (بلکہ ہر آرٹیکل) اپنی جگہ مکمل ہوتی ہے۔ لیکن "پہلی، دوسری تیسری جلد" کہنے سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا تھا کہ (قرآن کی تفاسیر کی طرح) یہ بھی ایک مسلسل کتاب ہے جس کی تمام جلدوں کو سلسلہ وار دیکھنا چاہیئے۔ یہ تصور غلط ہے۔ معارف القرآن کی ہر جلد اپنی جگہ مکمل ہے۔

ادھر یہ سابقہ جلدیں، بعد نظرِ ثانی، رفتہ رفتہ شائع ہوتی رہیں گی اور ان کے ساتھ ہی اس سلسلہ کی اگلی جلدیں بھی مرتب ہوتی چلی جائیں گی۔ چنانچہ، معراجِ انسانیت (چوتھی جلد) کے بعد اگلی جلد دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک کا عنوان ہے "انسان نے کیا سوچا" اور دوسرے کا عنوان ہے "خدا نے کیا کہا" پہلے حصہ میں بتایا گیا ہے کہ زندگی کے اہم مسائل کے متعلق آج تک انسانی مفکروں نے (وحی کی مدد کے بغیر) کیا کچھ سوچا ہے اور وہ کس مقام تک پہنچ کر رک گئے ہیں۔ اور دوسرے حصہ میں بتایا گیا ہے کہ قرآن اس مقام سے آگے انسانیت کی کیا راہ نمائی کرتا ہے۔ اس وقت پہلے حصہ (انسان نے کیا سوچا؟) کی کتابت ہو رہی ہے اور امید کی جا سکتی ہے کہ جلد شائع ہو جائے گی۔ اس موضوع پر اس قسم کی کوئی اور کتاب کم از کم میری نظر سے نہیں گزری۔

یہ ہے معارف القرآن کے مقصد اور اس کی ترتیب کا مختصر سا تعارف۔ ان مجلدات میں جو کچھ آپ کے سامنے آئے گا اس میں ایک تو قرآن کریم کی آیات ہوں گی جو ایک خاص ربط کے مطابق درج کی گئی ہیں اور دوسرے ان کی وضاحت ہو گی۔ جہاں تک وضاحت کا تعلق ہے وہ انسانی (یعنی میری) کوشش کا نتیجہ ہے جس میں ہر وقت سہو اور خطا کا امکان ہے۔ لہٰذا اگر آپ کو کسی مقام پر اس سے اختلاف ہو تو آپ متعلقہ آیات کا مفہوم خود متعین کر لیں۔ میرا مقصد بھی درحقیقت یہ ہے کہ آپ براہِ راست قرآن پر غور کرنا شروع کر دیں۔

آیات میں اوپر سورت کا نمبر اور نیچے آیت کا نمبر ہے۔ مثلاً $\frac{۲}{۱۵}$ کا مطلب ہے۔ سورۂ بقرہ کی پندرھویں آیت۔ اگر کوئی آیت حوالہ کے مطابق نہ ملے تو ایک دو آیات آگے یا پیچھے دیکھ لیں۔ کیونکہ قرآن کریم کے مختلف نسخوں میں آیات کے شمار میں اختلاف ہوتا ہے۔

میں نے شروع میں لکھا ہے کہ قرآن فہمی کے سلسلہ میں ایک بڑی دشواری یہ ہے کہ ہمارے ہاں قرآن کے مروجہ تراجم اس مقصد کو پورا نہیں کرتے۔ میں نے اس مسئلہ پر مدتوں غور کیا ہے اور اس کے بعد یہ کوشش کی ہے کہ قرآن پاک کا ایک ایسا رواں ترجمہ مرتب کر دیا جائے جسے ایک کتاب کی طرح مسلسل پڑھا جا سکے اور وہ اپنا مفہوم آپ واضح کرتا چلا جائے۔ میں آج کل اس ترجمہ اور قرآن کے لغت کی تدوین میں مصروف ہوں۔ توفیق ایزدی شامل حال رہی تو یہ بھی اپنے وقت پر سامنے آجائے گا۔ (معارف القرآن میں مروجہ تراجم ہی پر اکتفا کیا گیا ہے۔ کیونکہ میرا اپنا ترجمہ ابھی مکمل نہیں ہوا)۔

میری اس تمام کوشش سے مقصود یہ ہے کہ قوم کا تعلیم یافتہ طبقہ اُس چشمۂ زندگی (قرآن) سے سیراب ہو سکے جو مزرعِ انسانیت کی سرسبزی و شادابی کا واحد ذریعہ ہے۔ اگر میری اس کوشش نا تمام سے کوئی ایک سعید روح بھی قرآن کی گہرائیوں تک جا پہنچی تو میں سمجھوں گا کہ مجھے میری محنت و کاوش کا صلہ مل گیا۔ وَمَا توفیقی اِلّا باللہ العلی العظیم۔ علیہ توکلت والیہ انیب۔

والسلام

پرویز

کراچی۔ اگست ۱۹۵۰ء
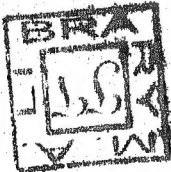
پیش رس

(جس کے ساتھ پہلا ایڈیشن شائع ہوا تھا)

معارف القرآن کا تفصیلی تعارف جلد اوّل میں کرایا جا چکا ہے۔ چونکہ یہ تمام جلدیں ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ اس لئے ہر مرتبہ اس تفصیلی تعارف کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ جلد پیش نظر جن اہم مباحث پر مشتمل ہے ان کے متعلق البتہ کچھ تمہیداً عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

گذشتہ صدی میں یورپ نے ایک نئے نظام تمدن کی بنیاد رکھی جس کی درخشندگی اور تابناکی نے بڑے بڑے دیدہ وروں کی نگاہوں میں خیرگی پیدا کر دی۔ اس تہذیب کی اساس، درحقیقت کائنات کے متعلق اس تصور پر تھی جو وہاں کے علمائے فطرت (سائنسدانوں) نے اپنی طبیعیاتی تحقیقات کے بعد قائم کیا تھا۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ مادہ (Matter) ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے اور طبیعی قوانین کے ماتحت اپنے اندر تبدیلیاں پیدا کرتا رہتا ہے۔ انہی تبدیلیوں سے کسی نہ کسی طرح میکانکی طور پر (Mechanically) زندگی پیدا ہو گئی اور اس سے آگے مزید ارتقائی منازل کے بعد شعور انسانی وجود میں آگیا۔ لہٰذا ان کے نزدیک انسان ایک مشین سے زیادہ کچھ نہ تھا جس کے پرزوں میں ایک خاص ترتیب پیدا ہو جانے سے اس میں زندگی اور شعور پیدا ہو گیا اور جب ان پرزوں میں انتشار ہو جائے گا تو یہ مشین چلنے سے رک جائے گی۔ ظاہر ہے کہ جب انسان ایک طبیعی پیکر سے زیادہ کچھ نہ تھا تو اس کے تقاضے بھی طبیعی زندگی (physical life) سے بیش نہ تھے۔ ان ہی تقاضوں کی تسکین، انسان کا نصب العین تھا۔ پھر چونکہ ہر نوع (species) کی ہستی کے قیام و بقا کے لئے بقاءاللاصلح [1] (survival of the fittest) کا قانون جاری و ساری تھا اس لئے نوع انسانی کو بھی اپنے تحفظ کے لئے قوت فراہم کرنے کی ضرورت تھی۔ یہ قوت تسخیر فطرت سے حاصل کی جا سکتی تھی۔ یعنی زمین۔ آسمان۔ خشکی۔ تری۔ پانی۔ ہوا۔ غرضیکہ کائنات کی تمام طبیعی قوتوں کو مسخر کر لینے سے جو زیادہ قوت حاصل کر لے وہی زندہ رہنے کا حقدار تھا۔ ان ہی قوتوں کا مالک، ڈاروِن [2] کا "اصلح انسان" اور نیٹشے کا "فوق البشر" تھا۔ افراد سے آگے بڑھ کر یہی جذبہ قوموں میں پیدا ہو

---

[1] اس نظریہ کی بنیادی غلطی یہ تھی کہ اس میں حیوان کی "اصلیت" اور انسان کی "اصلیت" میں فرق نہیں کیا گیا اور دونوں کو ایک ہی سطح پر رکھ دیا گیا۔ [2] درحقیقت یہ سلوگن ہربرٹ اسپنسر کی ایجاد ہے۔ ڈاروِن کی نہیں۔

لہٰذا یورپ کے نظامِ اجتماعی کی بنیادیں بھی اسی تصورِ حیات پر قائم ہوئیں۔ اب ہر قوم زیادہ سے زیادہ قوت فراہم کر لینے کی فکر میں تھی۔ جس کے لئے مادی اسباب و ذرائع کے سرچشموں پر قابو پا لینا ضروری تھا۔ اس سے اقوام میں باہمی رقابت پیدا ہوئی اور رقابت سے عداوت۔ نتیجہ ظاہر ہے! آپ اندھی قوتوں سے بھرپور ہوائی جہازوں کو فضا میں چھوڑ دیجئے اور طیارہ بازوں (pilots) کو اُن سے الگ کر لیجئے۔ پھر دیکھئے کیا قیامت برپا ہوتی ہے؟ یَوْمَ یَکُوْنُ النَّاسُ کَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۝ وَتَکُوْنُ الْجِبَالُ کَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ۝ انسان، بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح منتشر و پریشان حال۔ اور پہاڑ، دُھنی ہوئی اون کی طرح فضا میں اُڑتے پھرتے وَدُکَّتِ الْاَرْضُ دَکًّا دَکًّا زمین ٹکڑے ٹکڑے۔ وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۝ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ تَصْلٰی نَارًا حَامِیَةً ۝ قوموں کی قومیں خاسر و نامراد۔ تھکی ماندی جہنم کی آگ میں جھونکی جا رہی ہیں۔ یَقُوْلُ الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ اَیْنَ الْمَفَرُّ ۝ اور انسان یاس و حسرت سے پکار رہا ہے کہ اب بھاگنے کی کوئی راہ نہیں۔

غلط بنیادوں پر اٹھی ہوئی تہذیب کا یہی وہ مآل تھا جس کو بھانپ کر وہاں کے مفکرین نے اپنے زوایائے فکر و نظر کو بدلا اور کائنات کے متعلق ایک نئے اسلوب سے غور کرنا شروع کیا۔ اس غور و فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ علمِ فطرت (طبیعیاتی سائنس) کا وہی قصرِ مشید جسے انیسویں صدی میں اس قدر محکم اور پائیدار تصور کیا جاتا تھا بیسویں صدی کے اوائل ہی میں اس کی شکست و ریخت شروع ہو گئی اور رفتہ رفتہ اس کی بنیادیں تک اکھیڑ دی گئیں۔ اور انہوں نے علیٰ وجہ البصیرت اس حقیقت کا اعتراف کر لیا کہ

> ہم نے اپنے زمانہ کی ابتداء سائنس کی کارگری سے کی۔ اس وثوق کے ساتھ کہ مادی کامرانیاں، زندگی کے عقدوں کو حل کر دیں گی۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہم غلطی پر تھے۔ زندگی کے مسائل ایسے سہل نہیں ہیں۔
>
> (Masoni creative Freedom – P. 184)

اب مادہ کی وہ حیثیت باطل قرار پا گئی جو اسے انیسویں صدی کے محققین نے عطا کی تھی۔ مادہ کا تجزیہ کر کے اسے سالمات (Molecules) میں تقسیم کیا گیا۔ سالمات، انفرادی جوہروں (Atoms) میں منقسم ہوئے اور (Atoms) کے متعلق تحقیق ہوا کہ یہ برقیات (Electrons) کی مثبت اور منفی قوتوں کے سوا کچھ نہیں۔ لہٰذا مادہ کی اصل و حقیقت غیر مادی (immaterial) قرار پا گئی اور مادہ کا، بہ حیثیت مادہ، یوں خاتمہ ہو گیا۔ بقول پروفیسر (McDougall)

> (Atoms) ختم ہو چکے ہیں مادہ نے اپنے آپ کو توانائی (Energy) میں تحلیل کر دیا ہے اور توانائی کے متعلق کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ کیا ہے؟
>
> (صدارتی خطبہ ۱۹۲۴ء)

اور جب یہ بنیاد ہی غلط ٹھہری تو اس پر استوار عمارت کب قائم رہ سکتی تھی! لہٰذا اب کھلے کھلے طور پر کہہ دیا گیا کہ۔

ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ ہم آغازِ آفرینش کی تحقیق کے لئے قانونِ فطرت (Natural Law) کو اپنا راہ نما بنا سکیں۔

اس کے بعد زندگی کے متعلق یہ اعتراف ہوا کہ وہ بھی مادہ کی پیداوار نہیں بلکہ اس کی اساس ماورائے مادہ ہے اور شعورِ انسانی بھی مادہ اور حیات کے میکانکی امتزاج کا نتیجہ نہیں (تفصیل ان امور کی وحی کے عنوان میں ملے گی) جب مادہ اور زندگی کے متعلق نگاہوں میں یہ تبدیلی پیدا ہوئی تو پھر کائنات کے متعلق انیسویں صدی کے مادی تصور نے انسانی نظامِ اجتماعی پر جو زہر آلود اثرات مرتب کئے تھے، وہ بھی ایک ایک کر کے بے نقاب ہونے شروع ہو گئے اور حساس قلوب پکار اٹھے کہ اس دور کی تباہی کا راز کیا ہے؟ بقول ہیٹن۔

> بڑھتی ہوئی مادی خواہشات کی تسکین کے لئے کشمکشِ زندگی ..... نے یہ حقیقت نگاہوں سے اوجھل کر دی کہ انسانی زندگی کا سرچشمہ غیر مادی روحانیت میں ہے ...... چونکہ سائنس نے مادی کامیابی عطا کر دی اس لئے ہم سائنس کی اسی طرح پرستش کرنے لگ گئے جس طرح ہمارے بزرگ جادو کی پرستش کیا کرتے تھے۔
>
> یہ روش، درحقیقت، اس زندگی سے فرار کی راہ تھی جس میں انسانی خودی اپنے استحکام کے لئے ضبطِ نفس کی متقاضی تھی اور ضبطِ نفس یقیناً ایک مشقت طلب مرحلہ ہے ...... ہوتا یہ ہے کہ جس قدر مادی ترقی بڑھتی جاتی ہے خودی کی محبوبیت کم ہوتی جاتی ہے۔ یہ ہے ہمارے دور کی ناکامی کا اصلی راز۔ خوش حالی اس قدر فراواں ہے کہ بایدوشاید۔ عیش و عشرت کے سامان ہر مقام پر موجود ہیں۔ مادی کامیابی کے مواقع نچلے سے نچلے درجہ کے انسانوں تک کے لئے کھلے ہیں۔ لیکن بایں ہمہ انسان بے حد غیر مطمئن اور مضطرب و بیقرار ہے..... تخلیق کی قوتِ محرکہ کبھی مستقل طور پر ایسے نظریہ کو اپنے سینہ سے نہیں لگائے رکھ سکتی جو انسانی ذات کو محض مادہ کی نمود قرار دے۔ ایسے نظریہ کے ماتحت افراد اور قومیں دونوں تباہ ہو کر خاک میں مل جاتی ہیں۔

اب زندگی کے تقاضے بھی طبیعی زندگی کے تقاضوں تک محدود نہ رہے۔ بلکہ ان کے متعلق آکسفورڈ یونیورسٹی کے فلسفہ کے استاد (Dr. William Brown) کے الفاظ میں تسلیم کیا گیا کہ یہ تقاضے

> قلبِ انسانی کے وہ بنیادی رجحانات ہیں جن کی براہِ راست ترجمانی عقلِ انسانی نہیں کر سکتی۔
>
> (Hibbert-Journal April 1925)

اسی لئے اب اخلاقی ضوابط کی اقدار (values) کے معیار بھی مختلف قرار پا گئے اور فیصلہ کیا گیا کہ

> اخلاقیات کی قدر و قیمت نفسِ انسانی کے تحت متعین ہونی چاہیئے۔ اس لئے کہ ہم انسانوں کے باہمی تعلقات کو کتنا ہی افادی حیثیت (Utilitarianism) پر مبنی قرار دے لیں، انسان کا وہ تعلق جو اسکی

اپنی ذات سے ہے، اسے ہم غیر مادی ماننے پر مجبور ہو چکے ہیں۔ انسان کو اپنے مادی مفاد کو زندگی کے تقاضوں کے تابع رکھنا ہوگا تاکہ وہ اس کی ذات کے استحکام سے ایک بلند قدر و قیمت حاصل کر لیں۔
فطرتِ انسانی کا صحیح تقاضا کیا ہے؟ اسے میبسن، دورِ حاضرہ کے انسان کے قلبی اضطراب کو سامنے رکھ کر، ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

ہمارے دور میں جس چیز کی کمی ہے اور جس کی وجہ سے یہ اپنی ناقصیت کو محسوس کر رہا ہے وہ انسانی خودی ہے جس کی نمود مادہ اور روح دونوں میں ہونی چاہیئے۔ انسان مادی کامرانیوں میں ڈوبا ہوا، پریشان اور ایک عجیب الجھاؤ میں ہے اس لئے کہ اس کی ذات اپنے آپ کو مادہ سے بلند نہیں لیجا سکتی بلکہ مادہ کے اندر ڈوبتی ہوئی محسوس کرتی ہے۔ اس کا اضطراب اس لئے ہے کہ اس کا تحت الشعور یہ چاہتا ہے کہ وہ ثابت کر دے کہ وہ مادہ سے جن چیزوں کی تخلیق کرتا ہے خود ان سے کچھ بیش ہے۔ وہ مادی کارگری کو بحال رکھنا چاہتا ہے اس لئے کہ یہ اس کی قوتِ تخلیق کی مدد کے لئے ضروری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو مادیت سے بلند لے جائے اور اس کی ذات کا اندازہ اس کی مادی تخلیق سے نہ لگایا جائے بلکہ اس سے کہ وہ خود کیا ہے؛

(P. 183)

لیکن جس تہذیب کی بنیاد اس تصور پر ہو کہ ماورائے مادہ کسی شے کا وجود نہیں اس میں انسان اپنی ذات کو بھول کر (فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ) ایک مادی مشین بن کر رہ جاتا ہے جس سے رفتہ رفتہ اس کی انسانیت ختم ہو جاتی ہے۔ تہذیبِ مغرب کا یہی تباہ کن نتیجہ تھا جس کے متعلق مشہور فرانسیسی مفکر (Rene Guenon) لکھتا ہے۔

عہدِ حاضر کی تہذیب رفتہ رفتہ تنزل کی طرف گرتی گئی ہے حتیٰ کہ یہ انسان کے پست ترین عناصر کی سطح پر جا کر غرق ہو گئی ہے اس کا نصب العین اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسانی فطرت کے محض مادی گوشے کے تقاضوں کی تسکین کا سامان فراہم کیا جائے یہ نصب العین خود ایک فریب ہے۔ اس لئے کہ یہ جس قدر انسانی ضروریات کو پورا کر سکتا ہے اس سے زیادہ مصنوعی ضروریات کو پیدا کر دیتا ہے.................... اس عہد کے انسان نے نہ صرف اپنی ذہنی کاوشوں کو مشینوں کی ایجاد اور ساخت کے لئے وقف کر رکھا ہے بلکہ وہ خود رفتہ رفتہ مشین بن چکا ہے۔ یہ ایجادات جن کا شمار دن بدن بڑھتا جا رہا ہے اور بھی زیادہ خطرناک ہیں۔ اس لئے کہ یہ ان قوتوں کو بروئے کار لا رہی ہیں جن کی حقیقت کا علم ان انسانوں کو نہیں جو انہیں استعمال کرتے ہیں.... جو لوگ مادہ کی وحشی قوتوں کو بے لگام چھوڑ دیتے ہیں وہ خود ان ہی قوتوں کے ہاتھوں تباہ ہو جاتے ہیں..... دورِ حاضرہ میں مادی قوانین کو کھلا چھوڑ دیا گیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مادہ اس انسان کو برباد کر دے گا۔ جو خود مادہ سے بلند ہوئے بغیر، مادہ کی تسخیر چاہتا ہے۔ اس لئے کچھ بعید نہیں کہ موجودہ دنیا خود ان ہی ایجادات کے ہاتھوں تباہ ہو جائے۔

ا؎ کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے		مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق		(اقبالؒ)

(The crisis Of the Modern world)

ان ہی حقائق کے پیش نظر یہ مغربی مفکر اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ:۔

مغرب کے غرق ہو جانے کا خطرہ سر پر ہے وہ خود تو ڈوبے گا ہی۔ لیکن اپنے ساتھ تمام نوع انسانی کو بھی اپنے منتشر (انکار و) اعمال کے گرداب میں غرق کر دے گا۔ (ایضاً)

آپ نے غور فرمایا کہ یورپ کے تصورات کی دنیا میں کتنا بڑا انقلاب پیدا ہو رہا ہے۔ یہی وہ انقلاب تھا جسے مغرب کے تحت الشعور میں بھانپ کر علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ

لیکن حقیقت یہ ہے کہ قدیم عالم کا باطنی اضطراب جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم محض اس لئے نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں۔ ایک بہت بڑے روحانی اور تمدنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ یورپ کی جنگ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت، زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے جس کا ایک دھندلا سا خاکہ حکیم آئن سٹائن اور برگساںؔ کی تصانیف میں ملتا ہے

یہ انقلاب جو انسانی ضمیر میں اس طرح پہلو بدل رہا تھا، اپنی نمود کے لئے شاید ابھی کچھ اور وقت لے لیتا لیکن موجودہ جنگ عالم[2] اسے کھینچ کر بہت قریب لے آئی ہے۔ یورپ اب ایک مرتبہ پھر زندگی کے دوراہے پر کھڑا ہے لیکن چونکہ اس کے پاس وحی کی روشنی نہیں اس لئے وہ نئے راستہ کا فیصلہ بھی فکرِ انسانی کی مدد سے ہی کرنا چاہتا ہے (حالانکہ اسے خود اس حقیقت کا احساس ہو چکا ہے کہ فطرتِ انسانی کے تقاضوں کی ترجمانی، عقل نہیں کر سکتی، اس لئے وہ پھر ایک غلط راہ اختیار کرے گا جس کا خمیازہ ایک مرتبہ پھر ساری دنیائے انسانیت کو اٹھانا پڑے گا۔

لیکن جن کے پاس وحی کی روشنی ہے ان کی حالت خود یورپ سے بدتر ہے۔ وہاں قلبی تسکین کا سامان نہیں لیکن کم از کم مادی ترقیاں تو کہکشاں گیر ہیں۔ لیکن یہاں تو یہ حالت ہے کہ

بے کسی ہائے تمنا! کہ نہ دنیا ہے نہ دیں!!!

یہ ایک رسمی نوحہ نہیں جس کا آج کل عام طور پر رواج سا ہو چکا ہے اور اس لئے وہ اپنا اثر بھی زائل کر چکا ہے بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جو خود فریبی کے ہزار پردوں سے بھی چھپائے نہیں چھپ سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو اپنی آخری کتاب کی

---

[1] (Mason) جس کی تصنیف کے اقتباسات گذشتہ صفحات میں پیش کئے گئے ہیں۔ برگساں کا متبع اور اس کے نظریہ تخلیقی ارتقا کا ایک معنی میں شارح ہے۔ [2] دوسری عالمگیر جنگ (۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء)

وراثت کے لئے منتخب کیا تھا جسے نوع انسانی کے لئے ضابطہ حیات بننا تھا۔ اس کے لئے انہیں ایک نظامِ زندگی (دین) عطا کیا گیا تھا جو ہر غیر فطری نظام کے لئے پیامِ موت تھا۔ اس نظام کا فطری نتیجہ وہ سب کچھ تھا جس کی تلاش میں دنیا آج یوں سرگردان و حیران پھر رہی ہے اور جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ یعنی فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں حیات کے تقاضوں (حدود اللہ) کے تابع رکھنا تاکہ انسانیت ارتقائی مراحل طے کر کے اپنی تکمیل تک پہنچ جائے۔

لیکن یہ دور جلد ختم ہو گیا اور اس کے بعد آہستہ آہستہ، رفتہ رفتہ، غیر محسوس طور پر یہ دین دھرم بنتا چلا گیا اور بالآخر وہی نظام جس نے اپنی حرارت سے کائنات کی رگوں میں ایک تازہ خون زندگی دوڑا دیا تھا ٹھٹھر کر چند رفطری معتقدات اور افسردہ رسمیات کا مجموعہ بن کر رہ گیا۔ یہ عبرتناک تبدیلی کیسے رونما ہوئی؟ یہ ایک حدیث ہے دل گداز اور سانحہ ہے الم انگیز جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہی قوم جسے اقوامِ عالم کی امامت کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ زندگی کے میدان سے باہر نکال دی گئی۔ اب مرورِ زمانہ سے اس کی یہ روش کچھ اس طرح مین زندگی بن چکی ہے کہ اس میں ذرا سی تبدیلی (بلکہ تبدیلی کا تصور) ان کی روح کو کپکپا دیتا ہے۔ تہذیب کا مشہور مورخ .. .. (Briffault) اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ

> مشرق کے جمود کی صرف یہ وجہ ہے کہ وہاں ہر شے مقدس بن چکی ہے۔ جسے چھونا بہت بڑا گناہ سمجھا جاتا ہے۔
>
> (The Making of Humanity)

ظاہر ہے کہ ایسی قوم کو وحی کی روشنی کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے جو زندگی کے عملی مسائل سے کنارہ کش ہو چکی ہو اور مکڑی کی طرح اپنے گرد جالا تن کر اسے حصارِ عافیت سمجھ بیٹھی ہو؟ بقول سنگلر۔

> جو عقائد اپنے زمانہ کی زندگی کی انتہائی گہرائیوں پر حملہ آور ہو کر اسے متاثر نہیں کرتے، بہتر ہے کہ ان کی تعلیم ہی نہ دی جائے۔ (صفحہ ۴۷)

جو قوم زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائے اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ آگے بڑھنے والوں کی خوبیوں پر نگاہ نہیں رکھتی بلکہ ان کے نقائص کی تجسس میں رہتی ہے۔ یہ لوگ ان تیز دوڑنے والوں کی ٹھوکروں پر ہنسی اڑاتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو یہ کہہ کر جھوٹا

لہ (The decline of the west) کا مشہور مصنف (spengler) اس حقیقت کو باندازِ دگر یوں بیان کرتا ہے کہ ہر پیغام اپنے ساتھ ایک کلچر لاتا ہے۔ اس کلچر کی تشکیل ایک تمدن (civilisation) سے ہوتی ہے۔ جس کا مقصد اس کلچر کی حفاظت ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ کلچر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور خالی تمدن باقی رہ جاتا ہے۔

مسلمان ہزار برس سے اس تمدن کی پرستش کر رہا ہے اور اسی کو اصل دین سمجھے بیٹھا ہے۔

لہ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو میری مختصر سی کتاب "اسباب زوالِ امت"

اطمینان دے لیتے ہیں کہ ہمارے پاؤں زخمی ہونے سے بچ گئے۔ لیکن نہیں سمجھتے کہ وہ تو پھر بھی مادی ترقیوں میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ تگ و دو حیات میں تو کہنے والے یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ

کوشش بیہودہ بہ از خفتگی　(رومی)

آج ہماری یہی حالت ہو چکی ہے۔ ہم نے نہ تو یورپ کی تسخیر فطرت کی بے پناہ قوتوں کو دیکھا اور نہ ہی علمی تحقیقات میں ان کے محیر العقول کارناموں پر نگاہ ڈالی۔ دیکھا تو ان کی صہبائے ارغوانی و جام بلوریں اور ساقی سیمیں و سینۂ عریاں کو دیکھا۔ اور "لاحول" پڑھ کر اپنے آپ کو اطمینان دے لیا کہ حسنات ہمارا ہی حصہ ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس قسم کی تمام برائیاں قابل نفرت ہیں لیکن ان کی مذمت کرتے وقت ہم نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ اگر ان کی وہ "بیدینی" انہیں جہنم میں لیجائیگی تو ہماری یہ "دینداری" بھی جس کا نتیجہ

محکومی و مسکینی و نومیدی جاوید

کے سوا کچھ نہیں۔ ہمیں جنت کا مستحق نہیں بنا سکے گی کہ مَنْ کَانَ فِیْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰی فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی لیکن یہ حقیقت اسی پر بے نقاب ہو سکتی ہے جو اقوام عالم کے اور خود اپنے اعمال کا محاسبہ قرآن کی میزان سے کرے۔ لیکن آج مسلمان میں اتنی جرأت کہاں؟ اس لئے کہ یہ محاسبہ اس کے غلط اطمینان کے پردوں کو اٹھا کر حقیقت کو اس طرح بے نقاب کر دیتا ہے کہ وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا کا انسان بے ساختہ چیخ اٹھتا ہے کہ یہ کیا ہو گیا؟

اب ظاہر ہے کہ جب یہ قوم خود اپنی راہ نمائی کے لئے قرآن کی روشنی سے بہرہ یاب نہیں ہوتی تو دوسروں کو مشعل ہدایت کیا دکھائے گی! اس لئے حقیقت یہ ہے کہ دنیا جن غلط روشوں پر بضد اور سرکشی سے نہیں بلکہ صحیح روشنی سامنے نہ ہونے کی وجہ سے چلتی رہی ہے اور آج بھی چلی جا رہی ہے اس کی ذمہ داری مسلمان کے سر پر بھی کچھ کم عائد نہیں ہوتی۔ اسی کی سزا ہے کہ اپنے پاس دنیا کی قیادت کا سامان رکھنے والی قوم، دنیا کی نگاہوں میں اس قابل بھی نہیں رہی کہ اسکی بات تک بھی سنی جائے۔ وذالك هو الخسران المبين

لہٰذا آج اس دوراہے سے اگر یورپ پھر غلط راستہ کی طرف مڑ گیا تو اس غلطی کا فطری نتیجہ (یعنی یہ کہ اس کا ہر قدم اسے منزل سے دور ہٹاتا جائے گا) تو اسے بھگتنا پڑے گا۔ لیکن اس دوراہے پر متعین کردہ چوکیدار بھی، جو چراغ راہ کو اپنی گدڑی میں لپیٹے سو رہا ہے، بازپرس سے نہیں بچ سکتا۔ اس کے ساتھ ہی ایک خطرہ اور بھی ہے۔ دنیا کے انقلابات کے تھپیڑوں نے مسلمانوں کی نئی پود کو نیند سے بیدار تو کر دیا ہے لیکن ڈر ہے کہ وہ آنکھیں ملتے ملتے پھر ایک مرتبہ اسی غلط راہ رو کے پیچھے نہ ہو لے۔

یہ ہے وہ شدید احساس جس نے مجھے معارف القرآن لکھنے پر آمادہ (بلکہ مجبور[1]) کیا۔ میرا اولین مخاطب نوجوان

---

[1] فٹ نوٹ اگلے صفحے پر دیکھئے۔

تعلیم یافتہ طبقہ ہے اور اسی کو میں شروع سے پکار رہا ہوں۔ زیرِ نظر جلد میں خصوصیت سے وہ مباحث آگئے ہیں جن کے صحیح طور پر واضح نہ ہونے سے ان کا دامن شکوک و ارتیاب کی خاردار جھاڑیوں میں اُلجھا رہتا ہے۔ میں متوقع ہوں کہ وہ ان مباحث کا نہایت غور اور سکون سے مطالعہ کریں گے۔ اگر اس کے بعد بھی کوئی چیز تشریح طلب رہ جائے تو اس کے متعلق مجھ سے دریافت کر لیا جائے[۵۱]۔ جس جذب و شوق سے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ نے جلد اول کو اپنے سینوں میں جگہ دی ہے اس کے پیشِ نظر مجھے اپنی یہ توقع بیجا معلوم نہیں ہوتی۔

مغرب نے مادہ کو زندگی کے تقاضوں کے حل کرنے کا اہل سمجھنے میں بڑی فاش غلطی کی۔ "روحانیت" کے غلط مفہوم سے مشرق نے اپنے آپ کو دھوکے میں رکھا۔ زندگی کے مسائل کا حل ان دونوں کے صحیح امتزاج میں سے ہی نکلتا ہے۔

> سو آج (زندگی میں روحانی اثرات کی بڑی کمی ہے۔ لیکن وہ غلط روحانیت نہیں جو مادہ کو محض مادہ ہونے کی وجہ سے شر (Evil) خیال کرتی اور انسان کو اس سے دور رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ دورِ حاضرہ میں مادیت کے روحانی مفہوم کو سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ یعنی ہم نے اس حقیقت کو فراموش کر دیا ہے کہ خود ہمارا اور مادہ کا سرچشمہ اولیں، ماورا ر مادہ ایک روحِ خالص (pure spirit) ہے۔ ہم یہ نہیں جانتے کہ افادی تخلیق (Utilitarian creativeness) کے ساتھ روح کی آمیزش کس طرح کی جائے۔ اس لئے کہ ہم یہ خیال کئے بیٹھے ہیں کہ ہماری زندگی کا سرچشمہ مادہ ہے اور مادہ کا سرچشمہ کہیں بھی نہیں! (یوں سمجھئے کہ) ہم یہ نہیں جانتے کہ مادیت اور روحانیت میں کس طرح باہمی توافق پیدا کیا جائے
>
> (P. 183)

یورپ کو معلوم نہیں، اور یورپ آج بھی معلوم نہیں کر سکتا کہ مادہ اور روح کی اس مغایرت کو مٹا کر اس میں امتزاج کیسے پیدا کیا جائے۔ یہ تنہا فکرِ انسانی (علم استدلالی) کے بس کی بات نہیں[۵۲]۔ اس کا حل صرف اس چشمۂ علم سے مل سکتا ہے جس سے مادہ

فٹ نوٹ صفحہ ۱۲ نمبر ۵۰) اس لئے کہ میرا ماحول، فکرِ معاش کے لئے میری دفتری مصروفیات اور پھر دن بدن ساتھ چھوڑنے والی صحت، شاید اس کٹھن منزل کے لئے بآسانی آمادہ نہ ہونے دیتی اگر یہ شدتِ احساس ایسا جبر نہ برتتی جس سے ذوق، دیوانگی کی حد تک پہنچ جائے۔ میں اس شدتِ احساس کی موہبت پر اس بارگہِ صمدیت کے آستانۂ عالیہ پر بہ ہزار تشکر و امتنان سجدہ ریز ہوں کہ اس نے یہ سوز عطا کیا اور پھر اسے یوں زندگی کا ساز بنا دیا۔

پھونک ڈالا ہے میری آتش نوائی نے مجھے 	اور میری زندگانی کا یہی ساماں بھی ہے

۵۱ اس مقصد کے لئے میری تصنیف "سلیم کے نام خطوط" دیکھئے۔

۵۲ نفسِ انسانی کے متعلق، عقل کی رو سے کس قدر معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اس کے متعلق وحی کے عنوان میں تفصیلی تذکرہ آئے گا۔ اس باب میں سب سے آخر، علمِ تحلیل نفسی (psycho-analysis) بہت بڑے دعاوی لیکر آگے بڑھا تھا لیکن (Dalbiez) کے الفاظ میں۔

اس نے نفسِ انسانی کے بنیادی مسائل کو جہاں پایا تھا وہیں چھوڑ دیا۔

(Psycho-analytical Method and Doctrine of Freud)

اور روح دونوں نے اپنا وجود پایا۔ وہی خالق کائنات جانتا ہے کہ ان دونوں کی فطرت کے کیا جوہر ہیں اور ان میں باہمی توافق کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ قرآن اسی سوال کا حل پیش کرتا ہے (اور معارف القرآن میں اسی کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے) حیات کا تقاضا ہے کہ وہ اپنی تخلیقی قوت (creative impetus) کے زور سے بلند سے بلند تر ہوتی جائے۔ تخلیقی قوتوں کی نمود کے لئے اسے مادہ کو بطور مسالہ (Material) استعمال کرنا پڑتا ہے۔ مادہ کے جمود و تعطل (Inertia) کا تقاضا ہوتا ہے کہ حیات اسی کی چار دیواری میں گھر کر رہ جائے۔ یہی خیر و شر کا مفہوم ہے۔ اسی کو آویزشِ ابلیس و آدم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی آویزش کی مسلسل داستان تاریخ انسانیت ہے۔ حیات کو اس چار دیواری سے ابھر کر بلند ہونے کے لئے اس قوت کی ضرورت ہے جو قوانینِ الٰہیہ کے اتباع سے حاصل ہوتی ہے۔ یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۝ (۳۳/۵۵) یہ سلطان (غلبہ و قوت) قرآن سے حاصل ہو سکتا ہے جس کا نتیجہ ہے لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۔

معارف القرآن کی آئندہ جلدیں اسی اجمال کی تفصیل پیش کریں گی جس سے یہ تمام مباحث واضح طور پر سمجھ میں آ جائیں گے۔ (انشاء اللہ العزیز)

ان مباحث کو سمجھ لینے کے بعد یہ نہ سمجھ بیٹھئے کہ کام ہو گیا۔ کام تو اس کے بعد شروع ہوگا۔ قرآن فی الحقیقت "کرنے" کی چیز ہے۔ "کہنے" کی نہیں۔ عمل کا ایک ذرہ علم کے ہمالیہ پہاڑ سے زیادہ وزنی ہوتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے گھر سے اسٹیشن کس طرف کو ہے؟ وہاں تک پہنچنے کا ذریعہ کیا ہے؟ وہاں سے ٹکٹ کیسے اور کتنے میں خریدا جائے گا؟ گاڑی میں کس طرح سوار ہوا جائے گا؟ راستہ میں کیا کیا احتیاطیں برتنی چاہئیں؟ بالآخر گاڑی پشاور کتنے بجے پہنچے گی؟ لیکن اتنا کچھ جان لینے کے بعد بھی اگر آپ بدستور اپنے مکان پر بیٹھے رہیں گے تو آپ پشاور قیامت تک بھی نہیں پہنچ سکیں گے اور قرآن تو ایسی چیز ہے کہ اس پر عمل ہو رہا ہو تو نہ اس کے سمجھنے میں دقت ہوتی ہے نہ سمجھانے میں اس وقت سمجھنے اور سمجھانے میں دقت اس لئے ہو رہی ہے کہ قرآن پر عمل نہیں ہو رہا۔ اس کا متعین کردہ نظام قائم نہیں۔ لیکن آج جس ماحول میں ہم مقید ہیں اس میں آغازِ کار "قرآن کہنے" سے ہی ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ جب تک قرآن کریم کی صحیح تعلیم سامنے نہیں آئیگی اور اس کے بصائر و حکم دل کی گہرائیوں میں نہیں اتر جائیں گے اس وقت تک نہ ہمیں اپنی موجودہ غلط روش کا احساس ہوگا اور نہ ہی طریقِ کار سامنے آ سکے گا۔ اس لئے آپ سب سے پہلے قرآنی حقائق کو سمجھنے کی کوشش کریں اور جب ان مباحث کو سمجھ لیں تو اس کے بعد انہیں عملی پیکروں میں بدلنے کی تدبیر کریں۔ اس انداز کی تدبیر کہ کانٹ کے الفاظ میں

اس طرح کام کرو کہ جن نظریات کو تم اپنے عزم و ارادہ سے عمل میں لا رہے ہو انہیں گویا تمام نوعِ انسانی

کے لئے قانون بنتا ہے۔

اس حقیقت کے پیش نظر میری اپنی یہ کیفیت ہے کہ جتنا کچھ قرآن سمجھ میں آتا جاتا ہے، اتنے ہی اپنے انفرادی اور اجتماعی جرائم زیادہ سنگین دکھائی دیتے ہیں اور شرم محسوس ہوتی ہے کہ خدا کے حضور کس منہ سے جانا ہوگا؟ اندریں حالات، میں قرآن کے متعلق کچھ لکھنے کے لئے قلم اٹھانے کو بھی بہت بڑی جسارت سمجھتا ہوں۔ لیکن، بایں ہمہ، وہ شدتِ احساس جس کا ذکر اوپر آچکا ہے مجھے اتنی بڑی جرأت پر یہ کہکر آمادہ کر دیتی ہے کہ کہیں وقت کی نزاکت کے پیش نظر آج کا سکوت بھی جرم نہ قرار پا جائے۔

سکیں دلکم مانذہ دریں کشمکش اندر

جیسا کہ جلد اول (کے تعارف) میں لکھا جا چکا ہے قرآن کریم کی صحیح تعلیم اسی صورت میں سامنے آسکتی ہے کہ ہم خالی الذہن ہو کر اس میں غور و فکر کریں۔ ہم سفر زندگی میں ذہنی تصورات اور معتقدات کا اس قدر سامان لیکر چلتے ہیں کہ خود اسی کا بوجھ ہمیں آگے نہیں بڑھنے دیتا۔ ضرورت ہوتی ہے کہ ہم کبھی کبھی رک کر اس سامان کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ اس میں کون کون سی چیزیں غیر ضروری ہیں تاکہ انہیں الگ کر دیا جائے۔ اگر یہ جائزہ قرآن شریف کی روشنی میں لیا جائے تو آپ دیکھیں گے کہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد یہ بوجھ بہت ہلکا رہ جائے گا۔ یاد رکھئے کہ جو کچھ ذہنِ انسانی کی پیداوار ہے اس میں غلطی کا امکان ضروری ہے۔ خود سائنس کے نظریات کی یہ کیفیت ہے کہ ہر چند وہ محسوس مشاہدات پر مبنی ہوتے ہیں بایں ہمہ (Kenneth Walker) کے الفاظ میں

> یہ نظریئے فکر انسانی کے لئے سستانے کی جگہ ہیں۔ جب کسی نئی حقیقت کے انکشاف سے معلوم ہو کہ فلاں نظریہ اس سے مطابقت نہیں رکھتا تو اسے فوراً چھوڑ دینا چاہیئے۔

(Meaning and purpose)

جب سائنس کی محسوس دنیا میں نظریات کی یہ کیفیت ہے تو مذہب کی غیر محسوس دنیا میں انسانوں کے خود ساختہ معتقدات کس طرح ابدی طور پر واجب التسلیم قرار پا سکتے ہیں؟ حقیقت صرف قرآن کے اندر ہے کہ وہ ذہنِ انسانی کی تخلیق نہیں۔ اس لئے وہی غیر متبدل ہے جب حقیقت یہ ہے تو پھر اور تو اور جو کچھ میں نے قرآن سے سمجھا ہے اسے بھی آخری سمجھ یا منزہ عن الخطأ نہ تصور کیجئے۔ اسی طرح جس قدر انسانی تصانیف کے اقتباسات معارف القرآن میں سامنے آئیں انہیں بھی ان کی حیثیت سے آگے نہ لیجائیے۔ یہ اقتباسات، بلکہ جو کچھ خود میں نے لکھا ہے، وہ بھی سب کے سب۔

چراغِ راہ ہیں منزل نہیں ہیں

اگر یہ قرآن کی کسی حقیقت کی تائید کرتے ہیں تو ان سے قرآن فہمی میں مدد لیجئے۔ لیکن اگر ان میں سے کوئی چیز قرآن کے خلاف

جاتی ہے تو بلا ادنیٰ تامل اسے دیوار پر دے ماریئے۔ پھر اس حقیقت کو بھی سامنے رکھیئے کہ رستہ کے ان چراغوں سے مقصود منزل تک راہبری ہے۔ جب آپ خود منزل (قرآن) تک پہنچ جائیں گے تو پھر راستے کے ان چراغوں کی بھی ضرورت نہ رہیگی۔ اور یہی میرا مقصود ہے کہ آپ خود قرآن تک پہنچ جائیں۔

جیسا کہ جلد اول (کے تعارف) میں لکھا جا چکا ہے، بوقت تحریر مصنف کے مطالعہ کا ما حصل، شعوری یا غیر شعوری طور پر قلم کی راہ سے صفحۂ قرطاس پر آتا جاتا ہے۔ نام صرف انہی کتابوں یا مصنفوں کے لکھے جا سکتے ہیں جن کے اقتباسات پیش کئے جائیں۔ بایں ہمہ، میں ان تمام حضرات کا سپاس گذار ہوں جن کی تحقیق و کاوش میرے لئے کسی شکل میں بھی مفید ثابت ہوئی ہے خواہ ان کا ذکر بصراحت آیا ہے یا نہیں۔

جلد پیش نظر میں انگریزی کے الفاظ کثرت سے سامنے آئیں گے جو شاید بعض احباب کے ذوقِ سلیم پر گراں گذرے۔ لیکن وہ بادنیٰ تعمق خود محسوس کر لیں گے کہ جن مباحث پر یہ جلد مشتمل ہے ان میں انگریزی کے الفاظ کا استعمال ناگزیر تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض الفاظ (بالخصوص فنی اصطلاحات) ایسے وسیع معانی اپنے اندر رکھتے ہیں کہ ان کے ترجمہ سے اصلی مفہوم سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اس لئے انہیں بجنسہٖ لکھ دینا ضروری ہو جاتا ہے۔ انگریزی سے ترجمہ کرنے میں بھی میں نے مصطلحہ قواعد کی پابندی کے بجائے ادائیگی مفہوم کو پیش نظر رکھا ہے۔ اس کے باوجود اکثر مقامات پر میں ان تراجم سے اب بھی مطمئن نہیں۔ لیکن اس میں مجبوری ہے (اس جلد میں مغربی مصنفین کے اس قدر اقتباسات کیوں پیش کئے گئے ہیں اس کے لئے وحی کے عنوان کی تمہید دیکھئے)

جلد اول اواخر ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ ارادہ تھا کہ ہر سال ایک ایک جلد شائع ہوتی جائے۔ لیکن ۱۹۴۲ء کے بعد جنگ ایسی ہولناک شکل اختیار کر گئی کہ تمام پروگرام درہم برہم ہو گئے۔ معارف القرآن جیسی کتاب کے لئے کاغذ حاصل کرنا۔ لانا تھا جوئے شیر کا۔ خدا خدا کر کے دسمبر ۱۹۴۳ء میں کاغذ ملا۔ اور اس کے بعد، آپ حیران ہوں گے کہ ۱۹۴۴ء کا پورا سال کتابت اور طباعت کے چکر میں گذر گیا۔ اس سلسلہ میں کس قدر جاں کاہ تجارب ہوئے اور ان سے کس درجہ نقصان پہنچا۔ ان کی یاد باعث سوہانِ روح ہے۔ اس لئے ان کے ذکر سے درگذر ہی بہتر ہے۔ ان حالات میں آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ کتاب کو اس حُسن صوری سے مزین کرنا جو میرے ذوق کا تقاضا تھا، کس طرح ممکن تھا۔ جبکہ سوال یہ درپیش تھا کہ کسی نہ کسی طرح یہ دونوں جلدیں چھپ کر محفوظ ہو جائیں۔ بہر حال کتاب آپ کے سامنے ہے اور باوجود ان تمام موانع و مشکلات کے اس مبداء حسن و خوبی کی کرم گستری، کہ جلد دوم جلد اول سے بہر کیف بہتر رہی ہے۔ تیسری جلد بھی پریس میں ہے اور انشاء اللہ اس کے ساتھ ہی یا تھوڑے دنوں بعد آپ کے ہاتھوں میں ہوگی وَاللہ المستعان علیہ توکلت والیہ انیب

کتاب کی معنوی صورت ہو یا صوری۔ بہر حال نگاہ مقصود پر رکھئے اور میری کوتاہیوں پر مجھے مطلع کیجئے۔ حقیقت تو یہ

ہے کہ

نغمہ کجا و من کجا، سازِ سخن بہانہ ایست　　سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

اگر یہ مقصد حاصل ہو جائے تو کتاب کا ہر عیب حسن ہے۔ اور اگر یہ نہ ہو تو تمام خوبیاں بے معنی ہیں۔

جلد اول میں بصراحت لکھ چکا ہوں، اور یہاں اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ میرا مقصود کسی کی تحقیر و تنقیص ہے اور نہ کسی سے بحث و تمحیص۔ میرا مقصد قرآن پیش کرنا ہے۔ اگر قرآنی حقائق سامنے آجانے کے بعد بھی کوئی شخص اپنے کسی غیر قرآنی عقیدہ کو زیادہ محبوب رکھتا ہے تو اس کے لئے دعا کرتا ہوں کہ اللہ اسے حق قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ میں حق و باطل کی خفیف سی مصالحت کو بھی شرک سمجھتا ہوں کہ حق اگر ذرا بھی اپنے مقام سے سرک جائے تو حق نہیں رہتا، باطل ہو جاتا ہے۔ اگر میرا یہ مسلک کسی پر گراں گذرتا ہے تو میں معذور ہوں۔ کہ

جہانِ او دگر است و جہانِ من دگر است

جی چاہتا تھا کہ ان احباب کا شکریہ ادا کروں جنہوں نے متذکرہ صدر موانع و مشکلات میں میرا ہاتھ بٹایا۔ لیکن پھر یاد آگیا کہ قرآنی رشتہ اظہارِ سپاس گذاری و تشکر کی رسمیات سے بلند ہوتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں

یک نگہ، یک خندۂ دزدیدہ، یک تابندہ اشک

کی خاموشیاں وہ کچھ کہہ جاتی ہیں جو بیان و کلام کی ہزار سحر آفرینیاں بھی نہ کہہ سکیں۔

مقامِ مسرت ہے کہ اس دشوار گذار منزل میں بھی علامہ حافظ محمد اسلم جیراج پوری مدظلہ کی حوصلہ افزائی میرے شریکِ حال رہی۔ آج قرآنی حلقہ میں ان کی ہستی یقیناً مغتنمات میں سے ہے۔

باقی رہی توفیقِ ایزدی؛ سو اس کے بغیر تو ایک حرف بھی نہ سمجھ میں آسکتا ہے نہ سمجھایا جا سکتا ہے۔ جو کچھ آپ کے سامنے ہے اس کے عیوب و اسقام میرے ہیں اور صفات و حسنات اس کی طرف سے مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ۔

میرے ساقی نے عطا کی ہے مئے بے دُرد و صاف
رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے

نئی دہلی　　　　پرویز
　　　　　　　　مارچ ۱۹۴۵ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مطالب

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

بابِ خلق الانسان من طین

انسان

(شجر ارتقا کا گلِ سرسبد)

سکوتِ شام سے تا نغمۂ سحر گاہی ہزار مرحلہ ہائے فغانِ نیم شبی
کشاکشِ زم و گرما تپ و تراش و خراش ز خاک تیرہ دروں تا بہ شیشۂ حلبی
مقامِ بست و کشاد و فشار و سوز و کشید میانِ قطرۂ نیسان و آتشِ عنبی
مغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند
ستارہ می شکنند آفتاب می سازند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسان

انسانی بچہ کی پیدائش آج ہمارے نزدیک ایک ایسا عادی اور معمولی واقعہ بن چکی ہے۔ جیسے سورج کا طلوع وغروب۔ لیکن اسباب وعلل کی کڑیوں میں جکڑا ہوا انسان جب کتابِ تخلیق کے اوراق کو پیچھے کی طرف اُلٹتا ہے تو اُس کی نگہِ استعجاب کا اُس مقام پر جاکر رُک جانا ضروری ہے جسے وہ سلسلۂ تخلیقِ انسانی کی سب سے پہلی کڑی قرار دیتا ہے۔ اس وادیِ حیرت میں پہنچ کر وہ ٹھٹک کر رہ جاتا ہے کہ "سب سے پہلا انسان" کس طرح وجود میں آگیا۔ اس کا تحیّر بجا اور تعجب درست ہے۔ انسانی تحقیق وتفتیش کا ماحصل اور اس کے تمام انکشافات وایجادات کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ وہ کارگہِ عالم کے مختلف پرزوں کے اسباب وعلل کی کڑیوں پر پڑے ہوئے پردوں کو اپنی مژگانِ کاوش سے اٹھا لیتا ہے۔ لیکن جہاں اس سلسلۂ دراز کی آخری کڑی آجاتی ہے، اُس کی نگہِ تجسس کے سامنے پردۂ حیرت کے سوا اور کچھ نہیں رہتا۔ یہ مقامِ تحیّر واستعجاب انسانی علم وتحقیق کی نسبت سے متعین ہوتا ہے یعنی جس قدر علم ودانش کی سرحدیں آگے بڑھتی جائیں گی اسی نسبت سے یہ مقام بھی آگے سرکتا چلا جائے گا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر ایک خدا فراموش مادہ پرست اور ایک حق شناس عبدِ مومن کا فرق نمایاں طور پر سامنے آجاتا ہے۔ اوّل الذکر اس مقام سے آگے وادیِ حیرت کو اپنی ذہنی قیاس آرائیوں کی آماجگاہ بناتا ہے اور اس طرح خود بھی ٹھوکریں کھاتا ہے اور دوسروں کو بھی راہ سے گم کرتا ہے۔ لیکن ایک حکیمِ مومن وہاں پہنچ کر بلا تامل پکار اٹھتا ہے کہ اس سلسلۂ دراز کی ابتدا اس قادرِ مطلق کی اسباب فراموش مشیّت اور علل ناآشنا صمدیت کی رہینِ منت ہے جو طبعی سلاسلِ اسباب وذرائع سے مستغنی اور علائق وعلل سے بے نیاز ہے۔ وہ علیٰ وجہ البصیرت اس حقیقتِ عظمیٰ کا اعلان کرتا ہے اور اس طرح حیرت واستعجاب کی وہ وادی جو اُس خدا فراموش محقق کی قیاس آرائیوں سے تیرہ وتار ہو چکی تھی اس مردِ خود آگاہ وخدا مست کی مشعلِ ایمان وشمعِ ایقان سے جگمگا اٹھتی ہے۔

سب سے پہلا انسان

"سب سے پہلا انسان" کس طرح وجود پذیر ہو گیا۔ یہ وہ مقامِ تحیر ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ انسانی شعور نے جب پہلے پہل آنکھ کھولی تو اپنے گرد و پیش ایک نگار خانۂ حیرت دیکھا۔ سطحِ ارض کی حدود فراموش وسعتیں، فضائے آسمانی کی ناپیدا کنار پہنائیاں" سامنے ایک خوفناک بحرِ متلاطم دائیں بائیں لرزہ انگیز، دیو ہیکل سلسلۂ کوہ۔ اوپر ایک معلق دہیب چھت۔ اُفق کے اس پار سے، ہر صبح ایک انگارۂ آتشیں کی نمود اور ہر شام شفق کی جوئے خونیں میں اس کا غروب۔ محفلِ انجم کی شمع فروزاں۔ کہکشاں کی گرد میں اور چاند کا ساغرِ نور۔ وہ اس طلسم ہوش رُبا کو دیکھتا تو اُس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں۔ وہ بھلا کیسے سمجھ سکتا تھا کہ کائنات کا یہ محیّر العقول سلسلہ کیا ہے؟ زمین کہاں سے آئی ہے۔ پہاڑ کیسے پیدا ہو گئے ہیں۔ سورج کہاں سے آتا اور کہاں چلا جاتا ہے؟ یہ چاند، یہ تارے۔ یہ دریا، یہ سمندر کیسے پیدا ہو گئے۔ یہ سوالات بار بار اس کے سامنے آتے اور ہر بار اُسے ایک نئی دنیائے حیرت میں چھوڑ جاتے۔ وہ بیچارا کیا سمجھ سکتا کہ ؎

سبزہ و گُل کہاں سے آئے ہیں؟
ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟
(غالب)

اور جب وہ عام عالمِ آفاق کے متعلق کچھ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اس کی تخلیق کس طرح سے ہو گئی ہے تو بھلا اس معمہ کو کیسے سلجھا سکتا کہ "سب سے پہلا انسان" کس طرح پیدا ہو گیا؟ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا تھا کہ یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دے لے کہ سب سے پہلے کسی نہ کسی طرح ایک مٹی کا پتلا بن گیا ہو گا۔ جس میں جان ڈال دی گئی ہو گی۔ اور پھر اس پتلے کی پسلی چیر کر اس میں سے اس کے لئے ایک بیوی پیدا کر دی ہو گی۔ اور اس جوڑے سے اولاد کا سلسلہ آگے بڑھ گیا ہو گا۔ وہ بیچارہ اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا تھا؟ لیکن جب اس کے شعور میں کچھ پختگی آگئی اور اس نے زندگی کی کچھ منازل طے کر لیں تو اس کے زمانۂ طفولیت کی یہ توجیہہ باعثِ طمانیت اور وجہ شکیبائی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے اضطراب نے کاوشِ تجسس و خلشِ تحقیق کی صورت اختیار کی۔ علمِ اشیائے فطرت (Natural Sciences) کی رُو سے جس کی صلاحیت اس میں ودیعت کر کے رکھ دی گئی تھی۔ اس نے ان پیچ در پیچ رموز کی گرہ کشائی کی کوشش شروع کی۔ اور رفتہ رفتہ اُس کی تحقیقات نے اس نتیجہ کی صورت اختیار کر لی جسے آج نظریۂ ارتقاء (Theory -of organic Evolution) سے تعبیر کیا جاتا ہے! اس کی نگہِ تفحص نے بھانپا کہ

نظریۂ ارتقا

کائنات میں منظم و مربوط انداز سے ایک سلسلۂ تدریج و تحوّل جاری و ساری ہے یعنی ہر شے ایک خاص قانون کے ماتحت بتدریج نشو و ارتقاء کے مدارج طے کر رہی ہے، اور یوں ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ یہ تحوّل و تقلّب کچھ ایسے غیر محسوس انداز سے عمل میں آ رہا ہے کہ سطحی آنکھ اسے محسوس طور پر دیکھ نہیں سکتی۔ اور پھر، یہ تبدیلیاں اتنے طول طویل عرصے کے بعد ظہور پذیر ہوتی ہیں کہ

انسانی یادداشت کے لئے اس کا ریکارڈ رکھنا مشکل ہے۔ اس لئے ان تدریجی انقلابات کے لئے خود صحیفۂ فطرت کے اوراق اور خزائن و دفائن ارضی کے نقوش و آثار کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ کتاب فطرت کے ان منتشر اوراق کے مطالعہ کے بعد، ذہن انسانی، تخلیقِ انسانی کے متعلق جس نتیجہ پر پہنچا ہے وہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ

(۱) صفحۂ ارض پر زندگی (Life) کی ابتدا پانی سے ہوئی ہے۔

(۲) پانی اور مٹی کے امتزاج سے زندگی کے جرثومۂ اولیں کو پیکر عطا ہوا۔

(۳) زندگی کے یہ جراثیم مختلف نوعوں میں تقسیم ہو کر ایک درخت کی شاخوں کی طرح بڑھنے پھولنے لگے۔

(۴) ان جراثیم کے پیکروں میں ہزار ہا ہزار سال کے مراحل کے بعد مختلف تبدیلیاں واقع ہوتی رہیں

(۵) ان طویل المیعاد مراحل کو طے کر کے سلسلۂ تخلیق اس منزل پر پہنچا جسے "تخلیق بذریعہ تناسل" کہتے ہیں۔ یعنی حیوانی زندگی۔

(۶) حیوانی زندگی اسی قسم کے غیر محسوس اور طویل المیعاد مراحل طے کرنے کے بعد منزل بمنزل انسانی پیکر میں جلوہ ریز ہوئی۔

اس طرح نوعِ انسانی کی ابتدا ہوئی۔

انسانی تخلیق کے متعلق یہ انکشافات وہ تھے جو مغربی سائنسدانوں کے سامنے ان کی سائنٹفک تحقیقات اور طبعی شاہدات کے بعد آئے۔ اس کے برعکس، ان کی مذہبی کتابوں (بائبل) میں انسانی تخلیق کے متعلق جو کچھ لکھا تھا وہ اس علمی تحقیق کے سامنے ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ اس کی وجہ سے وہاں کے محققین اس نتیجے پر پہنچ گئے (اور ان کا اس نتیجے پر پہنچنا حق بجانب بھی تھا) کہ مذہبی کتابیں درحقیقت اس عہد کے افسانوں پر مشتمل ہیں جب انسانی شعور ہنوز بچپن میں تھا۔ اس لئے ان کتابوں کے بیانات (مذکورات علم و بصیرت کی روشنی میں پرکھے جانے کے قابل ہی نہیں ہیں۔ اس حد تک تو مغرب کے محققین اپنے خیال میں سچے تھے۔ لیکن انہوں نے بغیر تحقیق کئے غلطی سے، یہ سمجھ لیا کہ ہر مذہبی کتاب اسی قسم کے توہم انگیز افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اگر وہ اس باب میں عجلت بازی نہ کرتے اور جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں علم و تحقیق کے بعد کسی نتیجے تک پہنچتے ہیں، اس بارے میں بھی ذاتی تحقیق سے کام لیتے تو ان پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی کہ دنیائے مذاہب میں ایک کتاب ایسی بھی ہے جس کا اعلان یہ ہے کہ:۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (۱۲/۱۰۸)

(اے پیغمبر) ان سے کہدو کہ میری روش یہ ہے کہ میں خدا کی طرف علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں۔ میں بھی، اور جن لوگوں نے میرے پیچھے قدم اٹھایا ہے۔ وہ بھی (اسی طرح دعوت دیتے ہیں) (کائنات میں خدا کا قانون کارفرما ہے جو جہالت کی توہم پرستیوں سے بہت بلند ہے اور اس قدر قوتوں کا مالک کہ اس میں کسی اور کی قوت شامل ہی نہیں۔ میں اسی قانون کو مانتا اور اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں)۔

یہ آواز صحرائے عرب سے، ایک نبی اُمّی کی زبانِ اقدس سے، اُس زمانہ میں بلند ہوئی جب اہلِ مغرب ہنوز درختوں کے پتوں اور حیوانات کی کھالوں سے اپنا ستر ڈھانپا کرتے تھے۔ لیکن مغرب نے ایسا نہ کیا اور اس کی وجہ سے قرآن جیسی سراپا علم وبصیرت کتاب، علم وعقل کی حریف سمجھ لی گئی۔ ارتقائے علومِ انسانی کے لئے وہ دن انتہائی بدبختی کا تھا جب یورپ کی "سندِ تحقیق" سے یہ فتویٰ صادر ہوا کہ قرآن بھی، بائبل کی طرح، اساطیر الاولین (توہم پرستانہ افسانوں) کا مجموعہ ہے۔ دنیا میں اس سے بڑا جھوٹ کبھی نہیں بولا گیا۔ اس سے بڑی حماقت "اہلِ دانش وبینش" نے کبھی نہیں کی۔ آج اس کا اندازہ بمشکل کرایا جا سکتا ہے کہ (مغرب کی دنیا) اپنے اس غلط فیصلے سے علم کے کتنے بڑے سرچشمے سے محروم رہ گئی۔ اگر مغرب کے متلاشیانِ حقیقت کے سامنے قرآن اپنی اصلی شکل میں آجاتا تو نہ معلوم آج دنیا کیا سے کیا ہو جاتی؟ زیرِ نظر موضوع میں سائنس کا معرکہ آرا کارنامہ نظریۂ ارتقا (Theory of organic Evolution) ہے۔ ذرا قرآن کریم کے اوراق الٹئے اور دیکھئے کہ اس باب میں اس کے ارشادات کیا ہیں۔ واضح رہے کہ (میں اپنی دوسری تحریروں میں تفصیلاً لکھ چکا ہوں) قرآن کریم

قرآن اور سائنس کے انکشافات

"سائنس کی تحقیقات" کی کتاب نہیں اس کا اصل موضوع ایک ایسے معاشرے کی تشکیل ہے جس میں تمام نوعِ انسانی کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہو جائے اور اس طرح شرفِ انسانیت اپنی تکمیل تک پہنچ جائے۔ لیکن اس مقصدِ عظیم کی تبئین و توضیح کے سلسلہ میں ضمناً وتبعاً دوسری چیزوں کا بھی ذکر آجاتا ہے اور چونکہ یہ ذکر خدائے علیم وحکیم کی طرف سے ہوتا ہے جو کائنات کا خلاق ہے۔ اس لئے ہو نہیں سکتا کہ اس کی طرف سے کائنات کے متعلق کوئی اشارہ آجائے۔ اور وہ (معاذ اللہ) حقیقت کے خلاف ہو۔ مشین کا مبدع وخالق مشین کے متعلق ذرا سا اشارہ بھی کرے گا تو وہ مبنی علی الحقیقت ہوگا۔

أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ﴿۶۷/۱۴﴾

کیا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا ہے؟ اور وہ بڑا باریک بین اور انتہائی باخبر ہے۔

اس ضمنی وضاحت کے بعد آپ دیکھئے کہ اشیائے کائنات کے طبعی ارتقاء اور انسانی تخلیق کے متعلق قرآن کریم نے کیا کہا ہے۔

نظریۂ ارتقا اور قرآن کریم سلسلۂ کائنات کی ابتداء، اس کے تدریجی مراحل اور تکمیل کے متعلق قرآنِ کریم نے ایک اصول بیان کیا ہے۔ جو اس بحث کا نقطۂ ماسکہ ہے۔ ارشاد ہے:۔

یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۝ (۳۲/۵)

تدابیرِ الٰہیہ (خدا کی اسکیموں) کی صورت یہ ہے کہ وہ اپنی مضمر شکل میں علمِ الٰہی کی بلندیوں پر ہوتی ہیں۔ جب ان میں سے کسی اسکیم کو بروئے کار لانا مقصود ہوتا ہے تو زمین کی پستیوں سے اس کا نقطۂ آغاز ہوتا ہے۔ پھر وہ اسکیم اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی اپنے مقامِ تکمیل کی طرف اٹھتی چلی جاتی ہے۔ یہ مراحل بڑے بڑے طویل المیعاد وقفوں میں طے ہوتے ہیں۔ جن میں کا ایک ایک وقفہ (Period) تمہارے حساب و شمار کی رو سے ہزار ہزار برس کا ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ اس خدا کے قانون کے مطابق ہوتا رہتا ہے جو ہر شے کی موجودہ صورت اور اس کے مضمر ممکنات دونوں سے واقف ہوتا ہے اور جو اپنے اندر اتنی قوت رکھتا ہے کہ ہر شے کو نشو و نما دے کر اس کے نقطۂ تکمیل تک پہنچا دے۔

مشیتِ ایزدی کے سامنے ایک اسکیم ہوتی ہے جسے اس کی انتہائی پستی، نقطۂ اولیں (سب سے نچلی منزل) سے شروع کیا جاتا ہے۔ پھر وہ اسکیم ان خاص قوانین کے ماتحت جو اس کے لئے متعین کئے جاتے ہیں، نشو و ارتقاء کے مراحل طے کرتی اپنی تکمیل کے نقطۂ آخریں تک جا پہنچتی ہے۔ یہ مراحل بڑے بڑے طویل المیعاد "ایام" (Periods) میں طے ہوتے ہیں کہیں ہزار ہزار سال کا ایک ایک تدریجی مرحلہ کہیں پچاس پچاس ہزار سال کا۔

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَةٍ (۷۰/۴)

"ملائکہ اور روح" اس کی طرف بلند ہوتے ہیں ایک (ایک) دن میں جس کی مقدار (پچاس پچاس) ہزار سال کی ہوتی ہے۔

نقطۂ آغاز بیج کو درخت، قطرے کو گہر، خاک کے ذرے کو انسان بننے کے لئے ان تدریجی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ کارگہِ مشیت کے ان عظیم المرتبت امور (Schemes) میں سے ایک اہم اسکیم انسان کی تخلیق ہے۔ اس اسکیم کا نقطۂ آغاز، طین (درجۂ جمادات) بتایا گیا ہے۔

وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ۝ (۳۲/۷)

انسانی تخلیق کی ابتدا مٹی سے کی۔

واضح رہے کہ خلق کے معنی کسی شے کو عدم سے وجود میں لانا نہیں۔ اس کے معنی ہیں مختلف عناصر میں خاص ترکیب پیدا

کرکے، اس سے ایک نئی چیز بنا دینا۔ یہاں جس "نقطۂ آغاز" کا ذکر ہے وہ، وہ مقام ہے جہاں سے زندگی ایک محسوس و مشہود شکل میں سامنے آجاتی ہے۔ اس سے پہلے مقامات کا ذکر نہیں۔

سورۂ انعام میں ہے:۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ قَضٰىٓ اَجَلًا ۭ وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ۝ (۶/۲)

وہ ذات جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر تمہارے لئے (مختلف مراحل کی) ایک میعاد مقرر کردی۔ اور ان میعادوں کے بعد، ایک اور میعاد بھی اس کے علم میں ہے۔ پھر بھی تم (اس حقیقت میں) شک کئے جاتے ہو۔

سورۂ ہود میں طین کے بجائے ارض کہا گیا ہے جو اور بھی جامع اور واضح ہے۔

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ۭ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ۝ (۱۱/۶۱) (نیز ۵۳/۳۲)

اور ہم نے قوم ثمود کی طرف اس کے بھائی بندوں میں سے صالح کو بھیجا۔ اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو! محکومیت صرف خدا کے قانون کی اختیار کرو۔ کیونکہ اس کے علاوہ کائنات میں اور کسی کا قانون نہیں چل رہا۔ اس نے تمہیں (اپنے اس قانون کے مطابق) ارض سے اوپر ابھار دیا۔ اور اسی میں آباد کر دیا۔ لہٰذا تم اپنی حفاظت کا سامان بھی اُسی کے قانون سے طلب کرو اور اگر اس وقت تک تم کسی اور روش پر چل رہے تھے تو اسے چھوڑ کر اسی کی روش پر چلو۔ اس کا قانونِ ربوبیت ہر ایک کے قریب ہے اور ہر ایک کی پکار کا جواب دیتا ہے۔"

سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہے:۔

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ۝ (۲۰/۵۵)

ہم نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اسی میں تمہیں گردشیں دے رہے ہیں اور پھر اسی سے دوسری مرتبہ اٹھائے جاؤ گے۔

مٹی کا پتلا نہیں بنایا بلکہ مٹی کے خلاصہ سے اس کی تخلیق کی ابتدا کی۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ (۲۳/۱۲)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔

جب ابلیس نے اس آدمِ خاکی کے سامنے جھکنے سے انکار کیا ہے (جس کی تفصیل آئندہ باب میں ملے گی)، تو یہی

کہہ کر کہ اس کی پیدائش کا مادہ مٹی ہے۔ میں اس کے سامنے کیوں جھکوں؟

قَالَ مَا مَنَعَكَ أَلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ ۖ قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ ○ (۷/۱۲ ، نیز ۱۵/۳۳ ، ۱۷/۶۱ ، ۳۸/۷۶)

اللہ نے کہا جب ہم نے تجھے حکم دیا تھا تو (اے ابلیس) کس بات نے تجھے جھکنے سے روکا۔ اس نے کہا کہ (اس بات نے کہ) میں آدم سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے۔

لیکن منزلِ جمادات میں (جو اس سلسلہ کا نقطۂ آغاز ہے) زندگی محوِ خواب تھی (کُنتُم أَمْوَاتًا ۲/۲۸) تم غیر شعوری حالت میں مردہ تھے) اس کی بیداری پانی کے چھینٹے سے ہوئی۔[1]

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۖ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ ○ (۲۱/۳۰)

اور ہم نے ہر جاندار شے کو پانی (الماء) سے بنایا۔ کیا یہ لوگ اس حقیقت پر یقین نہیں رکھتے؟

سرچشمۂ حیات

زندگی کی جل پری نے اپنی آنکھ پانی کی گہرائیوں میں کھولی۔ سائنس کی تحقیق اسی نقطہ پہنچی ہے کہ حیات کے جرثومۂ اولیں (protoplasm) کی ابتدا سمندر میں ہوئی ہے۔ اسی لئے اس میں اسی نوعیت اور اسی تناسب کے املاح (salts) پائے جاتے ہیں جیسے سمندر کے پانی میں۔ یوں تخلیقِ انسانی کا قافلہ، وادیٔ خاک سے منزلِ آب کی طرف منتقل ہوا۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا ۗ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيرًا ○ (۲۵/۵۴)

اور اللہ وہ ہے جس نے انسان کو پانی سے پیدا کیا۔ پھر اس کے رشتے اور ناتے بنائے اور تیرے نشو ونما دینے والے نے اپنے قانون کے مطابق ہر شے کے اندازے اور پیمانے مقرر کر رکھے ہیں۔

"پانی اور مٹی" کے خلاصہ کے امتزاج سے اس جرثومہ نے خلیہ (cell)[2] کی شکل اختیار کی جس کے ہیولیٰ کو قرآن کریم نے طینِ لازب (کیچڑ کی سی چپچپی مٹی) سے تعبیر کیا ہے۔

إِنَّا خَلَقْنَاهُم مِّن طِينٍ لَّازِبٍ ○ (۳۷/۱۱)

ہم نے انسانوں کو طینِ لازب (چپچپی مٹی) سے تعبیر کیا ہے۔

طینِ لازب

یہ طینِ لازب وہی ہے جو نالیوں کی تہ میں اور جوہڑوں کے کنارے دکھائی دیتی ہے۔ جب پانی سوکھ جاتا ہے تو یہ سیاہ رنگ کی (کالی بھجنگ) مٹی بڑی سخت ہو جاتی ہے۔

---

[1] اس سے اس اگلی منزل کی طرف اشارہ بھی ہو سکتا ہے جس میں انسانی تولید نطفے کے ذریعہ ہوتی ہے۔

[2] خلیہ (cell) مرکب ہوتا ہے مادۂ خمیر (Nucleus) اور پیکر (cell-body) سے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ (۱۵/۲۶ نیز ۵۵/۱۴)

اور بلاشبہ یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو خمیر اُٹھے ہوئے گارے سے بنایا جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے

پانی اور مٹی کی آمیزش سے جرثومۂ حیات نے پیکر کی شکل اختیار کی۔ ان خلیات (cells) میں ایک لیس دار مادہ (nucleus) زندگی کے تمام عظیم المرتبت امکانات اپنے اندر لئے ہوتا ہے، جیسے ایک ننھا سا بیج ایک تناور درخت کو اپنے اندر سمیٹے نمو و شگفتگی کے لئے ہمہ تن اضطراب ہو۔ حیات کا یہ نقطۂ آغاز وہ نفسِ واحدہ ہے جس سے شجرِ زندگی کی شاخیں پھوٹتی ہیں۔ ایک خلیہ خاص حد تک پہنچ کر جوشِ نمو سے خود بخود دو حصوں میں منقسم ہو جاتا ہے جنہیں (daughter cells) کہا جاتا ہے۔ اس نفسِ واحدہ سے جاندار مخلوق کی شاخیں پھوٹیں اور ایک طویل القامت درخت کی طرح سطحِ ارض پر پھیل گئیں۔ ہر شاخ کو مخلوق کی ایک الگ نوع (species) سمجھئے جو بڑھتی، پھولتی، پھلتی اپنی اپنی سمت میں نشوونما و ارتقاء کے منازل طے کئے جا رہی ہے۔ ان تمام شاخوں میں سربلند نوعِ انسانی کی شاخ ہے۔ جو اس نفسِ واحدہ کے ننھے سے بیج سے مختلف مراحل طے کرتی۔ درجہ بدرجہ، قدم بقدم، جادہ بجادہ منزل بمنزل اس بلندی تک آپہنچی ہے۔

شجرِ ارتقا

مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ۝ وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا ۝ ...... وَاللّٰهُ أَنْبَتَكُمْ مِّنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا ۝ (۷۱/۱۳-۱۷)

تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ سے وقار کے آرزومند نہیں ہوتے اور یقیناً اس نے تمہیں مختلف مراحل سے گزار کر پیدا کیا ہے..... اور تمہیں زمین سے اگایا ہے ایک طرح کا اگانا

درجہ بدرجہ۔ طبقاً طبقاً یہاں تک پہنچا دیا۔

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (۸۴/۱۹)

تم یقیناً ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہوتے ہوئے شاہراہِ زندگی پر آگے بھی بڑھتے جاؤ گے اور بلند بھی ہوتے جاؤ گے۔

اس خوردبینی نفسِ واحدہ سے سلسلۂ تخلیق آگے بڑھا۔ اس نشأۃِ اولیٰ کے بعد وہ نفسِ واحدہ مختلف منازل میں ٹھہرتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ وہ اس پیکرِ بشریت کے مقام تک آپہنچا جو اس حیاتِ ارضی میں اس کی جائے قرار ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ أَنْشَأَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ۝ (۶/۹۹)

وہی ہے جس نے تمہیں نفسِ واحدہ سے نشوونما دی۔ پھر تمہارے لئے مختلف منازل مقرر کیں کہ تم ایک مدتِ معین کے لئے ایک منزل میں ٹھہرو اور وہ منزل پھر تمہیں اگلی منزل کے سپرد کر دے۔ بلاشبہ ہم نے اپنے قوانین حیات

کو سمجھ بوجھ رکھنے والوں کے لئے تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

اس انتقالِ مکانی یعنی ایک مستقر سے دوسری منزل تک پہنچنے میں قرنہا قرن (الف سنتیں) گزر گئے۔ اور یوں جراثیم حیات (life-cells) کے ابتدائی مرحلہ کے بعد وہ مقام آگیا جہاں تخلیق کا سلسلہ بذریعہ تناسل شروع ہوا۔

ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ﴿۳۲/۸﴾

پھر اس کی (انسان کی) نسل کو کمزور سے پانی کے خلاصہ سے بنایا۔

حیوانی زندگی کی ابتدا

یعنی ان تمام سابقہ طبقات سے گزار کر، ہزار ہا سال کی تشکیل و تدبیر اور ساخت و بافت کے بعد، اس کا سلسلہ "کمزور سے پانی کے نچوڑ" سے جاری رکھا۔ یعنی حیوانی زندگی کا سلسلہ افزائش نسل تولید کے ذریعے شروع ہوا۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۚ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿۲۳/۱۲-۱۳﴾

اور دیکھو! یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا پھر ہم نے اسے نطفہ سے بنایا۔ ایک ٹھہر جانے اور دبا رہنے کی جگہ میں۔

سورۂ یٰسین میں ہے:-

اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ﴿۳۶/۷۷ نیز ۱۶/۴﴾

کیا انسان اس پر غور نہیں کرتا کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا۔ اور رہا یہ (اس کی کیفیت یہ ہے کہ یہ حقائق ابدی اور کبریائے خداوندی کے خلاف) کھلا کھلا جھگڑا کرتا ہے۔ (حالانکہ اگر وہ ذرا غور و تدبر سے کام لے تو اس پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ خدا کا قانون، جو اشیائے کائنات کو اس طرح تخلیقی مراحل میں سے گزار رہا ہے، کس قدر ہمہ گیر اور محکم ہے)

سورۂ حج میں ان مراحل کا یوں ذکر فرمایا گیا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۚ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ؕ وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ﴿۲۲/۵ نیز ۴۰/۶۷﴾

اے نوعِ انسانی! اگر تمہیں اس بارے میں شک ہو کہ آدمی (دوبارہ کس طرح) جی اٹھے گا تو (اس بات پر غور کرو کہ)

ہم نے تمہیں کس چیز سے پیدا کیا؟ مٹی سے۔ پھر تمہاری پیدائش کا سلسلہ کس طرح آگے بڑھا؟ اس طرح کہ پہلے نطفہ بنتا ہے پھر علقہ بنتا ہے (یعنی جونک کی طرح ایک چیز)۔ پھر متشکل اور غیر متشکل گوشت کا ایک ٹکڑا۔ تاکہ جو آخری شکل تم نے اختیار کرنی ہے اس کے خطوط اور گوشے واضح ہوتے چلے جائیں۔ (پھر دیکھو کہ جس نطفہ کو ہم چاہتے ہیں (کہ اپنے قانون کے مطابق تکمیل تک پہنچائیں) اسے عورت کے رحم میں ایک وقت مقررہ تک ٹھہرائے رکھتے ہیں (پھر جب وہ اپنے تمام مراحل طے کر لیتا ہے تو) طفولیت کی حالت میں تمہیں باہر لے آتے ہیں۔ پھر تم اپنی جوانی کی حالت تک پہنچ جاتے ہو۔ پھر تم میں کوئی ایسا ہوتا ہے جو (بڑھاپے سے پہلے ہی) مر جاتا ہے۔ کوئی ایسا ہوتا ہے جو (بڑھاپے تک پہنچتا ہے۔ اور اس طرح) عمر کی نکمی حالت کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے کہ سمجھ بوجھ کا درجہ پا کر پھر ناسمجھی کی حالت میں پڑ جائے۔ اپنی تخلیق کے علاوہ اگر تم خارجی کائنات پر غور کرو تو تمہیں نظر آئے گا کہ جب ہم خشک زمین پہ پانی برسا دیتے ہیں تو اچانک وہ لہلہانے اور ابھرنے لگتی ہے اور ہر قسم کی روئیدگیوں میں سے حسن و زیبائی پھوٹ پھوٹ کر اگ آتی ہے

دوسرے مقام پر ہے:۔

أَلَمْ نَخْلُقكُّم مِّن مَّآءٍ مَّهِينٍ ۝ (۷۷/۲۰)

کیا ہم نے تمہیں ایک کمزور سے پانی سے نہیں پیدا کیا؟

سورۂ الطارق میں ہے:۔

فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝ خُلِقَ مِن مَّآءٍ دَافِقٍ ۝ (۸۶/۵-۶)

پس انسان کو چاہیئے کہ وہ غور کرے کہ اسے کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے؟ اُسے پیدا کیا گیا ہے ایسے پانی سے جو اُچھل کر (رحم میں) گرتا ہے۔

قافلۂ حیات کی اس منزل میں جو مخلوق پیدا ہوئی اس میں رینگنے والے اور پاؤں کے بل چلنے والے حیوانات سب شامل ہیں۔

وَاللَّهُ خَلَقَ كُلَّ دَابَّةٍ مِّن مَّآءٍ ۖ فَمِنْهُم مَّن يَمْشِي عَلَىٰ بَطْنِهِ وَمِنْهُم مَّن يَمْشِي عَلَىٰ رِجْلَيْنِ ۚ وَمِنْهُم مَّن يَمْشِي عَلَىٰ أَرْبَعٍ ۚ (۲۴/۴۵)

اللہ نے ہر جاندار حیوان کو پانی سے پیدا کیا۔ ان میں سے وہ ہے جو اپنے پیٹ کے بل رینگتا ہے۔ اور ان میں وہ بھی ہے جو دو پاؤں پر چلتا ہے۔ اور ان میں وہ بھی ہے جو چار پاؤں پر چلتا ہے۔

صرف رینگنے اور پاؤں کے بل چلنے والے ہی نہیں بلکہ پرندے بھی۔ یعنی وہ تمام مخلوق جس کا سلسلۂ افزائش بذریعہ تناسل آگے بڑھتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ زندگی کی اس بڑی شاخ سے بہت سی چھوٹی چھوٹی شاخیں اِدھر اُدھر پھوٹیں۔

اس لئے اس حد تک یہ مختلف اقسام کی مخلوق، دراصل ایک ہی نوع کی مختلف شکلیں اور ایک ہی خاندان کے مختلف افراد ہیں۔

وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُم ۚ مَّا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِن شَيْءٍ ۚ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يُحْشَرُونَ ○ (۶/۳۸)

اور زمین میں چلنے والا کوئی حیوان اور ہوا میں پروں سے اڑنے والا کوئی پرندہ ایسا نہیں جو تمہاری ہی طرح گروہ (امت) نہ ہو۔ یہ سب کچھ ہمارے قانون کے مطابق ہو رہا ہے جس کے دائرے سے کوئی چیز باہر نہیں رہ سکتی۔ ان مختلف انواع کی مخلوق کا یک جا جمع ہونا ان کے نشوونما دینے والے کے قانونِ ربوبیت ہی کی بنا پر ہے۔

نر و مادہ کا امتیاز یہ وہ مقام ہے جہاں ذکور واناث (نر اور مادہ) کا امتیاز محسوس طور پر ہمارے سامنے آتا ہے۔

وَاللَّهُ خَلَقَكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ أَزْوَاجًا (۳۵/۱۱)

اور اللہ نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔ پھر نطفہ سے۔ پھر تمہیں جوڑے بنا دیا۔

یعنی اس مقام پر خلیاتِ حیات (life-cells) میں جنسی تخلیق (Sexual reproduction) کا جوہر نمایاں ہو گیا۔ یہ جرثومے (germ cells or Gametes) دو حصوں میں تقسیم ہو گئے ایک (ovum) یعنی مادہ خلیہ اور دوسرا (spermatazoon) نر کا خلیہ۔ یعنی ایک جرثومہ زندگی، ذوقِ تخلیق سے نر اور مادہ کے خلیوں میں بٹ گیا۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا ... (۷/۱۸۹)

وہی تمہارا پروردگار ہے جس نے تمہیں ایک نفسِ واحدہ (جرثومہ حیات) سے پیدا کیا اور اسی میں سے اس کا جوڑا بنا دیا۔

سورۂ روم میں ہے:۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ إِذَا أَنتُم بَشَرٌ تَنتَشِرُونَ ○ وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا .... (۳۰/۲۰-۲۱)

یہ بھی اس کے قوانین میں سے ہے کہ اس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا اور تم مختلف مراحلِ ارتقاء طے کر کے آدمی کی صورت میں چلتے پھرتے ہو۔ اور یہ بھی اسی کے قوانین کی رو سے ہے کہ اس نے تمہیں میں سے تمہارے جوڑے بنائے۔

سورۂ نساء میں ارشاد ہے:-

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً ...... (۴/۱)

اے نوعِ انسانی! اپنے پروردگار کے قانونِ نشوونما سے ہمیشہ ہم آہنگ رہو جس نے تمہیں نفسِ واحدہ سے پیدا کیا اور اس سے تمہارے جوڑے بنائے۔ اور ان جوڑوں سے مردوں اور عورتوں کی بڑی تعداد دنیا میں پھیلا دی۔

سورۂ شوریٰ میں فرمایا:

فَاطِرُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ جَعَلَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَمِنَ الْأَنْعَامِ أَزْوَاجًا ۖ يَذْرَؤُكُمْ فِيهِ ۚ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ۖ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ (۴۲/۱۱)

وہ ذات جو پستیوں اور بلندیوں کی خالق ہے، اُس نے تمہارے لئے تم میں سے جوڑے بنا دیئے۔ اور مویشیوں میں سے بھی جوڑے بنا دیئے۔ پھر وہی تمہیں پھیلاتا بڑھاتا رہتا ہے۔ اس ذات کی مثل کوئی نہیں۔ اور وہ سب کچھ سننے والا۔ دیکھنے والا ہے۔

ہرچند اپنے موضوع کے اعتبار سے ہم اس مقام پر احاطۂ بحث کو صرف حیوانی زندگی تک ہی محدود رکھنا چاہتے ہیں لیکن بعض دیگر نکات کا (جو ابھر کر سامنے آجاتے ہیں) اجمالی ذکر کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم نے نر و مادہ کی تمیز کا ذکر صرف حیوانات تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اس کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شے کے جوڑے بنائے ہیں۔

وَمِن كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (۵۱/۴۹)

اور ہم نے ہر شے کے جوڑے بنا دیئے ہیں تاکہ تم نصیحت حاصل کرسکو۔

دوسری جگہ ہے۔

وَالَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُم مِّنَ الْفُلْكِ وَالْأَنْعَامِ مَا تَرْكَبُونَ (۴۳/۱۲)

وہ ذات جس نے ہر شے کو جوڑے بنا دیئے اور اس نے تمہارے لئے کشتیاں اور مویشی پیدا کر دیئے جن پر تم سواری کرتے ہو۔

نباتات میں جوڑے

حیوانات کے ذکور و اناث کے متعلق تو کسی تشریح کی ضرورت نہیں۔ تحقیق جدید نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ نباتات میں بھی نر اور مادہ کا جوڑا ہوتا ہے۔ اور اُن کا سکن

بالعموم پودے کا پھول ہوتا ہے۔ پھول کی نرم اور نازک تیلیوں میں اوپر کی طرف ایک ایسا مادہ ہوتا ہے جس میں نر کا جوہر تولید (male stamens) حفاظت سے رکھا ہوتا ہے۔ پھول کے درمیانی حصہ میں ایک اور خانہ ہوتا ہے جسے (pistil) کہتے ہیں۔ اسے مادہ کا گوشۂ رحم سمجھئے۔ بعض پودوں میں جنہیں (Monoecious) کہتے ہیں، یہ دونوں جوہر ایک ہی پھول میں نہیں ہوتے بلکہ ایک پھول میں صرف نر کا مادۂ تولید ہوتا ہے، اسے (staminate) کہتے ہیں اور دوسرے پھول میں مادہ کا جوہر جسے (pistillatte) کہتے ہیں۔ بعض پودے ایسے ہیں جن میں ایک پودا نر اور دوسرا پودا مادہ ہوتا ہے۔ اس نوع کا نام (Dioecious) ہے۔ سطح بیں نگاہوں کے نزدیک یہ تحقیق بھی دورِ حاضرہ کی رہینِ منت ہے۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ نہ صرف نباتات میں نر و مادہ کے امتیاز کا علم بلکہ اصولی طور پر خود نظریۂ ارتقاء مغربی محققین سے بہت پہلے مسلمان حکماء دریافت کر چکے تھے۔

مسلمان حکماء اور نظریۂ ارتقاء اس باب میں حکیم ابن مسکویہ (المتوفی ۴۲۱ھ) کی معرکہ آراء تحقیق دنیائے علم میں ایک خاص امتیازی شان رکھتی ہے۔ اس نے اپنے مشہور رسالہ "الفوز الاصغر" میں اس نظریہ پر خصوصیت سے بحث کی ہے۔ نباتات کے تدریجی ارتقائی مراحل کا ذکر کرتے ہوئے یہ حکیم لکھتا ہے:۔

> اب یہی اثر تدریجی ترقی کر کے خرما کے درخت میں بغایت شرف ظہور کرتا ہے اور نباتات کو مرتبۂ اعلیٰ پر پہنچاتا ہے۔ کہ اگر اس مرتبے سے ذرا سا بھی آگے بڑھے تو حدِ نباتی سے نکل جائے اور صورتِ حیوانی اختیار کر لے۔ خرما کے درخت میں نفس کا اثر اس درجہ قوی اور زیادہ ہوتا ہے کہ حیوان سے کثیر مشابہت اور قوی نسبت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک تو مثل حیوان کے اس میں نر اور مادہ ہوتے ہیں۔ اور بار آور ہونے کے لئے نر کو مادہ سے ملانا ضروری ہوتا ہے۔ اس ملانے کو تلقیح کہتے ہیں جو حیوانات کے جماع کے مثل ہے۔ پھر خرما کے درخت میں علاوہ جڑ اور رگوں کے ایک چیز مثل دماغ حیوانات کے ہوتی ہے۔ یہ اس کے لئے ایسی ضروری ہے کہ اگر اس کو کوئی آفت لاحق ہو جائے تو درختِ خرما ضائع ہو جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ مسلمان حکماء کے زمانہ میں دورِ حاضرہ کے ریسرچ کے ذرائع موجود نہ تھے۔ لیکن اُن کے پاس (قرآن کریم کی) ایک ایسی درخشندہ قندیل تھی جس کی روشنی میں حقائق بے نقاب ہو کر سامنے آجاتے تھے۔

ہر شے کے جوڑوں کے متعلق قرآن کریم کے اشارات کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ خود نباتات کے متعلق ارشاد ہے:

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡ خَلَقَ الۡاَزۡوَاجَ کُلَّہَا مِمَّا تُنۡۢبِتُ الۡاَرۡضُ وَ مِنۡ اَنۡفُسِہِمۡ وَ مِمَّا لَا یَعۡلَمُوۡنَ ۝ (۳۶:۳۶)

وہ ذات (تمام نقائص و عیوب سے) پاک ہے جس نے زمین سے اُگنے والے (پودوں) میں سے ہر ایک کے

جوڑے بنا دیئے اور خود نوعِ انسانی میں سے بھی اور (ان چیزوں سے بھی) جنہیں وہ ابھی نہیں جانتے۔

رجعت الی المقصود

بہر حال، اِس نفسِ واحدہ نے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے پیکرِ حیوانی میں بھی قرنہا قرن گزارے۔ ان ادوار میں "انسان" ابھی قابلِ ذکر شے نہ تھا۔

هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا ○ (۷۶/۱)

کیا انسان پر وہ زمانہ نہیں گزر چکا جب یہ قابلِ ذکر شے نہ تھا۔

حیوانی زندگی کی ان تمام شاخوں میں سے ایک شاخ اوپر کو اُبھری یہ پیکرِ انسانی کی شاخ تھی۔ یعنی پیکرِ حیوانی

پیکرِ انسانی

کو بتدریج سنوارا گیا اسے حشو و زوائد سے پاک کر کے اس کی لطافت و نازک تر ہر دلبری میں جلا دی گئی اور یوں عروسِ حیات، حریمِ بشریت میں جلوہ ریز ہوئی۔

الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ ○ (۸۲/۷)

وہ ذات جس نے تجھے پیدا کیا پھر (ہر طرح سے) درست کیا۔ پھر (اعضاء و جوارح میں) تناسب پیدا کیا۔

پھر اسے احسنِ تقویم عطا فرمائی۔ یعنی بہترین توازن و تناسب کو لئے ہوئے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (۹۵/۴)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو بہترین ہیئت میں پیدا کیا جس میں توازن و تناسب اپنے ٹھیک ٹھیک مقام تک پہنچ گیا ہے۔

بہترین صورت[1] عطا فرمائی۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ ○ .... (۷/۱۱ نیز ۶۴/۳)

---

[1] یہ نہیں کہ جیسا تورات میں مذکور ہے (جس کا ذکر آگے چل کر آئے گا) انسان کو اللہ نے اپنی صورت پر پیدا کیا بلکہ اسی سلسلۂ ارتقا میں بہترین ہیئت عطا فرمائی۔ نہ ہی یہ کہ اس کی تخلیق خصوصیت سے کسی جداگانہ طریق پر ہوئی۔ بلکہ جس طرح خالقِ فطرت نے اور مخلوق کو اپنے دستِ قدرت سے بنایا اسے بھی اسی انداز و طریق سے پیدا کیا۔ مثلاً جہاں سورۂ صٓ میں انسان کے متعلق ارشاد ہے کہ قَالَ يَا إِبْلِيسُ مَا مَنَعَكَ أَن تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ (۳۸/۷۵) "اللہ نے فرمایا کہ اے ابلیس وہ کون سی بات ہے جس نے تمہیں اس سے روک دیا کہ جسے میں نے اپنے دستِ (قدرت) سے بنایا ہے اس کے آگے جھکو"۔ وہاں سورۂ یٰسین میں انعام کے متعلق فرمایا أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا خَلَقْنَا لَهُم مِّمَّا عَمِلَتْ أَيْدِينَا أَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مَالِكُونَ ○ (۳۶/۷۱) "کیا انہوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ ہم نے ان کے لئے اپنے دستِ (قدرت) سے مویشیوں کو بنایا جن کے یہ مالک ہیں"۔ یعنی انسان کی تخلیق بھی اسی قانون کے مطابق ہوئی ہے جس کے مطابق دیگر اشیائے کائنات کی تخلیق ہوئی ہے۔ اس میں اور دیگر اشیائے کائنات میں فرق یہ ہے کہ یہ سلسلۂ ارتقا کی اگلی کڑی ہے۔ ورنہ قانون ہر منزل میں ایک ہی کارفرما چلا آرہا ہے۔

اور ہم نے تمہیں مختلف تخلیقی مراحل میں سے گزارنے کے بعد انسانی صورت (Form) عطا کی۔

یہ احسنِ تقویم کیا ہے؛ اس بہترین ہیئت میں کون سی امتیازی خصوصیت ہے؛ وہ کون سا جوہرِ خصوصی ہے جس کی بنا پر انسان سلسلۂ ارتقاء کی سابقہ کڑیوں سے الگ حیثیت کا مالک بن گیا۔ قرآن کریم نے اسے ایک لفظ میں بیان فرمایا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ وہی لفظ اس کی امتیازی خصوصیات کو ایک نمایاں جامعیت سے ادا کر سکتا ہے۔ فرمایا۔ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ (۳۲/۹) (پھر اسے درست کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی) یعنی شجرِ ارتقاء کی اس شاخِ بلند و بالا کو ہر طرح سے درست کیا۔ اس میں مناسب صلاحیت و استعداد پیدا کی۔ اسے سنوارا آگے بڑھایا اور جب اس میں یہ صلاحیتیں پیدا ہو گئیں تو اسے درجۂ حیوانیت سے آگے بڑھا کر اس میں خدائی توانائی (Divine — Energy) کا کرشمہ ڈالا۔ اب وہ دیکھنے سننے اور سمجھنے سوچنے والا انسان بن گیا۔ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ (۳۲/۹) اور اس نے تمہارے لئے سمع بصر اور فواد بنایا۔ (یعنی عقل اور جذبات دونوں عطا کر دیئے) لیکن تھوڑے ہیں جو ان صلاحیتوں کی بھرپور نشوونما کرتے ہیں)۔ یہ

شرفِ انسانیت

"روحِ خداوندی" کیا ہے جس کی کرشمہ سازیوں نے ایک پیکرِ آب و گل کو کائنات کا جانِ مدعا بنا دیا؛ اس کی تفصیل تو اپنے مقام پر آئے گی، اس وقت صرف اتنا دیکھئے کہ اس "نفخِ روح" سے حاصل کیا ہوا؛ قرآن کریم کے الفاظ میں اس سے سمع و بصر و فواد عطا ہوا۔ کہنے کو تو یہ تین لفظ ہیں۔ لیکن اگر غور سے دیکھئے تو شرف و مجدِ انسانیت کی پوری کی پوری دنیا ان تین گوشوں میں سمٹ آئی ہے۔ دنیا میں یہی ذرائعِ علم و احساسات ہیں اسی کا نام انسانی ذات (personality) تشخص (Indviduality) یا الیغو (Ego) ہے۔ یعنی خدا "انائے مطلق" ہے۔ اور انسان میں "انائے صغر" ہے۔ اس سمع و بصر سے انسان کن ذمہ داریوں کا حامل بن جاتا ہے۔ یہ بھی قرآن ہی کی ایک آیۂ مقدسہ میں دیکھئے۔ فرمایا۔

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝ (۷۶/۲-۳)

یقیناً ہم نے انسان کو نطفہ سے پیدا کیا جو باہمی مل جانے والا ہوتا ہے (پھر اسے) ہم مختلف حالتوں میں گردش دیتے رہے حتیٰ کہ اسے سننے اور دیکھنے والا بنا دیا۔ اسے (پھر) ہدایت کا رستہ دکھا دیا۔ خواہ یہ اسے قبول کر لے یا اس سے انکار کر دے۔

اختیار و ارادہ کا جوہر

یہ ہے وہ سب سے بڑا امتیاز جو انسان کو حیوانی زندگی سے الگ کرتا ہے۔ یعنی انسان کی ذات اور اس کی بنا پر اختیار و ارادہ اس تمام پیچیدہ سلسلہ ارتقاء کی یہ کڑی اپنی سابقہ کڑیوں سے یکسر الگ ہو جاتی ہے۔ انسانی پیکر اپنے سلسلہ کے گزشتہ طبقات کی تعداد

اور صلاحیتوں کا حاصل جمع (sum-total) نہیں بلکہ یہاں پہنچکران تمام صلاحیتوں اور جوہروں میں ایک اور ہی قسم کی تبدیلی پیدا ہوئی جو ارتقاء کے اس سلسلہ سے بالکل مختلف تھی جو اس وقت تک چلا آرہا تھا۔ (اب تو خود مغرب کے سائنسدان بھی اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ یہ تبدیلی ارتقاء کے میکانکی اثر کا نتیجہ نہیں۔ تفصیل وحی کے عنوان میں ملے گی) یہ تبدیلی کا نتیجہ انسانی اختیار وارادہ ہے۔ جس سے نبضِ کائنات میں تموج اور زندگی کی جوئے رواں میں تلاطم برپا ہے۔ اختیار وارادہ کے بغیر یہ دنیا پہاڑوں، دریاؤں، جنگلوں کا بے رنگ مجموعہ اور درندوں۔ چرندوں، پرندوں کا ایک کیف مسکن (zoo) رہتی۔ حسن کی ضیائے تابندہ اور عشق کی آتشِ سوزندہ اس کے نصیب میں نہ ہوتی۔ یہ سب "نفخِ روح" کی سحرکاریاں ہیں جن سے یہ ویرانہ، رنگ و نعطر کا کاشانہ بن گیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں صفاتِ خداوندی ایک مقید (Finite) شکل میں بطور ممکنات (potentialities) ودیعت کردی گئیں۔ یہ خصوصیت اس سے پہلے کسی مخلوق کے حصے میں نہیں آئی تھی۔ یہی وہ "نفخِ روح" تھی جس سے یہ آدمِ خاکی مسجودِ ملائکہ[1] قرار پایا۔

إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّن طِينٍ ○ فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ ○ (۳۸/۷۱-۷۲)

جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں مٹی سے انسان بنانے والا ہوں۔ پس جب اُسے (مختلف مراحلِ ارتقاء کے بعد) سنوار دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جانا۔

یہ ہے وہ انسان جو زمین (مٹی) سے پیدا ہوا اور زمین میں بسایا گیا۔

وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ هُوَ أَنشَأَكُم مِّنَ الْأَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا فَاسْتَغْفِرُوهُ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ ۚ إِنَّ رَبِّي قَرِيبٌ مُّجِيبٌ ○ (۱۱/۶۱)

اور ثمود کی طرف اُن کے بھائی بندوں میں سے صالح کو بھیجا۔ اس نے اپنی قوم سے کہا کہ قانونِ خداوندی کی محکومیت اختیار کرو۔ اس کے سوا کسی اور کا اقتدار نہیں۔ اس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور اس میں بسایا۔ تم ہر قسم کی تباہیوں اور بربادیوں سے حفاظت کا سامان اسی کے قانون سے طلب کیا کرو۔ اور ہر دوسرے قانون کو چھوڑکر اس کے قانون کی طرف رُخ کرو۔ میرے پروردگار کا قانونِ ربوبیت ہر ایک کے قریب ہے اور ہر ایک کی مانگ کو پورا کرتا ہے۔

یہ ہے قرآن کریم کی رو سے جواب اس سوال کا کہ "سب سے پہلا انسان" کس طرح وجود میں آگیا؟ کہیے کہ علم و عقل

---

[1] ملائکہ کی حقیقت کے متعلق چند صفحات آگے چل کر دیکھیے۔

دانش و بینش سائنس اور علوم و فنون متعلقہ" اس سے کچھ زیادہ یا الگ بھی پیش کر سکے ہیں؟ اور یہ بیان حقیقت ہو اُس زمانہ میں، اُس زمانے میں جب دنیا ہنوز سائنس اور اس کے لزومات و ماجریات سے آشنا تک نہ تھی۔ آگے بڑھنے سے پیشتر ایک مرتبہ پھر نگہِ بازگشت ڈال لیجئے اس آیۂ مقدسہ پر جس سے اس موضوع کی ابتدا ہوئی ہے۔ نگہ ڈال لیجئے اور غور کیجئے کہ یہ پوری کی پوری داستانِ طول و طویل کس حسن و اعجاز نگاری سے چند جملوں میں سمیٹ کر رکھ دی گئی ہے۔ ارشاد ہے:۔

یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ .... قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝

(۳۲/۵-۹)

تدابیر الٰہیہ (خدا کی اسکیموں) کی صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی مقدّر شکل میں علم الٰہی کی بلندیوں پر ہوتی ہیں۔ جب الٰہی سے کسی اسکیم کو بروئے کار لانا مقصود ہوتا ہے تو زمین (مادہ) کی پستیوں سے اس کا نقطۂ آغاز ہوتا ہے۔ یہاں سے وہ اسکیم اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی اپنے مقامِ تکمیل کی طرف اٹھتی چلی جاتی ہے۔ یہ مراحل بڑے بڑے طویل المیعاد وقفوں میں طے ہوتے ہیں جن میں کا ایک ایک وقفہ تمہارے حساب و شمار کے مطابق ایک ایک ہزار سال کا ہوتا ہے....... مثلاً اس کی اسکیم یہ ہے کہ ہر شے کو مختلف تخلیقی تراکیب سے گزار کر بہترین تناسب توازن کا حامل بنا دیا جائے (اس اسکیم کی ایک شق خود انسان کی تخلیق ہے)۔ اس تخلیق کی ابتدا مٹی (طبقۂ جمادات) سے ہوئی۔ (پھر یہ مختلف مراحل میں سے گزرتا ہوا اس منزل میں پہنچا جہاں) اس کی تولید کا سلسلہ نطفہ کے ذریعے قرار پایا۔ پھر اس میں ہر طرح کا اعتدال پیدا کیا۔ اس کے بعد اس میں "خدا کی توانائی" (صفاتِ خداوندی) کا ایک شمہ ڈال دیا گیا۔ اور اسے علم و عقل اور احساسات و جذبات عطا کر دیئے۔ لیکن بہت تھوڑے لوگ ہیں جو ان صلاحیتوں کی کماحقہ نشوونما کرتے ہیں۔

اس سلسلۂ ارتقاء سے **نوعِ انسانی** (نہ کہ کوئی خاص فرد) وجود پذیر ہوئی۔

لیکن اس مقام پر ایک مرتبہ پھر اس حقیقت کو سامنے لے آیئے جس کا ذکر ابتدا میں کیا جا چکا ہے۔ یعنی قرآن کریم تاریخ و جغرافیہ، طبیعیات و کیمیات، حیاتیات و طبقات الارض کی کتاب نہیں۔ وہ ایک ایسا ضابطۂ حیات ہے جس سے انسانیت نشوونما و ارتقاء کے مراحل طے کر کے اس منزل تک پہنچ جائے جو اس سفرِ زندگی کا مقصود ہے۔ اس میں اگر

قرآن کریم کا منتہیٰ

متذکرہ صدر علوم و فنون کے متعلق اشارات پائے جاتے ہیں تو اُن سے مفہوم اس منزل کی طرف راہ نمائی اور اُس نصب العین کی طرف نگاہوں کا مرکوز کرنا ہے۔

مثلاً اسی نظریۂ ارتقاء کو لیجئے۔ اس سلسلۂ دراز کی اولین کڑی طین (طبقۂ جمادات) سے شروع ہوتی ہے۔ یہاں تک

ایک مادہ پرست سائنس داں بھی متفق ہے۔ اس کی تحقیق اسے از خود اس مقام تک لے گئی ہے۔ لیکن قرآن کریم، نگہ تجسس کو اس سے بھی پیچھے جانے کی دعوت دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس مادہ کو جسے سلسلہ ارتقا کی محسوس طور پر ابتدائی کڑی کہا جاتا ہے کہیں ازلی اور ابدی نہ سمجھ لینا۔ ایک وقت وہ تھا کہ یہ مادہ بھی کوئی شے نہ تھا۔[1] چنانچہ خود تخلیق انسانی کے متعلق فرمایا:۔

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُـــــــــــــــمُ الْخٰلِقُوْنَ ۝ (۵۲/۳۵)

(کیا یہ حقیقت ہے کہ) یہ (خود) اس انداز سے پیدا کئے گئے کہ کوئی شے موجود نہ تھی یا (یہ کہ) یہ خود خالق ہیں (حقیقت پہلی ہی بات ہے)

غیر شے نہیں بلکہ لا شے۔ پیدائش حضرت یحییٰؑ کے سلسلہ میں ارشاد ہوا۔

قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئًا (۱۹/۹)

فرمایا "ایسا ہی ہوگا۔ (یا اسی طرح ہوگا) "تیرا پروردگار کہتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لئے کچھ مشکل نہیں۔ میں نے اس سے پہلے خود تجھے (اے زکریا) پیدا کیا۔ حالانکہ تو کوئی شے نہ تھا۔

یہ وہ مقام ہے جہاں سے کائنات کی ابتداء امر الٰہی کے تابع ہوئی، جو ہر مادی اسباب و ذرائع سے بے نیاز ہے (تفصیل دوسرے مقام میں ملے گی)

یہ تو تھی ابتدا۔ اب انتہا کی طرف چلئے۔ مغرب کے محققین نے جب یہ دریافت کر لیا کہ خاک کا ذرہ کس طرح اپنی ارتقائی منازل طے کرکے درجہ انسانی تک آپہنچا ہے۔ تو انہوں نے کتاب کائنات کے اس باب (Chapter) کو ختم کر دیا اور سمجھ لیا کہ انسان کی موجودہ منزل ارتقاء کے سلسلہ دراز کی آخری کڑی ہے۔ اس کے بعد کچھ نہیں۔ لیکن قرآن کریم نے اس سلسلہ دراز کی مختلف کڑیوں کی طرف توجہ منعطف کرانے کے بعد نگہ تجسس کو فوراً اس طرف منتقل کر دیا کہ انسان کی موجودہ زندگی اس سلسلہ کی آخری کڑی نہیں بلکہ اسے ابھی قانون ارتقاء کے مطابق آگے بڑھ کر کسی اور منزل تک پہنچنا ہے۔ اس موجودہ منزل سے اگلی منزل کا نام حیات اخروی ہے۔ اس نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ انسانی زندگی دو درجات پر مشتمل ہے۔ ایک درجہ حیوانی زندگی کا ہے جو اسے نچلے درجے سے ارتقائی طور پر ملا ہے یہ اس کی طبیعی زندگی (Physical life) ہے جو ان ہی قوانین کے تابع ہے جن قوانین کے تابع دوسرے حیوانوں کی زندگی ہے۔ یعنی کھانے پینے سے زندہ رہنا اور پھر ایک مدت کے بعد، مرجانا۔ یعنی یہ موت انسان کے طبیعی جسم کی موت ہے۔ اس زندگی کا خاتمہ ہے جسے ہم نے درجہ حیوانی سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی زندگی کا دوسرا درجہ

---

[1] اس کی مختصر تفصیل عنوان زیر نظر کے آخر میں دیکھئے۔

انسانی درجہ ہے جس کی بنیاد "نفخ روح" (صفاتِ خداوندی) پر ہے یہ انسانی ذات یا اس کی خودی ہے۔ جو طبعی موت کے بعد بھی باقی رہ سکتی ہے۔ یہ درجہ انسانیت کا ہے۔ اس درجہ میں زندگی کی نشوونما اور فلاح و بقا کے لئے طبعی قوانین کام نہیں دیتے۔ یہاں ایک اور ضابطہ قوانین کارفرما ہوتا ہے (اس کی تفصیل دوسرے مقام پر ملے گی۔ یہی وہ زندگی ہے جو حیاتِ آخروی کے میدان میں مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم نظریۂ ارتقاء کو بیان ہی اس انداز سے کرتا ہے کہ حیاتِ آخروی یا نشاۃ ثانیہ ایک منطقی نتیجہ (Logical inference) کی حیثیت سے خود بخود سامنے آجائے۔ وہ سلسلۂ تخلیق میں، سب سے پہلے اس حقیقت ثابتہ کو سامنے لاتا ہے کہ کائنات کی کوئی شئے بلا مقصد پیدا نہیں کی گئی۔[1] جب کائنات کی دیگر اشیاء کے متعلق یہ تصریح فرما دی کہ وہ بلا مقصد نہیں پیدا کی گئیں۔ تو کیا انسان جو اس بزم کائنات کا صدر اور نظمِ عالم کا ٹیپ کا بند ہے۔ بلا مقصد پیدا کر دیا گیا؟ کیا یہ ممکن ہے کہ بیج سے لے کر کونپل تک درخت کا ایک ایک ریشہ کسی نہ کسی مقصد کو لئے ہوئے ہو۔ لیکن اس کا پھل بلا غرض و غایت پیدا کر دیا گیا ہو؟ یہ ناممکن ہے۔ اسی لئے فرمایا:

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ۝ (۲۳/۱۱۵)

کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہیں بلا مقصد پیدا کر دیا ہے اور تمہاری زندگی کی گردشوں کا رخ ہماری طرف نہیں!

مبداء سے معاد پر استدلال

دوسرے مقام پر اس کی تصریح ان الفاظ میں فرمائی:

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ۝ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ۝ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۝ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ۝ (۷۵/۳۶-۴۰)

کیا انسان خیال کرتا ہے کہ اسے بغیر کسی نصب العین کے یوں ہی چھوڑ دیا گیا ہے[2] ؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ یہ پانی کے کمزور سے قطرہ میں زندگی کا یہ چھوٹا سا جرثومہ تھا۔ پھر اس نے علقہ (جونک کی سی) شکل اختیار کی۔

---

[1] یہ مسئلہ کہ یہ کائنات بلا مقصد نہیں پیدا کی گئی۔ ایک عظیم الشان حقیقت کو اپنی آغوش میں لئے ہے۔ لیکن اس کی تفصیل کا یہ مقام نہیں۔ جس مقام پر یہ تفصیل آئے گی وہاں بتایا جائے گا کہ خود یورپ کے مادہ پرست سائنسدان کس طرح بالآخر اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں جس کی طرف قرآن کریم نے اتنا عرصہ پہلے توجہ دلائی تھی۔

[2] سُدًی کے لفظی معنی ہیں تانا ہی تانا جس میں بانا نہ ہو۔ اس سے قرآن نے ایک ایسی عظیم القدر حقیقت بیان کی ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ مختصراً یہ سمجھئے کہ قرآن نے بتایا ہے کہ مقصودِ حیات، روح اور مادہ، "دنیا اور آخرت" ارض اور سماء کے امتزاج (تانے بانے) سے حاصل ہوگا۔ تنہا تانے سے نہیں۔

(پھر اللہ نے) اس کی (دوسری صورت میں تخلیق کی۔ پھر اسے درست کیا۔ اس کے بعد اس نے نر اور مادہ کا جوڑا بنایا۔ کیا
(یہ سب کچھ کر سکنے والا خدا) اس پر قادر نہیں کہ وہ مردوں کو زندگی عطا کر دے؟

قرآن کریم نے، مقصد تخلیق انسانی کی تکمیل کے لئے، اس زندگی سے اگلی زندگی کو ضروری قرار دیا ہے۔ اور یہی ہے وہ مقصد جس کی طرف قرآن کریم سلسلۂ ارتقاء کے تدریجی مراحل کا ذکر کرنے کے بعد ذہن انسانی کو منتقل کرنا چاہتا ہے۔ فرمایا:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۚ ...... ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ○ (۲۳)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔ (یعنی زندگی کی ابتدا یہاں سے ہوئی) پھر ہم نے اسے نطفہ بنایا ایک ٹھہر جانے اور جماؤ پانے کی جگہ میں۔ پھر نطفہ کو ہم نے علقہ بنایا (جونک کی شکل میں) پھر علقہ کو ایک گوشت کا ٹکڑا کر دیا۔ پھر اس مضغہ کو ہڈیوں کا ڈھانچہ بنایا۔ پھر ڈھانچہ پر گوشت کی تہہ چڑھا دی پھر (دیکھو) اسے کس طرح ایک دوسری ہی طرح کی مخلوق بنا کر نمودار کر دیا۔ اس کے پاس سامان نشو و نما کی کس قدر فراوانیاں ہیں جن سے وہ اس قسم کے تخلیقی مدارج طے کرا کر انسان کو بہترین تناسب توازن کا پیکر بنا دیتا ہے۔ اس قسم کا حسن تناسب کوئی اور پیدا نہیں کر سکتا۔

پھر (دیکھو ان مراحل کے بعد) تم سب کو ضرور مرنا ہے، پھر (مرنے کے بعد) ایسا ہونا ہے کہ قیامت کے دن اٹھائے جاؤ۔

سطح بین نگاہوں کو انسان کی نشأۃ ثانیہ کے خلاف یہ اعتراض نظر آتا تھا کہ جب ان عناصر ترکیبی کا شیرازہ بکھر جائے گا تو اس کے بعد ایک ترکیب جدید کیسے ہوگی؟ اور سطح بین نگاہوں پر ہی کیا موقوف ہے۔ آج یورپ کے اکثر حکماء جنہیں دنیا علم و بصیرت کی انتہائی بلندیوں پر خیال کرتی ہے؛ اسی سطح بینی میں گرفتار ہیں۔ اس لئے کہ جس طرح وہ پہلے راستوں میں محض اپنے ذہن کی قیاس آرائیوں کی مدد سے چلتے اور قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے تھے؛ اس منزل سے آگے بھی اپنے تصورات ہی کی روشنی میں بڑھنا چاہتے ہیں۔ اور ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ دنیا دیکھے گی کہ جس طرح ایک مدت کی صحرا نوردیوں کے بعد یہ لوگ تخلیق انسانی کے متعلق حقیقت کے ایک گوشہ تک جا پہنچے ہیں۔ بالآخر انہیں نشأۃ ثانیہ کے متعلق بھی وہیں آنا پڑے گا۔ جہاں کی دعوت قرآن دیتا ہے[۱]۔ اس لئے کہ قرآن کی دعوت ظن و تخمین کی آواز نہیں، علم و

---

[۱] خود سائنس معترف ہے کہ ابدی حقائق کی لِم اور کُنہ ابھی تک بے نقاب نہیں ہو سکی۔ الفریڈ کوبن اپنی کتاب (The Crisis of Civilisation) میں لکھتا ہے:

"اس امر کا خیال تک بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ہم قطعی حقیقت کا علم حاصل کر چکے ہیں۔ حتیٰ کہ سائنس کے محدود دوائر میں بھی نہیں جب تک اس تمام محسوس دنیا کا علم نہ حاصل ہو جائے۔" (صفحہ ۹۶)

بصیرت اور علم و یقین کی دعوت ہے۔ اس کا اعلان ہے کہ

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ۗ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝ (۳۱/۲۸)

تمہاری (موجودہ) پیدائش اور دوبارہ زندگی (نشاۃ ثانیہ) ایک نفسِ واحدہؐ کی سی ہے۔ بے شک اللہ سب کچھ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

جس دستِ قدرت میں یہ طاقت ہے کہ وہ زندگی کے جرثومۂ اولیں سے موجودہ ہیئت کا انسان بنا دے۔ اس کے لئے اس کے عناصرِ طبیعی کے انتشار کے بعد ترتیبِ جدید میں کیا مشکل ہو سکتی ہے؟

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ۝ (۲۰/۵۵)

اس نے اسی زمین سے تمہیں پیدا کیا۔ اسی میں تمہیں مختلف مراحل میں گردشیں دیں اور پھر اسی سے دوسری مرتبہ اُٹھائے جاؤ گے۔

دوسرے مقام پر ہے۔

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ۝ ...... قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا ۝ (۱۷/۴۹ـ۱۷/۵۱)

اور یہ کہتے ہیں کہ جب ہم (مرنے کے بعد) محض چند ہڈیوں کی شکل میں رہ جائیں گے۔ تو پھر کیا ایسا ہو سکے گا کہ از سر نو اُٹھا کھڑے کئے جائیں۔ تم کہدو کہ ہاں تم (مرنے کے بعد) کچھ ہی کیوں نہ ہو جاؤ۔ پتھر ہو جاؤ۔ لوہا ہو جاؤ۔ یا کوئی اور چیز جو تمہارے خیال میں (دوبارہ زندہ ہونے کے لئے) بہت ہی سخت ہو۔ (لیکن تم دوبارہ زندہ ہو کر رہو گے۔)

اس پر یہ کہیں گے کہ وہ کون ہے جو اس طرح ہمیں دوبارہ زندہ کرے گا؟

تم کہدو وہی جس نے پہلی مرتبہ تمہیں پیدا کیا۔

اس پر یہ لوگ تیرے آگے سر مٹکانے لگیں گے اور کہیں گے "ایسا کب ہوگا؟"

تم کہو کہ "عجب نہیں کہ اس کا وقت قریب ہی ہو"

اس کے ساتھ سورۂ حج کی اس آیت (۲۲/۵) کو بھی دیکھئے جو صفحہ ۱ پر درج کی گئی ہے۔ حقیقت اور بھی اُبھر کر سامنے آجائیگی

ؐ قرآن کریم حیات (Life) کو ایک ناقابلِ تقسیم وحدت (indivisible unit) قرار دیتا ہے۔ اور افراد کو اس وحدت کے مظاہر۔ جس طرح (محض سمجھنے کی خاطر یوں سمجھئے کہ) بجلی کی قوت (یا اس کی لہر) ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ اور قمقمے، پنکھے آلاتِ مکبر الصوت وغیرہ اس قوت کے مظاہر۔ وحدتِ حیات (اور اس کی بنا پر فرد اور جماعت کا باہمی ربط) اسلام کا مایہ الامتیاز فلسفہ ہے اور اسی پر اس کا تمام نظام قائم ہے۔ اس کی تفصیل بھی وحی کے عنوان میں ملے گی۔

موت اور حیات

اس مقام پر اس حقیقت کی طرف اشارہ کر دینا بھی ضروری ہے۔ کہ قرآن کریم صرف اس زندگی کے بعد کی دوسری زندگی ہی سے بحث نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اس زندگی کی "موت اور حیات" کے متعلق بھی ہدایات دیتا ہے۔ وہ قوموں کے عروج کو ان کی زندگی اور ان کے زوال و ہبوط کو ان کی موت سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ بار بار بتاتا ہے کہ وہ کون سے اصول ہیں جن کے مطابق قوموں کو زندگی عطا ہوتی ہے۔ اور کونسی روش ہے، جسے اختیار کرنے سے ان پر موت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ اقوام سابقہ کے عروج و زوال کی داستانیں پیش کرتا ہے تو اس لئے نہیں کہ وہ ایک تاریخ کی کتاب ہے بلکہ اس لئے کہ ان کے اعمال کے انجام و عواقب سے قانون فنا و بقا پر شہادت لائے اس لئے اس نے کھلے کھلے الفاظ میں ایک اصول بیان کر دیا کہ۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ ۙ الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ۙ (۶۷/۲)

زیست کی تمام فراوانیاں قانون خداوندی سے وابستہ ہیں جو تمام اختیارات و اقتدارات کا مالک ہے لیکن اس نے تمام امور کے لئے پیمانے اور اندازے مقرر کر رکھے ہیں جن کے مطابق اعمال کے نتائج مرتب ہوتے ہیں اس قانون کے مطابق قوموں کی زندگی اور موت کا فیصلہ ہوتا ہے۔ یہ گردشیں اس لئے دی جاتی ہیں تاکہ زندگی اور عروج اس کے حصہ میں رہے جو اس پروگرام پر عمل پیرا ہو۔ جو سب سے زیادہ توازن قائم رکھے اس کا قانون سب پر غالب رہنے والا اور تباہیوں سے بچنے کا سامان فراہم کرنے والا ہے۔

یعنی موت و حیات کا قانون اسی لئے متعین کیا گیا ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ تم میں سے کون ایسے کام کرتا ہے جو اس قانون کے مطابق زندگی بخش دیں۔ اور کون ایسا ہے جو اپنے اوپر ہلاکت وارد کر لیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ واضح اور مبہم قانون اسی لئے واضح طور پر بیان کیا گیا ہے تاکہ

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۙ (۸/۴۲)

جسے ہلاک ہونا ہے واضح قوانین کے تحت ہلاک ہو۔ اور جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی واضح قوانین کی رُو سے زندہ رہے۔ اور اللہ بے شک (سب کچھ) سننے والا۔ اور (ہر بات کا) علم رکھنے والا ہے۔

اعمال صالحہ سے مراد

وہ قانونِ ارتقاء کے اس بنیادی اصول کو مختلف گوشوں اور متنوع پہلوؤں سے دل نشین کراتا ہے کہ اس کارگہ سعی و عمل میں وہی نوع باقی رہ سکتی ہے جس میں باقی رہنے کی صلاحیت ہو۔ (جس کے اعمال صالح ہوں)، وہی آگے بڑھ سکتی ہے جو اپنے اندر آگے بڑھنے کی استعداد پیدا کرے۔ دیگر انواع کی مثال دے کر اس سے خود انسانی زندگی پر استشہاد کرتا ہے کہ ارتقاء کے اس عظیم الشان درخت کو دیکھو اور غور کرو کہ کتنی شاخیں تھیں جو سوکھ سوکھ کر گر گئیں۔ کتنے پھول تھے جو مرجھا مرجھا کر زمین پر آ گئے اور

راستہ چلنے والوں کے پاؤں تلے آکر مسلے گئے۔ اس کے برعکس کتنی شاخیں ہیں جو سرسبز و شاداب ہوئیں۔ کیسے کیسے شگفتہ اور نورستہ پھول لائیں اور کیسے کیسے نفیس و لطیف پھل پیدا کئے۔ وہ کہتا ہے کہ فطرت کے اس قانون پر غور کرو اور یہ سوچو کہ اقوام و مِلَلِ گزشتہ کا کیا حشر ہوا؟ اس کا ارشاد ہے کہ مختلف انواع کی طرح قوموں کی موت و حیات کا بھی یہی قانون ہے۔ جو قوم زندگی کی اہل نہیں رہتی فنا ہو جاتی ہے۔ اسے کوئی رعایت نہیں دی جاتی۔ اس فیصلہ یعنی ان کے اعمال کے ظہور نتائج) میں ذرہ بھر تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی۔[1]

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۖ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ○ (۷/۳۴)

اور ہر امت رگروہ۔ جماعت۔ نوع) کے لئے رظہور نتائج) کا وقت معین ہے جب وہ وقت آجاتا ہے تو پھر ایک ساعت کی بھی تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی

اس اصولی نکتہ کو بیان کر دینے کے بعد اگلی آیت میں یہ بتا دیا کہ زندہ اور باقی رہنے کے لئے کیا قانون مقرر ہے۔

يَا بَنِي آدَمَ إِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِي ۙ فَمَنِ اتَّقَىٰ وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ○ (۷/۳۵)

اے اولادِ آدم جب کبھی ایسا ہو کہ میرے پیغمبر تم میں پیدا ہوں۔ اور میرے قوانین سے تمہیں مطلع کریں۔ سو اس وقت، جو ان قوانین سے ہم آہنگ ہو کر میری) حفاظت میں آجائے گا اور یوں اپنے اندر زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی) صلاحیت پیدا کرلے گا۔ تو اس پر رمٹنے اور زوال پذیر ہو جانے کا) کوئی غم اور اندیشہ نہ ہوگا۔

یہ قومیں وہ جو باقی رہیں گے اور آگے بڑھیں گے جنہیں ہلاکت و بربادی کا اندیشہ نہ ہوگا ان کے برعکس

وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ○ (۷/۳۶)

لیکن جو لوگ ان قوانین کو جھٹلائیں گے اور ان سے سرکشی برتیں گے تو ان کی کھیتیاں جھلس کر رہ جائیں گی اور وہ زندگی کی خوشگواریوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم رہ جائیں گے۔

قوموں کے عروج و زوال کے اُصول

غور فرمائیے۔ پہلی آیت میں قوموں کی موت و حیات کا ایک اصولی قانون بیان فرما دیا۔ اس کے بعد اس کی وضاحت کر دی کہ ہلاکت سے مامون اور بربادی سے مصئون و بے خوف رہنے کا کیا طریقہ ہے اور وہ کونسا نظام ہے جس پر چل کر انسان امن و سلامتی کی جنت میں پہنچ سکتا ہے۔ اس وقت اس نظام کی تشریح کا موقع نہیں۔ یہاں صرف اتنا دیکھئے کہ قرآن کریم کی رُو سے اس

---

[1] ان امور کی تشریح دوسرے مقام پر ملے گی۔ جہاں قوموں کے عروج و زوال کی داستان پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جائے گی۔

نظام کا اصل الاصول یہ ہے کہ اس ضابطہ کو نصب العینِ حیات بنایا جائے جو حضرات انبیاء علیہم السلام کی وساطت سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کو ملا ہے۔ آیندہ اوراق میں اسی پیغامِ حیات بخش اور اسی نظام روح پرور کی بصیرت افروز داستان کو پیش کیا جائے گا۔ وہ نظام جس کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان میں وہ صلاحیت پیدا ہو جائے گی جس سے وہ فنا و برباد کر دینے والی مخالف قوتوں کا مردانہ وار مقابلہ کر سکے۔ اور اُسے کسی قسم کا خوف ہلاکت و حُزنِ بربادی نہ رہے (لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ○) اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو خدا کا قانونِ استخلاف و استبدال (Law of succession and substitution) اپنا اٹل فیصلہ کر دیگا اور اس قوم کی جگہ دوسری قوم آجائے گی۔

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۚ إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْ بَعْدِكُمْ مَا يَشَاءُ كَمَا أَنْشَأَكُمْ مِنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ آخَرِينَ ○ (۶/۱۳۴) نیز (۱۴/۱۹ ؛ ۳۵/۱۶)

اور دیکھو تیرا نشو و نما دینے والا، اپنی نشو و نما کے لئے کسی کا محتاج نہیں۔ بلکہ اس کے پاس تمام کائنات کی نشو و نما کا سامان فراواں موجود ہے۔ (لیکن یہ نشو و نما اس کے قانون کے مطابق ملتی ہے)۔ اگر تم اس کے قانون کے خلاف چلو گے۔ تو وہ تمہیں ہٹا دے گا اور تمہاری جگہ اس قوم کو لے آئے گا جس میں اس قانون کے مطابق جانشینی کی صلاحیت ہوگی۔ یہ اس قانون کے مطابق ہوگا جس کے مطابق اس نے تمہیں دوسری قوم کی ذریت سے اٹھا کھڑا کیا تھا۔

دوسری جگہ ہے

وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ ○ (۴۷/۳۸ ؛ نیز ۹/۳۹ ؛ ۴/۱۳۳)

اور اگر تم نے (ان قوانین سے) سرکشی اختیار کی تو وہ تمہاری جگہ دوسری قوم کو لے آئے گا۔ اور وہ قوم تمہارے جیسی نہیں ہوگی (بلکہ تم سے بہتر ہوگی۔ اسی لئے تو وہ تمہاری جگہ لے گی)۔

مغنّیِ آتش نفس، موسیقار کی طرح ایک قوم کی راکھ کے ڈھیر سے دوسری قوم وجود کوش ہوتی ہے۔ مٹنے والی قومیں مٹ جاتی ہیں اور باقی رہنے والی اُن کی جگہ لے لیتی ہیں۔

چوں جہاں کہنہ شود پاک بسوزند اورا
وز ہماں آب و گِل ایجادِ جہاں نیز کنند

شرفِ انسانیت کیلئے قانونِ ارتقاء

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے قانونِ ارتقاء کی اصل یہ ہے کہ وہی نوع باقی رہ سکتی اور آگے بڑھ سکتی ہے جس میں حفظِ نفس اور بقائے ذات کی صلاحیت و استعداد موجود ہو۔ جو، ان تمام مخالف قوتوں کا مقابلہ کر سکے جو اسے مٹانے پر آمادہ ہوں۔ جو ناسازگار ماحول، نامساعد فضا اور ہلاکت آفریں اسباب کی مدافعت کا سامان اپنے اندر رکھتی ہو۔ وہ اقوام و ملل جنہوں نے سامانِ

مدافعت اور قوتِ محافظت کو کھو دیا، ہلاک ہو گئیں جنہوں نے اس قوت کو قائم رکھا۔ ہلاکت سے محفوظ رہیں۔ قانونِ ارتقاء کا اتنا حصہ انسان کی طبیعی زندگی (Physical life) سے متعلق ہے اور اس اعتبار سے انسان اور اس سے پہلی کڑی (طبقۂ حیوانات) میں کچھ فرق نہیں۔ لیکن جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، انسان دیگر حیوانات سے ایک قدم آگے ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جو اسے افقِ حیوانیت سے بلند کر کے درجۂ انسانیت میں لے آتا ہے۔ وہ مقام جہاں قرآن کریم اسے (وَنَفَخْنَا فِيهِ مِن رُّوحِنَا) سے دیگر حیوانات سے ممتاز کر دیتا ہے۔ لہٰذا وہ قانونِ ارتقاء جو اس سے پیشتر تمام انواع میں محض طبیعی زندگی سے متعلق تھا، درجۂ انسانیت میں پہنچ کر طبیعی زندگی کے علاوہ نفسِ انسانی کو بھی اپنے حلقۂ اثر و نفوذ میں لے آیا۔ یعنی جس طرح انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی طبیعی زندگی کی حفاظت کے لئے مخالف قوتوں سے مدافعت کی صلاحیت پیدا کرے (جس طرح دوسرے حیوانات کرتے ہیں) اسی طرح اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے "نفس" کی حفاظت اور نشو و ارتقاء کے لئے تمام متصادم و متحارب قوتوں کے خلاف اپنے اندر سامانِ مدافعت پیدا کرے۔ نفسِ انسانی کی حفاظت اور نشو و ارتقاء سے تغافل برت کر محض حیوانی زندگی کے حفظ و بقا کو مقصودِ زندگی سمجھ لینا، کفر ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ

یقیناً اللہ ایمان اور اعمالِ صالح والوں کو ایسی خوشگوار زندگی عطا کرے گا جس کی شادابی و شگفتگی (۴۷/۱۲) میں کبھی کمی نہ آئے گی۔ ان کے برعکس وہ لوگ جو (قوانینِ الٰہیہ سے) انکار کرتے ہیں (ان کی کیفیت یہ ہے کہ) وہ پیش پا افتادہ مفاد سے اس طرح متمتع ہوتے ہیں اور یوں (محض) کھانے پینے ہی کو مقصدِ زندگی سمجھ لیتے ہیں، جس طرح حیوانات (کا مقصدِ زندگی محض) کھانا پینا ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہوتا ہے

یعنی جو لوگ قوانینِ الٰہیہ (نظامِ ربوبیت) کی جگہ انسانوں کے خود ساختہ نظام کے تابع زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کا مقصدِ زندگی محض طبیعی حیات کی پرورش اور حفظ و بقا ہوتا ہے۔ اس سے آگے کچھ نہیں۔ جو قوم تحفظِ "نفس" یعنی ارتقاءِ انسانیت سے یوں غفلت اختیار کر لے، وہ ہلاکت و بربادی سے کیسے بچ سکتی ہے؟ اس سے اگلی آیت میں ہے:

وَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ هِيَ أَشَدُّ قُوَّةً مِّن قَرْيَتِكَ الَّتِي أَخْرَجَتْكَ أَهْلَكْنَاهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ۝ (۴۷/۱۳)

اور کتنی ایسی بستیاں تھیں جو قوت میں ان لوگوں سے بھی بڑھ کر تھیں جنہوں نے تجھے (اے رسول مکہ سے) باہر نکال دیا ہے۔ ہم نے انہیں ہلاک کر دیا سو ان کا کوئی مددگار نہ تھا۔

یہ کیوں؟ اس لئے کہ:-

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ○ (۴۷/۱۴)

کیا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے واضح قوانین پر رہتا ہوا ہو۔ اس کی مانند ہو سکتا ہے جس کے غلط اعمال اس کی نگاہوں میں مزین بنا دیئے جائیں۔ اور وہ لوگ اپنی خواہشات کی اتباع ہی کو مقصد زندگی قرار دے لیں۔

یعنی جس شخص نے اللہ کے ضابطۂ حیات کے بجائے اپنے خیالات و نظریات کو شاہراہِ عمل بنا لیا وہ کبھی ہلاکت سے نہیں بچ سکتا۔ اس لئے کہ وہ قانونِ ارتقا جو انسانیت کے تحفظ اور عروج کے لئے ضابطہ ہے صرف خدا کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت ہے۔ وہ خدا جو ذوالمعارج ہے۔

مِنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ ○ (۷۰/۳)

اس خدا کی طرف سے جو بلندیوں کی راہوں کا مالک ہے۔

اب تو خود یورپ کے مادہ پرست محققین بھی رفتہ رفتہ اقرار کر رہے ہیں کہ سلسلۂ ارتقاء میں مادیات کے علاوہ "اخلاقیات" کو بھی بہت بڑا دخل ہے۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ارتقا کا مقالہ نگار اپنے مضمون کو ان الفاظ پر ختم کرتا ہے۔

> حب وطن، مذہب، آرٹ۔ سائنس اور لٹریچر کا بھی (میزان) بقا میں بڑا وزن ہے۔ اور یہ سلسلۂ ارتقاء میں بڑا مفید کام کرتے ہیں (اس سلسلہ میں) اخلاق کسی غیر متعلق خارجی قوت کی حیثیت نہیں رکھتا جو ایک مستبد اور بیگانہ اخلاق آفاقی نظام کے خلاف برسرِ پیکار ہے۔ بلکہ یہ خود ارتقا کی تخلیق ہے اور سلسلۂ ارتقا کے مذریجی تغیرات کو صحیح سانچے میں ڈھالنے کے لئے ایک اہم قوت۔ ہمیں امید بلکہ یقین ہے کہ وہ تہذیب جو عدل و حریت، آئین و انضباط اور مستحکم اخلاقیات پر مبنی ہیں۔ آخر الامر سب سے زیادہ کامیاب اور دیرپا ثابت ہونگی۔

اے کاش یورپ کے سامنے قرآن ہوتا تو وہ دیکھ لیتا کہ وہ کونسی تہذیب ہے جو عدل و حریت۔ نظم و ضبط اور مستحکم اخلاقیات پر مبنی ہے۔ اگر وہ قرآن کی رو سے ان الفاظ کا صحیح مفہوم سمجھ لیتا تو آج اس طرح برباد اور ہلاک نہ ہوتا۔ کہ خود اس کی تباہی بھی قانونِ ارتقاء ہی کے ماتحت ہو رہی ہے۔

یہ تو تھی محض طبیعی زندگی کی حفاظت کو منتہائے نگاہ بنا لینے والوں کی کیفیت۔ اس کے برعکس طبیعی زندگی کے لوازم سے چشم پوشی کر کے محض "روحانیت" کی ترقی کے لئے بزعم خویش سعی و کاوش میں زاویہ نشینی اور سربزیری اختیار کر لینا بھی قانونِ ارتقا کی رو سے غلط اندیشی ہے جس کا نتیجہ ہلاکت ہے۔ فوج کی حفاظت کے لئے قلعہ کی دیواروں کا آہنی ہونا بھی نہایت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے جہاں نفسِ انسانی کے تحفظ و بقاء اور عروج و ارتقاء کے لئے تاکید کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی رہبانیت کی زندگی کو غلط قرار دے کر طبعی زندگی کے

استحکام کے لئے مادی قوتوں کے حصول و استبقار کو بھی ضروری قرار دیا ہے اور اس طرح صحیح قانونِ ارتقاء کے مطابق ایک ایسا مکمل ضابطۂ حیات عطا فرمایا ہے جس میں انسان اپنی موجودہ منزل میں بھی اپنے آپ کو قائم رکھ سکے اور اس کے بعد کی منزل میں موجودہ زندگی سے ارفع و اعلیٰ زندگی بسر کرنے کی صلاحیت بھی اپنے اندر پیدا کرتا جائے۔

گذشتہ صفحات میں بیان کردہ اشارات سے ہم نے دیکھ لیا ہے کہ تمام کائنات میں (جس میں انسان بھی شامل ہے) خدا کا ایک قانون کارفرما ہے۔ جس کی رو سے ہر وہ شے جو اپنے اندر زندہ رہنے کی صلاحیت پیدا کر لیتی ہے زندہ رہتی ہے۔ اور جو اس صلاحیت کو کھو دیتی ہے وہ مٹ جاتی ہے۔ اس قانون "محو و اثبات" کو قرآن نے ایک جامع آیت میں بیان کر دیا ہے جہاں فرمایا کہ:-

یَمۡحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَ یُثۡبِتُ ۚۖ وَ عِنۡدَہٗۤ اُمُّ الۡکِتٰبِ ﴿۱۳/۳۹﴾

اللہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق (جسے چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے) ثبت کر دیتا ہے

اور اس قانون کی اصل و بنیاد اسی کے پاس ہے۔

یہ آیت ایک اور عظیم الشان حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہے جس کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ ہم گزشتہ اوراق میں دیکھ چکے ہیں کہ قانونِ ارتقاء کی رو سے زندہ وہی رہ سکتا ہے جس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہو۔ آگے وہی بڑھ سکتا ہے جس میں آگے بڑھنے کی استعداد ہو۔ یعنی وہ نوع جو کشمکشِ حیات میں ناسازگار قوتوں سے نبرد آزما ہو کر انہیں شکست دے اور یوں اپنے زندہ رہنے کا ثبوت پیش کرے۔ وہ زندہ رہتی ہے لیکن جو ایسا نہ کرے وہ مٹ جاتی ہے۔

ایک اہم حقیقت

ڈاروِن نے اس اصول کو بقاء للاصلح (survival of the fittest) سے تعبیر کیا ہے اگرچہ یہ الفاظ خود ڈاروِن کے نہیں بلکہ ہربرٹ اسپنسر کے ہیں۔ لیکن ڈاروِن اور اس کے رفقاء سفران الفاظ سے جو مراد لیتے تھے وہ قرآنی مفہوم سے جداگانہ تھی۔ انیسویں صدی میں۔ یورپ کے علمائے طبیعیات کے نزدیک کائنات کا تصور میکانکی تھا۔ اس تصور کی تشریح تو طول طویل ہے لیکن اس سے مختصراً مفہوم یہ تھا کہ یہ کائنات کسی نہ کسی طرح وجود میں آگئی ہے اور اب خود بخود اپنی اندرونی قوتوں کے زور سے چلی جا رہی ہے۔ نہ اس کی تخلیق میں اور نہ اس کے بعد اس کے نشو و ارتقاء میں کسی مقصد، ارادہ یا اسکیم کو کوئی دخل ہے۔ ایک اندھی قوت (Blind force) ہے جس سے یہ تمام

لے (Mechanistic conception of Universe) اس کی تشریح آئندہ چل کر ملے گی۔ اب خود یورپ اس تصور کو باطل قرار دے چکا ہے۔

کارگہِ عالم حرکت میں ہے۔ لہٰذا جو نوع قوت حاصل کر لیتی ہے اسے باقی رہنے اور آگے بڑھنے کے لئے چن لیا جاتا ہے اہل علمائے طبیعیات کے نزدیک اسی طریق کا نام "انتخاب طبیعی" (natural selection) ہے۔ عام الفاظ میں یوں سمجھئے کہ اس نظریہ کی رو سے، آج کائنات میں جو کچھ موجود ہے وہ اس لئے موجود نہیں کہ کسی مقصد یا اسکیم کے ماتحت اس کا موجود رکھنا ضروری تھا بلکہ اس لئے کہ ان میں کسی نہ کسی طرح باقی رہنے اور آگے بڑھنے کی قوت پیدا ہو گئی اس لئے فطرت نے انہیں باقی رہنے کے لئے منتخب کر لیا۔ قرآن کریم، اس تصور اور نظریہ کو بنیادی طور پر غلط قرار دیتا ہے، اس کے نزدیک، یہ تمام سلسلۂ کائنات ایک خاص اسکیم (مقصد یا حکمت) کے ماتحت وجود میں لایا گیا ہے اور اسی مقصد کے ماتحت آگے بڑھ رہا ہے۔ لہٰذا جو چیز خدا کے قانون کے مطابق زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ اس کا زندہ رہنا اور آگے بڑھنا اس مقصد کے لئے مفید ہوتا ہے اور جو چیز اپنے اندر ایسی صلاحیت نہیں پیدا کرتی، اس کا اس مقصدِ عظیم کی راہ سے ہٹ جانا مفید ہوتا ہے۔ "وعندہٗ اُمّ الکتاب" کا مطلب یہی ہے کہ یہ قانونِ محو و اثبات یونہی اندھا دھند کام نہیں کر رہا۔ اس کے پیچھے ایک بلند مقصد ہے جس کے لئے یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔

اب رفتہ رفتہ خود علمائے مغرب اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ اُنیسویں صدی کا میکانکی تصور باطل تھا۔ اور وہ اس حقیقت کا اقرار کر رہے ہیں کہ یہ تمام سلسلۂ کائنات ایک عظیم الشان مقصد کے ماتحت وجود میں لایا گیا ہے۔ اور ایک اہم اسکیم کے ماتحت آگے بڑھ رہا ہے۔ تفصیل ان امور کی آگے چل کر ملے گی لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں کہ تمام سلسلۂ کائنات ایک لگے بندھے ضابطہ کے مطابق، ایک معین پروگرام کے ماتحت سرگرمِ عمل ہے، تو اس سے یہ مراد نہیں کہ یہ ایک گھڑی کے مانند ہے جسے اس کے خالق نے ایک مرتبہ کوک دیا۔ اور اس کے بعد وہ ایک مرتب شدہ نقشہ کے مطابق چلی جا رہی ہے۔ کائنات کے متعلق یہ تصور بھی قرآنی تصور کے منافی ہے قرآن کی رُو سے کائنات حرکیاتی ہے۔ سکونی نہیں۔ يَسْئَلُهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ (۵۵ : ۲۹) "کائنات میں جو کچھ ہے سب اپنی نشو و نما کے لئے خدا کی ربوبیت کا محتاج ہے۔ وہ قانون ان چیزوں کی نشو و نما کرتا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ ہر آن ایک نئی شان میں سامنے آتی ہیں۔" اس طرح کائنات میں مختلف تخلیقی اضافے ہوتے رہتے ہیں۔

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
رہتا ہے آئینہ ابھی دائم نقاب میں

ایک ترکی شاعر کے الفاظ میں

یعنی کن کے نغمہ کی گونج ساری کائنات میں پھیلی ہوئی ہے۔

يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ (۳۵ : ۱)

اشارہ بھی غیر

اس مقام پر (بر سبیل تذکرہ) ایک اور اہم حقیقت کی طرف اشارہ بھی بے محل نہ ہوگا۔ یہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ کائنات ایک متعین پروگرام کے مطابق ایک خاص مقصد اور اسکیم (حکمت بالغہ) کے ماتحت سرگرم عمل ہے اس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ اس صورت میں (جب کائنات کی ہرشے ایک خاص پروگرام کے مطابق عمل پیرا ہے) انسان کو (جو خود کائنات ہی کی ایک شے ہے) مجبور ماننا جائے گا۔ لیکن (جیسا کہ آئندہ

جبر و اختیار

باب میں بیان ہوگا) انسان کو اختیار و ارادہ بھی دیا گیا ہے۔ اگر انسان اس پروگرام کے خلاف چلتا ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے (یعنی تخلیق کائنات کے مقصد کے حصول کا پروگرام) تو اس کا اس عظیم الشان پروگرام پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ نظام کائنات اس خالق کائنات کے ہاتھوں میں ہے جس کے حیطۂ قدرت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ اس سے اس کی اپنی ذات، ارتقاء و عروج کے بجائے، پستی اور تنزل کے جہنم میں جاگرتی ہے لیکن اگر یہ اس پروگرام کی تکمیل میں کوشاں ہوتا ہے تو اس پروگرام کی تکمیل خود اس کی اپنی ذات کی تکمیل ہوتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر ہاتھ اس کے ہوتے ہیں اور ان میں قوت، اللہ کی۔ تیر اس کے ہوتے ہیں اور ان کی انیوں کے ساتھ قضا مشیت کی۔ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ (۸/۱۷) "جب تو نے تیر چلایا تو وہ تو نے نہیں چلایا۔ بلکہ درحقیقت خدا نے چلایا"۔ وہ مقام جس کے متعلق ڈاکٹر ہنس ڈریش کہتا ہے کہ وہاں پہنچ کر "ہم اپنے آپ کو خدا کے سپاہی کہہ سکتے ہیں"۔ (The great Design) اور

"اس ارتقائی تبدیلی کے طرق و نہج میں خدا خود بندہ کا رفیق کار ہوجاتا ہے۔ بشرطیکہ انسان اس میں سبقت کرے کہ ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم (۱۳/۱۱) لیکن اگر وہ اس باب میں سبقت نہیں کرتا۔ اگر وہ اپنی خودی کی مخفی قوتوں کو بروئے کار نہیں لاتا۔ اگر وہ ابھرنے والی زندگی کے اندرونی تلاطم کا احساس نہیں کرتا تو اس کی روح پتھر کی سی قساوت اختیار کرلیتی ہے اور وہ (انسان نہیں رہتا بلکہ) جامد مادہ کی صورت اختیار کرلیتا ہے"۔ (خطبات تشکیل جدید = علامہ اقبالؒ۔ صفحہ ۱۲-۱۱)

جس جماعت کو ڈریش نے "خدا کی سپاہ" کہا ہے یہ وہی ہے جسے قرآن کریم حزب اللہ کے ممتاز لقب سے تعبیر کرتا ہے۔

أُولَٰئِكَ حِزْبُ اللَّهِ ۚ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۵۸/۲۲)

سابقہ صفحات میں ضمنی طور پر لکھا گیا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے ایک وقت تھا کہ خود مادہ کا بھی وجود نہ تھا۔

ایک ضمنی گوشہ

حدوث و قدم مادہ کا مسئلہ شروع سے بحث و جدل کا مرکز بنے چلا آرہا ہے۔ شعور انسانی اپنے عہد طفولیت میں سمجھ نہیں سکتا تھا کہ یہ محیر العقول مادی کائنات کس طرح عدم سے

وجود میں آگئی۔ مادّہ کہاں سے پیدا ہوگیا؟ لیکن مادہ کی حقیقت کے متعلق دورِ حاضرہ کی سائنس کی تحقیق کیا ہے؟ اس کے متعلق چند صفحات آگے چل کر، وحی کے عنوان میں واضح تصریحات سامنے آئیں گی۔ اس وقت صرف ایک اقتباس پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ دورِ حاضر کا مشہور سائنس داں، سر جیمز جینس لکھتا ہے۔

> دورِ حاضرہ کے علم طبیعیات کا رجحان اس طرف ہے کہ یہ تمام مادی کائنات سوائے لہروں (Waves) کے اور کچھ نہیں۔ یہ لہریں دو قسم کی ہیں۔ محصور لہریں (Bottled up waves) جسے ہم مادہ کہتے ہیں اور آزاد لہریں جسے روشنی کہا جاتا ہے۔ فنائے مادہ اس کے سوا اور کچھ نہ ہوگا کہ ان محصور لہروں کو آزاد کر دیا جائے کہ وہ فضا کی پہنائیوں میں منتشر ہو جائیں۔ ان تصورات کے ماتحت یہ تمام کائنات سمٹ سمٹا کر نقطہ "دنیائے نور" رہ جاتی ہے۔ مضمر یا مشہود۔ اس اعتبار سے تخلیقِ کائنات کی تمام داستان بالکل صحیح اور مکمل طور پر ان چند الفاظ میں بیان کی جا سکتی ہے۔ کہ خدا نے نور (Light) سے کہا کہ ہو جا اور وہ ہوگیا۔" (The Mysterious Universe)

غور فرمایا آپ نے کہ عصرِ حاضر کی سائنس کی تحقیقات کی رو سے مادہ کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے؟ یہ ٹھوس اور ثقیل پتھر اور لوہا نہیں، بلکہ روشنی کی لہریں ہیں جنہیں محصور کر لیا گیا ہے۔ یہ ہے مادہ۔ باقی رہی اس کی فنا۔ سو وہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ جس بوتل میں یہ لہریں بند ہیں اس کا کارک کھول دیا جائے گا اور یہ نورانی لہریں فضا میں منتشر ہو جائیں گی۔ لہٰذا مادی کائنات کی ابتدا تموج نور سے ہوئی۔ اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲۴/۳۵) تفصیل ان امور کی کتاب آخرت میں ملے گی جہاں شرح و بسط سے بتایا جائے گا کہ قرآن کریم کی رُو سے کائنات کی ابتدا کیسے ہوئی۔ اور اس کے بعد کیا ہوگا؟ اس وقت صرف اتنا دیکھئے کہ خود سائنس کے انکشافات کس طرح آہستہ آہستہ، ذہنِ انسانی کو حقیقت کے قریب پہنچاتے چلے جارہے ہیں جس سے حقائق قرآنی کے سمجھنے میں آسانی ہوتی جارہی ہے۔ اور تماشہ یہ کہ یہ سب کچھ اُن کی سعی و کاوش کا نتیجہ ہے جو خود مادہ پرست اور خدا کے منکر ہیں

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانوں سے

اسی لئے قرآنِ کریم بار بار تاکید کرتا ہے کہ تخلیقِ ارض و سمٰوٰت میں غور و فکر کرو تاکہ تم مبداء و معاد کی حقیقت کو سمجھ سکو۔

خلاصۂ بحث

یہ سوال کہ دنیا میں "سب سے پہلا انسان" کس طرح وجود میں آگیا، ذہنِ انسانی کے لئے وجہ ہزار

حیرت و استعجاب رہا ہے۔ چنانچہ اُن مذاہب میں جن میں توہم پرستی نے حقائق کی جگہ لے رکھی ہے (اور اسلام کے علاوہ کونسا مذہب ہے جس میں ایسا نہیں ہوا) اس عقیدے کے حل میں عجیب وغریب افسانہ طرازیوں سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے اس کے متعلق جو کچھ بتایا ہے وہ ٹھیک ٹھیک وہی ہے جس کی طرف علم و تفسیر کے انکشافات راہ نمائی کئے جا رہے ہیں۔ سائنس کے انکشافات کی رُو سے خاک کے ذرّے مختلف ارتقائی منازل طے کر کے، قرنہا قرن کے بعد انسانی صورت میں متشکل ہو گئے۔ یعنی سب سے پہلے کوئی ایک فرد صورتِ انسانی میں جلوہ گر نہیں ہوا، بلکہ ایک نوع وجود پذیر ہوئی۔ ان متنوع مراحل کی تفصیل قرآن کریم کی آیاتِ جلیلہ میں عجیب انداز میں سمٹی ہوئی ہے۔ لیکن قرآن کریم اس سے بھی ایک قدم اور آگے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کی موجودہ زندگی سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی نہیں بلکہ یہ پیش خیمہ ہے آنے والی زندگی کا۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ حیات اُس کے نزدیک ایک جوئے رواں ہے جس کا خاتمہ موجودہ وادی میں نہیں ہو جاتا۔ انسان کی زندگی محض حیوانی زندگی نہیں بلکہ اس سے بلند و بالا ہے۔ اب اس انسانی زندگی (یعنی شرفِ انسانیت) کے ارتقا کا سلسلہ شروع ہو گا۔ اس کے لئے قرآن کریم ایک مکمل نظام عطا کرتا ہے جس کے تابع زندگی بسر کرنے سے اس شرفِ انسانیت میں بڑھنے پھیلنے اور پھولنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے جس سے یہ بتدریج بلندیوں کی طرف اُٹھتا جاتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ اجتماعی زندگی میں ہوتا ہے انفرادی طور پر نہیں۔

خود یورپ کے محققین و مفکرین، جو انسان کے طبیعی ارتقا کو حرفِ آخر سمجھا کرتے تھے اب رفتہ رفتہ اس سے آگے بڑھ رہے ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ ارتقائے طبیعی کے بعد اب ارتقائے نفسی کے مراحل آئیں گے۔ چنانچہ پروفیسر جوڈ لکھتا ہے :-

> انسانیت کے ارتقا کی اگلی منزل طبیعی نہیں۔ بلکہ نفسی اور ذہنی ہو گی۔ پہلے پہل انسان ارتقا کی منزلیں طے کر کے حیوانیت سے انسانیت کے مقام میں آیا۔ پھر اس نے صنعت و حرفت کی مدد سے اپنے آپ کو آلات و اشیا سے آراستہ کیا۔ ہمارے اس دور میں انسان نے صنعت و حرفت میں پورا کمال حاصل کر لیا ہے۔ اب اس کے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ اس منزل سے آگے بڑھے اور جس طبیعی ارتقا نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ حیوان سے ترقی کر کے انسان کے درجے میں قدم رکھے۔ پھر اس کی جبلی ضرورتوں نے اس سے اوزار اور آلات بنوائے اور وہ مشین اور سٹیم کا خالق بنا۔ اسی طرح وہ آج مجبور ہے کہ اپنا قدم آگے بڑھائے اور اس کا یہ قدم مادی نہیں بلکہ نفسی اور ذہنی ترقی کی طرف ہو گا[1]۔

لیکن یہ ترقی وحی کے بغیر ممکن نہیں۔

---

[1] پروفیسر جوڈ کا یہ مضمون ہندوستان ٹائمز میں شائع ہوا تھا اور اس کے بعد اس کا ترجمہ ماہنامہ "کتاب" نے چھاپا تھا۔

إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً

(۲/۳۰)

(نمائندۂ آدمیت)

خودگرے خودشکنے خودنگرے پیدا شد

آدم (۲)

حسن کے ذوقِ نمود نے انگڑائی لی۔ حظیرۂ قدس کی ملکوتی فضا میں ہلکا سا تموج پیدا ہوا۔ ملاءِ اعلیٰ کے حریمِ ناز کے حریری پردوں میں غیر محسوس سی جنبش نظر آئی۔ بربطِ عدم کے خاموش تاروں میں نورانی ارتعاش سا محسوس ہوا۔ فرشتوں کی معصوم نگاہیں اوپر کو اٹھیں اور "سبوحٌ ۔ قدوسٌ" کی بے صوت صدائیں، نور و نکہت کے رنگین ترشح کی صورت میں زمزمہ ریز و نغمہ بار ہوئیں۔ دور، جانبِ عرشِ عظیم سے "کُن" کی تخلیقی آواز نے اس طلسمِ سکوت کو توڑا۔ عدم کے پردے اٹھنے لگے اور افق کے اس پار، عالمِ امر سے، نگارخانۂ کائنات نے خاموشی سے ابھرنا شروع کیا۔ سائنس دان نے اسے حرکت و حرارت سے تعبیر کیا۔ فلسفی نے اسے حلقۂ دامِ خیال قرار دیا۔ صوفی نے جلوۂ یکتائیِ محبوب کہا۔ اربابِ قضا و قدر نے ایک متعین پروگرام کا نقطۂ اولیں بنایا۔ اور قرآن نے امرِ تکوین کا کرشمۂ ایمان افروز نام رکھا جسے قلبِ سلیم نے قانونِ مشیت مان کر سر جھکا دیا۔

ہیولائے کائنات ابھرنے کو تو ابھرا لیکن بڑا بے کیف اور بہت بے رنگ۔ آہستہ آہستہ اس کے بکھرے ہوئے ذروں میں ربط و ضبط پیدا ہونا شروع ہوا۔ ربط و ضبط سے اس خاک میں کچھ رنگینیوں کے آثار محسوس ہونے لگے۔ منتشر رنگینیوں نے آہستہ آہستہ ایک نقطہ پر مرکوز ہونا شروع کیا۔ بکھری ہوئی شوخیاں سمٹ کر بجلیاں بننے لگیں۔ جنت کی حوروں نے کن انکھیوں سے باہم اشارے کئے۔ نوامیسِ فطرت کی نگاہوں میں ہلکا سا تبسم پیدا ہوا۔ حریمِ قدس کے رازداروں نے کانوں ہی کانوں میں کچھ کہا سنا۔ زمین کانپی۔ آسمان تھرتھرایا۔ چاند کا ساغرِ زریں چھلک گیا۔ ستاروں کے ننھے سے دل دہل گئے۔ فضا میں ایک شور اٹھا اور —

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور
خودگرے۔ خودشکنے۔ خودنگرے پیدا شد

خبرے رفت زگردوں بہ شبستانِ ازل — حذر اے پردگیاں! پردہ درے پیدا شد
آرزو بے خبر از خویش بآغوشِ حیات — چشم وا کرد و جہانِ دگرے پیدا شد
زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر — تا ازیں گنبدِ دیرینہ درے پیدا شد

حوروں نے نغمۂ تبریک گایا۔ فرشتوں نے سر جھکایا، ارض و سموٰت نے اپنی باج گزاری کا خریطہ پیش کیا۔ ابلیس نے مقابلہ کا چیلنج دیا۔ اور یوں یہ عالمِ بے کیف، دنیائے رنگ و بو اور جہانِ سوز و ساز بن گیا۔ اب درحقیقت اس پروگرام کی پہلی منزل شروع ہوئی جس کے پیشِ نظر عالمِ جمادات سے لے کر پیکرِ انسانی تک کے ارتقائی مراحل قریباً قرن کے عرصۂ دراز میں طے ہوئے تھے۔ اب وہ مقام آگیا جہاں انسان تخاطب کے قابل ہو گیا۔ جہاں اسے سمع و بصر، شعور و ادراک اور ارادہ و اختیار عطا کر کے ھُوَ (وہ) کے بجائے (کُمْ)[1] تم سے خطاب کیا گیا۔ یہ تو ہم پچھلے باب میں دیکھ چکے ہیں کہ انسان کی پیدائش کس طول و طویل سلسلۂ ارتقاء کے ماتحت واقع ہوئی ہے اور اس سلسلۂ ارتقاء کے بعد کسی ایک فرد کی تخلیق نہیں ہوئی بلکہ ایک نوع کی تخلیق ہوئی جسے نوعِ انسانی کہا گیا ہے۔ لہٰذا آدم سے یہ مراد نہیں کہ وہ "سب سے

آدم سے مراد! پہلا انسان" تھا جو کسی نہ کسی طرح یونہی بنا دیا گیا تھا اور اس سے پھر نسلِ انسانی آگے بڑھی بلکہ آدم سے مراد آدمی (The Man) ہے۔ .... قصۂ آدم خود آدمی کی سرگزشت ہے نہ کہ کسی خاص فرد کی داستانِ زندگی۔ "بابا آدم اور اماں حوا" کا تصور بائبل کا تصور ہے، قرآن کا نہیں۔ قرآن نے آدمی کی سرگزشت کو تمثیلی رنگ میں بیان کیا ہے تاکہ مجرد حقیقتیں، تشبیہات کے لباسِ مجاز میں سامنے آسکیں۔

آغازِ داستان قرآن کریم کا پہلا ورق الٹیے اس عظیم المرتبت کتاب کی غرض و غایت اور انسانوں کی تین جماعتوں (متقین، کفار، اور منافقین) کے اجمالی تذکرہ کے بعد سرگزشت آدم کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (۲/۳۰)

اور جب تیرے رب نے ملائکہ سے کہا کہ میں دنیا میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

لفظ خلیفہ کی تشریح اس عنوان کے آخر میں ملے گی۔ یہاں صرف اتنا سمجھ لیجیے کہ اس سے مراد "خدا کا خلیفہ" نہیں

---

[1] سابقہ عنوان میں ملاحظہ کیجیے "نفخ روح" سے پہلے تمام ارتقائی منازل میں انسان کیلئے ھو (ضمیر غائب) استعمال ہوئی ہے مثلاً (سواہ) وغیرہ۔ لیکن نفخ روح کے فوری بعد یہ ضمیر غائب، مخاطب (کُمْ) سے بدل گئی ہے۔ وجعل لکم السمع گویا اب انسان تخاطب کے قابل ہو گیا۔

اس سے مطلب سابقہ آبادی یا نوع کا جانشین ہے۔

انسان سے پہلی انواع میں (ہم دیکھ چکے ہیں کہ) اختیار و ارادہ کی قوت نہیں تھی۔ سلسلۂ ارتقاء میں یہ پہلی کڑی تھی جسے اختیار و ارادہ دیا گیا تھا۔ باقی کائنات (جسے اختیار و ارادہ حاصل نہیں) بلا چون و چرا قانونِ خداوندی کے مطابق اپنے اپنے مفوضہ فرائض کی تکمیل میں سرگرمِ عمل ہیں۔ لیکن انسان کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو قانونِ خداوندی کی اطاعت کرے اور چاہے تو اس سے سرکشی اختیار کر لے۔ قانونِ خداوندی سے سرکشی کا نتیجہ، فساد کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا کائنات کی قوتوں (ملائکہ) نے کہا کہ اتجعل فیہا من یفسد فیہا و یسفک الدماء (۲/۳۰) کیا اب دنیا میں ایک ایسی مخلوق کو پیدا کیا جائے گا جو اس میں فساد انگیزیاں اور خونریزیاں برپا کرے گی؟ اس کے برعکس، ہماری یہ حالت ہے کہ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ (۲/۳۰) ہم ہمیشہ اس پروگرام میں سرگرمِ عمل رہتے ہیں جس کے نتائج دیکھ کر ہر دیدۂ بینا مصروفِ حمد و ستائش ہو جائے اور اس میں جتنی دور تک بھی ہمیں جانا پڑے جاتے ہیں۔ کبھی تھکتے ہی نہیں۔

خلاقِ فطرت کے مقدس چہرۂ جمال آگیں پر ایک حسین سی ہنسی برق طور بن کر لہرا گئی ارشاد ہوا کہ:-

إِنِّيْٓ أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (۲/۳۰)

میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

استحقاق خلافت

استحقاق خلافت کے لئے تسبیح و تقدیس ہی کافی نہیں اس کے لئے اور بھی بہت کچھ درکار ہے۔ بقول حضرت علامہ اقبالؒ

مقامِ بندگی دیگر مقامِ عاشقی دیگر
ز نوری سجدہ می خواہی ز خاکی بیش ازیں خواہی

کائنات کی قوتیں، اس مشینری کو خدا کے حکم کے مطابق علیٰ حالہٖ چلا سکتی ہیں۔ اس کے حسن میں اضافہ نہیں کر سکتیں۔ وہ خدا کے حکم کی فرمان پذیر ہو سکتی ہیں اس کی رفیق نہیں بن سکتیں۔ یہ مقام صرف انسان کے لئے مختص ہے چنانچہ اس حقیقت کے اظہار کے لئے یہ کیا گیا کہ:-

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ .... وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝ (۲/۳۱-۳۳)

اور اس نے آدم کو تمام علم الاشیاء عطا کر دیا۔ پھر ان اشیاء کو فرشتوں کے سامنے رکھا اور کہا اگر تم (اپنے دعوئے استحقاقِ خلافت میں) سچے ہو تو ان کے نام مجھے بتاؤ (انہوں نے سر جھکا لیا اور) عرض کیا کہ (بار الہٰا!) ہمیں تو سوائے اس کے جو تو نے عطا کر رکھا ہے اور (کسی چیز کا) علم نہیں بے شک تو ہی سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

اس نے آدم سے کہا کہ (اب) تو ان کے نام فرشتوں کو بتادے۔ سو جب اس نے ان کے نام فرشتوں کو بتادیئے
تو (اللہ نے) کہا کہ کیا میں نے (اے فرشتو!) تم سے نہیں کہا تھا کہ میں پستیوں اور بلندیوں کی تمام غیب
کی باتوں سے واقف ہوں اور تمہارے ظاہر و غائب سے باخبر ہوں۔

یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ آدم کو اسماء (Names) کا علم دیا گیا۔ اس میں ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ علم کا پہلا درجہ (perceptual) ہوتا ہے یعنی وہ علم جو حواس (senses) کے ذریعے حاصل کیا جائے۔ قرآن نے اس علم پر بھی بڑا زور دیا ہے۔ وہ سمع و بصر سے کام لینے کی اہمیت کو بار بار اجاگر کرتا ہے۔ لیکن اس سے آگے علم کا وہ درجہ ہے جسے (Conceptual) کہتے ہیں یعنی مدرکات (perception) سے تصورات (Concepts ...... متعین کرنا۔ یہ حصہ خالص انسانی سطح زندگی پر حاصل ہو سکتا ہے۔ تصور (concept) وجود میں آ نہیں سکتا جب تک اس کے لئے نام (اسم) وجود میں نہ آئے۔ ہمارے زمانہ میں اس مسئلہ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے

علم الاشیاء کی بخشش

(اور لکھا جا رہا ہے کہ) اسماء اور تصورات کا کس طرح چولی اور دامن کا ساتھ ہے۔] اس کے لئے ڈاکٹر بک کی مشہور کتاب (...... Cosmic universe) میں بڑی دلچسپ بحث ملیگی [چنانچہ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ آدم کو تصوراتی علم ...... (Conceptual Knowledge) کی صلاحیت دی گئی یہ وہ خصوصیت تھی جس کے سامنے ملائکہ (کائنات کی مختلف قوتوں) کا سر جھک گیا۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ
مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (۲/۳۴)

اور جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کے سامنے جھک جاؤ تو وہ سب کے سب جھک گئے۔ لیکن ابلیس نہ جھکا۔
اس نے سرکشی برتی۔ اس نے استکبار کیا اور وہ نہ ماننے والوں میں سے تھا۔

ملائکہ نے اپنا سر تسلیم خم کر دیا۔ قوائے ملکیہ کی فطرت میں جھک جانا ہے۔ ان کی خصوصیت طاعت و انقیاد، تسلیم و رضا ہے۔ اس کے برعکس قوتِ ابلیسی کی شعلہ مزاجی کی فطرت میں سرکشی و استکبار ہے۔ قوانینِ الٰہیہ کے سامنے جھک جانا اسلام اور ان سے اعراض و سرکشی برتنا کفر ہے۔ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ [ملائکہ اور ابلیس کی تفسیر آگے چل کر ملے گی]

دوسری خصوصیت۔ اختیار و ارادہ

یہ پہلی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے آدم کو ملائکہ پر شرف حاصل ہے۔ یعنی علم الاشیاء کی بہرہ یابی۔ اس کے بعد دوسری خصوصیت کا تذکرہ فرمایا۔ یعنی اختیار و ارادہ۔ فرشتوں (بلکہ کائنات کی ہر شے) کے متعلق قرآن کریم میں ہے:

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ مِنْ دَابَّةٍ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (۱۶/۴۹ — ۵۰)

اور آسمانوں (بلندیوں) میں جس قدر چیزیں ہیں اور زمین (پستیوں) میں جس قدر جاندار ہیں اور فرشتے سب کے سب اپنی خداوندی کے سامنے سربسجود ہیں اور وہ سرکشی نہیں کرتے۔ اپنے پروردگار کے قانون ربوبیت سے ڈرتے ہیں جو ان کے اوپر موجود ہے اور جو کچھ انہیں حکم دیا جاتا ہے اس کی تعمیل کرتے ہیں!

دوسرے مقام پر ہے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ .... إِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۝ (۲۲/۱۸)

کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے (یعنی منجملہ ان کے) سورج۔ چاند۔ ستارے پہاڑ۔ درخت۔ چارپائے سب اللہ (کے قوانین) کے آگے سربسجود ہیں اور کتنے ہی انسان بھی؟ لیکن بہت سے انسان ایسے بھی ہیں کہ ان پر (ان کے انحراف کی وجہ سے) عذاب کی بات ثابت ہو گئی ہے۔ اور جسے اللہ (قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے) ذلت میں ڈال دے تو پھر کوئی نہیں جو اسے عزت دے سکے بیشک اللہ (اپنے قانونِ) مشیت کے مطابق (سب کچھ) کرتا ہے۔

اختیار و ارادہ کی سحر کاریاں

یہاں انسان اور دیگر اشیاء کائنات کا فرق ظاہر ہو گیا۔ یہ انسان کا اختیار و ارادہ ہے جس سے یہ دیگر اشیاء کائنات سے ممتاز اور متمیز ہے۔ انسان کے سوا کسی اور مخلوق میں یہ قوت ہی نہیں کہ وہ جس نہج و اسلوب پر چلنے کے لئے پیدا کی گئی ہے اس سے سرکشی و انحراف اختیار کرے (كُلٌّ لَّهُ قَانِتُوْنَ ۝) لیکن انسان میں سجدہ ریزی اور سرکشی دونوں کی قوتیں ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہیں۔ یہی قوت اس کی سرفرازی و سربلندی کا باعث ہے۔ اسی سے یہ مسجود ملائک اور مخدوم خلائق ہے۔ کشمکشِ حیات میں پُرکیف جاذبیتیں ہیں تو اسی سے اور کشاکش زندگی میں رنگین کیفیتیں ہیں تو اسی کے دم سے۔ بربطِ ہستی کے تاروں میں خوابیدہ نغمے بیدار ہوتے ہیں تو اسی مضراب سے، اور مینائے حیات کے سادہ پانی میں کیف رنگ و نعطر کی رعنائی موجیں اٹھتی ہیں تو اسی کے جوش سے۔ سینۂ کائنات میں ایک دھڑکنے والا دل ہے تو اسی کے تموج سے اور اگر اس دل میں مچلنے والی آرزوؤں کی رسیلی بجلیاں ہیں تو اسی کے تحرک سے۔ غرضیکہ انسان، انسان ہے تو اسی کی بدولت اور یہ دنیا، دنیا ہے تو اسی کے صدقے۔ اگر یہ اختیار و ارادہ نہ ہوتا تو انسان پتھر کا بت ہوتا، یا اشیائے کائنات میں سے کوئی عام شے۔ مسجود ملائک و مسخر کائنات کبھی نہ ہوتا۔ قصۂ آدم کا پہلا باب اسی اختیار و ارادہ کے مظاہرہ سے شروع ہوتا ہے جو معصیت آدم کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ نیکی وہی نیکی ہے جو بدی کی قدرت رکھتے ہوئے عمل میں آئے۔

اطاعت وہی اطاعت ہے جو سرکشی کی استطاعت کے باوجود سرزد ہو۔ نیازمندی اسی کی قابلِ ستایش ہے جو خود سراپا ناز ہو۔ اسی سر کے جھکنے میں لذت ہے جس کی پیشانی میں دنیا بھر کی سرفرازیاں جھلک رہی ہوں۔ جس میں انتقام کی قوت نہیں اس کے عفو میں کیا خوبی ہے۔ جس میں ہمسری کی ہمت نہیں اس کا جھک کر سلام کرنا خوئے غلامی ہے جس کے پاؤں کے نیچے تختِ حکومت نہیں اس کا بوریہ نشین ہونا گداگری ہے۔ اختیار رکھتے ہوئے خود پہ کنٹرول کرنا ہی انسانیت کا شرف امتیاز ہے۔ اسی سے اس کی خودی میں استحکام پیدا ہوتا ہے اور استحکام خودی ہی انسانیت کی معراج ہے۔

آگے بڑھنے کی صلاحیت

نظریہ ارتقا میں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ بعض حیوانات جس مقام میں تھے وہیں ٹھٹر کر رہ گئے آگے نہیں بڑھ سکے اور بعض ارتقائی منازل طے کرتے کرتے بہت دور آگے نکل گئے۔ عروج وارتقا کن کے حصے میں آیا اور جمود وتعطل کن کے مقدر میں تھا؟ اس باب میں ماہرینِ فن کی تحقیق یہ ہے کہ ہر وہ نوع جسے اپنی بقا (یعنی ارتباط جسم وجان) کے لئے کسی خاص تگ و دو کی ضرورت نہ پڑی وہ بیکار ہو کر رہ گئی۔ مثلاً جو نوع کسی ایسے مقام میں آباد تھی جہاں اشیائے خورد ونوش کی فراوانی تھی کسی قسم کا خوف وخطر نہ تھا۔ جہاں

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں!

وہ نوع یا تو رفتہ رفتہ مٹ گئی یا منجمد ہو کر رہ گئی۔ آگے نہیں بڑھ سکی۔ لیکن اس کے برعکس جس نوع کو اپنی بقا اور حفاظت کے لئے تگ وتاز کی سپاہیانہ زندگی بسر کرنی پڑی۔ جس کا ہر لحظہ کش مکشِ حیات میں گزرا۔ جسے یم زندگی کے ساحل پر لہروں کی موسیقی میں جذب ہو کر رہ جانے کے بجائے عین تلاطمِ دریا میں بپھری ہوئی موجوں سے ہم آغوش ہونا پڑا۔ اس میں باقی رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیتیں پیدا ہو گئیں اور اسی نے ارتقائی منازل طے کیں۔ چونکہ انسان کی تخلیق کا مقصد ہی اسے ارتقائی منازل طے کرا کر آگے بڑھانا تھا۔ اس لئے خارجی دنیا کی کش مکش کے علاوہ خود اس کے قلب کی دنیا کو ایک مستقل کش مکش کی آماجگاہ بنا دیا۔ جس میں ہر وقت اور ہر آن خیر وشر کی نبرد آزمائی اور اہرمن ویزداں کی ستیزہ کاری وجہ گرمیِ کائنات رہے۔ یہی کش مکشِ پیہم اور کشاکشِ مسلسل ہے جو اس کی شمشیرِ خودی کے لئے فساں اور جوہرِ انسانیت کے لئے سامانِ بالیدگی ہے۔ صرف انسان کی اپنی ذات ہی کے لئے وجہِ بالیدگی نہیں بلکہ کائنات میں حسین ندرت کاریوں کے اضافے بھی انسان کے اختیار وارادے ہی کے رہین منت ہیں۔ باقی مخلوق، خدا کی بنائی ہوئی کائنات کو چھیڑتی نہیں ہے اور جب چھیڑتی نہیں تو سنوارتی بھی نہیں۔ لیکن انسان کی یہ حالت ہے کہ بقول علامہ اقبالؒ

گفت یزداں کہ چنیں است و چنیں خواہد ماند
گفت آدم کہ چنیں ہست و چناں خواہد بود

جو کچھ ہے (what is) کو جو کچھ ہونا چاہیئے (what ought to be) بنا دینے کا جذبہ انسان ہی کے سینے میں پنہاں ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ خود کائناتی قوانین کے مطابق بھی کائنات میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اس طرح پوری کی پوری کائنات ارتقائی منازل طے کئے جا رہی ہے۔ لیکن یہ تبدیلیاں (قرآن کے الفاظ میں) ایسے ایسے طویل المیعاد منازل (periods) کے بعد ہوتی ہیں جن میں سے ایک ایک منزل (یوم) ہزار ہزار اور پچاس پچاس ہزار سال کی ہوتی ہے۔ لیکن اس کائناتی قانون کے ساتھ جب انسان کی رفاقت شامل ہو جاتی ہے تو یہ تبدیلیاں دنوں کے اندر واقع ہو جاتی ہیں۔ اس لئے کہ انسان ان تبدیلیوں کو اپنی عمر کے پیمانوں کے مطابق ظہور میں لاتا ہے۔ خدا کی پیمانوں کے مطابق نہیں لاتا۔

یہ سب کچھ انسان کے اختیار وارادہ کی قوت سے ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے انسان کی خصوصیت علم الاشیاء کے ساتھ ہی اس خصوصیت کا بھی ذکر کر دیا جس کی رو سے یہ معصیت وقانون شکنی کا بھی اختیار رکھتا ہے۔

وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ ○ (2/35)

اور ہم نے کہا کہ اے آدم! تو اور تیری بیوی (یعنی مرد اور عورت دونوں) جنت میں رہو اور اس میں جہاں سے جی چاہے بافراغت کھاؤ (پیو) لیکن اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ ظالمین میں سے ہو جاؤ گے۔

یہ جنت کہاں تھی جس میں آدم کو رکھا گیا تھا؟ وہ درخت کونسا تھا جس کے پاس جانے سے اسے روکا گیا تھا؟ اس کے قریب جانے سے ان میں کس قسم کی کمی آ جاتی تھی (ظلم کے معنی کمی کے بھی ہیں)، ان نکات کی تشریح ذرا آگے چل کر ملے گی۔ اس مقام پر صرف اتنا دیکھ لینا کافی ہے کہ خدا نے حکم دیا کہ یہ کام نہ کرنا۔ اس کے بعد کیا ہوا؟

فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ (2/36)

اس سے شیطان نے انہیں پھسلا دیا اور اس طرح وہ جس (جنتی کیفیت) میں تھے وہاں سے انہیں نکال دیا۔

اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ ہبوط۔ آدم نیچے گر گیا۔ ارتقاء میں عروج وبلندی ہے، جمود میں سکون، اور ہبوط میں زوال وانحطاط۔ انسان عروج وارتقاء کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ جمود یا انحطاط کے لئے نہیں لیکن اس کی تخلیق کے ساتھ ہی ان قوتوں کو بھی پیدا کیا گیا ہے جو اسے زوال وانحطاط کی طرف لیجانے کی کوشش کریں گی۔ اس کشمکش خیر وشر کی رزمگاہ ارضی زندگی ہے جس میں اس کے لئے قیام اور تمتع ہے۔

وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۖ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (2/36)

ہم نے کہا کہ (اس مقام) سے نیچے گر جاؤ (کیونکہ معصیت کا یہی نتیجہ ہے)، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ اب تمہارے لئے زمین میں ایک وقت معین تک کے لئے ٹھکانا اور گزارے کا سامان ہے۔

ہبوط میں کس طرح ایک انسان اور دوسرے انسان میں بیگانگی اور مغائرت آجاتی ہے (عداوت کے یہی معنی ہیں) اور ارض میں مستقر اور متاع کا مفہوم کیا ہے۔ یہ چیزیں چند صفحات آگے چل کر سامنے آئیں گی۔ اس وقت یہ دیکھئے کہ کیا ایک بار کی لغزش کا نتیجہ ابدی ہلاکت ہو گیا یا اس کے بعد باز آفرینی کی صورت بھی باقی رہی؟ قرآن کہتا ہے کہ آدم ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ نہیں ہو گیا۔

باز آفرینی

فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْهِؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ۝ (۲/۳۷)

اس کے بعد آدم نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات سیکھے اور یوں سیدھی راہ کی طرف پھر لوٹا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اللہ بھی اس کی طرف لوٹ آیا۔ کیونکہ وہ تو بہت جلد توجہ کرنے والا اور رحمتوں والا ہے۔

لیکن یہ باز آفرینی اب اس مقام میں ایک خاص نقشے کے مطابق زندگی بسر کرنے سے حاصل ہونی ہے جس مقام میں آدم گر گیا ہے۔

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًاۚ (۲/۳۸)

ہم نے کہا کہ اس مقام سے تو بہر حال اب سب کو نیچے ہی گرنا ہو گا۔

اس مقام سے تو نیچے گرنا ہی ہو گا۔ اب رزمگاہ ارضی میں پہنچ کر اپنے آپ کو پھر سے اسی مقام بلند کا اہل ثابت کرو تو اس میں واپس آجاؤ گے۔ لیکن اس کی شکل کیا ہو گی؟

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۝ (۲/۳۸)

پس ہماری طرف سے تمہارے پاس ہماری ہدایت پہنچا کرے گی۔ سو جو شخص میری ہدایت کی اتباع کرے گا تو انہیں کسی قسم کا خوف اور غم نہ ہو گا۔

فردوسِ گم گشتہ کی بازیابی کی صورت

ہلاکت اور بربادی سے مصئون رہنے کی ایک ہی صورت ہو گی اور وہ یہ کہ زندگی قوانینِ الٰہیہ کے تابع بسر کی جائے۔ اگر ان قوانین کی تکذیب و انکار کی روش اختیار کی تو ہلاکت کا جہنم سامنے ہے۔

وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓىٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ۝ (۲/۳۹)

اور جو لوگ ہمارے قانون سے انکار کریں گے اور اس کی تکذیب پر اتر آئیں گے تو یہ لوگ جہنم کے رہنے والے ہوں گے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

آیاتِ متذکرہ بالا میں کئی ایک اہم نکات ہیں جن کی تشریح اپنے اپنے مقام پر آئے گی۔ مثلاً خلیفہ۔ ملائکہ ابلیس۔ شیطان۔ علم الاشیاء۔ جنت۔ ظالم۔ توبہ۔ اصحاب النار وغیرہ۔ لیکن یہاں ایک چیز قابلِ غور ہے۔

لغزشِ آدم تک، آدم اور اس کی بیوی کا ذکر ہے جن کے لئے افعال وضمائر تثنیہ (دو) آئے ہیں۔ لیکن اس کے بعد وَقُلْنَا اهْبِطُوْا۔ بَعْضُكُمْ۔ وَلَكُمْ۔ جَمِيْعًا۔ يَاْتِيَنَّكُمْ۔ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ يَحْزَنُوْنَ۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا۔ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ ○ ان سب میں تثنیہ کے بجائے جمع کے صیغے ہیں اور تخاطب تمام نوعِ انسانی سے ہے۔ لہٰذا قصّۂ آدم کسی ایک میاں بیوی کا واقعہ نہیں بلکہ خود انسان کی سرگزشت ہے۔ آئندہ آیات میں یہ نکتہ اور بھی کھلے کھلے الفاظ میں واضح ہو کر سامنے آجائے گا۔ شلاً سورۂ اعراف میں ہے

قصّۂ آدم، خود انسان کی سرگزشت ہے

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ○ (۷/۱۱)

اور دیکھو، ہم نے تمہیں پیدا کیا۔ پھر تمہاری (انسانوں جیسی) صورت بنا دی۔ پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے جھک جاؤ۔ اس پر سب جھک گئے۔ مگر ابلیس کہ وہ جھکنے والوں میں سے نہ تھا۔

دیکھئے یہاں نوعِ انسانی کی تخلیق اور صورت گری کے بیان کے بعد قصّۂ آدم شروع کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ آدم اس مقام کا مظہر ہے جہاں زندگی درجۂ حیوانیت سے نکل کر وادیٔ انسانیت میں پہنچی اور جہاں سے انسان کی تمدنی زندگی کی ابتدا اور کش مکش زندگی کا آغاز ہوا۔ قرآنِ کریم نے اس مقام پر آدم و ابلیس کی باہمی آویزش کو اور زیادہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ارشاد ہے:۔

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ○ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ (۷/۱۲-۱۳)

اللہ نے فرمایا کہ جب میں نے تجھے حکم دیا تھا تو تجھے کس بات نے جھکنے سے روکا؟ کہا اس بات نے کہ میں آدم سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے۔ فرمایا۔ جنت سے نکل جا۔ تیری یہ ہستی نہیں کہ یہاں رہ کر سرکشی اختیار کرے۔ یہاں سے نکل دور ہو۔ یقیناً تو ان میں سے ہوا جو ذلیل و خوار ہیں۔

یہاں ابلیس کے ہبوط و اخراج کا ذکر ہے۔ ابلیس کا جرم سرکشی تھا اور آدم کا لغزش، سرکشی کا جذبہ محرکہ ضد اور انکار ہوتا ہے۔ لیکن احساسِ لغزش کا نتیجہ وہ قطراتِ انفعال جنہیں کسی کی شانِ کریمی موتی سمجھ کر چن لیتی ہے۔ لہٰذا لغزش کے بعد بازیابی کا امکان ہے۔ لیکن سرکشی کے بعد نہیں۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ ابلیس کی نمود آدم کے ساتھ ہوئی ہے۔ یعنی سرکشی کا امکان آدم کے اندر موجود ہے۔

ابلیسی کشمکش ہمیشہ کیلئے ہے

اور جب تک آدم موجود ہے ابلیس بھی موجود رہے گا۔ کہ حق و باطل کی کش مکش نوع انسانی کی تمام مدت حیات تک لازمی ہے۔ ندی اس وقت تک ندی ہے جب تک اس میں روانی رہے۔ اور روانی کے لئے پتھریلی چٹانوں سے ٹکراؤ ضروری ہے۔ چنانچہ جب ابلیس کو راندۂ درگاہ قرار دے کر نکل جانے کا حکم دیا گیا تو اس نے کہا:۔

قَالَ اَنْظِرْنِیْ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ۝ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ ۝ (۱۴-۱۵/۷)

ابلیس نے کہا کہ مجھے بعثت کے وقت تک مہلت دی جائے۔ فرمایا (کہ جا) تجھے مہلت ہے۔

ابلیس کو یہ مہلت دے دی گئی۔ اب ابلیس کا چیلنج سامنے آتا ہے۔

قَالَ فَبِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝ ثُمَّ لَاٰتِیَنَّهُمْ مِّنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَیْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ؕ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِیْنَ ۝ (۱۶-۱۷/۷)

ابلیس نے کہا چونکہ تو نے مجھ پر (سعادت کی) راہ بند کر دی تو اب میں بھی ضرور ایسا کروں گا کہ تیری متوازن راہ سے بھٹکانے کے لئے بنی آدم کی تاک میں بیٹھوں پھر سامنے سے، پیچھے سے، دائیں سے، بائیں سے (غرضیکہ ہر طرف سے) ان پر یورش کروں۔ اور تو ان میں اکثروں کو شکر گزار نہ پائے گا۔

اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ

قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ؕ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِیْنَ ۝ (۱۸/۷)

فرمایا۔ یہاں سے نکل جا۔ ذلیل اور راندہ۔ بنی آدم سے جو کوئی تیری پیروی کرے گا، تو وہ تیرا ساتھی ہوگا) اور میں البتہ ایسا کروں گا کہ تم سب سے (پاداش عمل میں) جہنم بھر دوں۔

اس کے بعد پھر اُسی ماجرے کو دُہرایا گیا جس کا ذکر سورۂ بقرہ کی آیات میں کیا جا چکا ہے۔

وَیٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ .... وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ۝ (۱۹-۲۲/۷)

اور (اللہ نے کہا) اے آدم تو اور تیری بیوی دونوں جنت میں رہو سہو اور جس جگہ سے جو چیز پسند آئے شوق سے کھاؤ۔ مگر دیکھو اس درخت کے قریب بھی نہ جانا ورنہ تم زیادتی کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔

لیکن پھر ایسا ہوا کہ شیطان نے ان دونوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالا تاکہ ان کے ستر جو اُن سے چھپے تھے اُن پر کھول دے۔ اس نے کہا۔ تمہارے پروردگار نے اس درخت سے جو تمہیں روکا ہے تو صرف اس لئے کہ تم

کہیں فرشتے نہ بن جاؤ، یا تمہیں دائمی زندگی نہ حاصل ہو جائے اور اس نے قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا کہ میں تم دونوں کو محض خیر خواہی سے نیک بات سمجھا رہا ہوں۔

غرضیکہ شیطان (اس طرح) انہیں فریب میں لے آیا۔ پھر جوں ہی ایسا ہوا کہ انہوں نے درخت کا پھل چکھا تو ان کے ستر ان پر کھل گئے اور (جب انہیں اپنی برہنگی دیکھ کر شرم محسوس ہونے لگی) تو باغ کے پتے اوپر تلے رکھ کر اپنے جسم پر چپکانے لگے۔ اس وقت ان کے پروردگار نے پکارا کہ کیا میں نے تمہیں اس درخت سے نہیں روکا تھا اور کیا میں نے نہیں کہہ دیا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے؟

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے ان مختلف مقامات کی تشریح ذرا آگے چل کر بیان کی جائے گی جہاں بتایا جائے گا کہ یہ شجر کیا تھا۔ ستر کھل جانے سے مفہوم کیا ہے۔ اس وقت صرف اتنا دیکھئے کہ یہ قصہ کسی ایک "میاں بیوی" کا نہیں بلکہ پوری کی پوری نوعِ انسانی کی تمثیلی داستان ہے۔

آدم کو جب اپنی لغزش کا احساس ہوا تو ندامت سے اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ اس نے عرض کیا۔

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا سکتہ وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۝ (۷/۲۳)

انہوں نے کہا اے ہمارے نشوونما دینے والے۔ ہم نے تیرے حکم کی خلاف ورزی کر کے خود اپنی ذات (کی صلاحیتوں ہی) میں کچھ کمی کر لی ہے۔ اگر تو ہمیں سامانِ حفاظت اور اسبابِ نشوونما عطا نہیں کرے گا تو ہمارا یہ نقصان کبھی پورا نہیں ہوگا۔

آدم کی توبہ سے اتنا ہی ہوا کہ ابلیس کی طرح ہمیشہ کے لئے مردود نہ قرار پایا۔ لیکن اس ٹھوکر سے جو چوٹ آئی تھی اس کے اندمال کے لئے حیاتِ ارضی کی کش مکش یعنی سعادت و شقاوت کی وادیوں سے گزرنا ضروری تھا۔

قَالَ اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۖ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ۝ قَالَ فِيهَا تَحْيَوْنَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ وَمِنْهَا تُخْرَجُونَ ۝ (۷/۲۴-۲۵)

فرمایا (بہر حال) یہاں سے سب نکل جاؤ (یا اس مقام سے نیچے گر جاؤ) تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ اب تمہارے لئے زمین میں ٹھکانا ہے۔ اور ایک وقتِ خاص تک کے لئے وہاں سامانِ زندگی سے فائدہ حاصل کرنا۔ (پھر) فرمایا کہ تم اسی (زمین) میں زندگی بسر کرو گے۔ اسی میں مرو گے اور (پھر مرنے کے بعد) اسی میں سے (دوبارہ) نکالے جاؤ گے۔

اب اس فردوسِ گم گشتہ کی بازیابی کے لئے سفرِ زندگی میں ایمان و اعمالِ صالحہ ضروری ہیں۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۝ (۹۵/۴-۶)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو بہترین ہیئت میں پیدا کیا۔ پھر اسے (اس کے اعمال کی وجہ سے) نچلے سے نچلے درجہ میں پہنچا دیا۔ لیکن ان لوگوں کے حصہ میں بلندیاں ہی ہیں، جو ایمان لائے اور انہوں نے ایسے کام کئے جن سے اُن میں (آگے بڑھنے کی) صلاحیت پیدا ہو گئی۔ سو ان کے لئے غیر منقطع اجر ہے۔

مزید وضاحت

سورۂ اعراف کی متذکرہ صدر آیات (یعنی ٧/١١–٢٥) پر پھر غور فرمائیے۔ ابتدا میں نوعِ انسانی کی تخلیق کا ذکر ہے (خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ) پھر آدم کے لئے سجدہ۔ اس کے بعد ابلیس کا انکار اور چیلنج۔ لیکن چیلنج کے مخاطب صرف آدم اور اُس کی بیوی (تثنیہ) نہیں بلکہ جمع کا صیغہ ہے (لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ۔ اَيْمَانِهِمْ۔ خَلْفِهِمْ وغیرہ) نہ صرف ابلیس، بلکہ خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی جواب میں انسانوں کے متعلق جمع ہی کا صیغہ ہے۔ (لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ ....) اس کے بعد آدم اور اس کی بیوی کا ذکر ہے۔ جن کے لئے تثنیہ کا صیغہ آیا ہے۔ لیکن آخر میں جہاں ہبوط کا ذکر ہے وہاں پھر صیغہ جمع ہے (آیات ٢٤–٢٥) اس سے ظاہر ہے کہ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) قصۂ آدم نوعِ انسانی کا تذکرہ ہے نہ کسی ایک میاں بیوی کی سرگذشت۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ سورۂ بقرہ میں ہبوط کے بعد فرمایا تھا کہ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ..... (٢/٣٨) سورۂ اعراف میں بنی آدم کو خاص طور پر مخاطب کر کے کہا گیا ہے:۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ..... اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (٧/٣٥–٣٦)

اے بنی آدم! میرے پیغمبر تم میں پیدا ہوں گے اور وہ میرے قوانین تمہیں سنائیں گے۔ سو جو کوئی اپنے آپ کو (اُن قوانین کی) حفاظت میں لے آئے گا اور (یوں اپنے اندر زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا کر لے گا تو اُن لوگوں کو کسی قسم کا (مٹنے یا زوال پذیر ہونے کا) خوف اور غم نہیں ہوگا۔ لیکن جو لوگ میرے قوانین کی تکذیب کریں گے اور اُن سے سرکشی اختیار کریں گے تو اُن کی صلاحیتیں جُھلس کر رہ جائیں گی اور وہ ہمیشہ اسی حالت میں رہیں گے۔

یعنی سورۂ بقرہ کی آیت (٢/٣٨) میں بھی بنی آدم ہی مقصود ہیں۔

سورۂ حجر میں اس کی مزید وضاحت ان الفاظ میں آئی ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝ (١٥/٢٨–٢٩)

اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں خمیر اُٹھے ہوئے گارے سے جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے بشر پیدا

کرنے لگا ہوں۔ سو جب اُسے میں درست کر دوں (یعنی وہ تکمیل تک پہنچ جائے) اور اُس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم سب اس کے سامنے جھک جانا۔

یہاں کسی شبہ کی گنجایش ہی نہیں رہی کہ مسجودِ ملائک وہی بشر ہے جسے مٹی سے پیدا کیا تھا (اور جس کی تشریح سابقہ عنوان میں گزر چکی ہے) اس کے بعد انکارِ ابلیس کی سرگزشت ہے جس کا تذکرہ اوپر آ چکا ہے

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۝ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ....... وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ (۱۵/۳۰-۴۳)

چنانچہ فرشتے سب کے سب اُس کے سامنے جھک گئے۔ لیکن ابلیس (نہ جھکا) اس نے اس سے ابا کیا کہ سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جائے۔ اللہ نے فرمایا۔ ابلیس تجھے کیا ہوا کہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔ کہا مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ میں ایسے بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے خمیر اُٹھے ہوئے گارے سے بنایا جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے۔ حکم ہوا اگر ایسا ہے تو یہاں سے نکل جا کہ تو راندہ ہوا اور مکافات کے دن تجھ پر لعنت ہے (تو رحمتِ خداوندی سے محروم رہے گا) اُس نے کہا خدایا مجھے بعثت کے دن تک مہلت دیدے۔ فرمایا۔ اس وقتِ مقررہ تک تجھے مہلت دیدی گئی۔ اُس نے کہا خدایا! چونکہ تو نے مجھ پر (سعادت کی) راہ بند کر دی ہے تو اب میں ضرور ایسا کروں گا کہ (انسانوں کے لئے) دنیا میں (جھوٹی) خوشنمائیاں بنا دوں اور انہیں (اس طرح فریب دے کر راہِ حق سے) گمراہ کر دوں۔ ہاں! ان میں سے جو تیرے مخلص بندے ہوں گے (وہ میرے بہکانے میں نہیں آسکیں گے۔)

فرمایا! بس یہی متوازن راہ ہے جو مجھ تک پہنچانے والی ہے۔ جو میرے بندے ہیں ان پر کبھی تیرا غلبہ نہیں ہو سکے گا۔ صرف ان ہی پر (تیرا زور چل سکے گا) جو گمراہ ہو کر تیری اتباع کریں گے۔ اور اُن سب کے لئے جہنم کے عذاب کی وعید ہے۔

ضمائر کا استعمال یہاں بھی قابلِ غور ہے۔ ابتداء میں بشر کا ذکر ہے اور ضمیر واحد غائب کی ہے۔ لیکن جب ابلیس چیلنج دیتا ہے تو ضمائر جمع غائب کی شروع ہو جاتی ہیں۔ جن سے واضح ہے کہ مقصود تمام نوعِ انسانی ہے۔ اس باب میں سورۃ صٓ کی حسبِ ذیل آیاتِ جلیلہ بھی قابلِ غور ہیں۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ۝ ...... قَالَ فَالْحَقُّ ۡ وَالْحَقَّ اَقُوْلُ ۝ۚ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ (۳۸/۷۱-۸۵)

جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں مٹی سے بشر (انسان) بنانے والا ہوں۔ سو جب میں اسے درست کر دوں (وہ تکمیل تک پہنچ جائے) اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جانا۔

فرشتے تو تمام کے تمام سجدہ میں جھک گئے لیکن ابلیس (نہ جھکا) اس نے سرکشی برتی اور وہ نہ ماننے والوں میں سے تھا۔ اللہ نے کہا اے ابلیس وہ کون سی بات ہے جس نے تجھے اس سے روکا کہ جسے میں نے اپنے دست (قدرت) سے بنایا ہے۔ اُس کے سامنے نہ جھکے۔ کیا تو سرکش ہے یا اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھتا ہے؟ اُس نے کہا کہ میں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اُسے مٹی سے۔ اللہ نے فرمایا کہ اس میں سے نکل جا کیونکہ یقیناً تو راندہ ہے۔ اور تجھ پر مکافات کے دن تک لعنت ہے۔ اُس نے کہا! اے پروردگار! مجھے قیامت کے دن تک مہلت عطا کر دے۔ فرمایا! جا تجھے مُہلت ہے وقت معلوم تک! اس نے کہا تیرے غلبہ و سطوت کی قسم! میں ان سب کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔ مگر ان میں سے تیرے مخلص بندوں (پر میرا زور نہ چل سکے گا) اللہ نے فرمایا کہ پھر حق یہ ہے اور میں تو (ہمیشہ) حق ہی کہتا ہوں کہ میں تجھ سے اور ان تمام سے جو تیری اتباع کریں گے جہنم بھر دوں گا۔

سورۂ حجر اور سورۂ ص کی آیات بالا میں بشر کا ذکر ہے کہ اسے مٹی سے پیدا کیا۔ سورۂ آلِ عمران میں آدم کے متعلق فرمایا۔

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ ۝ (۳/۵۹)

یقیناً اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے اسے اُس نے مٹی سے پیدا کیا (یعنی ابتدائے تخلیق یوں ہوئی) پھر کہا کہ (اپنی ارتقائی منازل طے کر کے مکمل) ہو جا اور وہ (یوں مکمل ہو گیا)

یعنی آدم کو مٹی سے پیدا کیا۔ گویا آدم اور انسان ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ اسی طرح سورۂ بنی اسرائیل میں آدم کی تخلیق مٹی سے بتلائی گئی ہے

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ قَالَ أَأَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ .... وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ وَكِيلًا ۝ (۱۷/۶۱-۶۵)

اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ آدم کے سامنے جھک جاؤ اس پر سب (فرشتے) جھک گئے۔ لیکن ابلیس (نہ جھکا) اُس نے کہا۔ کیا میں اس ہستی کے آگے جھکوں جسے تو نے مٹی سے بنایا ہے؟ اور یہ بھی کہا کہ ذرا اس پر غور تو فرما کہ تو نے اس (حقیر) ہستی کو مجھ پر برتری دیدی ہے۔ اگر تو مجھے قیامت کے دن تک مہلت دیدے تو میں اس کی نسل کی ناک میں نکیل ڈال کر اس طرح لئے لئے پھروں کہ ان میں سے بجز معدودے چند کے کوئی بھی تیرے راستے پر نہ رہ سکے۔ اللہ نے فرمایا: جا (اپنی راہ لے) جو کوئی بھی اُن میں سے تیرے پیچھے چلے گا تو اس کے لئے اور تیرے لئے جہنم کی سزا ہو گی۔ پوری پوری سزا۔ اُن میں سے جس کسی کو

تو اپنی صدائیں سنا کر بہکا سکتا ہے۔ بہکانے کی کوشش کر لے۔ اس پر) اپنے لشکر کے سواروں اور پیادوں سے حملہ کر دے ان کے مال اور اولاد میں شریک ہو جا (طرح طرح) کے نظر فریب وعدے کر۔ اور شیطان کے وعدے تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ سراسر دھوکا ہی دھوکا ہیں۔ (جو تیرے جی میں آئے کر گزر لیکن) جو میرے بندے ہیں اُن پر تو کبھی قابو نہیں پا سکے گا (ان کے لئے) تیرا پروردگار کارسازی کے لئے کافی ہے۔

سورۂ طٰہٰ میں اس سرگزشت کے زمرہ میں دو ایک باتیں اور بھی قابلِ غور ہیں۔ فرمایا۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ .... وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (۲۰/۱۱۶-۱۲۴)

اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے سامنے جھک جاؤ سو سب جھک گئے۔ لیکن ابلیس نہیں جھکا۔ اس پر ہم نے کہا۔ اے آدم! (دیکھ لے) یہ ابلیس، تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ تمہیں جنت سے نکال کر رہے۔ اور تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔ تمہارے لئے اب ایسی زندگی ہے جس میں نہ تم بھوکے رہتے ہو نہ برہنہ۔ نہ تمہارے لئے پیاس کی جلن ہے نہ سورج کی تپش۔

لیکن شیطان نے آدم کو وسوسہ میں ڈال دیا۔ اس نے کہا اے آدم! میں تجھے ہمیشگی کے درخت کا نشان بتا دوں۔ اور ایسی بادشاہت کا جو کبھی زائل نہ ہو؟ چنانچہ ان دونوں (میاں بیوی) نے اس درخت کا پھل کھا لیا۔ اور دونوں کے ستر اُن پر کھل گئے۔ تب اُن کی حالت ایسی ہو گئی کہ وہ باغ کے پتے اوپر تلے رکھ کر ان سے اپنا جسم ڈھانپنے لگے۔ غرضیکہ آدم اپنے رب کے حکم پر نہ چلا اور بے راہ ہو گیا۔ لیکن پھر (اس کی توبہ کے بعد) اس کے رب نے اسے برگزیدہ کیا اور (اس پر) اپنی رحمتوں سے) لوٹ آیا اور اسے سیدھی راہ دکھا دی۔ مگر (ساتھ ہی یہ بھی) فرما دیا کہ تم دونوں یہاں سے نکل جاؤ اکٹھے۔ تم میں سے ایک دوسرے کا دشمن ہو گا۔ (اس کے بعد تمہیں کشمکشِ حیات میں رہنا ہو گا جس میں) میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے گی سو جو کوئی میری ہدایت کی اتباع کرے گا وہ نہ تو گمراہ ہو گا۔ اور نہ ہی مشقت میں پڑے گا (لیکن) جو کوئی میرے ذکر (قوانین) سے روگرداں ہو گا تو اس پر معیشت تنگ کر دی جائے گی اور اسے میں قیامت کے دن اندھا اٹھاؤں گا۔

جنت اور دنیا کی زندگی

اتنا سمجھ لینے کے بعد کہ یہ قصہ کسی خاص میاں بیوی کا نہیں بلکہ نوعِ انسانی کی سرگذشت ہے۔ ان مقامات کا صحیح مفہوم بھی سمجھ لیجئے جنہیں قرآن نے تمثیلی رنگ میں بیان کیا ہے۔ سب سے پہلے دیکھئے کہ اس میں جنت سے کیا مراد ہے؟ سورۂ بقرہ میں اس کے متعلق فرمایا تھا وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (۲/۳۵) اس میں سے جہاں سے جی چاہے بافراغت

کما (۲۰/۱۱۸) سورہ طٰہٰ میں کہا اس میں نہ بھوک ہو گی نہ برہنگی۔ نہ تشنگی نہ سورج کی جھلس دینے والی تپش۔ یعنی انسان کی طبعی زندگی کے لئے جس سامانِ معیشت کی ضرورت ہے اس کی فراوانی۔ اور اس "جنت" سے باہر نکلنے کا نتیجہ کیا ہوا؟ اسی سامانِ معیشت (خوراک، لباس، مکان) کے حصول کے لئے سخت مشقت اٹھانی پڑی۔ یعنی وہ سامان نشوونما جو حیوانات تک کے لئے اس آسانی سے میسر آجاتا ہے، انسان کو اس سامان کے حصول کے لئے بھی جانکاہ مشقتوں سے گزرنا پڑے گا۔ (فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقَىٰ) آدم جنت کی زندگی کھو بیٹھا۔ اور اسے ان تمام مشقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اب ان مشقتوں سے بچنے کا طریقہ کیا ہے؟ (فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ) جو اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کا اتباع کرے گا تو نہ تو اس کی محنت رائیگاں جائے گی اور نہ ہی وہ مشقت میں پڑے گا یعنی اُسے بھوک اور پیاس تشنگی اور خستگی کے مصائب سے نجات مل جائے گی۔ اس کے برعکس:-

وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ (۲۰/۱۲۴)

جو میرے ذکر (قوانین) سے اعراض برتے گا تو اس کی معیشت تنگ کر دی جائے گی اور زندگی کے متوازن دور میں وہ بالکل بے سروسامان رہ جائے گا۔

یعنی قوانینِ الٰہیہ کا لازمی نتیجہ خوش حالی اور اسبابِ معیشت کی فراوانی ہے۔ اس کے برعکس ذکرِ الٰہی سے اعراض اور روگردانی کا نتیجہ روزی کی تنگی ہے۔

اس بیان سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ "جنت کی زندگی" سے مراد نوعِ انسانی کی زندگی کا وہ دور ہے جس میں سامانِ رزق کی فراوانیاں تھیں یعنی وہ دور جس میں ہنوز اس کی تمدنی زندگی کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ علمائے علم الانسان (Anthropologists) کا بیان ہے کہ زمانہ قبل از تمدن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ انسان ملکیت کے لفظ سے ناآشنا تھا۔ جہاں سے جس کا جی چاہتا تھا سامانِ زیست لے لیتا تھا۔ اس کے بعد اس کی تمدنی زندگی شروع ہوئی جس کا پہلا دور قبائلی زندگی کا تھا۔ یعنی اب نوعِ انسانی مختلف ٹکڑوں میں بٹ کر الگ الگ ہو گئی۔ عربی زبان میں الگ الگ ہونے کو مشاجرت کہتے ہیں۔ اسی کا نام وہ شجر ہے جس کے قریب جانے سے انسان کو روکا گیا تھا۔ اس مشاجرت کا نتیجہ کیا ہوا؟ ارض (سامانِ معیشت یا رزق کے سرچشمے) مختلف لوگوں نے اپنی اپنی ملکیت میں لے لئے اور اس طرح وہی سامانِ زیست جو اس سے پہلے اس طرح بلاتحدید فراوانی سے ملتا تھا، اس کے حصول کے لئے مشقت اٹھانی پڑ گئی۔

اب ایک قدم اور آگے بڑھئے تحفظِ خویش (preservation of self) زندگی کا اولیں تقاضا ہے۔ کوئی مرنا نہیں چاہتا۔ زندگی کا دارومدار سامانِ رزق پر ہے اس لئے انسانی عقل کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ہر فرد زیادہ سے زیادہ سامانِ رزق اپنے لئے سمیٹ لے۔ اسی سے انفرادی زندگی کی وہ افراتفری شروع ہوتی

ہے جو انسانی معاشرہ کو جہنم بنا دیتی ہے۔ حیوان صرف اپنا پیٹ بھرنا جانتا ہے لیکن انسان کا پیٹ کبھی بھرتا ہی نہیں۔ وہ سمیٹتا چلا جاتا ہے۔ سمیٹتا چلا جاتا ہے تاآنکہ اسے موت آجاتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر بہت سے انسانوں نے ایک ہی جگہ رہنا ہو اور ان میں سے ہر ایک اپنے لئے زیادہ سے زیادہ سمیٹنا شروع کر دے تو اس سے معاشرہ میں سخت ناہمواریاں پیدا ہونا شروع ہو جائیں گی۔ انفرادی عقل کا یہ تقاضا کہ دنیا میں سب کچھ میرے ہی لئے ہونا چاہیئے ابلیس کہلاتا ہے۔ ملائکہ، یعنی کائنات کی قوتیں (جن سے رزق پیدا ہوتا ہے) انسان کے تابع فرمان ہیں۔ وہ سب اس لئے سرگرم عمل ہیں کہ انسان کو نشوونما کا سامان ملتا رہے۔ وہ سب اس کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ لیکن اس کی اپنی ہوس ہے کہ اس کی اجتماعی زندگی کے خلاف سرکشی اختیار کرتی ہے۔ وہ اپنے انفرادی مفاد کے مقابلے میں کسی اور مفاد کی کوئی حیثیت نہیں سمجھتی۔ یہ ہے ابلیسی کشمکش۔ یعنی عالمگیر انسانیت کے مفاد اور ہر فرد کے ذاتی مفاد میں تصادم۔

اگر انفرادی مفاد کا دائرہ ایک فرد کی اپنی زندگی تک ہی ہوتا، تو بھی اس کی حد مقرر ہو سکتی تھی۔ لیکن اپنے مفاد کے بعد، انسان اپنی اولاد کے مفاد کا تحفظ شروع کر دیتا ہے اس لئے کہ وہ مرنے کے بعد اپنی اولاد کے ذریعے اپنا نام روشن رکھنا چاہتا ہے اور اس طرح اس حیاتِ جاوید کی ہوس پوری کر لیتا ہے جس سے طبیعی موت نے اسے محروم کر دیا تھا۔ یہ ہے وہ جذبہ جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ ابلیس نے آدم کے کان میں یہ افسوں پھونک دیا کہ وہ اسے زندگی جاوید عطا کر دے گا اور اس کا ذریعہ بتایا اولاد۔ یہ ہے مفہوم اس تمثیلی بیان کا جس میں کہا گیا ہے کہ اس حیاتِ جاوید کے حصول کی تمنا میں ان کے جنسی ترغیبات کے عنوان اُبھر کر سامنے آگئے۔

یہ ہے اس معاشرے کی تصویر جسے انسان نے اپنی تمدنی زندگی کے ساتھ شروع کیا اور جس نے رفتہ رفتہ اسے اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دیا کہ کوئی فرد کسی دوسرے فرد کے قریب نہ رہ سکا۔ ان میں انفرادی مفاد کی (wedges[۱]) اس طرح دراندازی ہوئیں کہ گوشت سے ناخن جدا ہو گیا۔ یہ ہے آدم کا ہبوط۔ اس کا وہ تنزل جس میں یہ حیوانات کی سطح سے بھی نیچے گر گیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ کیا انسان کے لئے اس پستی سے نکلنے کی بھی کوئی صورت ہے؟ قرآن اس کا جواب اثبات میں دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان اپنے اس مقام سے اُبھر کر سطحِ انسانی پر آسکتا ہے اور وہاں سے ارتقائی منازل طے کرتا ہوا "اقطار السمٰوٰتِ والارض" سے بھی آگے نکل سکتا ہے۔

(جیسا کہ ہم سابقہ عنوان میں دیکھ چکے ہیں) قرآن کہتا ہے کہ انسان کی زندگی فقط طبیعی زندگی نہیں۔ زندگی

---

[۱] عداوت کے بنیادی معنی ہیں۔

کی اس سطح تک تو حیوان اور انسان دونوں شریک ہیں۔ انسان کے اندر ایک اور چیز بھی ہے جسے قرآن نے "روحِ خداوندی" (الوہیاتی توانائی) کہہ کر پکارا ہے اور جسے ہماری اصطلاح میں آنا یا خودی یا انسانی ذات (یا I) کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اپنی طبعی ضروریات کا بھی تحفظ کرے۔ لیکن یہی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی ذات کا بھی تحفظ اور استحکام کرے۔ انسان کو حیاتِ جاوید نہ طبعی جسم کی پرورش سے ملتی ہے اور نہ ہی اولاد کے ذریعے سے حیاتِ جاوید ملتی ہے۔ اس کی ذات (خودی) کے استحکام سے۔ قرآن ایک ایسا نظام تجویز کرتا ہے جس میں انسانی جسم کی پرورش بھی بطریقِ اعلیٰ ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کی ذات کا استحکام بھی ہوتا جاتا ہے۔ استحکامِ ذات کے لئے ضروری ہے کہ انسان، اپنے آپ سے آگے بڑھ کر نوعِ انسانی کے مفادِ کُلّی اور عالمگیر ربوبیت کا بھی انتظام کرے۔ اگر انسان اپنے معاشرے کو وحی کے مطابق متشکل کرے تو اس سے اس کی یہ زندگی بھی جنت کی زندگی بن جاتی ہے اور اس کے بعد کی زندگی بھی اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی جاتی ہے، اس طرح انسان، تباہی اور بربادی (Annihilation) کے عذاب سے بے خوف ہو جاتا ہے۔ (لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ)

انسانی عقل کا کام یہ ہے کہ وہ اس کے فیصلوں کو بروئے کار لانے کے لئے اسباب و ذرائع فراہم کرتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جس فیصلے کو ہم انسان کا اپنا فیصلہ کہتے ہیں وہ فیصلہ کس کا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کے اندر ایک تو اس کی جبلّت (Instinct) کے تقاضے ہیں۔ ان تقاضوں کو بھی انسان ہی کے فیصلے کہا جاتا ہے۔ مثلاً جب مجھے بھوک لگتی ہے تو میں اٹھتا ہوں کہ کہیں سے کچھ کھانے کو لاؤں۔ غذا کا حصول، میرا فیصلہ ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ فیصلہ درحقیقت میری جبلّت کا تقاضا ہے جو میری حیوانی زندگی کی سطح پر ہے۔ میری عقل مجھے یہ بتاتی ہے کہ فلاں جگہ کھانے کا سامان رکھا ہے یا فلاں جگہ پیسے رکھے ہیں جن سے کھانا خریدا جا سکتا ہے۔ عقل کا یہ کام نہیں کہ وہ بتائے کہ وہ کھانا جائز ہے یا ناجائز اور وہ پیسے مجھے لینے چاہئیں یا نہ لینے چاہئیں۔ چونکہ عقل کا کام جبلّت کے تقاضوں کو پورا کرنا ہے۔ اس لئے وہ عقل مجھے بار بار یہی کہے گی کہ اُٹھ اور کھانا لے لے۔ جا اور پیسے لے آ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میرے سامنے ایک اور تقاضا آتا ہے اور وہ یہ کہ وہ کھانا حلال نہیں۔ اس لئے مجھے نہیں کھانا چاہیئے۔ وہ پیسے میرے نہیں اس لئے مجھے نہیں لینے چاہئیں۔ اگر میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ پیسے مجھے چرا لینے چاہئیں تو میرا یہ فیصلہ عقلِ بے باک کے تابع ہو گیا۔ اسے ابلیسی فیصلہ کہیں گے۔ اگر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ نہیں جو کچھ میرے لئے ناجائز ہے مجھے وہ کبھی نہیں لینا چاہیئے تو میرا یہ فیصلہ وحی کے تابع ہے جس نے جائز ناجائز کی تمیز سکھائی ہے۔ اس فیصلے کے بعد میں عقل سے کہوں گا کہ وہ کوئی اور تدبیر سوچے جس سے مجھے حلال و طیب رزق مل سکے۔ اب جس روش پر عقل کام کرے گی اس کے متعلق کہیں گے کہ عقل وحی کی روشنی میں

کام کر رہی ہے - اس کا نام ہے وحی کی اتباع - اگر ہم عقل بے باک کی اتباع کرتے جائیں گے تو میری ساری تگ و تاز اپنے ذاتی مفاد (یا اپنی اولاد کے مفاد) کے تحفظ تک محدود رہے گی اور اس میں جائز و ناجائز کا کوئی سوال پیدا نہیں ہو گا۔ لیکن اگر ہم اسی عقل کو وحی کے تابع چلائیں گے تو اس سے تمام نوعِ انسانی کے مفاد کا تحفظ ہو گا اور انسانی جسم کے ساتھ ساتھ انسانی ذات کا استحکام بھی ہوتا جائے گا۔ پہلی روش "آدم" کو جنت سے نکلوا دیتی ہے اور دوسری روش اسے پھر سے جنت میں داخل کر دیتی ہے - یہ ہے قصۂ آدم کی روئیداد اور انتہا۔

تصریحاتِ سابقہ سے یہ حقیقت سامنے آگئی کہ سجدۂ ملائکہ اور انکارِ ابلیس وغیرہ کے تذکرہ میں آدم سے مراد خود انسان ہے کوئی خاص فرد (individual) نہیں۔ اور انسانوں کی ہر دو اصناف ذکور و اناث کا بیان ہے اس لئے آدم درحقیقت نمائندۂ آدمیت ہے نہ کہ کوئی خاص فرد۔

قرآن کریم میں البتہ ایک مقام پر آدم کا لفظ اس اسلوب سے بھی آیا ہے جو "فرد واحد" کے مفہوم کا حامل ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۙ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۚ (۳/۳۳-۳۴)

یقیناً اللہ نے آدم اور نوح اور آلِ ابراہیم اور آلِ عمران کو (ان کی ہم عصر) اقوام پر فضیلت دی - ان میں سے ایک دوسرے کی نسل (میں سے) تھے۔ اور اللہ (سب کچھ) سننے والا۔ جاننے والا ہے۔

نبوّتِ آدم یہاں آدم کا ذکر حضرت نوح کے ساتھ آیا ہے جس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ اس سے مفہوم کوئی خاص فرد ہے جو غالباً نبی تھا۔ اگرچہ اِصْطَفٰی کا لفظ قرآن کریم میں غیر نبی کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ حضرت مریمؑ کے متعلق فرمایا ہے :-

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ (۳/۴۲)

اور جب فرشتوں نے کہا کہ اے مریم! بے شک اللہ تجھے برگزیدہ اور مطہر بنانے والا ہے اور تجھے تمام اقوام کی عورتوں پر بزرگی عطا کرنے والا ہے۔

اور خود امتِ محمدیہ کے متعلق ہے :-

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ۚ (۳۵/۳۲)

پھر ہم نے ان لوگوں کو کتاب کا وارث بنا دیا، جنہیں اپنے بندوں میں سے برگزیدہ کیا تھا (پھر بعد میں ان کی یہ حالت ہو گی کہ) ان میں ایسے لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنے آپ پر زیادتی کی۔ اور ان میں سے (دوسرا گروہ)

میانہ روی اختیار کرنے والا اور (تیسرا گروہ) نیکیوں میں سبقت کرنے والا اور یہ اللہ کا بہت بڑا فضل ہے۔

لیکن سورۂ آل عمران کی متذکرۂ بالا آیت (۳/۳۳) میں چونکہ آدم کا ذکر نوحؑ کے ساتھ آیا ہے اور دونوں کے لئے اِصْطَفیٰ کا لفظ استعمال ہوا ہے اس لئے گمانِ غالب ہے کہ یہ آدمؑ نبی تھے۔ اگرچہ قرآن کریم میں اس کی تائید میں کوئی نص صریح موجود نہیں ہو سکتا ہے کہ آدمؑ کسی نبی کا بھی نام ہو جس کی ذریت کے متعلق سورۂ مریم میں ہے:۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ مِن ذُرِّيَّةِ آدَمَ ...... عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمَٰنِ خَرُّوا سُجَّدًا وَبُكِيًّا (۱۹/۵۸)

یہ ہیں وہ لوگ (یعنی جن کا تذکرہ سابقہ آیات میں گزر چکا ہے) جو انبیاء میں سے ہیں۔ جن پر اللہ نے انعام کیا۔ آدم کی نسل میں سے اور ان کی نسل سے جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ کشتی میں سوار کیا تھا۔ نیز ابراہیم اور اسرائیل کی نسل سے۔ اور ان گروہوں میں سے جنہیں ہم نے راہِ راست دکھائی اور منتخب کر لیا، یہ وہ لوگ ہیں کہ، جب خدا کے احکامات انہیں سنائے جاتے تھے تو (بے اختیار) سجدہ میں گر جاتے تھے۔ اور ان کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی تھیں۔

لیکن جو قرآنی تصریحات گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہیں ان کی روشنی میں یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ سجدۂ ملائکہ وغیرہ کے قصہ کا آدم ایک فرد نہیں ہے۔ یہ خود انسان کی سرگزشت ہے جسے قصے کے تمثیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اور اس تمثیل میں آدم کا لفظ غالباً اس رعایت سے لایا گیا ہے کہ انسانی ہیئت اجتماعیہ کے اولیں مراحل میں جن کا تعارف قرآن کریم نے کرایا ہے۔ آدم نامی کسی شخصیت کو ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ لیکن اس تمثیل میں اس شخص کی ذات مراد نہیں ہے۔ علاوہ دیگر امور، ایک نبی سے حکم خداوندی کی ایسی کھلی ہوئی خلاف ورزی ممکن نہیں جیسی اس تمثیل میں مذکور ہے۔ اور ابلیس اللہ کے بندوں پر کبھی غلبہ نہیں پا سکتا۔ سورۂ حجر میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ارشاد ہے:۔

إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِينَ (۱۵/۴۲ نیز ۱۷/۶۵)

یقیناً میرے بندوں پر تجھے (کبھی) غلبہ حاصل نہیں ہوگا (صرف ان پر ہوگا جو) راستہ بھٹک کر تیری اتباع کرنے لگیں گے۔

لہٰذا اگر قصۂ زیر نظر کے آدم کوئی نبی تھے تو انہیں ابلیس کبھی نہیں پھسلا سکتا تھا۔ اس لئے تصریحاتِ قرآنی کے مطابق جنت سے نکلنے والا آدم، کوئی خاص فرد نہیں تھا۔ بلکہ انسانیت کا تمثیلی نمائندہ تھا جس کی ذریت سے مراد تمام نوعِ انسانی ہے نہ کہ کسی فردِ خاص کی نسلی اولاد۔ یہی وہ نوعِ انسانی ہے جو ابلیسی قوتوں کے ساتھ قیامت تک کے لئے حریفانہ کشمکش میں ستیزہ کار ہے۔

قَالَ أَرَأَيْتَكَ هَٰذَا الَّذِي كَرَّمْتَ عَلَيَّ لَئِنْ أَخَّرْتَنِ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَأَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهُ إِلَّا قَلِيلًا (۱۷/۶۲)

(ابلیس نے کہا) کہ ذرا اس پر غور تو فرما کہ تو نے اس (حقیر) ہستی کو مجھ پر بڑائی دیدی ہے۔ اگر تو مجھے قیامت تک کے لئے مُہلت دیدے تو میں اس کی ناک میں نکیل ڈال کر اپنے لئے پھیر دوں گا۔ اور اس سے بہت تھوڑے لوگ بچ سکیں گے۔

ان قرآنی اشارات سے مترشح ہوتا ہے کہ نوعِ انسانی کو جب ہدایتِ آسمانی کی ضرورت ہوئی تو اس سلسلہ کی ابتدا اس شخصیت سے کی گئی جسے سورۂ آل عمران کی مذکورۂ صدر آیت (۳/۵۹) میں آدم کہا گیا ہے۔ چونکہ یہ انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کے اولیں نمایندہ تھے اس لئے انسان کی تمثیلی داستان میں نوعِ انسانی کی نمائندگی آدم ہی کے نام سے کی گئی۔ لیکن اس سے مراد آدم نامی کوئی فردِ خاص نہیں۔ اس تمثیلی داستان کے سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ ذہن سے اس تصور کو نکال دیں کہ یہ کسی سچ مچ کے واقعہ کا بیان ہے۔ یہ بیان (یعنی تمثیل) نہ کسی خاص زمانہ سے متعلق ہے نہ کسی خاص مقام سے۔ یعنی یہ نہیں کہ آج سے پانچ دس ہزار سال پہلے اس زمین پر، یا کہیں آسمانوں پر۔ اس قسم کا کوئی واقعہ ہوا تھا۔ ایسا نہیں بلکہ اس قصہ میں انسانی خصوصیات کو استعارہ کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے۔ (جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے اس قصے میں) ملائکہ سے مراد کائنات کی قوتیں ہیں جنہیں خاص قوانین کے تابع سرگرمِ عمل رکھا گیا ہے ان قوانین کا نام قوانینِ فطرت (Laws of nature) ہے ان قوانین کے علم سے انسان ان تمام قوتوں سے اپنے منشار کے مطابق کام لے سکتا ہے۔ یہ سجدۂ ملائکہ ہے۔ پھر اس زندگی کو جس میں انسان نے ہنوز "میری اور تیری کی تفریقات پیدا نہیں کی تھیں اور جس میں ہر فرد جہاں سے جی چاہتا پیٹ بھر کر کھا پی سکتا تھا۔ جنت کی زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے جو انسانی تمدن سے پہلے کی زندگی تھی۔ اس کے بعد ایک طرف شعورِ ذات پیدا ہوا۔ اور دوسری طرف مدنیت کی زندگی اختیار کرنے سے باہمی مفاد کا تصادم شروع ہو گیا۔ عقلِ حیلہ جو نے ہر فرد (یا ہر گروہ) کے دل میں اس کے اپنے مفاد کے تحفظ اور اس کی طبیعی زندگی کے بقا کا جذبہ اُبھارا۔ یہ فریبِ ابلیس ہے، اور اس کشمکش کی زندگی، ہبوطِ آدم۔ اس کشمکش کی زندگی میں متصادم قوتوں پر غالب آنے کے لئے وحیِ آسمانی کی تائید و نصرت کی ضرورت ہے۔ یعنی علم و عقل کی رو سے کائنات کی تمام قوتوں کو مسخر کیا جائے (کہ اسی خصوصیت کی بنا پر آدم مسجودِ ملائک قرار پایا تھا۔) اور پھر ان تمام قوتوں کو وحیِ آسمانی کی روشنی میں کام میں لایا جائے تاکہ اس سے نہ صرف طبیعی زندگی عزت و تکریم سے گزرے بلکہ بقائے ذات سے وہ حیاتِ جاوید حاصل ہو جس کے حصول کے لئے انسان نے عقلِ بےباک (ابلیس) کا فریب کھایا تھا۔ یہ وہ اندازِ زندگی ہے جس میں انسانی ذات صحیح نشوونما پا کر (جس کا ذریعہ عالمگیر ربوبیت ہے) حیاتِ جاوید کے قابل بن جاتی ہے۔ اسے جنت کی زندگی کہا جاتا ہے۔ یہ اُن اعمال کی بدولت ملتی ہے، جو انسان میں بقائے دوام کی صلاحیت پیدا کر دیں۔ یہ ہے انسان کا تمثیلی بیان جسے قصۂ آدم کی شکل میں بیان کیا گیا ہے تاکہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجائے۔

خلیفہ فی الارض کا مفہوم

جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں قصہ آدم کی ابتدا ان الفاظ سے ہوئی ہے۔ اِذْ قَالَ رَبُّكَ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً اس میں لفظ خلیفہ تشریح طلب ہے۔ خلیفہ۔ خلف سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں پیچھے آنا۔ لہذا خلیفہ کے معنی ہیں پیچھے آنے والا۔ جانشین۔ (successor) اور خلافت کے معنی ہیں جانشینی (succession) خلیفۃ الرسول کے معنی ہیں رسول کا جانشین۔ استخلاف کے معنی ہیں جانشین بنانا۔ قرآن کریم میں قوم عاد کے متعلق آیا ہے :-

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ ...... (۷/۶۹)

...... خدا کا یہ احسان یاد کرو کہ اس نے تمہیں قوم نوح کے بعد ان کا جانشین (خلیفہ) بنایا۔

قوم عاد کے بعد قوم ثمود کے متعلق فرمایا :-

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ (۷/۷۴)

اور (وہ وقت) یاد کرو جب خدا نے تمہیں قوم عاد کے بعد ان کا جانشین (خلیفہ) بنایا۔

کشتی نوح میں جو لوگ محفوظ و مصئون رہے تھے وہ ان کے جانشین تھے جو غرق ہو گئے تھے۔

فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِى الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ○ (۱۰/۷۳)

اس پر بھی لوگوں نے (نوح کو) جھٹلایا۔ پس ہم نے اسے اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ کشتی میں سوار تھے (طوفان سے) بچا لیا اور (غرق شدہ قوم کا) جانشین بنایا اور جن لوگوں نے ہماری نشانیاں جھٹلائی تھیں ان سب کو غرق کر دیا۔ تو دیکھو! ان لوگوں کا کیا حشر ہوا جو (انکار و سرکشی کے نتائج سے) آگاہ کرائے گئے تھے۔

جسد فرعون کے متعلق فرمایا کہ اسے (مصر کے نہ خانوں میں) اس لئے محفوظ رکھ دیا گیا تھا کہ وہ اس کے بعد آنے والوں کے لئے آیہ عبرت ہو۔ اس کے لئے بھی خلف کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً .... (۱۰/۹۲)

پس ہم آج تیرے جسم کو (سمندر کی موجوں سے) بچا لیں گے۔ تاکہ ان لوگوں کے لئے جو تیرے بعد آنے والے ہیں نشانی ہو۔

رات اور دن کی گردش دولابی کے متعلق فرمایا :-

وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ○ (۲۵/۶۲)

اللہ کی ذات وہ ہے جس نے دن اور رات کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے والا بنایا (اس میں نشانی ہے) اس کے لئے جو (رہنمائے قوانین کی) یاد تازہ رکھنا چاہتا ہے۔ یا شکر گزار بننا چاہتا ہے۔

یعنی ایک کے بعد دوسرا آتا ہے۔ سورہ حدید میں ہے:

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ (۵۷/۷)

ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر۔ اور جن چیزوں میں اللہ نے تمہیں دوسروں کا جانشین بنایا ہے انہیں فائدہ عامہ کے لئے کھلا رکھو۔

جب حضرت موسیٰ کوہ طور پر تشریف لے گئے تو اپنے بھائی حضرت ہارون کو اپنا جانشین بنا گئے۔

..... وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ۝ (۷/۱۴۲ نیز ۷/۱۵۰)

.... اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ تم میرے بعد قوم میں میرے جانشین بن کر رہو۔ اور دیکھو سب کام درستی سے کرنا اور خرابی کرنے والوں کی راہ نہ چلنا۔

حضرات انبیاء کرام کے بعد ایسے لوگ آئے جنہوں نے تعلیم کتاب کو ضائع کر دیا۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا۝ (۱۹/۵۹)

پھر اُن کے بعد ایسے ناخلف ان کے جانشین ہوئے جنہوں نے صلوٰۃ (کی حقیقت) ضائع کر دی اور اپنی نفسانی خواہشات کے پیچھے پڑ گئے۔ سو قریب ہے کہ اُن کی سرکشی ان کے آگے آئے۔

دوسرے مقام پر ہے۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا۔ الخ (۷/۱۶۹)

پھر ان کے بعد ایسے ناخلف ان کے جانشین ہوئے۔ اور کتاب اللہ کے وارث ہوئے جو دین فروشی کر کے اس دنیائے حقیر کی متاع ربلا حاصل لے لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کی معافی تو ہمیں ضرور مل ہی جائے گی۔ الخ

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ خلیفہ کے معنی کسی کے پیچھے آنے والے یعنی جانشین کے ہیں۔ لیکن جب کوئی قوم یا جماعت کسی ماسبق قوم یا جماعت کی جانشین ہوتی ہے تو اس میں تمکن و تسلط بھی داخل ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جانشینی سے مفہوم ہی یہ ہے کہ کسی قوم کو قوم ماسبق کی جگہ متمکن و مسلط کر دیا جائے۔ چنانچہ سورۂ انعام میں ہے:

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ۝ (۶/۱۳۴)

تیرا پروردگار بے نیاز اور صاحب رحمت ہے۔ اگر وہ چاہے تو اپنے قوانین مشیت کے مطابق تمہیں اٹھا لے

اور جسے چاہے (اسی قانون کے مطابق) تمہارے بعد تمہارا جانشین بنا دے۔ جس طرح اس نے ایک دوسری قوم کی نسل سے تمہیں اٹھا کھڑا کیا۔

یعنی وہی قانون استبدال و استخلاف جسے دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ اَیُّهَا النَّاسُ وَ یَاْتِ بِاٰخَرِیْنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰی ذٰلِكَ قَدِیْرًا ۝ (۴/۱۳۳)

اے نوع انسانی! اگر وہ چاہے تو تمہیں اٹھا لے اور (تمہاری جگہ) کسی اور کو لے آئے۔ اور اللہ اس پر پوری پوری قدرت رکھتا ہے

اسی کو سورۂ توبہ میں یوں بیان فرمایا گیا ہے۔

اِلَّا تَنْفِرُوْا یُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ۙ۬ وَّ یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ وَ لَا تَضُرُّوْهُ شَیْـًٔا ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ (۹/۳۹)

اگر تم (جہاد کے لئے) قدم نہ اٹھاؤ گے تو یاد رکھو وہ تمہیں ایسے عذاب میں ڈالے گا جو دردناک ہوگا۔ اور تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو لے آئے گا اور تم (اس طرح) اللہ کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکو گے۔ (اپنا ہی بگاڑو گے) اور اللہ ہر بات پر قادر ہے۔

غلبہ و تسلط سے جانشینی لہٰذا آدم (نوع انسانی) کے خلیفہ فی الارض سے مفہوم اپنے سے پہلی مخلوق کی جانشینی، اور تسلط و تمکن اور قوت و غلبہ کے ساتھ جانشینی ہے۔ حضرت داؤدؑ کے متعلق فرمایا،

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ ..... الخ (۳۸/۲۶)

اے داؤد! ہم نے تمہیں ملک میں خلیفہ (حاکم) بنایا ہے۔ سو لوگوں میں حق کے ساتھ حکومت کرو (ان کے معاملات کے فیصلے قانون خداوندی کے تابع کرو)

سورۂ یونس میں ہے۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝ (۱۰/۱۴)

پھر ہم نے تمہیں ان (امم گزشتہ) کے بعد ملک میں خلیفہ (حاکم) بنایا ہے تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو۔

کس کا جانشین یا خلیفہ بنایا؟ اس کی تشریح اس سے پہلی آیت میں ہے۔

وَ لَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ وَ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ وَ مَا كَانُوْا لِیُؤْمِنُوْا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْقَوْمَ الْمُجْرِمِیْنَ ۝ (۱۰/۱۳)

اور ہم سے پہلے کتنی ہی قومیں گزر چکی ہیں کہ جب انہوں نے ظلم کی راہ اختیار کی تو ہم نے انہیں (ان کے اعمال کی پاداش میں) ہلاک کر دیا۔ اور اُن کے رسول اُن کے پاس روشن دلیلوں کے ساتھ آئے۔ مگر اس پر بھی وہ ایمان پر آمادہ نہ ہوئے تو دیکھو ہم اس طرح مجرمین کو ان کے جرائم کی سزا دیتے ہیں۔

(خلیفہ فی الارض کے لئے نیز دیکھئے ۶/۱۶۶ ۔ ۲۷/۶۲ ۔ ۳۵/۳۹)

استخلاف کے معنی حکومت و مملکت

بنی اسرائیل کے استخلاف کی حیات انگیز اور بصیرت افروز حکایات قرآن کریم کے مختلف مقامات پر پھیلی ہوئی ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے:

قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ...... يَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝ (۷/۱۲۸-۱۲۹)

موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ قانونِ خداوندی سے مدد مانگو اور (راہ جہاد میں) جمے رہو۔ بلاشبہ زمین خدا کی ملکیت ہے وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے (قانون مشیت کے مطابق) اس کا وارث بنا دیتا ہے اور انجام کار متقیوں ہی کے لئے ہے۔ انہوں نے کہا کہ تمہارے آنے سے پہلے ہمیں (بڑی بڑی) اذیتیں پہنچیں اور اب تمہارے آنے کے بعد بھی ستائے جا رہے ہیں۔ موسیٰ نے کہا۔ قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تمہیں ملک میں اس کا جانشین بنائے پھر دیکھے (اس جانشینی کے بعد) تمہارے کام کیسے ہوتے ہیں۔

یہی وہ استخلاف ہے جسے ملتِ اسلامیہ کے لئے ایمان و اعمالِ صالحہ کا فطری نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ ......
وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (۲۴/۵۵)

اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائیں اور اعمال صالح کریں۔ وعدہ کر رکھا ہے کہ انہیں زمین کی حکومت (استخلاف) عطا کرے گا۔ جیسے ان سے پہلے کی قوموں کو حکومت عنایت کی تھی اور ان کے لئے ان کا وہ نظام زندگی (دین) متمکن (و محکم) کر دیگا جو اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے اور (اس طرح) ان کے خوف کے بعد ان (کی حالت غمگینی) کو امن سے بدل دے گا۔ (ان کی کیفیت یہ ہو گی کہ) وہ میرے قوانین کے سوا کسی اور کی محکومیت اختیار نہیں کریں گے۔ اور (اس میں) کسی اور کو میرے ساتھ شریک نہیں کریں گے اور جو کوئی اس کے بعد (اس روشِ زندگی سے) انکار کرے گا تو وہ فاسقین میں سے ہو گا۔

تسخیر ارض و سماوات

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ خلافتِ آدم سے مفہوم کیا ہے؟ تمام سابقہ مخلوق کی قوتوں کا وارث قوائے ملکیہ کا مسجود اور جملہ اشیائے کائنات کا مخدوم۔ جو کچھ زمین میں ہے سب اس کے لئے قوانین کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ؕ وَیُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ (۲۲/۶۵)

کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ اللہ نے کس طرح زمین کی تمام چیزیں تمہارے لئے مسخر کر دی ہیں؟ جہاز کو دیکھو! کس طرح وہ اس کے حکم سے سمندر میں تیرتا چلا جاتا ہے۔ پھر اس نے کس طرح فضائی کروں کو تھامے رکھا ہے کہ وہ زمین پر نہ گرنے پائیں۔ مگر جب اس کا اذن ہو بیشک اللہ انسانوں کے لئے بڑا رؤف و رحیم ہے۔

بڑے بڑے کف بدہاں سمندر اور ان کی چھاتی کو چیر دینے والے جہاز۔ عظیم الجثہ حیوانات۔ سب کائناتی قوانین کے تابع ہیں تاکہ انسان ان سے کام لے سکے۔

لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَیْتُمْ عَلَیْهِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ ۝ (۴۳/۱۳ نیز ۲۲/۳۷)

تاکہ تم ان پر اچھی طرح سے سواری کر سکو اور پھر اپنے پروردگار کی نعمت کو یاد کرو۔ جب اس پر جم کر بیٹھ جاؤ اور کہو کہ اللہ کی ذات بزرگ و برتر ہے جس نے یہ سب کچھ) ہمارے لئے مسخر کر دیا۔ ورنہ ہم ایسا کبھی نہ کر سکتے (ہم میں یہ قدرت کہاں تھی۔ یہ سب اسی کی عطا فرمودہ ہے۔

یہ سب کچھ پاؤں کے نیچے، اور سر کے اوپر محیر العقول اجرام فلکی۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ...... وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ۝ (۱۴/۳۲-۳۳)

یہ اللہ ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا۔ اور (زمین پر) اوپر سے پانی برسایا۔ جس سے طرح طرح کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔ جو تمہارے لئے غذا کا سامان ہیں۔ اور جہاز تمہارے لئے مسخر کر دیئے کہ اس کے حکم سے (یعنی اس کے قانون کے مطابق) سمندر میں چلنے لگیں۔ نیز دریا بھی تمہارے لئے مسخر کر دیئے۔ اسی طرح سورج اور چاند بھی مسخر کر دیئے ہیں کہ ایک خاص آئین کے مطابق برابر چلے جا رہے ہیں۔ اور تمہارے لئے رات اور دن بھی مسخر کر دیئے۔

غور فرمائیے! یورپ کے سائنس داں ایک عمر کی کد و کاوش کے بعد ہنوز اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مریخ والوں سے سلسلہ گفت و شنید قائم کر لینا امکانات میں سے ہے لیکن قرآن کریم آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پیشتر اعلان فرما رہا ہے کہ مریخ والوں سے باتیں کرنا تو ایک طرف تمام اجرام فلکی، شموس و اقمار انسان کے لئے مسخر کر دیئے گئے ہیں۔ جب ہی تو روح ارضی نے آدم کا استقبال کرتے ہوئے یہ زمزمہ تہنیت و تبریک پیش کیا تھا کہ

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں یہ گنبد افلاک یہ خاموش فضائیں

یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں

آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں

جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں

اے پیکرِ گل، کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

صرف دریا اور پہاڑ اور سورج اور چاند ہی نہیں بلکہ ارض و سموٰت میں جو کچھ ہے۔ سب انسان کے لئے مسخر کر دیا گیا۔

اَللّٰہُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَکُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْکُ فِیْہِ بِاَمْرِہٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِہٖ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ۚ وَسَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْہُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ۝ (۴۵/۱۲-۱۳)

اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے سمندر کو مسخر کر دیا تاکہ جہاز اس کے حکم سے (یعنی اس کے ٹھہرائے ہوئے قانون کے ماتحت) چلتے جائیں۔ اور اس طرح تم رزق کی تلاش کرو۔ اور یوں اس کے سپاس گزار بندے بنو۔ اور ارض و سما میں جو کچھ ہے اس نے سب تمہارے لئے مسخر کر دیا۔ یقیناً اس میں غور و فکر کرنے والی قوم کے لئے بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔

ظاہر و باطن کی نعمتیں

اس سے بھی بلکہ دو قدم آگے۔ ظاہر و باطن کی تمام نعمتیں۔ انفس و آفاق کی تمام قوتیں اس کے لئے مسخر کر دی گئی ہیں۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَہٗ ظَاہِرَۃً وَّبَاطِنَۃً ؕ (۳۱/۲۰)

کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے اللہ نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ اور ظاہر و باطن کی تمام نعمتیں تم پر مکمل کر دیں۔

غور فرمائیے! ممکناتِ انسانی کی یہ حدود فراموش وسعتیں کسی کے حیطۂ تصور میں بھی آسکتی تھیں؟ یہ تھا ناموسِ ازل کا امین۔ کائنات کا فرمانروا۔ آدم، جو پیکرِ آب و گل کی صورت میں ملائکہ کے سامنے آیا۔ اور ان کا مسجود قرار پایا۔ اُس وقت کیا سمجھ میں آسکتا تھا کہ اس ہیولائے خاکی میں امکانات کی کون سی بجلیاں سمیٹ کر رکھ دی گئی ہیں۔ ساجد و مسجود کے اس فرق کو زبانِ شعر میں یوں سمجھئے کہ

کجا نورے کہ غیر از قاصدی چیزے نمی داند

کجا خاکے کہ در آغوش دارد آسمانے را

ظاہر اور باطن کی نعمتوں کا مطلب ایک تو یہ ہو سکتا ہے کہ وہ نعمتیں جو کائنات میں ابھری ہوئی سامنے رکھی ہیں۔ اور وہ نعمتیں بھی وہ کائنات کے امکانی پردوں میں چھپی ہوئی ہیں اور جنہیں انسان علوم سائنس کے ذریعے کھینچ کر باہر لا سکتا ہے۔ لیکن اس سے دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کائنات کی تمام قوتیں اور اس کے ساتھ ہی خود انسان کی تمام صلاحیتیں جو اس کے اندر مضمر ہیں اور جو مناسب تربیت سے مشہود ہوتی ہیں۔ ان قوتوں کا مشہود ہونا اس نظام کے اندر ہی ممکن ہے جو وحی کے ذریعے متشکل ہوتا ہے۔ یہی ہے وہ ضابطۂ حیاتِ انسانی جو انسانیت کی نشو و ارتقاء کے ساتھ ساتھ حضراتِ انبیاء کرامؑ کی وساطت سے ملتا رہا اور بالآخر حضور خاتم النبیین (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے عہدِ سعادت عہد میں کامل و مکمل ہو کر قیامت تک کے لئے محفوظ کر دیا گیا۔

مردِ مومن اور حکیمِ افرنگ کا فرق

یہ ہے وہ مقام جہاں ایک مردِ مومن، حکیمِ افرنگ سے آسمانوں دور ہوتا ہے۔ مغرب کا مادہ پرست، تسخیرِ ارض و سمٰوٰت کو مقصود بالذات سمجھتا ہے اور اس متاعِ گراں بہا کو اپنی مرضی کے مطابق صرف کرتا ہے۔ جس کا نتیجہ،

جز "یسفک الدماء" و "خصیم مبین" نبود

وہی آگ کی چنگاریاں اور خون کے چھینٹے، جنہیں فرشتوں کی نگاہوں نے خمیرِ آدم میں بھانپا تھا۔ اور جن کی وجہ سے خدا کی یہ وسیع و عریض زمین، عدمِ اطمینان اور فقدانِ سکون کا جہنم بن رہی ہے۔ لیکن ایک مردِ مومن ارض و سمٰوٰت کی اس متاعِ عظیم کو اپنی ملکیت نہیں سمجھتا۔ بلکہ خدا کی طرف سے دی ہوئی امانت سمجھتا ہے جسے وہ تمام نوعِ انسانی کی عالمگیر نشو و نما کے لئے وحی کے مطابق صرف کرتا ہے۔ وہ اس میں اپنے ذاتی مفاد کو مقدم نہیں رکھتا بلکہ اس مفاد کو وحی کے قائم کردہ نظام کے ماتحت رکھتا ہے۔

بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (۲/۱۱۲)

ہاں! جس نے اپنی خواہشات کو خدا (کے قوانین) کے سامنے جھکا دیا اور اس طرح معاشرہ میں توازن پیدا کر دیا تو اس کا اجر اس کے رب کے ہاں ہے (کیا اجر؟ کہ) ان لوگوں کو کسی قسم کا خوف اور غم نہیں ہوگا۔

خلیفہ کا مفہوم آپ کے سامنے آگیا۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں عام طور پر جو عقیدہ مروّج ہے کہ خدا نے آدم کو اپنا خلیفہ بنایا، یعنی آدم خلیفۃ اللہ فی الارض ہے اس عقیدے کی کوئی سند قرآنی سند نہیں اور نہ ہی

نیابت

ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) خلیفہ کے معنی ہیں کسی کا جانشین (Successor) اس لئے خدا کا جانشین (Successor) ہونا نہ صرف مضحکہ خیز بلکہ گمراہ کن تصور ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفۃ الرسول (یعنی رسول اللہ کے جانشین تھے) خلیفۃ اللہ (خدا کے جانشین) نہیں تھے۔ اگر خلیفہ کے معنی نائب

یا قائم مقام بنے جائیں تو بھی انسان خدا کا نائب نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ نیابت اس کی ہو سکتی ہے جو خود موجود نہ ہو۔ خدا ہر جگہ اور ہر مقام پر موجود ہے اس لئے اس کا نائب (Representative) ہونا کیا معنی؟ اسی نیابت کے غلط تصور نے ہمارے ہاں یہ عقیدہ پیدا کر دیا کہ خدا نے اپنے اختیارات انسان کو تفویض (Dalegat) کر دیئے ہیں۔ یہ عقیدہ بھی یکسر غلط ہے۔ جو شخص اپنے اختیارات کسی اور کو تفویض (Dalegate) کر دے، وہ اختیارات اس شخص کے پاس باقی نہیں رہتے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ خدا نے اپنے بعض اختیارات انسان کو تفویض کر دیئے ہیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ اختیارات خدا کے پاس نہیں رہے اور وہ ان قوتوں سے عاری ہو گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی حیثیت نہ تو خدا کے خلیفہ (جانشین) کی ہے اور نہ ہی اس کے نائب (Vice-gerant) کی۔ اور نہ ہی خدا نے اپنے اختیارات اسے تفویض کئے ہیں۔ خدا نے انسان کو (ایک محدود پیمانے کے اندر) اختیار و ارادہ دیا ہے۔ اگر وہ اپنے اختیار و ارادے کو وحی کی حدود کے اندر (قوانینِ خداوندی کے مطابق) استعمال کرے تو انسانی معاشرے میں صحیح توازن پیدا ہو جاتا ہے اور اس سے انسانی ذات کی ایسی نشوونما ہو جاتی ہے جس سے وہ زندگی کے مراحل طے کرتا ہوا آگے بڑھ جاتا اور اوپر کو اٹھ جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ ان اختیارات کا استعمال اس طرح نہیں کرتا تو اس کے معاشرے میں ایسی ناہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں جو اسے جہنم بنا دیتی ہیں اور جس میں انسانی ذات کی تمام صلاحیتیں جھلس کر رہ جاتی ہیں۔

اسے پھر دہرا لیجئے کہ انسان دنیا میں کسی سابقہ مخلوق کا (سلسلۂ ارتقا کی سابقہ کڑی کا) جانشین (successor) ہے، خدا کا خلیفہ (جانشین) نہیں ہے۔

باہمی عداوت

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ "ہبوطِ آدم" کے وقت نسلِ انسانی سے کہدیا گیا کہ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ۔ جادۂ حیاتِ ارضی میں تم ایک دوسرے کے باہمی دشمن[1] ہو گے۔ شیطان یہی چاہتا ہے۔ اس کے برعکس ہدایتِ خداوندی کی تعلیم، اتحاد اور مودّت۔ یک جہتی و یک رنگی۔ تمام نوعِ انسانی کی وحدت ہے۔ جو آسمانی تعلیم کا اتباع کریں گے۔ ان میں تحزب و تشیع، اختلاف و تنازع۔ گروہ سازیاں اور فرقہ بندیاں نہیں ہوں گی۔ ان میں باہمی مؤاخات و محبت ہو گی۔ وہ سب متحد اور یک جان ہوں گے۔ لیکن وحی خداوندی سے انحراف اور اتباعِ شیطانی کا نتیجہ؛ باہمی اختلاف، قتل و خونریزی اور فساد و مشاجرت ہو گا۔ چنانچہ قرآنِ کریم نے سورۂ مائدہ میں "آدمؑ کے دو بیٹوں" کا قصہ بیان

---

[1] ابلیس نے بقائے دوام کا جو فریب دیا تھا اس کا لازمی نتیجہ باہمد گر عداوت تھا۔ مزید تشریح وحی کے عنوان میں ملے گی۔ — اس سے یہ مراد نہیں کہ یہ دو بھائی آدم نامی کسی خاص فرد کے دو بیٹے تھے۔ قرآن کریم نے تمام نوعِ انسانی کو بنی آدم کہا ہے۔ ہم آپ سب آدم کے بیٹے ہیں۔ یہ دو افراد قصہ بھی ہم میں سے ہی بنی آدم تھے۔ یا یوں سمجھئے کہ یہ قصہ بھی خود ہمارا ہی نقشہ ہے۔ یعنی انسانی سیرت و کردار کا تمثیلی بیان۔

کیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ قتل کی ابتدا کس طرح باہمی حسد سے ہوتی ہے۔ فرمایا۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ...... فَاُوَارِيَ سَوْاَةَ اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ۚ (۵/۲۷-۳۱)

ان سے آدم کے دو بیٹوں کا قصہ حق کے ساتھ بیان کرو۔ جب انہوں نے اپنی اپنی قربانیاں پیش کیں۔ سو ایک کی قربانی قبول کرلی گئی۔ لیکن دوسرے کی قبول نہ کی گئی (جس کی قربانی قبول نہ ہوئی) اس نے (دوسرے سے کہا) کہ میں یقیناً تجھے قتل کردوں گا۔ دوسرے نے کہا کہ (میرے خلاف جذبۂ انتقام کیسا؟) اللہ فقط متقیوں کی قربانی قبول کرتا ہے۔ اگر تم قتل کے ارادے سے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھانا چاہتے ہو (بڑھاؤ) میں اس ارادے سے تمہاری طرف (پہلے) ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا۔ میں تو اللہ۔ پروردگارِ عالمین کے قانونِ مکافات سے ڈرتا ہوں۔ میں تو یہی چاہوں گا کہ تم میرے قتل کے جرم اور اپنے دوسرے گناہوں کا بوجھ اٹھاؤ) اور اس طرح اہلِ دوزخ میں سے ہو جاؤ۔ اور ظالمین کی یہی سزا ہے۔ پس اس کو اس کے نفس نے اپنے بھائی کے قتل پر آمادہ کر دیا۔ سو اس نے اسے قتل کر دیا اور یوں نقصان پانے والوں میں سے ہوگیا۔ (قتل کرنے کو تو کر دیا لیکن جب غصہ فرو ہوا تو اس واقعہ پر غور کرنے لگا۔ وہ اسی حالت میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اتفاقیہ سامنے ایک کوے کو دیکھا جو زمین کرید رہا تھا۔ اس سے اس کا خیال اس طرف منتقل ہوگیا کہ یہ مجھے یہ بتانا چاہتا ہے کہ مجھے چاہیئے تھا کہ بھائی کی قربانی قبول ہو جانے پر مجھے جس حقارت کا احساس ہوا تھا اسے اسی طرح خاک میں دبا دیتا۔ کس قدر افسوس ہے کہ مجھ سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ میں اس کوے کی مانند ہو جاتا اور اپنے بھائی کی طرف سے جو جذباتِ شنیعہ میرے دل میں پیدا ہوئے تھے انہیں مٹی میں ملا دیتا۔ چنانچہ ان خیالات سے وہ اپنے دل میں بڑا نادم ہوا۔

غور کیجیئے! دل میں حسد کی آگ پیدا ہوئی (اور حسد بھی تقدس اور قربِ الٰہی کا مقدس نقاب لیئے ہوئے) اور اس سے انتقام کی خواہش۔ یہ خواہش اتباعِ نفس (فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ) کی بنا پر تھی۔ اور اتباعِ نفس (بمقابلہ اتباعِ قوانینِ الٰہیہ) باہمی تشتت وانتشار اور جنگ وجدل کی طرف مائل کرتا ہے۔ اس لیئے کہ میزانِ خداوندی میں قتلِ بلا حق تو ایسا جرمِ عظیم ہے کہ ایک فرد کا قتل گویا تمام نوعِ انسانی کا قتل ہے۔

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ...... بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ (۵/۳۲)

اس بنا پر ہم نے بنی اسرائیل کی طرف یہ قانون نازل کیا۔ کہ جو شخص کسی دوسرے شخص کو قتل کر ڈالے بجز اس کے کہ وہ قصاص میں قتل کیا جائے یا فساد فی الارض کے جرم کی سزا میں تو یوں سمجھیئے کہ گویا اس نے تمام نوعِ انسانی کو قتل کر دیا اور جس شخص نے کسی ایک شخص کی جان بچائی تو یوں سمجھیئے کہ گویا اس نے تمام نوعِ انسانی کی

جان بچالی اور یقیناً اُن کے پاس ہمارے پیغمبر کھلے ہوئے احکام لے کر آئے۔ لیکن اس کے بعد بھی ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں (مسرفین ہیں)

سجدہ گزشتہ صفحات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو سجدہ کا حکم دیا۔ اور انہوں نے آدم کو سجدہ کیا اس سے یہ مراد نہیں کہ ملائکہ نے آدم کے سامنے اپنی پیشانی کو زمین پر رکھ دیا۔ سجدہ کے معنی جھکنے کے ہیں۔ لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ اقرار اطاعت کے مفہوم میں بھی استعمال ہوا ہے۔ وہ سجدہ جس میں پیشانی زمین بوس ہو جاتی ہے۔ درحقیقت اقرار اطاعت ہی کی ایک محسوس شکل ہے۔ اس لئے قصۂ آدم میں ملائکہ کے سجدہ سے مراد اقرار اطاعت ہے۔ سورۂ رعد میں ہے:۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ (13/15)

اور آسمانوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب خدا (کے قوانین) کے آگے جھکا ہوا ہے۔ خوشی سے ہو۔ یا مجبوری سے۔ اور (دیکھو) ان کے سائے صبح و شام (کس طرح گھٹتے، بڑھتے اور اِدھر اُدھر ہوتے رہتے ہیں۔ جس سے ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ ایک خاص نظام کے ماتحت واقع ہو رہا ہے)

ظاہر ہے کہ اس سے مفہوم، اطاعت کوشی کا عملی اعتراف و اقرار ہے۔ اس مفہوم کی وضاحت سورۂ نحل میں یوں کر دی گئی:

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝ (16/49-50)

اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اور زمین میں جتنے جاندار ہیں سب اللہ (کے قوانین) کے آگے سربسجود ہیں۔ اور فرشتے بھی وہ (بھی) سرکشی نہیں اختیار کر سکتے۔ وہ اپنے پروردگار سے ڈرتے رہتے ہیں جو ان کے اوپر موجود ہے۔ اور جو کچھ حکم انہیں دیا جاتا ہے اس کی تعمیل کرتے ہیں۔

یہاں سجدہ کا حقیقی مفہوم بالکل واضح ہے۔ سورۂ حج میں ہے:۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ۭ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ۭ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۝ (22/18)

کیا نہیں دیکھتے کہ جو کوئی بھی آسمانوں میں ہے اور جو کوئی بھی زمین میں ہے۔ نیز سورج۔ چاند، ستارے، پہاڑ، درخت۔ چارپائے۔ سب اللہ (کے قوانین) کے آگے سربسجود ہیں۔ اور کتنے ہی انسان بھی؟ ہاں بہت سے انسان ایسے بھی ہیں کہ ان پر عذاب کی بات ثابت ہو گئی اور جس کسی کو اللہ ذلت میں ڈالے تو پھر کوئی نہیں جو اسے عزت دے سکے۔

اللہ جو چاہتا ہے (اپنے قانون مشیت کے مطابق) کرتا ہے۔

ایک دوسرے مقام پر ہے۔

وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ ○ (۵۵/۶)

اور بوٹیاں اور درخت سب اللہ کے قانون کے آگے جھکے ہوئے ہیں

ان تصریحات سے واضح ہے کہ ملائکہ کے سجدے سے مراد اقرار اطاعت ہے۔ یعنی کائناتی قوتیں انسان کے لئے قوانین کی زنجیروں میں جکڑ دی گئی ہیں جن سے یہ اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکتا ہے۔

تورات اور قصہ آدم

بائبل (عہد عتیق) میں بھی قصہ آدم مذکور ہے۔ لیکن اس کی اور قرآن کریم کی بیان کردہ تفاصیل میں جو بین فرق ہے وہ انسانی ہاتھوں سے مسخ شدہ تعلیم اور خالص آسمانی تعلیم کی ایک زندہ شہادت ہے (اور یہ شہادت آپ کو آئندہ اوراق میں اکثر دبیشتر ملے گی۔ سب سے پہلے بائبل میں مذکور ہے کہ:-

"خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا" (تورات۔ کتاب پیدائش۔ ۱/۲۷)

تخلیق انسانی کے متعلق قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ:-

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ○ (۹۵/۴)

یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو بہترین متوازن ہیئت میں پیدا کیا۔

نگارخانۂ کائنات میں انسانی تخلیق بلاشبہ فطرت کا شاہکار ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ خدا نے اسے اپنی صورت پر پیدا کیا اس حسن ازل کو (جس کا تصور بھی حیطۂ انسانی سے باہر ہے) اس کے بلند و بالا مقام سے کھینچ کر بہت نیچے لے آتا ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ یہ ارشاد خداوندی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ تصور ذہن انسانی کی تخلیق ہے جس نے جذبہ خود ستائی سے سرشار ہو کر اتنا بھی نہیں سوچا کہ اپنی نسبت کہاں ملا رہا ہے؟ اور نہ ہی یہ کہ اس عقیدہ سے خدا کے متعلق ذہن انسانی میں کس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ البتہ اگر یہ کہا جائے کہ انسان میں صفات خداوندی کا ایک ادنیٰ سا پرتو پیدا ہوا تو یہ اور بات ہے لیکن اس کے کہنے کا انداز اور ہونا چاہیئے۔

(۲) جنت آدم کے متعلق ہے:-

اور خداوند خدا نے عدن میں پورب کی طرف ایک باغ لگایا اور آدم کو جسے اس نے بنایا تھا وہاں رکھا اور خداوند خدا نے ہر درخت کو جو دیکھنے میں خوشنما اور کھانے میں خوب تھا۔ اور باغ کے بیچوں بیچ حیات کے درخت اور نیک و بد کی پہچان کے درخت کو زمین سے اگایا۔ اور عدن سے ایک ندی باغ کے سیراب کرنے کو نکلی اور وہاں سے تقسیم ہو کر چار سر سے ہزاروں کے بنی۔ پہلی کا نام فیسون جو حویلہ کی ساری زمین کو گھیرتی ہے۔ وہاں

سونا ہوتا ہے اور اس زمین کا سونا اچھا ہے ۔ اور وہاں موتی اور بلور بھی ہیں۔ اور دوسری نہر کا نام جیحون ہے جو کوش کی ساری زمین کو گھیرتی ہے ۔ اور تیسری نہر کا نام دجلہ ہے جو اسور کے پورب جاتی ہے اور چوتھی نہر کا نام فرات ہے (پیدائش ۲ : ۱۱-۱۴)

ظاہر ہے کہ اس جنت کا مقام دجلہ و فرات کے ارد گرد ہے ۔ سو یہ قصہ اسی دنیا کے کسی انسان کا ہو گیا۔ خود ان کی سرگذشت نہ رہی ۔ اور دونوں میں جو فرق ہے ظاہر ہے ۔ قرآن کا اعجاز یہ ہے کہ وہ اس طرح نام اور مقام نہیں بیان کرتا کہ جس سے حقیقت انسانہ محسوس ہونے لگ جائے ۔

(۳) شجر ممنوعہ کے متعلق لکھا ہے :-

اور خداوند خدا نے آدم کو لے کر باغ عدن میں رکھا کہ اس کی باغبانی اور نگہبانی کرے ۔ اور خداوند خدا نے آدم کو حکم دے کر کہا کہ تو باغ کے ہر درخت کا پھل کھا یا کر لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت سے نہ کھانا کیونکہ جس دن تو اسے کھائے گا ضرور مرے گا ۔ (پیدائش ۲ : ۱۵-۱۷)

" نیک و بد کی پہچان " یہی تو وجہ شرف انسانیت ہے ۔ انسان کو اس پہچان سے محروم رکھنا اسے درجۂ انسانیت تک پہنچنے سے روکنا ہے ۔

(۴) آدم کی بیوی کی پیدائش کے متعلق لکھا ہے ۔

اور خداوند خدا نے آدم پر بھاری نیند بھیجی کہ وہ سو گیا اور اس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکالی اور اس کے بدلے گوشت بھر دیا اور خداوند خدا اس پسلی سے جو اس نے آدم سے نکالی تھی ایک عورت بنا کر آدم کے پاس لایا ۔ اور آدم نے کہا کہ اب یہ میری ہڈیوں میں سے ہڈی اور گوشت میں سے گوشت ہے ۔ اس سبب سے وہ ناری کہلائے گی ۔ کیونکہ وہ نر سے نکالی گئی ۔ اس واسطے مرد اپنے ماں باپ کو چھوڑے گا اور اپنی جورو سے ملا رہے گا اور وہ ایک تن ہوں گے ۔ اور وہ دونوں آدم اور اس کی جورو ننگے تھے اور شرماتے نہ تھے ۔ (پیدائش ۲ : ۲۱-۲۵)

اس کے بعد یہ مذکور ہے کہ کس طرح سانپ نے (ابلیس نے نہیں بلکہ سانپ نے) اس عورت کو بہکایا اور اس نے شجر ممنوعہ کا پھل خود بھی کھایا اور اپنے خاوند کو بھی کھلا دیا اس کے بعد :-

اور انہوں نے خداوند خدا کی آواز جو ٹھنڈے وقت باغ میں پھرتا تھا سنی ۔ اور آدم اور اس کی جورو نے آپ کو خداوند خدا کے سامنے سے باغ کے درختوں میں چھپایا ۔ تب خداوند خدا نے آدم کو پکارا اور اس سے کہا کہ تو کہاں ہے وہ بولا کہ میں نے باغ میں تیری آواز سنی اور ڈرا کیونکہ میں ننگا ہوں ۔ اس لئے میں نے اپنے آپ کو چھپایا ۔ اور اس نے کہا کہ تجھے کس نے بتایا کہ تو ننگا ہے ؟ کیا تو نے اس درخت سے کھایا جس کی بابت میں نے تجھ کو حکم کیا تھا کہ اسے نہ کھانا ؟ آدم نے کہا کہ اس عورت نے جسے تو نے میری ساتھی کر دیا مجھے اس درخت سے دیا اور میں نے کھایا

تب خداوند خدا نے عورت سے کہا کہ تو نے یہ کیا کیا؟ عورت بولی کہ سانپ نے مجھ کو بہکایا تو میں نے کھایا۔

(پیدائش ۳/۱۳)

چنانچہ اس جرم کی پاداش میں:۔

اس نے (یعنی خداوند خدا نے) عورت سے کہا کہ میں تیرے حمل میں تیرے درد کو بہت بڑھاؤں گا اور درد سے تو لڑکے جنے گی اور اپنے خصم کی طرف تیرا شوق ہوگا اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا۔ (پیدائش ۳/۱۶)

اور آدم سے کہا کہ:

اس واسطے کہ تو نے اپنی جورو کی بات سنی اور اس درخت سے کھایا۔ جس کی بابت میں نے تجھے حکم کیا کہ اس سے مت کھانا۔ زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی۔ اور تکلیف کے ساتھ تو اپنی عمر بھر اس سے کھائے گا۔ اور وہ تیرے لئے کانٹے اور اونٹ کٹارے اگائے گی اور تو کھیت کی نبات کھائے گا (پیدائش ۳/۱۷-۱۸)

اس کے بعد مذکور ہے کہ:

اور خداوند خدا نے کہا۔ دیکھو کہ انسان نیک و بد کی پہچان میں ہم میں سے ایک کی مانند ہو گیا۔ اور اب ایسا نہ ہو کہ اپنا ہاتھ بڑھائے اور حیات کے درخت سے بھی کچھ لے اور کچھ کھائے اور ہمیشہ جیتا رہے۔ اس لئے خداوند خدا نے اس باغ کو عدن سے باہر کر دیا تاکہ وہ زمین کی جس میں سے وہ لیا گیا تھا کھیتی کرے۔ چنانچہ اس نے آدم کو نکال دیا۔ اور باغ عدن کی پورب کی طرف کروبیوں کو چمکتی تلوار کے ساتھ جو چاروں طرف پھرتی تھی مقرر کیا۔ کہ درخت حیات کی راہ کی نگہبانی کریں۔ (پیدائش ۳/۲۲-۲۴)

آپ نے غور فرمایا کہ اس قصہ کی مذکورہ صدر تفاصیل میں کس طرح زمین کی پستی اور خاک کی کثافت جھلک رہی ہے۔ یہ چیز بھی خاص طور پر قابل غور ہے کہ تورات میں عورت کو مجرم قرار دیا گیا ہے کہ وہی سانپ کے فریب میں آئی اور اس نے پھر اپنے خاوند کو بھی بہکایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عیسائیوں کے نزدیک عورت ایک ایسی جنس ملعون ہے جسے شرف انسانیت سے کچھ علاقہ نہیں۔ عیسائیت کے ارباب حل و عقد میں چھٹی صدی عیسوی تک یہ مسئلہ نہایت متانت و سنجیدگی سے مرکز بحث و تمحیص رہا کہ عورت میں روح انسانی ہوتی ہے یا نہیں۔ بڑے بڑے بزرگان کلیسا عورت کو فریب کا مجسمہ اور دنیا کی تمام تکالیف و مصائب کا سرچشمہ قرار دیتے رہے (St: Hievonymus) کا قول ہے کہ "عورت شیطان کا دروازہ۔ برائیوں کی راہ اور بچھو کا ڈنک ہے"۔ یہی وجہ ہے کہ عیسائیت میں متاہل زندگی مذہبی تقدس و روحانیت کے منافی ہے۔ عیسائیوں کے قانون میں سوسائٹی میں عورت کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس کی انفرادیت تک بھی تسلیم نہیں کی جاتی۔ ہندو دھرم میں بھی عورت کی یہی حالت ہے۔ منوسمرتی میں ہے:۔

کسی لڑکی۔ جوان عورت یا بڑھیا کو۔ خواہ اپنے ہی گھر میں کیوں نہ ہو۔ کوئی کام بھی اپنی مرضی کے مطابق نہیں

کرنا چاہیئے۔ بچپن میں لڑکی کو اپنے باپ کی مرضی کے تابع رہنا چاہیئے۔ جوانی میں اپنے خاوند کی اور اگر خاوند کی موت ہو جائے تو اپنے لڑکے کی مرضی کے ماتحت عورت کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کبھی بھی اپنی مرضی برت سکے۔ حتیٰ کہ خرچ اخراجات میں بھی اسے کوئی اختیار نہیں ہونا چاہیئے۔

(The Bible of the World; p 81)

ملکیت کے معاملہ میں فیصلہ یہ ہے کہ

"بیوی لڑکے اور غلام کی اپنی جائیداد کوئی نہیں۔ پس جو کچھ ان کا ہے وہ ان کے مالک کا ہے (ایضاً ص۸۹)

چنانچہ ہندو سوسائٹی میں لڑکیوں کو دان (خیرات) دیا جاتا ہے۔ بطور استحقاق انہیں کچھ نہیں مل سکتا۔ لیکن قصۂ آدم میں قرآن کریم میں تنہا عورت کو مجرم نہیں ٹھہرایا۔ اس نے کہا کہ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ (ان دونوں کو شیطان نے بہکایا)۔ اس لئے کہ یہ انسان کی کیفیات کا بیان ہے۔ اور ظاہر ہے کہ انسانی کیفیت مرد و عورت دونوں میں موجود ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے عورت کو محض عورت ہونے کے اعتبار سے مجرم و معتوب قرار نہیں دیا۔ (اسلام میں عورت کی کیا حیثیت ہے اس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔ یہاں فقط اتنا ہی دیکھئے کہ قرآن نے معصیتِ آدم کا باعث عورت کو قرار نہیں دیا۔)

یہ ہے بائبل اور قرآن کریم میں بیان شدہ قصۂ آدم کی تفاصیل کا بدیہی فرق۔ بائبل میں ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ کس طرح (معاذ اللہ) خدا کو یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ کہیں آدم نیکی و بدی کی پہچان کے درخت کی طرح شجرِ حیات سے بھی نہ کچھ کھا لے اور ہمیشہ جیتا رہے۔ اس لئے خدا نے اسے جنّتِ عدن سے باہر نکال دیا۔ لیکن اس سے بھی کچھ نہ بنا اور اللہ میاں (معاذ اللہ) تخلیقِ آدم کے اپنے اس فعل پر پشیمان ہی رہا۔ چنانچہ کتاب پیدائش کے باب ششم کی پانچویں سے آٹھویں آیت میں ہے۔

اور خداوند نے دیکھا کہ زمین پر انسان کی بدی بہت بڑھ گئی اور اس کے دل کے تصور اور خیال روز بروز صرف بدہی ہوتے ہیں۔ تب خداوند زمین پر انسان کے پیدا کرنے سے پچھتایا۔ اور نہایت دل گیر ہوا۔ اور خداوند نے کہا کہ میں انسان کو جسے میں نے پیدا کیا روئے زمین پر سے مٹا ڈالوں گا۔ انسان کو اور حیوان کو بھی اور کیڑے مکوڑے اور آسمان کے پرندوں تک۔ کیوں کہ اُن کے بنانے سے پچھتاتا ہوں۔ مگر نوح پر خداوند نے مہربانی سے نظر کی۔

(نعوذ باللہ)

یہ حقائق کسی تبصرہ کے محتاج نہیں۔

قصۂ آدم کی حکمتِ بالغہ

قصۂ آدم کی تفاصیل آپ کے سامنے آگئیں۔ لیکن آگے بڑھنے سے پیشتر ایک مرتبہ اس پر نگہ بازگشت ڈالئے اور دیکھئے کہ یہ قصہ کس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

آدم کی جنت کی زندگی سے نوعِ انسانی کو یہ بتا دیا گیا ہے کہ یہ ہے تمہاری منزلِ مقصود جسے تمہیں رزمگاہِ حیات میں مسلسل سعی و عمل سے حاصل کرنا ہے۔

وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٧٢﴾

اور یہ ہے وہ جنت جس کا تمہیں تمہارے اعمال کی بدولت وارث بنایا گیا ہے۔

اس **منتہیٰ** کو اچھی طرح سے ذہن نشین کرا کر اُن کے سفرِ حیات کی ابتدا کرائی گئی۔ یہ نقطۂ آغاز ہے۔ اس کے بعد سے ہبوطِ آدم یعنی سلسلۂ ارتقاء کی اس اولین کڑی (سب سے نچلی منزل) سے انسانیت نے اُبھرنا شروع کیا۔ اور برابر اُبھرتی چلی جا رہی ہے۔ ذمانہ کی سطح بلند ہوتی جاتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ستیزہ گاہِ جہان میں طاغوتی قوتوں سے مقابلہ سخت ہے۔ انسانی معاشرہ میں بالعموم ان ہی قوتوں کا اثر غالب نظر آتا ہے۔ لیکن بایں ہمہ اگر آپ بنگاہِ تعمق غور کریں گے تو یہ حقیقت آپ پر واضح ہو جائے گی کہ انسانیت من حیث الکل وحی کی تعلیم کے قریب آتی چلی جا رہی ہے اور تماشا یہ کہ اس کا جو قدم آگے اٹھتا ہے آگ اور خون کے ان چھینٹوں سے ٹکراتا ہوا اٹھتا ہے جسے فرشتوں کی نگاہوں نے خمیرِ آدم میں چھپا دیکھا تھا۔ انسان کے خود قائم کردہ نظام کی سب سے مہیب لعنتیں کیا ہیں؟ ملوکیت، استعماریت، برہمنیت، غلامی، سرمایہ داری۔ قومیت پرستی (جس میں امتیازِ رنگ و نسل و خون کی سب خباثتیں شامل ہیں) اور مفاد پرستی (جس میں سرمایہ داری، زمینداری، اجارہ داری وغیرہ کی خون آشام جونکیں سب شامل ہیں) دنیا کی تاریخ پر غور کیجیے اور دیکھئے کہ انسان کس طرح ٹھوکریں کھا کھا کر ان لعنتوں سے تنگ آ رہا ہے اور آہستہ آہستہ انہیں دور کرتا چلا جا رہا ہے۔ اور یوں بتدریج غیر شعوری طور پر (بلا اعتراف) قرآنی حقائق کے قریب آتا جا رہا ہے۔ ذرا انقلابِ فرانس کو دیکھئے کہ جب انسانیت خون کے اس سیلاب میں ڈوب کر اُبھری ہے۔ تو کس طرح شاہنشاہیت (شخصی حکومت کے بنیادی تصور) کے خلاف جذبۂ بغاوت لیکر آگے بڑھی ہے۔ وہ **شاہنشاہیت** جو انسانیت کے رگ و پے میں اس طرح سرایت کر چکی تھی کہ گویا اُن کی زندگی کا جزو ہے شاہنشاہ دنیا میں خدا کا سایہ (ظل اللہ) برہما کا اوتار۔ آسمانی برکات کا حامل۔ شئونِ الٰہیہ کا مظہر سمجھا جاتا تھا۔ اس کی پرستش ہوتی تھی۔ بادشاہ کے بغیر کوئی نظامِ حکومت انسان کے تصور میں آ نہیں سکتا تھا۔ لیکن اس ایک انقلاب کی بھڑکتی ہوئی آگ نے ان تمام تصورات کو بھسم کر کے رکھ دیا اور اس کی جگہ اس نئے تصور نے لے لی کہ حکومت منشائے عامہ (General Will of the people) کے مطابق قائم ہونی چاہیئے۔ دنیا میں آج جمہوریت کے جس قدر چرچے ہیں اسی تصور کی مختلف شکلیں ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ دنیا ہنوز اس صحیح تصور تک نہیں پہنچ سکی جو قرآن نے پیش کیا ہے[۱]۔ لیکن

انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کے ارتقائی مراحل

---

[۱] آپ نے عام طور پر سطحی بیں لوگوں کو کہتے سنا ہو گا کہ "اسلام جمہوریت کا مذہب ہے" اور اس سے ان کی مراد مغرب کے نظامِ جمہوریت

(باقی صفحہ پر)

بایں ہمہ ملوکیت کا خواب تو پریشان ہو چکا۔ اس کا مقدس بت تو پاش پاش ہو گیا۔ تخریب کی منزل (وادی لا الٰہ) کچھ تو طے ہو گئی۔ انسانیت کا ایک قدم تو آگے بڑھا۔

پھر ذرا امریکہ کی اس جد و جہد کی داستان پر چھپلتی ہوئی نگاہ ڈالئے جو انسداد غلامی کے لئے معرض وجود میں آئی۔ جب سے انسان نے آنکھ کھولی تھی غلامی انسانی حیات اجتماعیہ کا جزو لاینفک نظر آتی تھی۔ دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہ تھا جس میں غلامی کا رواج نہ ہو اور یہ تصور کچھ جہالت و وحشت ہی سے متعلق نہ تھا بلکہ بڑے بڑے ارباب علم و حکمت بھی اس کے جواز (بلکہ اہمیت) کے قائل تھے۔ حکمت یونان میں دیکھئے۔ کس طرح افلاطون و ارسطو غلامی کے جواز و ضرورت میں دلیل پر دلیل لاتے نظر آ رہے ہیں۔ اگرچہ امریکہ (اور اس کے ساتھ انگلستان) نے غلامی کی ایک محسوس شکل کو مٹایا ہے۔ اور ابیض و احمر میں جو بین امتیاز آج تک کارفرما ہے اس کی رو سے وہ غلامی کی روح کو نہیں مٹا سکے۔ بایں ہمہ انسانوں کی بیع و شریٰ کی لعنت کا ٹیکہ تو انسانیت کے ماتھے سے دُھل گیا

اور پہلی عالمگیر جنگ کے بعد اس عظیم الشان انقلاب پر نگاہ ڈالئے جو نظام سرمایہ پرستی کے خلاف روس میں رونما ہوا۔ ہر چند روس اپنے تشدد میں افراط سے اتر کر تفریط تک جا پہنچا۔ اور رد عمل میں اعتدال کی راہ سے بہت دور نکل گیا۔ لیکن وہ سرمایہ داری جو شجر انسانیت سے اکاس بیل کی طرح لپٹ رہی تھی اور جس نے انسانوں

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۰۱ سے آگے) سے ہوتی ہے۔ حالانکہ وہ نہیں سمجھتے کہ مغرب کے نظام جمہوریت اور قرآنی نظام حکومت میں اساسی اور بنیادی اختلاف ہے۔ مغربی نظام میں ملوکیت ہو یا آمریت۔ جمہوریت ہو یا عمومیت۔ ہر ایک نظام اس اساس پر مبنی ہے کہ اقتدار و حاکمیت کا حق انسانوں کو حاصل ہے۔ ایک انسان کو یا انسانوں کی کسی جماعت کو۔ بہر حال یہ فرق محض شکل و نوعیت کا ہے۔ اس کے برعکس قرآنی نظام کی بنیاد یہ ہے کہ حاکمیت و اقتدار کا حق خدا کے سوا اور کسی کو نہیں۔ لہٰذا مغرب کا نظام جمہوریت بھی قرآن کریم کے نزدیک ایسا ہی مردود ہے جیسا کوئی اور نظام۔ قرآن "طرز حکومت" سے بحث نہیں کرتا۔ بلکہ اس اصول سے بحث کرتا ہے کہ انسانوں پر حکومت کا حق کسے حاصل ہے؟ اور اس کا جواب صرف ایک ہے کہ

سروری زیبا فقط اُس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی۔ باقی بتانِ آذری

اور یہ "خدا کی حکمرانی" درحقیقت خود انسان کی "اعلیٰ صفات" کی اطاعت کیشی ہے لہٰذا کسی "غیر" کی غلامی نہیں۔ بقول حضرت علامہ اقبال ؒ

"اسلام بحیثیت ایک نظام سیاست کے اصول توحید کو نوع انسانی کی جذباتی اور فکری زندگی میں ایک جیتا جاگتا عنصر بنانے کا عملی طریق ہے اس کا مطالبہ اطاعت شعاری خدا کے لئے ہے نہ تخت (کی قوتوں) کے لئے۔ اور چونکہ خدا کی ذات زندگی کی روحانی اساس سے عبارت ہے۔ اس لئے اس اطاعت شعاری سے درحقیقت مفہوم یہ ہے کہ انسان خود اپنی معیاری فطرت (His own ideal nature) کی اطاعت کرتا ہے"

تشکیل جدید صفحہ ۱۴۰۔ تفصیل ان امور کی اپنے مقام پر آئے گی۔

کی ہڈیوں کے گودے تک سے زندگی کی رمق نچوڑ لی تھی۔ اس کے خلاف تو ایک فضا پیدا ہو گئی۔

ادھر ہندوستان میں دیکھئے ورنوں کی تقسیم کس طرح انسانوں کو پیدائشی امتیازات کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھی۔ یہ وہ تقسیم تھی جسے مذہبی تقدس کی سند حاصل تھی اور جو قرنہا قرن سے ہندو تمدن کی اساس و بنیاد قرار پاتے چلی آ رہی تھی۔ آپ نے دیکھا کہ جنگ عظیم کے بعد انسانوں کی اس تقسیم کے خلاف یہاں کیسی فضا پیدا ہوئی۔ ہر چند صدیوں سے رگ و پے میں سرایت شدہ جراثیم ایک ہی دھچکے سے نہیں نکل جایا کرتے۔ لیکن اس "مہر مقدس" کی بنیادیں تو متزلزل ہو گئیں جو اس تقسیم کے لئے قلعہ کی سی حفاظت کا کام دے رہا تھا۔ اسی طرح برہمنیت (priest hood) کو لیجئے جس کے بغیر دنیا میں مذہب کا تصور ہی ذہن میں نہیں آسکتا تھا۔ اس لعنت کے خلاف لوتھر نے آواز اٹھائی اور آج دنیا کے قریب قریب ہر مہذب ملک سے یہ خباثت ختم ہو گئی ہے (یا ختم ہو رہی ہے) آپ نے دیکھا کہ اس باب میں بھی دنیا کس طرح قرآن کے قریب آتی جا رہی ہے

اس کے بعد دوسری جنگ عظیم کو دیکھئے۔

قومیت پرستی کی وہ لعنت جس نے یورپ کو بیچ بیچ جہنم بنا رکھا ہے محسوس طور پر اقوام مغرب کے سامنے آچکی ہے اور جنگ کے بعد جس نظام جدید کے تصورات مدبرین یورپ کی آنکھوں کے سامنے دھندلے سے نقوش کی صورت میں شکل ہو رہے ہیں اس کی بنیاد اس اصول پر رکھی جا رہی ہے کہ ساری دنیا کو نوع انسانی کی برادری تصور کر کے ایک عالمگیر وفاق (world federation) کا نظام قائم کیا جائے (مزید تصریحات دجّی کے عنوان میں ملیں گی)

دنیا کس طرح قرآن کے قریب آرہی ہے

آپ نے غور فرمایا کہ دنیا کس طرح ٹھوکریں کھا کھا کر قرآنی نظام کے قریب آتی جا رہی ہے؟ اس لئے کہ قرآنی تعلیم کے اصول غیر محسوس طور پر فضائے عالم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور ذہن انسانی ان سے غیر شعوری طور پہ متاثر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اگر یورپ اپنی ضد کو چھوڑ کر براہ راست قرآن کی طرف آجاتا تو پھر دیکھتا کہ اس کا یہ جہنم کس طرح جنت ارضی میں تبدیل ہو جاتا ہے؟

لیکن خود مسلمان

لیکن اس کے برعکس ذرا "عالم اسلام" (یعنی مسلمانوں کے ممالک) پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ نظام اجتماعی کی وہ تمام لعنتیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اور جنہیں مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ کس طرح ایک ایک کر کے اُن کے نظام زندگی میں داخل اور اُن کے اعصاب پر مسلط ہیں۔ کیا قیامت ہے کہ آج دنیا میں ملوکیت کی سب سے بڑی لعنت آپ کو ممالک "اسلامیہ" میں مسلط نظر آتی ہے! اور آگے بڑھئے آج اس صفحۂ ارض پر اگر کہیں انسان حیوانوں کی طرح نخاس میں آکر بکتے ہیں تو وہ مکہ کی گلیاں ہیں (ہر چند اس حقیقت کے اظہار سے ہماری نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ لیکن حقیقت سے چشم پوشی بھی کس طرح کی جا سکتی ہے؟) سرمایہ داری کی لعنت مسلمانوں کے ہاں عام طور پر موجود ہے۔ ذات پات کی تقسیم ان کی معاشرت کا جزو اعظم ہے۔ قومیت پرستی

(Nationalism) ان کی سیاست کا عروۃ الوثقیٰ ہے حب الوطن کو من الایمان ان ہی کے یہاں قرار دیا جاتا ہے اور اس دیدہ دلیری کے ساتھ کہ اس دورِ جاہلیت کے تصور کو منسوب کیا جاتا ہے اس ذات اقدس و اعظم کی طرف، جو وطن پرستی کے طاغوت کو پاش پاش کرنے کے لئے مبعوث ہوئی برہمنیت ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے اور زندگی کے کسی شعبہ میں یہ ان "مقدس زنجیروں" سے آزاد نہیں۔

سوچا آپ نے کہ وہ تمام لعنتیں جنہیں آج کفار اپنے ہاں سے یا تو دور کر چکے ہیں اور یا دور کرنے کی فکر میں ہیں کس طرح مسلمانوں کے اعماقِ قلب میں جا گزیں ہیں اور ان سے نفرت اور سرکشی کے آثار کہیں دکھائی نہیں دیتے یہ سب اس لئے کہ:-

بندۂ مومن ز قرآں بر نخورد　　　در ایاغ او نہ مے دیدم نہ درد
خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست　　　خود سرِ تختِ ملوکیت نشست
تا نہالِ سلطنت قوت گرفت　　　دینِ او نقش از ملوکیت گرفت
از ملوکیت نگہ گردد دگر
عقل و ہوش و رسم و رہ گردد دگر

قصۂ آدم اور ملتِ اسلامیہ

ان حقائق کو سامنے رکھئے اور ایک بار پھر قصۂ آدم پر نگاہ ڈالئے محمد رسول اللہ و الذین معہ نے اس خطۂ ارض پر قرآنی حکومت کا نظام قائم کر کے اس جنت کا نمونہ دکھایا جو انسانیت کا منتہیٰ ہے۔ اس کے بعد ہبوطِ آدم ہوا۔ یعنی مسلمانوں نے قرآنی نظام کو الگ کر دیا اور اس جنت سے نکل کر جسے اس نظام نے قائم کیا تھا۔ یہ بھی دوسرے انسانوں کی طرح حیوانی زندگی کی سطح پر آ گئے اب یہ تیرہ سو برس سے ٹھوکریں کھا رہے ہیں (اور ان کے ساتھ ساری دنیا ان ہی ٹھوکروں میں مبتلا ہے) اور اس فردوس گم گشتہ کی بازیابی کیلئے تڑپ رہے ہیں۔ جسے چشمِ فلک نے ایک بار دیکھا اور دوبارہ دیکھنے کے لئے سرگرداں ہے جب انسان چاروں طرف سے ہار تھک کر قرآن کی طرف آ جائے گا تو پھر اس مقام کو پا لے گا جس کی تلاش میں یہ مارا مارا پھر رہا ہے۔ اس وقت آواز آئے گی کہ:-

اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ ۝ ...... وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (۴۳/۷۲)

تم اور تمہارے رفقاء جنت میں داخل ہو جاؤ خوش و خرم یہ (مسرتوں کے چھلکتے ہوئے) ساغر سیمیں و زریں کا دور ہو گا۔ جو کچھ نفس (انسانی ذات) کو مطلوب ہو گا سب کچھ ملے گا۔ (دل کی آرزوئیں اور آنکھوں کی ٹھنڈک) اس جنت میں تم رہو گے۔ یہ ہے وہ جنت جس کے تم اپنے اعمال کی بدولت وارث بنا دیئے گئے ہو۔

خلاصۂ مبحث خاک کے ذرات، ارتقائی منازل طے کرکے صورتِ انسانی میں متشکل ہوئے۔ انسان اپنی نیم حیوانی اور نیم انسانی زندگی کے مراحل طے کرکے اس مقام تک آپہنچا جہاں اسے آپس میں مل جل کر رہنا تھا۔ اس معاشرتی زندگی کا پہلا دور وہ تھا جس میں انسان نے ہنوز رزق کے سرچشموں پر انفرادی ملکیت کا سبق نہیں سیکھا تھا۔ ہر انسان جہاں سے جی چاہے بافراغت کھا پی سکتا تھا۔ اس کے بعد اس نے انفرادی ملکیت کا تصور پیدا کیا جس سے ان کے مفاد میں تصادم شروع ہوگیا۔ یہاں سے کش مکش حیات کی ابتدا ہوئی قرآن کریم نے انسانی تمدن کے ان ماجریات و کیفیات کو تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے جسے قصۂ آدم کہتے ہیں۔ آدم آدمیت کا نمایندہ ہے۔ آدم کو اختیار و ارادہ کی خصوصیت دی گئی ہے۔ اسے علم الاشیاء عطا کیا گیا ہے۔ کائنات کی تمام ملکوتی قوتیں اس کے تابعِ فرمان کر دی گئی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کشمکش زندگی میں متصادم و متخالف ابلیسی قوتیں بھی ہیں۔ انسان کا فریضۂ زندگی یہ ہے کہ کائنات کی تمام قوتوں کو تابعِ فرمان بنا لے۔ پھر ان قوتوں کے ماحصل کو وحی آسمانی کی روشنی میں صحیح مصرف میں لاکر ایسا نظام قائم کرے جس میں تمام نوعِ انسانی کی ضروریاتِ زندگی بلامشقت و تردد پوری ہوتی جائیں اور جملہ افرادِ انسانیہ کی مضمر صلاحیتیں نشوونما پاکر تکمیل تک پہنچتی جائیں اور اس طرح اپنے ہبوط کے بعد صعود و عروج کی تمام منازل طے کرکے پھر وہ مقامِ رفعت و بلندی حاصل کرے جو اسے شروع میں بطور اس کے منتہیٰ کو دکھا دیا گیا تھا۔

پھر ملتِ اسلامیہ کی تاریخ بھی قصۂ آدم کی سی داستان ہے۔ حضورِ ختمی مرتبت نے دنیا میں حکومت قرآنی کے قیام سے دکھا دیا کہ اس دنیا میں انسان کا نصب العین حیات کس قسم کی جنت کی زندگی ہے۔ اس کے بعد ہبوط ہوا۔ اور سخت ترین قسم کا ہبوط ہوا۔ ابھی تک یہ اس ہبوط کے زخموں کی مرہم پٹی میں مصروف ہے۔ جب اس کے زخم مندمل ہوں گے تو پھر آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا ہوگی اور اس طرح اس کے اعمال کی بدولت وہ جنت ارضی حاصل ہوگی جس کی جھلک چودہ سو سال پیشتر دکھائی گئی تھی۔ وہ جنتِ ارضی جس کی حدیں اُخروی جنت سے جا کر مل جاتی ہیں۔ کیونکہ زندگی جوئے رواں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ابتدائے آفرینش کے سوال کی طرح تخلیقِ انسانی کے آغاز کا مسئلہ بھی اربابِ مذاہب اور اہلِ فکر کیلئے ہمیشہ وجہ کاوش رہا ہے۔ (وحی کو چھوڑ کر) مذاہبِ عالم کے پاس چونکہ سرمایۂ علم محض توہم پرستی ہے اس لئے ان میں انسانی تخلیق کے مسئلہ نے بھی عجیب و غریب شکلیں اختیار کر رکھی ہیں۔ لیکن ان میں "آدم" کا تصور کسی نہ کسی انداز میں ضرور ملتا ہے۔ عیسائیت نے اس تصور کی بنیاد پر ایک فلک بوس فلسفہ کی عمارت قائم کر رکھی ہے۔ اس نے انسانی فطرت کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ایک حصہ وہ جو "ہبوطِ آدم" سے پیشتر کا ہے اور دوسرا حصہ وہ جو اس تنزل کے بعد کا ہے۔ اس تصور کے مطابق ہبوطِ آدم سے پہلے انسان، فطرت کے مطابق زندگی بسر

کرتا تھا۔ اس زندگی میں گناہ کا تصور کہیں نہیں تھا۔ انسان معصوم تھا اور اس کی فطرت پاکیزہ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ باہمی معاملات میں کوئی خرابی اور کسی قسم کا فساد نہیں تھا۔ اس کے بعد زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا جو ہبوط (Fall) کے بعد کا دور ہے۔ اس میں ہر انسانی بچہ، پیدائش ہی سے گنہگار پیدا ہوتا ہے اور گناہ کے اثرات کا الگ کردینا کسی کے بس میں نہیں۔ لہٰذا اب انسان کی زندگی غیر فطری خطوط پر بسر ہوتی ہے جس کا نتیجہ وہ جہنم خیز فتنہ و فساد ہے جس میں انسانیت مبتلا چلی آرہی ہے۔ یہ دور اسی طرح سے چلا جائے گا تا آنکہ انسانوں کا خاتمہ ہو جائیگا۔ اس میں انسان کی نجات کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ انسان حضرت مسیحؑ کے صلیب دیئے جانے پر ایمان لائے اور ان کے خونِ ناحق کو اپنے گناہوں کا کفارہ سمجھے۔ زمانہ کی اسی قسم کی تقسیم ہندوؤں کے ہاں ہے۔ اُن کے تصور کی رُو سے، ابتدا کا زمانہ ست جگ تھا جس میں راست بازی کا دور دورہ تھا۔ لیکن اس کے بعد اب کلجگ ہے جس میں باطل کو فروغ ہے۔ اب ست جگ پھر واپس نہیں آسکتا۔ لہٰذا، جوں جوں انسانیت آگے بڑھتی ہے فتنہ و فساد کا اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

لیکن قرآن نے اس قسم کا کوئی تصور نہیں دیا۔ اس نے بتایا کہ انسان کے لئے تمثیلی (آئیڈیل) معاشرہ وہ ہے جس میں افراد کو اپنی پرورش اور نشوونما کے لئے جگر سوز مشقتوں سے نہ گذرنا پڑے اور ایک فرد دوسرے فرد کی صلاحیتوں کے نشوونما اور ارتقاء کا ذریعہ بنتا ہے اس کے بعد اس نے بتایا کہ یہ معاشرہ اس صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہونے سے قائم ہوسکے گا جو وحی کے ذریعے عطا کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ معاشرہ انسانوں کی اپنی سعی و کاوش کا ثمرہ ہوگا۔ اسے جنتِ ارضی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایسے معاشرہ کا قیام ہر وقت ممکن ہے اور ہر دور کا انسان اسے سعی و عمل سے متشکل کر سکتا ہے۔ نہ آدم کی فطرت گناہوں سے آلودہ ہے اور نہ ہی کوئی ست جگ ایسا ہے جو دوبارہ نہ آسکے ہر انسانی بچہ ایک سادہ لوح لے کر دنیا میں آتا ہے۔ اس کے پاس انسانی ممکنات کی مضمر قوتیں ہوتی ہیں جن کی وہ اپنی زندگی میں ہر مقام پر نمود کرسکتا ہے۔ جب یہ قوتیں وحی الٰہی کے تابع سرگرم عمل ہوتی ہیں تو ان کا نتیجہ خوشگوار یوں کی جنت ہوتا ہے۔ مفاد پرست قوتیں اس معاشرہ کی تشکیل میں حائل ہوتی ہیں۔ انہی کو ابلیسی قوتیں کہا جاتا ہے جن کا ذکر آئندہ باب میں آئے گا۔ ان ابلیسی قوتوں کے مقابلہ سے انسانی قوتوں میں مزید جلا پیدا ہوتی ہے۔ یہی وہ کشمکش ہے جس میں زندگی کا راز اور ارتقاء کا سراغ پوشیدہ ہے۔ لہٰذا، "آدم" انسانی زندگی کے اس نقطۂ آغاز کا نام ہے جہاں سے اس کی مضمر صلاحیتوں کے نشوونما کے مواقع شروع ہوتے ہیں۔ آدم کا ہبوط کسی بلند زندگی سے اسفل زندگی کی طرف تنزل نہیں۔ یہ تو انسانی نصب العین کے حصول کی داستان کا نقطۂ آغاز ہے۔

أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ

قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا جس کا لہو!

ابلیس

قانونِ ارتقا کی رُو سے استحکام و عروج اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ متصادم و متحارب قوتوں سے نبرد آزما ہوا جائے۔ جن انواع کو نامساعد احوال و ظروف سے مقابلہ نہیں کرنا پڑتا وہ آگے نہیں بڑھ سکتیں۔ زندگی ایک جوئے رواں ہے۔ لیکن اگر اس کی راہ میں پتھروں کی (falls) نہ آئیں تو اس کی پُرسکوت روانی آہستہ آہستہ مبدل بہ سکون ہو جائے اور یہ جوئے رواں جمود و تعطل کا ایک جوہڑ یا تالاب بن کر رہ جائے۔ بربط کے تاروں میں خوابیدہ نغمے بلا مضراب کبھی بیدار نہیں ہو سکتے۔ پانی کے اندر چھپی ہوئی بے پناہ قوتیں جو اس کی پُرسکوت روانیوں میں کہیں محسوس تک نہیں ہوتیں۔ کبھی اپنے جوہر کی نمود نہیں کر سکتیں۔ تاوقتیکہ پانی کا دھارا اپنے سے غیر (فولادی مشینوں) سے نہ ٹکرائے آئینۂ شمشیر میں کبھی آب و تاب پیدا نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ اسے سنگِ فسان پر صیقل نہ کیا جائے۔ چقماق کی شعلہ فشانی پتھر کی رگڑ کے بغیر ممکن نہیں۔ شیشہ میں کبھی جوہرِ آئینہ پیدا نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ اس کے پیچھے زنگار کی کثافت نہ ہو۔ اسی طرح خودی بھی اپنی نمود، استحکام اور عروج کے لئے اپنے سے غیر کو چاہتی ہے۔ اگر خودی اپنے غیر سے متقابل و متصادم نہ ہو تو ہنگامۂ کائنات سرد پڑ جائے۔ بزمِ ہستی کی رنگینیاں بے کیف ہو جائیں۔ یہ جہانِ رنگ و بو پھر سے مٹی کا گھروندا بن کے رہ جائے۔ خونِ رگِ کائنات کی تپش صرف خودی کے ولولۂ نمود کی مظہر اور اس کی لذتِ کشمکش کی رہینِ منت ہے۔ بقول حضرت علامہ اقبالؒ۔

صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ او	غیرِ او پیداست از اثباتِ او
سازد از خود پیکرِ اغیار را	تا فزاید لذتِ پیکار را

انسان پیدا ہوا تو عالمِ آفاق کی تمام اشیاء اس کے لئے مسخر کر دی گئیں وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَمِيْعًا۔

انسانی خودی کا استحکام

ان قوتوں سے کام لینے کے لئے اسے زیادہ سے زیادہ اپنی طبیعی اور دماغی قوتوں کو بروئے کار لانا تھا۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ انسان فقط ان طبیعی اور دماغی قوتوں کا ہی نام نہیں۔ اس کے علاوہ اس کے اندر ایک اور شے بھی ہے جسے روحِ خداوندی کہا گیا ہے۔ یہی انسان کی انا ہے۔ یعنی جب انسان "میں" کہتا ہے تو اس سے مفہوم اس کا طبیعی پیکر نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے ماوراء کچھ اور ہوتا ہے۔ یہ انا یا (Ego) اس کی خودی ہے اور اس خودی کا استحکام و ارتقاء تکمیل شرفِ انسانیت۔ خودی کے استحکام و عروج کا تقاضا تھا کہ اس کے مدمقابل بھی کوئی قوت ہوتی جس سے تصادم اور کش مکش اس کے جوہر میں جلا پیدا کرتا۔ اسی قوت کا نام ابلیس ہے، جس کے متعلق علامہ اقبالؒ کہتے ہیں۔

جہاں تا از عدم بیروں کشیدند ضمیرش سرد و بے ہنگام دیدند

بغیر از جان ما سوزے کجا بود ترا از آتش ما آفریدند

خوئے ابلیسی

ملائکہ انسان کے حضور جھک گئے۔ ابلیس مقابلہ کے لئے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اطاعت انقیاد۔ تعمیل ارشاد۔ یہ ملائکہ کی خصوصیات ہیں۔ بغاوت۔ سرکشی۔ معصیت۔ انکار۔ یہ خوئے ابلیسی ہے۔ قصۂ آدم کی تمام آیات پر غور کیجئے۔ یہ فرق ممتاز طور پر سامنے آ جائے گا۔ تخلیقِ آدم کے وقت فرشتوں نے بھی ایک "اعتراض" پیش کیا تھا۔

أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ (۲/۳۰)

(بار الٰہا! کیا تو ایسا خلیفہ بنا رہا ہے جو زمین میں خونریزی اور فساد انگیزی سے ہنگامے برپا کر دے گا۔ اور ایک ہم ہیں کہ ہمیشہ تیری تسبیح و تقدیس میں منہمک رہتے ہیں، سو ایک ایسی ہنگامہ خیز ہستی کو ہم پر فوقیت دینا ہماری ناقص سمجھ میں نہیں آتا)

اسی قسم کا "اعتراض" ابلیس نے بھی پیش کیا۔

أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ (۷/۱۲)

(میں اس پیکرِ خاکی سے کہیں بہتر ہوں۔ اسے تو نے مٹی سے پیدا کیا۔ میری تخلیق آتشیں ہے، میں اس کے سامنے کیوں جھکوں!)

فرشتوں کے سامنے جب حقیقت واضح کی گئی تو ان کی فطرتِ سلیم نے سر جھکا دیا عرض کیا۔ اے الٰہ العالمین! ہمارا شبہ ہماری کوتاہ علمی پر مبنی تھا۔

سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ (۲/۳۲)

تیری ذات۔ (تمام نقائص و عیوب سے) بلند ہے۔ ہمیں تو فقط اتنا ہی علم تھا جو تو نے عطا کر رکھا ہے۔ علیم و حکیم تو

فقط تیری ہی ذات ہے۔

لیکن جب ابلیس کے سامنے حقیقت بے نقاب ہوئی تو اُس نے کیا کیا؟ جھکا نہیں

اَبٰی وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ۝ (۲/۳۴)

اس نے سرکشی اور تکبر اختیار کیا اور وہ نہ ماننے والوں میں سے تھا۔

اس کے بعد

قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ (۱۷/۶۲)

اس نے کہا۔ "دیکھ تو یہی وہ ہے جسے تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے"؟

اگر یہی فیصلہ ہے تو میں اسے ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔

قرآنِ کریم نے جہاں سجودِ ملائکہ کی داستانِ اطاعت انقیاد کو متعدد مقامات میں دہرایا ہے۔ وہاں استکبارِ ابلیس کے قصۂ سرکشی و عدوان کو بھی کئی جگہ بیان کیا ہے۔ سورۂ حجر میں ہے۔

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ۝ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ۝ قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ۝ قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ۝ (۱۵/۳۰-۳۳)

چنانچہ جتنے فرشتے تھے وہ تو سب اس کے سامنے سربسجود ہو گئے۔ مگر ابلیس نہیں جھکا۔ اس پر یہ بات شاق گزری کہ وہ جھکنے والوں میں سے ہو۔ اللہ نے کہا۔ "اے ابلیس! تجھے کیا ہوا؟ جھکنے والوں میں شامل نہ ہوا۔"؟ "کہا" مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ایسے بشر کے سامنے جھکوں جسے تو نے خمیر اٹھے ہوئے گارے سے بنایا ہے جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے۔"

سورۂ ص میں ہے۔

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ۝ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اِسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ۝ قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ۭ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ۝ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۭ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ۝ (۳۸/۷۳-۷۶)

چنانچہ جس قدر فرشتے تھے وہ تو سب اس کے سامنے سربسجود ہو گئے۔ مگر ابلیس نہ جھکا۔ اس نے غرور کیا اور نافرمانوں میں سے ہو گیا۔ اللہ نے کہا "اے ابلیس! تجھے آدم کے سامنے جھکنے سے جسے میں نے اپنے ہاتھوں پیدا کیا۔ کس بات نے روکا۔ تو نے غرور کیا یا تو کچھ بہت اونچی شان والوں میں سے ہو گیا ہے"؟ کہا کہ "میں اس سے بہتر ہوں مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے بنایا ہے"۔

سورۂ طٰہٰ میں فقط آبیٰ (۲۰/۱۱۶) کہہ کر اس تمام تفصیل کو ایک لفظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔

دیکھئے! دونوں "اعتراض" (یعنی فرشتوں کی طرف سے اور ابلیس کی طرف سے) عقل و منطق پر مبنی ہیں۔ لیکن ایک عقل وہ ہے کہ علمِ الٰہی کے سامنے جھک جاتی ہے۔ دوسری وہ ہے جو اس سے بغاوت اور سرکشی اختیار کر لیتی ہے۔ یہ دوسری عقلِ ابلیسی ہے۔ عقلِ سرکش۔ علم بے راہ رو۔ خردِ بے زمام۔ لادینی افکار۔ یہ ہے فطرتِ ابلیسی۔ اس کے برعکس وحیِ خداوندی کے تابع علم و عقل! یہ ہے خوئے ملکوتی۔ اس کا نام ہے ایمان۔ اسے کہتے ہیں عشق۔

عقلِ سرکش فقط ضدی ہوتی ہے

پھر یہ بھی دیکھئے کہ ملائکہ کے استفسار کے جواب میں انہیں سمجھا دیا گیا کہ انتخابِ آدم کیوں عمل میں آیا ہے لیکن ابلیس کے اعتراض کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس لئے نہیں کہ اس کے اعتراض کا جواب بن نہیں پڑتا تھا۔ بلکہ اس کی تہ میں ایک اور حقیقت پوشیدہ تھی۔ ہم نے دیکھا ہے کہ ملائکہ جھک جانے والی قوتیں ہیں اور ابلیس عقلِ سرکش۔ جو شخص قلبِ سلیم لے کر آئے اس کی ہر بات کا جواب دیا جانا چاہیئے۔ تاکہ اس سکون و طمانینت کے بعد اس کے قلب میں اور جھکاؤ پیدا ہو اور جسے وہ بالغیب مانتا تھا اسے علیٰ وجہ البصیرت قبول کرلے۔ لیکن عقلِ سرکش کی کیفیت اس سے الگ ہوتی ہے۔ ایسی عقل کیا ہے؟ اس کی تشریح چند صفحات بعد (وحی کے عنوان میں) ملے گی۔ اس مقام پر صرف اتنا سمجھئے کہ دورِ حاضرہ کے علم النفس کے ماہرین کی تحقیق کی رو سے عقل درحقیقت جذبات کی لونڈی ہے۔ یعنی نفسِ انسانی جو کچھ چاہتا ہے عقل اس کے لئے ذرائع و اسباب پیدا کر دیتی ہے اور اس کے جواز کے دلائل بہم پہنچاتی ہے۔ بلا تمیز اس کے کہ جو کچھ نفسِ انسانی چاہتا ہے وہ صحیح ہے یا غلط۔ حق ہے یا باطل۔ جائز ہے یا ناجائز۔ لہٰذا ابلیس کا اعتراض (جو بظاہر عقل و منطق پر مبنی نظر آتا ہے) درحقیقت ان جذباتِ سرکشی کا آئینہ دار تھا جو اس کے نفسِ خودسر کی تخلیق تھے یعنی اس کے نفس کی گہرائیوں میں استکبار و سرکشی کا طوفان متلاطم تھا۔ اور اس کا اعتراض اس تلاطم کی گرجتی ہوئی آواز۔ ہٰذا اس سے الجھنا بیکار تھا۔

آگے بڑھنے سے پہلے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ عقل کا مقام کیا ہے، اور اس کے فرائض و مناصب کیا (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) انسانی زندگی کی ایک سطح وہ ہے جسے حیوانی زندگی (یا اس کی طبعی زندگی) کہتے ہیں اس سطح پر اس کے تقاضے وہی ہوتے ہیں جو جبلّی طور پر (Instinctiveiy) حیوانات کے تقاضے ہوتے ہیں۔ یعنی تحفظِ خویش (preservatin of self) اور افزائشِ نسل کے تقاضے اور ان کے متعلقات۔ یہ تقاضے انسان کے اندر از خود کارفرما رہتے ہیں۔

انسان کے اندر دوسری چیز ہے عقل (Intellect) عقل کا ایک کام تو یہ ہے کہ حواس (Senses)

جو اطلاعات اس تک پہنچائیں ان میں ربط پیدا کر کے نتائج مستنبط کرے اور اس طرح ہر معاملہ کی (Object-ive study) کرے لیکن اس کا دوسرا کام یہ ہے کہ انسانی جذبات جو کچھ طلب کریں یہ اس کے فراہم کرنے کا انتظام سوچے۔ اس اعتبار سے عقل، جذبات کی خادم ہوتی ہے۔ اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ جذبات اس سے کہیں وہ کچھ کرتی جائے۔

تیسری چیز انسان کے اندر وہ "میں" (I) ہے جس سے درحقیقت انسانی زندگی عبارت ہے۔ اس "میں" کا کام یہ ہے کہ وہ صحیح صحیح فیصلے کرے اور عقل سے ان فیصلوں کے مطابق کام کرائے۔ اگر یہ "میں" کمزور ہے تو انسان کے سارے فیصلے جذبات کی رو سے ہوں گے اور اس کی زندگی کی سطح حیوانی زندگی سے آگے نہیں بڑھے گی۔ لیکن اگر اس کی "میں" کمزور نہیں تو اس کے فیصلے جذبات سے الگ ہٹ کر ہوں گے اور انہی فیصلوں کو انسانی فیصلے کہا جائے گا۔

یہ "میں" (I) (ایک خاص نظام کے ماتحت (جو وحی کی روشنی میں متشکل ہوتا ہے) اس قدر استحکام حاصل کر لیتی ہے کہ ہر معاملے میں، خود فیصلے کر سکتی ہے۔ یہ فیصلے ایسے ہوتے ہیں جن سے ایک طرف زندگی کے طبعی تقاضے بھی کماحقہٗ پورے ہوتے جاتے ہیں اور دوسری طرف استحکام ذات بھی زیادہ سے زیادہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

جب عقل، انسانی جذبات کے تابع چلتی ہے تو اسے عقل سرکش یا علم بیباک کہا جاتا ہے۔ اس کا نام ابلیس ہے۔ جب یہی عقل وحی کے تابع چلتی ہے تو عین انسانیت بن جاتی ہے۔ عقل بے باک اور انسانیت کے تقاضوں میں جو کشمکش ہوتی ہے، اسے ابلیسی کشمکش کہا جاتا ہے۔ یہی خیر و شر کی کشمکش ہے۔ اس کشمکش سے انسانی خودی مستحکم ہوتی چلی جاتی اور عقل بے باک پر غالب آتی چلی جاتی ہے۔ اپنی عقل بے باک کے بعد، دوسرے افراد کی عقل بے باک سے بھی تصادم ہوتا ہے۔ یہ وہ موانعات ہیں جو انسانی خودی کی راہ میں حائل ہوتے ہیں لیکن ان کی سختی اور سنگینی ہی سے خودی میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔ بم کا فولادی خول (جو اس کے اندر کے بارود کے راستے میں سد سکندری بن کر حائل ہوتا ہے) جس قدر زیادہ مضبوط ہوگا اتنی ہی زیادہ اس کے بارود کی قوت ہوگی۔

جہاں تک عقل کے اس شعبے کا تعلق ہے جس میں یہ حواس کے ذریعے بہم پہنچائے ہوئے مواد (Sense-data) سے استنباط نتائج کرتی ہے اور کسی مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر غور کر کے دلائل و براہین فراہم کرتی ہے، قرآن نے اس علم اور عقل کو بڑا بلند مقام عطا کیا ہے۔

واضح رہے کہ علم و عقل فی ذاتہٖ معیوب شے نہیں۔ معیوب تو ایک طرف! یہ تو وجہ شرف انسانیت ہے۔

علم و عقل کی فضیلت

قصۂ آدم میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ علم ہی وہ جوہر تھا جس کی بنا پر آدم مسجودِ ملائک قرار پایا۔ قرآن کریم کے درخشندہ اوراق کو اُلٹتے جائیے شروع سے اخیر تک۔ آپ یہ دیکھیں گے

کہ عقل و بصیرت۔ فہم و فراست۔ علم و دانش کو کس طرح وجہ افتخار اور باعث عزت و تکریم قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کریم درحقیقت مخاطب ہی عقل کو کرتا ہے۔ صاحبان دانش و بینش، اولی الابصار و اولی الالباب۔ اس کے نزدیک انسانیت کے بلند ترین مدارج کے اہل ہیں۔ اس کے برعکس عقل و فکر سے کام نہ لینے والے بدترین خلائق۔

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ۝ (۸/۲۲)

یقیناً اللہ کے نزدیک سب سے بدتر حیوان وہ (انسان) ہیں جو بہرے گونگے ہو گئے جو کچھ نہیں سمجھتے۔

وہ اس قابل ہی نہیں، کہ انہیں انسانوں کے زمرہ میں شمار کیا جائے۔

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ۖ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ۝ (۷/۱۷۹)

اور کتنے ہی جن و انسان ہیں جو جہنمی زندگی بسر کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ اُن کے پاس عقل ہے مگر اس سے سمجھ بوجھ کا کام نہیں لیتے۔ آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان ہیں مگر اُن سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ وہ عقل و حواس کا استعمال کھو کر چارپایوں کی طرح ہو گئے۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ کھوئے ہوئے۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو یک قلم غفلت میں ڈوب گئے۔

لیکن وہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتاتا ہے کہ علم خداوندی کے مقابلہ میں انسان کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا ۝ (۱۷/۸۵)

اور تمہیں (اسرار کائنات کا) جو کچھ علم دیا گیا ہے وہ علم خداوندی کے مقابلے میں) بہت کم ہے۔

اس لئے انسان ان امور و معاملات کے لئے جن کا اسے تمام و کمال علم نہیں دیا گیا۔ علم خداوندی یعنی وحی الٰہی کا محتاج ہے۔ اسی طرح محتاج جس طرح اس کی آنکھ سورج کی روشنی کی محتاج ہے۔ وحی الٰہی ایک چمکتا ہوا نور ہے جس کی تابانی سے ہر شے کی حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔

لیکن کون سا علم؟

تنہا علم انسانی ظن و تخمین کی ظلمت انگیز وادیوں میں بھٹکتا پھرتا اور جا بجا ٹھوکریں کھاتا ہے۔ علم و عقل کو وحی خداوندی کے تابع رکھنا ایمان و عشق ہے۔ اور اپنے آپ کو "عقلِ کل" اور "علم تمام" کا حامل سمجھ کر وحی کی روشنی سے بے نیاز ہو جانا، کفر و ابلیسیت۔

علم بے عشق است از طاغوتیاں | علم با عشق است از لاہوتیاں
عقل اندر حکم دل یزدانی است | چوں ز دل آزاد شد شیطانی است

دنیا میں جس قدر فساد اور خونریزیاں اور ظلم و استبداد ہے سب کی لِمّ یہ ہے کہ انسان نے اپنے علم و عقل کو سرکش و بیباک

چھوڑ رکھا ہے۔ اور اسے اپنے سے بلند و بالا ہستی کے قوانین کے تابع نہیں رکھا۔ اسی کا نام ابلیسی نظام ہے جس میں ہر وہ شخص، جماعت یا قوم جو دوسرے کو فریب دے سکے (یعنی وہ جو دوسرے کے علم و عقل سے زیادہ علم و عقل رکھے اور اسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا جانے) نہایت کامیاب ہے۔ علم کو جب وحی الٰہی کے ساحلوں میں محدود نہ رکھا جائے تو یہ ایک ایسا پُر شور دریا بن جاتا ہے جس کی طغیانیوں کے سامنے عدل، انصاف، اخلاق تہذیب و تمدن جڑ سے اکھڑ کر بہے چلے جاتے ہیں ؎

اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے | عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

لا دیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر | ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

یہی وہ ابلیس ہے جس نے (شعر کی زبان میں) روزِ ازل للکارا تھا کہ ؎

از زدمن موجہ چرخ سکون ناپذیر

من بہ دو صر صرم۔ من بہ غونشدرم

اور علم بیباک ایک کفِ بدہاں سیلاب۔ ایک چرخ بہ آغوش طغیانی۔ ایک ہمہ تن رقص بگولہ۔ ایک جہاں سوز شعلۂ جوالہ یعنی ابلیس!

ذرا غور فرمایئے قرآن کریم نے اس قوتِ بیباک کی تندی و سرکشی کو کس شوکت و جلال کے انداز میں بیان فرمایا ہے تاکہ اس کی حقیقت چشمِ بصیرت کے سامنے واضح طور پر آجائے۔ ابلیس سے کہا جاتا ہے کہ جاؤ نکل جاؤ۔ یہاں سے تم مردود، ملعون ہو۔ راندۂ درگاہ ہو۔ تم ہمیشہ کے لئے سعادت و تکریم سے محروم ہو۔ بارگاہِ صمدیت کی طرف سے اس قسم کی سرزنش کچھ کم لرزہ فگن نہ تھی۔ لیکن اس کے جواب میں ابلیس کی طرف سے کسی رنج و تاسف یا شرم و ندامت کا اظہار نہیں ہوتا۔ وہ کہتا ہے کہ:۔

رَبِّ فَأَنْظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ۝ (۱۵/۳)

اے میرے پروردگار! مجھے یوم بعثت تک مہلت دیدے۔

اور جب یہ درخواست منظور کر لی جاتی ہے تو کہتا ہے کہ:۔

چیلنج رَبِّ بِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ (۱۵/۳)

"خدایا! چونکہ تو نے مجھ پر (نجات و سعادت کی) راہ بند کر دی، تو اب ضرور ایسا کروں گا کہ زمین میں ان کیلئے (جھوٹی) خوشنمائیاں بنا دوں اور (راہِ حق سے) سب کو گمراہ کر دوں"۔

دوسری جگہ ہے کہ جب اُس سے کہا گیا کہ تو نے آدم کو سجدہ کیوں نہیں کیا۔

قَالَ ءَأَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِينًا ۝ (۱۷/۶)

کہا۔ کیا میں اسے سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے؟

اس کے بعد۔

قَالَ اَرَءَیْتَكَ هٰذَا الَّذِیْ كَرَّمْتَ عَلَیَّ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّیَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۱۷/۶۲﴾

کہا دیکھ تو یہی وہ ہے جس کو تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے؟ اچھا اگر یہی فیصلہ ہے تو اگر تو مجھے قیامت تک کے لئے مہلت دیدے تو دیکھ میں تیرے اس منتخب کردہ کی، ذریت کی ناک میں نکیل ڈال کر انہیں کس طرح تگنی کا ناچ نچاتا ہوں۔ بجز معدودے چند کے۔

یعنی علامہ اقبالؒ کی تشریح کے مطابق اس نے کہا۔

آدم خاکی نہادِ دوں نظر و کم سواد
زاد در آغوشِ تو۔ پیر شود در برم

سورۂ صٓ میں ہے کہ جب ابلیس کو مہلت دیدی گئی تو اس نے کہا۔

قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۳۸/۸۲﴾

کہا! تیرے عزت و جلال کی قسم! میں ان سب کو ضرور راہ حق سے گمراہ کر دوں گا۔

یہاں ابلیس کی قسم پر غور کیجئے۔ اے ارض و سمٰوات کے مالک! تیری قوت و شوکت کی قسم! تیرے جبروت و جلال کی قسم۔ تیرے غلبہ و تسلط کی قسم۔ میں انہیں برباد کر کے چھوڑوں گا گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔ ابلیس چونکہ قوت بیباک کا مظہر ہے اس لئے اس نے قسم بھی اللہ کے جبروت و جلال اور قوت و سطوت کی کھائی۔

پھر یہ دیکھئے کہ جب آدم کو اپنی لغزش کا احساس ہوا تو اس نے فوراً اللہ کی طرف رجوع کیا اور اس سے اپنی فروگذاشت کی معافی چاہی۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا سکتہ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۷/۲۳﴾

پروردگار! ہم نے اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کیا اگر تو نے اپنی ربوبیت و رحمت سے ہمارے لئے سامانِ حفاظت عطا نہ کیا تو ہم برباد ہو جائیں گے۔

ابلیسیت کا ایک اور پہلو

لیکن ابلیس نے اپنی معصیت کے بعد انابت الی اللہ اور توبہ کے بجائے ضد اور سرکشی اختیار کی۔ لہٰذا یہ اس کی رحمت سے ابدی طور پر محروم ہو گیا۔ اس کا نام ہی ابلیس اس لئے ہے کہ وہ سعادت سے یکسر ناامید ہے۔ ابلاس کے معنی ہی ناامیدی ہے۔ قرآن کریم میں ہے:۔

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ○ (۳۰/۱۲)

اور جس روز قیامت قائم ہوگی اس روز تمام مجرم لوگ (حیرت زدہ اور) ناامید رہ جائیں گے۔

دوسری جگہ ہے کہ اللہ اس وقت باران رحمت کو بھیجتا ہے جب لوگ اس (بارش سے) ناامید ہو چکتے ہیں۔

وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِيْنَ ○ (۳۰/۴۹)

(نیز دیکھئے ۶/۴۴ ؛ ۲۳/۷۷ ؛ ۴۳/۷۵)

اور وہ لوگ قبل اس کے کہ اُن کے خوش ہونے سے پہلے (بارش) اُن پر برسے۔ ناامید تھے۔

غور کیجئے دنیا میں کس قدر تباہیاں اور بربادیاں ہیں جو محض اس بنا پر آتی ہیں کہ اپنی غلطی کا احساس ہو جانے کے بعد انسان اس کا اعتراف نہیں کرتا بلکہ ضد اور سرکشی اور نفس کی جھوٹی عزت کے خیال سے اس پر جما رہتا ہے اور اکثر و بیشتر کوشش کرتا ہے کہ اپنی غلطی کا جواز پیش کرکے اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کرے۔ یہ ضد اور سرکشی فطرت ابلیسی کی بنا پر ہے جس میں کہیں جھکنا نہیں لکھا۔ لغزش اور غلطی کے احساس کے بعد جھک جانا ہی انسانیت ہے۔ ضد پر اڑے رہنا ابلیسیت ہے۔ یہ ضد اور سرکشی یوں تو ہر شعبۂ زندگی میں ہلاکت آفریں ہے۔ لیکن مذہب کی دنیا میں اس کے جرائم بڑے تباہ کن ہوتے ہیں۔ یہ تمام تحزب و تشیع۔ یہ تمام فرقہ بازیاں اور گروہ سازیاں اور یہ تمام اختلافات۔ محض باہمی ضد اور سرکشی کی بنا پر ہیں ورنہ جب علم (قرآن) موجود ہو تو پھر اختلاف کی گنجائش کہاں ہے؟ لیکن

باہمی ضد!

یہ فطرت ابلیسی ہے کہ بڑے بڑے مقدس نقاب اوڑھ کر فریب دیتی اور وحدت ملت کو پارہ پارہ کر دینے والی تخریبی کوششوں کو مزین بنا کر اس کا نام "خدمت دین" رکھتی ہے۔ سورۂ بقرہ میں فرمایا کہ وحی خداوندی کا مقصد یہ ہے کہ وہ اختلافات کو مٹا دے لیکن لوگوں کی حالت یہ ہے کہ :-

وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ۗ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ (۲/۲۱۳ نیز دیکھئے ۳/۱۸ ؛ ۴۲/۱۴ ؛ ۴۵/۱۷)

اور یہ لوگ جو باہم دگر مختلف ہوئے۔ تو اس لئے نہیں ہوئے کہ ہدایت سے محروم اور حقیقت سے بے خبر تھے۔ نہیں وحی الٰہی کے واضح احکام ان کے سامنے تھے (اور ان میں تفرقہ و اختلاف کی کوئی گنجائش نہ تھی) مگر پھر بھی محض آپس کی ضد اور مخالفت سے اختلاف کرنے لگتے تھے (اور دین کی ایک راہ پر مجتمع رہنے کی جگہ الگ الگ گروہ بندیوں میں بٹ جاتے تھے) بالآخر اللہ نے ایمان لانے والوں کو (دین کی) وہ حقیقت دکھا دی، جس میں لوگ مختلف ہو گئے تھے۔ (اور ایک دوسرے کو جھٹلا رہے تھے) اور اللہ جسے چاہتا ہے اپنے قانون کے

مطابق دین کی سیدھی راہ دکھلا دیتا ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کا شیوہ یہ ہے کہ جب ایک مرتبہ منہ سے نکل گئی تو پھر ہاں نہیں کہیں گے خواہ ہزاروں دلائل اور لاکھوں بیّنات پیش کر دیجئے۔

تِلْكَ الْقُرَىٰ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَائِهَا ۚ وَلَقَدْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا مِنْ قَبْلُ ۚ كَذَٰلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِ الْكَافِرِينَ ۝

(اے پیغمبر!) یہ ہیں (دنیا کی پرانی) آبادیاں جن کے حالات ہم تمہیں سناتے ہیں۔ ان سب پاس اُن کے پیغمبر (سچائی کی) روشن دلیلوں کے ساتھ آئے۔ مگر اُن کے بسنے والے ایسے نہ تھے کہ جو بات پہلے جھٹلا چکے تھے اُسے (سچائی کی نشانیاں دیکھ کر) مان لیں۔ سو دیکھو، اس طرح خدا ان لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے جو ہٹ دھرمی سے (انکار کرتے ہیں۔

واضح دلائل سامنے ہیں۔ دل مانتا ہے کہ بات سچی ہے۔ لیکن ضد، بات کی پچ اور جھوٹی عزت کا پاس ہے کہ اقرار پر آمادہ نہیں ہونے دیتا۔

فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ آيَاتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوا هَٰذَا سِحْرٌ مُبِينٌ ۝ وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ۝ (۲۷/۱۳-۱۴)

پھر جب ایسا ہوا کہ ان لوگوں کے پاس ہماری واضح نشانیاں پہنچ گئیں تو وہ (پھر بھی ضد اور ہٹ دھرمی سے) کہنے لگے کہ یہ تو کھلا ہوا جھوٹ ہے اور اُن نشانیوں کا (محض سرکشی اور غرور کی وجہ سے انکار کرنے لگے حالانکہ اُن کے دل (بطورِ خود) اُن کا یقین کر چکے تھے۔ سو دیکھو ان مفسدوں کا انجام کیسا (عبرت انگیز) ہوا۔

یہ گروہ سازیاں

ذرا اپنے گرد وپیش نظر دوڑائیے اور دیکھئے کہ ملتِ اسلامیہ جیسی اُمت واحدہ میں جن کا خدا ایک۔ رسول ایک۔ ضابطۂ حیات (قرآن) ایک۔ مرکزِ محسوس (قبلہ) ایک۔ اس قدر فرقے اور گروہ کس علت کی بنا پر ہیں۔ بادنیٰ تعمق یہ حقیقت آپ پر روشن ہو جائے گی کہ اس تفرق و انتشار کی تہ میں باہمی ضد اور تعصب کے سوا اور کچھ نہیں، اس لئے کہ خود قرآن شاہد ہے کہ علم (یعنی علمِ کتاب) آ چکنے کے بعد اختلافات محض ضد کی بنا پر ہوتے ہیں۔ قرآن کے من جانب اللہ ہونے کی تو سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ اس میں اختلاف نہیں۔

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ۝ (۴/۸۲)

پھر کیا یہ لوگ قرآن (کے مطالب پر) غور و فکر نہیں کرتے؟ اور خدا کی دی ہوئی عقل و بصیرت سے کام نہیں لیتے؟) اگر یہ خدا کے سوا کسی دوسرے کی طرف سے ہوتا تو ضروری تھا کہ یہ اس کی بہت سی باتوں میں اختلاف

پاتے، (حالانکہ وہ تو اپنی ساری باتوں میں اوّل سے لے کر آخر تک۔ کامل طور پر ہم آہنگ اور یکساں ہے)
پھر کیا یہ حقیقت دل خراش اور یہ حدیث الم انگیز نہیں کہ اس کتاب کے ماننے والے جس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل

اور یہ فرقہ بندیاں! یہ ہو کہ اس میں اختلاف نہیں۔ اس قدر اختلافات میں الجھے ہوئے ہوں اور ان اختلافات کو قائم رکھنے کی ہر کوشش کو جہاد فی سبیل اللہ اور خدمت دین قرار دے رہے ہوں؛ حالانکہ قرآن نے انہیں متنبہ کر دیا تھا کہ:۔

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۖ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۝ (۳۰-۳۱ / ۳۲)

(اور دیکھو!) کہیں مشرکین میں سے یعنی ان لوگوں میں سے جنہوں نے اپنے دین میں تفریق پیدا کر ڈالی اور الگ الگ گروہ بن بیٹھے۔ نہ بن جانا (پھر اس وقت حالت یہ ہو جایا کرتی ہے کہ) ہر فریق اپنے اپنے خیالات پر خوش ہوتا ہے اور اپنے آپ کو برسرِ حق اور دوسروں کو باطل پر سمجھ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتا ہے۔

جو ملت کی وحدت کو توڑ کر یوں فرقہ بندی کی لعنت میں گرفتار ہو جائے اس کے متعلق ارشاد فرمایا:

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ۚ إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝ (۶/۱۵۹)

(اے پیغمبر!) جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور الگ الگ گروہ بن گئے۔ تمہیں اُن سے کچھ سروکار نہیں (تمہاری راہ دینِ حقیقی کی راہ ہے۔ نہ کہ لوگوں کی بنائی ہوئی گروہ بندیوں کی راہ) اُن کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے) پھر وہی بتلائے گا کہ جو کچھ کرتے رہے ہیں اس کی حقیقت کیا تھی؟

سب اسی فطرتِ ابلیسی کے مظاہر ہیں لیکن اس کا کیا علاج کہ ابلیس نے قیامت تک کیلئے مہلت مانگ رکھی ہے سو یہ فطرتِ ابلیسی ہی ہے جو مختلف پردوں میں مختلف ادوار میں، گردش کرتی رہتی ہے ؎

بدل کے بھیس زمانہ میں پھر سے آتے ہیں
اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

ابلیس سے حفاظت اب سوال یہ ہے کہ ابلیس کی یورش سے حفاظت کا سامان کیا ہو؟ اس سے چھٹکارا کس طرح حاصل کیا جائے؟ مشرق کی رہبانیت نے اس کا آسان

علاج سوچ لیا کہ سر میں درد ہو تو سر کٹا دیا جائے۔ یعنی ابلیسی کش مکش سے تنگ آکر ترک دنیا اور ترک علائق پر اُتر آئے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ تو شکست خوردہ ذہنیت (Defeatist - mentality) کا ثبوت اور ضعف خودی کی دلیل ہے۔ یہ انتہائی یاس اور نا امیدی کا مظاہرہ ہے، جو ابلیس کا مقصد و منشاء ہے۔ اگر منشاء فطرت یہی ہوتا کہ انسان غاروں میں جا بیٹھیں تو کش مکش حیات کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اس صورت میں تو خلافت ارضی کے لئے آدم سے بڑھ کر فرشتے زیادہ موزوں تھے۔ عجمی تصوف کی بنیاد کا مسلک اس امر کا اعتراف ہے کہ اس باب میں (معاذ اللہ) خدا کا فیصلہ صحیح نہیں۔ یہ لوگ درحقیقت بہت سطح بین تھے۔

رہبانیت میں نہیں

انہوں نے سوچا ہی نہیں کہ انسانی خودی (نفس انسانی) کے عروج و ارتقاء کے لئے کش مکش زندگی۔ ابلیسی قوتوں سے مقابلہ۔ کس قدر ضروری ہے۔ یہ تصادم و تزاحم عین تقاضائے فطرت ہے۔ لہٰذا رہبانیت کی زندگی غیر فطری اور یہی انکار ذہن انسانی کی ایجاد ہے۔

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ ۝
.... فَآتَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ ۖ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ ۝ (۵۷/۲۷)

پھر ان کے بعد اور رسولوں کو یکے بعد دیگرے بھیجتے رہے۔ اور ان کے بعد ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا اور ہم نے اسے انجیل دی اور جن لوگوں نے اس کی پیروی کی ہم نے ان کے دلوں میں شفقت و مہربانی (کے پاکیزہ جذبات) پیدا کر دیئے رہ گئی رہبانیت سو اُسے انہوں نے خود ہی ایجاد کر لیا تھا۔ ہم نے ان پر فرض نہیں کی تھی۔ انہوں نے (اسے اختیار تو کیا تھا) حق تعالیٰ کی رضامندی کی خاطر (لیکن چونکہ ایک خود ساختہ چیز تھی۔ اس لئے) اس کی پوری پوری رعایت نہ رکھ سکے سو ان میں سے جو لوگ ایمان لائے۔ ہم نے ان کو ان کا اجر موعود دیا۔ مگر زیادہ تر ان میں سے نافرمان ہی ہیں۔

انہوں نے سوچا نہیں کہ کائنات کی حرارت زندگی تو قائم ہی اس کش مکش سے ہے۔

ہے گرمی آدم سے ہنگامۂ عالم گرم
سورج بھی تماشائی تارے بھی تماشائی

لہٰذا ایسی دنیا جس میں ابلیس کا وجود نہ ہو۔ انسانوں کی بستی نہیں رہ سکتی۔ بقول علامہ اقبال

مزی اندر جہانے کور ذوقے
کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

لہ ان امور کی تشریح اپنے مقام پر آئے گی۔ جہاں یہ بتایا جائے گا کہ مسلک رہبانیت کہاں سے شروع ہوا اور کیسے! اور پھر اس کے نتائج دعواقب کیا ہوئے۔

اسی لئے تو ابلیس کو قیامت تک کے لئے مہلت دیدی گئی ہے، کہ جب تک دنیا میں انسانی خودی کی شمشیر موجود ہے۔ اس کی جلا وبرندگی کے لئے فسان کی بھی ضرورت ہے۔

نہ ہی مغرب کی مادیت میں دوسری طرف مغرب کی مادہ پرستی ہے، کہ اس نے نظام زندگی پر یکسر ابلیس کو مسلط کر رکھا ہے جس کا نتیجہ عدم سکون اور فقدانِ طمانینت کی وہ جہنم ہے جس میں آج یورپ ہی نہیں بلکہ ہر وہ سرزمین مبتلا ہے جس پر اس کے ابلیسی نظام کا کچھ بھی پرتو پڑ چکا ہے (اور آج دنیا کا کونسا گوشہ ایسا ہے جو اس نظام کے اثرات سے محفوظ رہ سکا ہے؟) مغرب کے نظام میں ہوا یہ کہ

عقل ناپید دخ روی گزوشش صورت مار
عقل کو تابع فرمانِ نظر کر نہ سکا

لہذا یہ مسلکِ زندگی کسی طور بھی انسانوں کے شایانِ شان نہیں۔ اس میں تو ابلیس کا چیلنج پوری قوتوں کے ساتھ فاتح وبالادست بن کر اُبھر کر سامنے آگیا ہے۔ اس نے یہی کہا تھا کہ:

قَالَ فَبِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ ثُمَّ لَآتِيَنَّهُم مِّن بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَيْمَانِهِمْ وَعَن شَمَائِلِهِمْ ۖ وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ ۝ (۷/۱۶-۱۷)

اس پر ابلیس نے کہا "چونکہ تو نے مجھ پر (سعادت کی) راہ بند کر دی، تو اب میں بھی ضرور ایسا کروں گا کہ تیری سیدھی راہ سے بھٹکانے کے لئے بنی آدم کی تاک میں بیٹھوں۔ پھر سامنے سے، پیچھے سے، دائیں سے، بائیں سے (غرضکہ ہر طرف سے) ان پر آؤں؛ اور تو ان میں سے اکثروں کو شکر گذار نہ پائے گا۔

یہی وہ متبعینِ ابلیس ہیں جن کے متعلق اسی وقت کہہ دیا گیا تھا کہ

لَّمَن تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنكُمْ أَجْمَعِينَ ۝ (۷/۱۸ نیز ۳۸/۸۵)

بنی آدم میں سے جو کوئی تیری پیروی کرے گا، تو (وہ تیرا ساتھی ہوگا، اور) میں ایسا کروں گا کہ (پاداشِ عمل میں) تم سب سے جہنم بھر دوں!

تیسرا گروہ اب تیسرا گروہ باقی رہ گیا۔ یہ وہ گروہ ہے جس کے متعلق ابلیس کے چیلنج کے جواب میں کہدیا گیا تھا کہ جا، اپنی ساری قوتیں صرف کر دو۔ اپنا تمام لشکر دائیں بائیں سے یورش کر کے لے آؤ۔ لیکن:

إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِينَ ۝ (۱۵/۴۲)

جو میرے (مخلص) بندے ہیں اُن پر تیرا کچھ زور نہیں چلے گا۔ صرف انہی پر چلے گا جو (صحیح) راہ سے بھٹک گئے۔

دوسری جگہ ہے

وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَأَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ۚ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا ۝ إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ ۚ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ وَكِيلًا ۝ (۱۷/۶۴-۶۵)

ان میں سے جس کسی کو تو اپنی صدائیں سنا کر بہکا سکتا ہے بہکانے کی کوشش کرلے۔ اپنے لشکر کے سواروں اور پیادوں سے حملہ کر، ان کے مال و اولاد میں شریک ہو جا۔ ان سے (طرح طرح کی باتوں کے) وعدے کر، اور شیطان کے وعدے تو اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ سرتاسر دھوکا۔ جو میرے (سچے) بندے ہیں۔ اُن پر تو قابو پانے والا نہیں۔ تیرا پروردگار (اُن کی) کارسازی کے لئے بس کرتا ہے۔

یعنی جو لوگ قانونِ خداوندی کے مطابق نظامِ معاشرہ قائم کریں گے اُن پر ابلیس کا تسلط نہیں جم سکے گا۔ وہ ابلیس پر غالب رہیں گے۔ ابلیسی قوتیں سب ان کے زیرِ فرمان ہوں گی۔ علم۔ عقل۔ دولت۔ قوت۔ افراد کی کثرت۔ یہ تمام چیزیں سرکش و بیباک نہیں رہیں گی۔ یہ سب ان حدود کے اندر کارفرما رہیں گے جو قوانینِ خداوندی نے متعین کر رکھی ہیں۔

ابلیس کو "مسلمان" کر لیا جائے

ابلیس کو ہلاک نہیں کیا جا سکتا (اسے تو قیامت کے لئے مہلت مل چکی ہے) اُسے زیرِ تسخیر رکھا جائے گا۔ بالفاظِ دیگر اُسے "مسلمان" کر لیا جائے گا۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں۔[1]

علم را بے سوزِ دل خوانی شر است　　نور او تاریکی بحر و بر است
کشتنِ ابلیس کارے مشکل است　　زانکہ او گم اندر اعماقِ دل است
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی　　کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی
خویش را بہر اہرمن باید زدن　　تو ہمہ تیغ آں ہمہ سنگِ فسن

اپنے اندر اتنی قوت پیدا کی جائے جو تمام ابلیسی قوتوں کا مقابلہ کر سکے اور پھر اس قوت کے اجتماعی اثر سے ایسا نظام قائم کیا جائے جو قوانینِ الٰہیہ پر متشکل ہو۔ یوں ابلیس کو لگام دے کر تابع فرمان بنا لیا جائے۔ غور فرمائیے کہ وہ قوت کس قدر عظیم الشان اور کوہ شکن ہو گی جو ابلیس کے اشہبِ عناں گسیختہ کو زیرِ پالان لے آئے؟

یہ کیسے؟

یہ قوت سوائے قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے اور کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتی اور قوانینِ خداوندی کی اطاعت اس معاشرہ کے اندر کی جا سکتی ہے جو وحی کی رُو سے متشکل ہوتا ہے۔ افراد کے اندر وہ قوت جو ابلیسی کششوں کا مقابلہ

---

[1] ایک روایت میں ہے کہ نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمایا تھا کہ "میں نے اپنے شیطان کو مسلمان کر لیا ہے"۔

کر سکے، ایسی معاشرہ کے اندر پیدا ہو سکتی ہے۔ اس لئے جب آدم کے ساتھ ابلیس کو دنیا میں بھیجا گیا ہے تو بنی آدم سے کہہ دیا گیا تھا کہ۔

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی فَمَنْ تَبِعَ ھُدَایَ فَلَاخَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ (۲/۳۸)

لیکن (یاد رکھو) جب کبھی ایسا ہوگا کہ ہمارا ضابطہ ہدایت تم تک پہنچے گا تو تم میں سے جو کوئی اس کی پیروی کرے گا اس کے لئے کسی طرح کا کھٹکا نہیں کسی طرح کی غمگینی نہیں ہوگی۔

ابنِ آدم سے کہدیا گیا تھا کہ مت گھبراؤ۔ اگرچہ ابلیسی لشکر کا ساز و سامان بڑا خوفناک اور ہراس انگیز ہے۔ لیکن تمہیں ہم نے اکیلا نہیں چھوڑا، تمہیں ایک ایسی شمشیر سے مسلح کر دیا گیا ہے کہ طاغوتی قوتیں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ ؎

اگرچہ عقل فسوں پیشہ لشکرے انگیخت
تو دل گرفتہ نباشی کہ عشق تنہا نیست

یہ ہے وہ قوت جس کی بنا پر ایک عبدِ مومن ابلیس سے بھی سجدہ کرا لیتا ہے۔ یہ ہے وہ مقام جہاں پہنچ کر وہ علیٰ وجہ البصیرت کہہ سکتا ہے کہ کس قدر صحیح ہے یہ فرمان کہ وَسَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَمِیْعًا ؕ

ایسی تسخیرِ فطرت جس میں ابلیس انسان سے قدم قدم پر سجدے کرائے۔ حکومت نہیں محکومیت ہے۔ اصلِ حکومت تو اس میں ہے کہ تمام ابلیسی قوتیں سر جھکائے منتظر فرامین کھڑی ہوں۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب انسان "اِنَّ عِبَادِیْ" کے گروہ میں شامل ہو جائے۔ اللہ کا محکوم، اور ساری کائنات کا حاکم؛ یعنی جب انسان ایسا معاشرہ قائم کرے جس میں قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر ہو۔

قصۂ آدم کے علاوہ قرآن کریم میں دو جگہ اور بھی ابلیس کا ذکر آیا ہے۔ ایک سورۂ شعراء میں۔ جہاں فرمایا کہ۔

وَجُنُوْدُ اِبْلِیْسَ اَجْمَعُوْنَ ؕ (۲۶/۹۵)

اور ابلیس کے لشکر سب کے سب۔

دوسرے سورۂ سبا میں۔ جہاں فرمایا کہ اہلِ سبا نے اپنے اوپر ظلم کیا جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے انہیں مٹا کر اُن کی فقط داستانوں کو باقی رکھا۔ اس طرح ابلیس کا خیال اُن کے متعلق پورا ہو کر رہا۔

وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَیْھِمْ اِبْلِیْسُ ظَنَّہٗ فَاتَّبَعُوْہُ اِلَّا فَرِیْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ؕ (۳۴/۲۰)

اور واقعی ابلیس نے ان لوگوں کے بارہ میں اپنا گمان صحیح پایا کہ یہ سب اسی کی راہ پر ہو لئے۔ مگر ایمان والوں کا گروہ۔

ابلیس جنات میں سے!

سورۂ کہف میں ابلیس کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ جنوں میں سے تھا۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ (۱۸/۵۰)

اور جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا تھا "آدم کے سامنے جھک جاؤ" اور سب جھک گئے تھے مگر ابلیس نہیں جھکا تھا۔ وہ جن میں سے تھا۔

ابلیس کے متعلق ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس کی تخلیق آگ سے ہوئی تھی۔ جنات کے متعلق قرآن میں ہے کہ انہیں انسان سے پہلے آگ سے پیدا کیا۔

وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ٥ (۱۵/۲۷)

اور ہم جان کو اس سے پہلے جلتی ہوئی ہوا کی گرمی سے پیدا کر چکے تھے۔

(جنات کی تفصیل ذرا آگے چل کر آئے گی) اس مقام پر صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ ہمارے ہاں جو یہ عقیدہ رائج ہے کہ ابلیس بھی ملائکہ میں سے تھا بلکہ معلم الملکوت (فرشتوں کا استاد) تھا' وہ غلط تھا۔ ابلیس فرشتوں میں سے نہیں تھا۔ قرآن کریم نے جہاں کہا ہے کہ

ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ٥ (۷/۱۱)

پھر (وہ وقت آیا کہ) فرشتوں کو حکم دیا "آدم کے آگے جھک جاؤ" اس پر سب جھک گئے۔ مگر ابلیس کہ جھکنے والوں میں سے نہ تھا۔

تو اس کے یہ معنی نہیں کہ "ابلیس کے سوائے اور ملائکہ نے سجدہ کر دیا" عربی زبان میں اس قسم کے اِلَّا (سوائے) کو استثنائے منقطع کہتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس چیز کو مستثنیٰ کیا گیا ہے وہ اس جنس میں سے نہیں ہے جس سے اُسے مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ جیسے ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ (مثلاً) پھل تو سب آ گئے ہیں لیکن مٹھائی ابھی تک نہیں آئی۔ لہذا اس کے معنی ہیں کہ فرشتوں نے تو سب کے سب نے سجدہ کر دیا۔ لیکن ابلیس نے سجدہ نہیں کیا۔ واضح رہے کہ ابلیس کو بھی سجدہ کا حکم اسی طرح دیا گیا تھا جس طرح فرشتوں کو دیا تھا۔

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ٥ (۷/۱۲)

خدا نے کہا "کس بات نے تجھے جھکنے سے روکا جب کہ میں نے حکم دیا تھا؟" کہا "اس بات نے کہ میں آدم سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اسے مٹی سے۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے ملائکہ اور ابلیس درحقیقت ان قوتوں کے مظاہر ہیں جو عالم النفس و آفاق میں عمل پیرا ہیں۔

عالمِ آفاق کی تمام قوتیں انسان کے لئے مسخر کر دی گئیں۔ لیکن عالم انفس (انسان کی داخلی دنیا) میں ایسی قوت بھی ہے جو خود اس کے ارتقائے ذات کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔ اسے ابلیسی قوت کہا جاتا ہے۔ اور چونکہ اس قوت کو مجبور نہیں پیدا کیا گیا (جس طرح خارجی کائنات کی قوتیں خاص قوانین کے مطابق کام کرنے کے لئے مجبور پیدا کی گئی ہیں) اس لئے اس کے متعلق کہا گیا کہ اس نے انسان کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔ اب انسان کا کام یہ ہے کہ اس سرکش قوت کو اپنے سامنے جھکالے۔ یہ ہے منصبِ انسانیت۔ جس نے ایسا کر لیا اس کی خودی میں استحکام اور شرفِ انسانیت میں بالیدگی پیدا ہو گئی۔ جو اس قوت سے دب گیا اس کے جوہر انسانیت فنا ہو گئے۔ [باقی رہا یہ کہ ابلیس جنوں میں سے کس طرح تھا؟ سو اس کے لئے جنات کی تفصیل دیکھئے جو ذرا آگے چل کر سامنے آجائے گی]

ابلیس مایوسی کا مظہر ہے

لفظ ابلیس کو پھر دیکھئے۔ اس کے مادہ (ابلاس) سے ظاہر ہے کہ یہ انتہائی مایوسی کا مظہر ہے۔ سب سے بڑی ابلیسیت جس کا مقابلہ انسان کو کرنا ہے یاس اور ناامیدی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی نام ہی امید و آرزو کا ہے۔ جب تک کسی سینہ میں آرزو کی کرن موجود ہے زندگی کی رمق باقی ہے۔ آرزوؤں کے فنا ہو جانے کا نام موت ہے۔ زندہ رہنے کی امید اور آگے بڑھنے کی آرزو ہی ہے جس سے انسان کی خودی میں ارتقاء اور اس کے جوہر خفتہ میں بیداری پیدا ہوتی ہے۔

زندگانی را بقا از مدعا است   کاروانش را درا از مدعا است

زندگی در جستجو پوشیدہ است   اصلِ او در آرزو پوشیدہ است

آرزو جانِ جہانِ رنگ و بو است   فطرتِ ہر شے امینِ آرزو است   (اقبالؒ)

زندگی یہ ہے کہ انسان کے سامنے ایک درخشندہ نصب العین ہو اور اس نصب العین کے حصول کی تڑپ برقِ تپاں کی صورت میں رگ و پے میں جاری و ساری۔ کائنات کی تمام رنگینیاں نقطۂ آرزو کے اندر پوشیدہ ہیں۔ سفرِ حیات میں جہاں یاس و ناامیدی نے غلبہ پا لیا انسان پر عملاً موت طاری ہو گئی۔ ابلیس کا سب سے بڑا مشن یہ ہے کہ انسان پر یاس و ناامیدی طاری کر دے۔ اس کے جنود و عساکر (انواع و اقسام کے شیاطین) ایسے اسباب پیدا کرتے رہتے ہیں جن سے اس پر خوف مسلط ہو جائے۔ اس کے حوصلے پست اور ولولے سرد پڑ جائیں۔ اس پر خوف و حزن طاری ہو جائے اور یہ جی چھوڑ کر کشمکشِ حیات سے کنارہ کش ہو جائے۔ مایوسیوں کی ان ظلمت خیز گھٹاؤں میں یا تو انسان چپ چاپ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کسی گوشۂ تنگ و تاریک میں سر بزانو بیٹھ جاتا ہے۔ اور یا (بعض اوقات) شدتِ یاس و غم سے مغلوب ہو کر تخریب پر اتر آتا ہے اور اپنے مقاصد کی جو عمارت برسوں کے پسینہ اور خون سے بہزار مشقت تیار کی تھی اسے خود اپنے ہاتھوں سے توڑ پھوڑ کر خاک میں ملا دیتا ہے۔ کسی گوشۂ تیرہ و تار

میں سربزیری ہو یا اس قسم کی حرکتِ مذبوحی - بہرحال دونوں شدتِ یاس اور فرطِ نا امیدی کے مظاہر ہیں - یہ وہ وقت ہوتا ہے جب ابلیس اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر انسان پر ہنستا ہے - مایوسیوں کی اس تاریکی میں اگر کہیں سے شعاعِ امید نظر آسکتی ہے تو وہ ایمان کی شمع فروزاں ہے جو ان بھیانک اور سیاہ بادلوں پر جگمگاتے نقرئی حروف میں لکھ دیتی ہے کہ :-

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ○ (۳/۱۳۹)

اور دیکھو، نہ تو ہمت ہارو، نہ غمگین ہو، تم ہی سب سے برتر و اعلیٰ ہو - بشرطیکہ تم مومن ہو -

ایمان کے معنی ہیں اپنے نصب العین کی صداقت پر یقینِ محکم - اور مومن اسے کہتے ہیں جس کے اس یقین میں دنیا کی بڑی سے بڑی مشکل، ذرا سی لغزش نہ پیدا ہونے دے - ایمان کی روشنی میں یہی وہ شمعِ تابندہ تھی جس کا وعدہ آدم سے کیا گیا تھا - جب اس سے کہا گیا تھا کہ دنیا میں جاؤ اور پوری قوت سے ابلیس کے حربوں کا مقابلہ کرو - یاد رکھو تم تنہا نہیں ہو -

فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲/۳۸)

لیکن یاد رکھو، جب ایسا ہو گا کہ ہماری طرف سے تمہارے پاس ضابطۂ حیات آئے گا تو تم میں سے جو کوئی اس ضابطہ کی پیروی کرے گا اس کے لئے نہ کسی طرح کا کھٹکا ہو گا نہ کسی طرح کی غمگینی -

اس کا علاج

ابلیس کے جنود و عساکر سے خوف اور اپنی امیدوں کی موت سے حزن دونوں ایمان کی کمزوری کی دلیل اور ضعفِ خودی کا مظاہرہ ہیں - ایمان کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ خوف اور حزن پاس نہ پھٹکنے پائیں - یہی وہ مقام ہے جس کے متعلق ابلیس سے کہہ دیا گیا تھا کہ جاؤ - اپنا سارا زور لگا کر دیکھ لو -

إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ (۱۵/۴۲)

میرے بندوں پر تیرا قبضہ نہیں ہو سکے گا -

شمعِ ایمانی کا ایک لمعہ

ذرا تصور میں لائیے وہ وقت کہ چاروں طرف سے مخالفوں کے ہجوم نے گھیر رکھا ہے - گھر بار چھوڑ کر ایک ویرانے پہاڑ کے مہیب غار میں چھپے بیٹھے ہیں - تعاقب کرنے والوں کے گھوڑوں کی ٹاپ کی آوازیں کانوں میں آرہی ہیں - دشمن اپنے پورے سامانِ ہلاکت کے ساتھ قریب سے قریب تر ہوتے چلے آرہے ہیں - یہ بالکل بے ساز و سامان، دشمن کی عین زد میں آچکے ہیں - نظامِ حفاظت کا کوئی سامان اور مدافعت کا کوئی ذریعہ موجود نہیں - گویا ابلیس کا پورا لشکر اپنی ساری قوتوں کے ساتھ طوفانِ بلا کی طرح امنڈے چلا آرہا ہے - ایک دوست دوسرے کی پیشانی پر کچھ تردد کے آثار محسوس کرتا ہے -

اس کا یہ تردد اپنی خاطر نہیں بلکہ اس ذات اقدس و اعظم کی خاطر ہے جو دنیا کی ہر شئے سے محبوب ہے کہ ایسے میں ایمان کی پوری قوتوں کے ساتھ، زندہ امیدوں اور تابندہ آرزوؤں کی ایک دنیا جلو میں لئے اس رفیق شفیق کے قلب مطمئنہ سے یہ جاں بخش آواز آتی ہے کہ

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (۹)

غمگین نہ ہو یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

یہ ہے وہ "مقام عبدیت" جس کا ذکر اوپر کی آیت میں کیا گیا ہے

دوسری طرف ابلیس کی سرکشی پر غور کیجئے جس انداز سے قرآن کریم میں اس کا قصہ مذکور ہے اس سے صاف ظاہر ہے۔ اسے اپنے غلبۂ و استیلاء پر کس قدر ناز ہے۔ اس کے بعد سوچئے کہ انسان جس کا منصب حیات یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں کش مکش حیات کے ہر معرکہ میں ابلیس کی قوت کو اس طرح شکست دے کہ اس کی ہڈیاں چٹخنے لگ جائیں کتنی بڑی قوتوں کا مالک بنایا گیا ہے۔ لیکن یہ قوتیں صرف ایمان اور اعمال صالحہ سے بیدار ہوتی ہیں۔ وہ اعمال جو اس میں یہ صلاحیت پیدا کردیں، کہ دنیا کی بڑی سے بڑی ابلیسی قوت اس کے سامنے آئے لیکن جب یہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کی طرف ہاتھ بڑھائے تو اس پر لرزہ طاری ہو جائے۔ اس کا کلیجہ کانپ اٹھے، اسے آگے بڑھنے کی جرأت نہ ہو، وہ میدان چھوڑ کر پہاڑوں کے غاروں میں منہ چھپاتا پھرے۔ یہ ہے ابلیس کے مقابلہ میں ایک مرد مومن کا مقام!

ابلیس اور ہم!

لیکن کیا آج کا مسلمان بھی اس مقام کا دعویدار ہو سکتا ہے۔ وہ مسلمان جس کی حالت یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی طاغوتی قوتوں کے سامنے بھی سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ ابلیس کی قوت کے تصور سے اس کی روح کانپ اٹھتی ہے۔ ابلیسی نظام اپنے پورے دبدبہ و جلال سے دنیا پر چھا رہا ہے اور یہ اس کے ماتحت نہایت اطمینان سے زندگی بسر کئے جا رہا ہے۔ قرآن نے کہا تھا کہ جب ابلیس کا مقابلہ ہو تو فوراً اپنے آپ کو تائید و نصرت خداوندی کی پناہ میں لے آیا کرو جو اس کے قوانین کی اطاعت سے حاصل ہوتی ہے لیکن یہ پناہ آج (اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ) کے الفاظ دہرانے تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ نتیجہ یہ کہ آج ابلیس کو کسی تردد کی ضرورت ہی نہیں۔ ہم خود لپک کر اس کے دام میں گرفتار ہونے کے لئے چلے جاتے ہیں۔

صید خود صیاد را گوید بگیر
الاماں از بندۂ فرماں پذیر

ہم تو ابلیسانہ کشش و جاذبیت کے ذرا سے فریب اور اس کی تخویف و ترہیب کی چھوٹی سی دھمکی کے بھی حریف نہیں ہو سکتے چہ جائیکہ اس کی قہرمانی قوتوں کو استحقار کی ہنسی سے ٹھکرا کر رکھ دیں۔ ابلیس کی فرعونی قوتوں کا تو تقاضا ہے کہ اس کے مقابلہ میں کوئی فولادی پنجے والا مرد مومن آئے جس سے دو ہاتھ کرنے میں اسے بھی لذت پیکار ملے۔ ان

مٹی کے پتلوں سے زور آزمائی میں اسے کیا لذت مل سکتی ہے؟ اسی لئے اُس نے ربالفاظ علامہ اقبالؒ) بحضور رب العزت" فریاد" کی ہے کہ ؎

آں چناں تنگ از فتوحات آمدم پیشِ تو بہرِ مکافات آمدم
منکرِ خود از تومی خواہم بدہ سوئے آں مردِ خدا راہم بدہ
بندہ ای باید کہ پیچد گردنم لرزہ اندازد نگاہش در تنم
اے خدا، یک زندہ مردِ حق پرست لذتے شاید کہ یابم در شکست

لیکن آج ایسا بندۂ حق پرست کہاں سے ملے؟ اس قسم کے مردانِ خود آگاہ و خدا مست صرف اس معاشرے میں پیدا ہو سکتے ہیں جو قوانینِ خداوندی کی رو سے متشکل کیا جائے اور ایسا معاشرہ آج اس وسیع و عریض زمین کے کسی چپہ بھر گوشے میں بھی موجود نہیں ہے۔ اس لئے آج ساری دنیا پر ابلیسی نظام ہی مسلط ہے۔ یعنی وہ نظام جس میں عقلِ انسانی اس کے جذبات کی لونڈی بن کر رہ گئی ہے اور زندگی کا مقصد رہ گیا ہے ان حیوانی جذبات کی تسکین۔ انسانیت اور اس کے شرف کا دنیا میں کہیں نام نہیں ہے اس لئے دنیا میں کہیں احترام آدمیت نہیں۔

جن

جیسا کہ ہم ابھی ابھی دیکھ چکے ہیں! ابلیس کے متعلق کہا ہے کہ:۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ؕ کَانَ مِنَ الْجِنِّ (۱۸/۵۰)

اور جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا تھا" آدم کے آگے جھک جاؤ" اور سب جھک گئے تھے مگر ابلیس نہیں جھکا تھا وہ جن میں سے تھا۔

اور یہ بھی کہ اس کی پیدائش آگ سے ہوئی تھی۔

قَالَ مَا مَنَعَکَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُکَ ؕ قَالَ اَنَا خَیْرٌ مِّنْہُ ۚ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَہٗ مِنْ طِیْنٍ ۝ (۷/۱۲)

خدا نے فرمایا "کس بات نے تجھے جھکنے سے روکا جبکہ میں نے حکم دیا تھا؟" کہا " اس بات نے کہ میں آدم سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا۔ اسے مٹی سے"۔

دوسرے مقام پر ہے کہ اللہ نے جان (جن) کو آگ سے پیدا کیا۔

وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ﴿۵۵/۱۵﴾

اور جنات کو خالص آگ سے پیدا کیا۔

اور انسان کو اُن کے بعد پیدا کیا۔

وَالْجَانَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ﴿۱۵/۲۷﴾

اور ہم جان کو اس سے پہلے جلتی ہوئی ہوا کی گرمی سے پیدا کر چکے تھے۔

جن۔ ایک آتشیں مخلوق

ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ جن ایک آتشیں مخلوق تھی جسے اللہ نے انسان سے پہلے پیدا کیا تھا۔ یعنی ایسی مخلوق جس میں انسان کی نسبت حرارت زیادہ تھی۔ اسی اعتبار سے اس مخلوق کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ آگ سے پیدا ہوئی تھی۔ جس طرح انسان کے متعلق کہا ہے کہ وہ مٹی سے پیدا ہوا ہے۔ ابلیس کے متعلق اس کی خوئے سرکشی کی وجہ ہی سے کہا گیا ہے کہ وہ جنوں میں سے تھا۔ (مزید تفصیل شیطان کے عنوان میں ملیگی)

لفظ جن کے معنی ہیں پوشیدہ۔ مستور۔ نگاہوں سے اوجھل۔ غیر مرئی۔ جب یہ کرۂ ارض سورج سے الگ ہوا ہے تو ایک پگھلا ہوا آتشیں مادہ تھا۔ قرنہا قرن کے بعد فضا کی برودت سے اس کا اوپر کا حصہ سخت ہونا شروع ہوا۔ جیسے دودھ پر بالائی جم جاتی ہے۔ لیکن نہ معلوم اس کرۂ نار کو کس قدر طویل المیعاد مراحل سے گزرنا پڑا کہ بالآخر یہ ذی نفوس آبادی کے قابل ہوا۔ تبدل و تحول کے ان ابتدائی ادوار میں یہاں کس قسم کی مخلوق تھی جسے اس کی آتشیں فضا سازگار تھی۔ اس کا ہمیں علم نہیں۔ لیکن وہ مخلوق اب ہماری نگاہوں سے مستور کر دی گئی۔ اس کی جگہ انسانی آبادی نے لے لی۔ اس مخلوق سے آج ہمارا تعلق اس کے سوا اور کچھ معلوم نہیں کہ قرآن کریم نے اس کا ذکر کیا ہے جس پر ہمارا ایمان ہے۔ لیکن ذہن انسانی جب اپنے عہد طفولیت میں تھا تو اس کی حالت عجیب تھی۔ وہ ہر اُس قوت کو جو نگاہوں سے اوجھل ہو اور ہر اُس مافوق الفطرت واقعہ کو جس کا سبب بظاہر معلوم نہ ہو سکے۔ خارقِ عادت سمجھ کر اس سے خوف کھانے لگتا اور اس کے مُضر اثرات سے محفوظ رہنے کے لئے اس کی خوشامد کرتا۔ جس کا اظہار پرستش کی صورت میں کیا جاتا۔ بادل کی گرج۔ بجلی کی کڑک۔ بارش۔ زلزلے اور اسی قسم کے دیگر حوادث و واقعات جن کی علت و حقیقت اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی اس کی عقل و ہوش کو چکر میں ڈال دینے کے لئے کافی تھے۔ وہ ان غیر مرئی حوادث کو مافوق الفطرت قرار دیتا۔ انہیں دیوتا (دیو) سمجھتا۔ اور ان کی پرستش کرتا۔ اسی طرح ایسے اعصابی امراض (مثلاً مرگی، ہسٹیریا وغیرہ) جن میں مریض بے ہوش ہو کر طرح طرح کی حرکتیں یا باتیں کرنے لگتا اس کے لئے سامانِ خوف و ہراس پیدا کر دیتے۔ وہ سمجھ نہیں سکتا تھا کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ (وہ تو خیر پھر بھی ذہن

انسانی کا بچپن کا زمانہ تھا۔ آج بھی ہسٹریا کا دورہ دیکھنے والوں کے لئے خوف اور حیرت کے عجیب و غریب سامان پیدا کر دیتا ہے) لامحالہ وہ یہی سمجھتا کہ یہ بھی کسی دیوی۔ دیوتا (چھپی ہوئی قوت) کا کارنامہ ہے۔ یہ تھی اس توہم پرستی کی ابتدا۔ رفتہ

بھوت پریت!

رفتہ ذہن انسانی کے کارخانے میں ان پوشیدہ قوتوں کے مجسمے ڈھلنے شروع ہوئے (کہ ذہن انسانی کا ہر تصور ایک محسوس پیکر کی صورت اختیار کر لیتا ہے) اور آہستہ آہستہ ان کے جداگانہ نام تجویز ہوئے اور الگ الگ کام ان کی طرف منسوب کئے گئے جن۔ بھوت۔ دیو۔ چڑیل۔ پری ارواح خبیثہ اور نہ معلوم کیا کیا خرافات چونکہ (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) ان کی طرف مافوق الفطرت قوتیں منسوب کی گئیں اس لئے ان کی پرستش بھی شروع ہو گئی۔ اس کی ابتدا تو انسان کے ابتدائی مراحل زندگی میں ہوئی۔ لیکن جیسا کہ ہر مسلک کے ساتھ ہوتا چلا آیا ہے۔ چونکہ یہ سلسلہ بھی مختلف اقوام میں نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلا آیا اس لئے جہالت آمیز ملکوں اور قوموں میں یہ باتیں آج تک اسی طرح چلی آ رہی ہیں۔ نزول قرآن کریم کے وقت عرب میں بھی یہی حالت تھی۔

سورۃ انعام میں ہے۔

وَجَعَلُوا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ
سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ (۱۰۰/۶)

اور (دیکھو) ان لوگوں نے خدا کے ساتھ جنوں کو (طاقت و تصرف میں) شریک ٹھہرا لیا ہے۔ حالانکہ (یہ مانتے ہیں کہ تمام مخلوقات کی طرح) انہیں بھی خدا ہی نے پیدا کیا ہے اور انہوں نے بغیر اس کے علم کی روشنی اپنے سامنے رکھتے ہوں۔ خدا کے لئے بیٹے اور بیٹیاں بھی تراش لی ہیں۔ خدا کی تقدیس ہو! اس کی ذات تو ان تمام باتوں سے پاک اور بلند ہے جو یہ اس کی نسبت بیان کرتے ہیں۔

سورۂ سبا میں ہے۔

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ
بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ۝ (۴۱/۳۴)

وہ کہیں گے کہ تو پاک ہے ہمارا کارساز (اور آقا) تو ہی ہے۔ یہ نہیں۔ بلکہ یہ لوگ تو جنات کی پرستش کیا کرتے تھے ان میں سے اکثر لوگ انہیں کے معتقد تھے۔

(وہ دیگر دیوی۔ دیوتاؤں کی طرح) ان میں اور خدا میں رشتے بھی قائم کر لیتے

وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ؕ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ۝ (۱۵۸/۳۷)

اور ان لوگوں نے اللہ میں اور جنات میں رشتہ داری (بھی) قرار دے رکھی ہے۔ حالانکہ جنات خود جانتے ہیں کہ وہ بھی احتساب میں لائے جائیں گے۔

یہ تو دورِ جاہلیت کی باتیں تھیں۔ لیکن خود مسلمانوں نے ان خرافات سے کس قدر اثر قبول کیا ہے۔ اس کا اندازہ لگانا ہو تو ایک نظر جھانکئے کسی خانقاہ کے گوشے، کسی اونچی قبر کے سرہانے، کسی "صاحبِ مجاز" کے تعویذ خانے یا کسی "عامل قرآن" کے عمل میں۔ اور پھر دیکھئے کہ یہ قوم جسے اللہ تعالیٰ نے ایسی عالمتاب روشنی عطا فرمائی تھی تو ہم پرستیوں کے کن کن ظلمت کدوں میں ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ یورپ نے تنہا عقل کے جگنو کی روشنی سے ان اوہام و اباطیل سے نجات حاصل کر لی۔ لیکن جن کے صحن خانہ میں آفتاب ضوفشاں ہے وہ چمگادڑ کی طرح اپنی آنکھیں بند کئے اندھوں کی دنیا میں بس رہے ہیں۔

انسانی جنات

چونکہ جن کے معنی تھے پوشیدہ اور اس کا تصور ذہن کو بڑی تند آور، دیو ہیکل، اشتلم صفت مخلوق کی طرف منتقل کرتا تھا۔ اس لئے عربی زبان میں ایسے وحشی قبائل پر جو آبادیوں سے دور صحراؤں اور جنگلوں میں رہتے تھے اور شہری لوگوں سے زیادہ طاقتور اور ڈیل ڈول میں زیادہ توی اور مضبوط تھے لفظ جن کا اطلاق کیا جاتا تھا۔ اس اعتبار سے مہذب اور غیر مہذب۔ حضری اور بدوی (شہری اور جنگلی) کی تمیز کیلئے انس (باہمی موانست سے رہنے والے) اور جن کے الفاظ استعمال ہونے لگے۔ آج جبکہ ذرائع رسل و رسائل کی عام فراوانی کی وجہ سے شہری تمدن کے اثرات دور دراز دیہات حتیٰ کہ خانہ بدوش قبائل (Nomadic tribes) تک جا پہنچے ہیں شہری اور بدوی آبادیوں کے طرزِ تمدن۔ نفسیاتی کیفیات۔ سیاسی احوال و ظروف۔ رجحانات قلبی و ذہنی وغیرہ میں کچھ زیادہ فرق نہیں رہا۔ لیکن اس زمانہ میں یہ فرق ایسا گہرا اور دونوں کی درمیانی خلیج اتنی وسیع تھی کہ یہ امتیازی خط ایک خاص اہمیت رکھتا تھا۔ قرآن کریم میں جن و انس کے الفاظ ان ہی معانی میں استعمال ہوئے ہیں۔ قصۂ حضرت سلیمانؑ کے ضمن میں فرمایا:-

وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ‎(۲۷/۱۷)

اور سلیمان کے لئے اس کے لشکر جنوں، انسانوں اور پرندوں (یا قوم طیر) سے اکٹھے کئے گئے اور انہیں (حاضری

---

[۱] یہیں تک ہی نہیں بلکہ قیامت تو یہ ہے کہ بڑے بڑے ارباب علم بھی ابھی اوہام پرستی کے چکر میں مبتلا ہیں۔ "فلاں مکتب میں ایک جن پڑھتا تھا۔ ایک دن وہ بچوں کے ساتھ کھیلتا کھیلتا مسجد کی بدھنی میں جا چھپا۔ جب اس کا راز یوں فاش ہو گیا تو حضرت...... نے فرمایا کہ اب تمہیں یہاں سے چلے جانا چاہیئے۔ یہ اور اسی قسم کے واقعات بڑے بڑے ارباب علم و فضل کی طرف منسوب ہیں اور ان سے ان کی بزرگی اور عظمت کی دلیل لائی جاتی ہے۔ ع ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے

قرآن کریم سے جنات کے متعلق ایسی باتوں کی کوئی سند نہیں ملتی۔

کے لیے بیجا لمفرا کیا جاتا تھا۔

جیسا کہ حضرت سلیمانؑ کے تذکرہ میں تفصیلی طور پر لکھا جائے گا۔ یہ جنات پہاڑی اور جنگلی علاقوں کے دیو ہیکل، مضبوط اور توانا سرکش قبائل تھے جنہیں حضرت سلیمانؑ نے اپنے محلات اور۔ بالخصوص ہیکل) کی تعمیر کے کاموں پر لگا رکھا تھا۔ بنی اسرائیل، حاکم قوم کے افراد تھے۔ اس لیے انہیں اس قسم کے مزدورانہ کاموں پر نہیں لگایا جاتا تھا۔ ان کاموں کے لیے غیر اسرائیلی اجنبی لوگ (foreigners) منگلئے جاتے تھے۔ یہ قوی، سرکش۔ اجنبی لوگ جن کے نام سے پکارے گئے ہیں۔ ان ہی میں کا ایک دیو ہیکل جن تھا جس نے کہا تھا کہ ملکہ سبا کا تخت آن کی آن میں لیے آتا ہوں۔ اس لئے کہ وہ قوی بھی تھا اور قابلِ اعتماد بھی۔

قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ (۲۷/۳۹)

ایک قوی ہیکل جن نے جواب میں عرض کیا کہ میں اس کو آپ کی خدمت میں حاضر کر دوں گا قبل اس کے کہ آپ اپنے اجلاس سے اٹھیں۔ اور میں اس پر پوری پوری قدرت رکھتا ہوں۔ اور اس کی حفاظت بھی کر سکتا ہوں۔

سورہ سبا میں ان مختلف کاموں کا ذرا تفصیلی تذکرہ بھی آیا ہے جن پر ان وحشی قبائل کے افراد مامور تھے۔

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ ۭ وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ...... اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ۭ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ (۳۴/۱۲-۱۳)

اور سلیمان کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا کہ اس ہوا کی صبح کی منزل ایک مہینہ بھر کی راہ) ہوتی اور اس کی شام کی منزل ایک مہینہ بھر کی (یعنی ان ہواؤں کے زور اور رُخ سے حضرت سلیمان کے جہاز مہینوں کا سفر دنوں میں طے کر لیتے) اور ہم نے اس کے لئے تانبے کا چشمہ بہا دیا۔ جنات (وحشی قبائل) کا ایک گروہ اس کے ماتحت خدمت گزاری پر تعین تھا اس کے رب کے حکم سے۔ اور ان میں سے جو شخص ہماری حکم عدولی کرتا اسے ہم سلیمان کے ہاتھوں سخت سزا دلواتے۔ وہ جنات سلیمان کے لیے اس کے حسب منشا چیزیں بناتے بڑی بڑی عمارتیں اور مورتیں اور لگن (ایسے بڑے) جیسے حوض اور بڑی بڑی، دیگیں جو ایک ہی جگہ جمی رہیں۔ (ہم نے کہہ رکھا تھا کہ) اے داود کے خاندان والو تم سب شکریہ میں نیک کام کیا کرو۔ اور میرے بندوں میں شکر گزار کم ہی ہوتے ہیں۔

ان ہی کو دوسرے مقام پر ان کی سرکشی اور شعلہ مزاجی کی بنا پر شیاطین کہا گیا ہے۔ یعنی سرکش لوگ۔

وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمْ

حٰفِظِیْنَ o (21/82)

اور سرکش قبائل کے افراد جو ان کے لئے غوطے لگاتے اور اس کے لئے اور بھی طرح طرح کے کام کرتے اور ہم انہیں اپنی پاسبانی میں لئے ہوئے تھے

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے ان تمام امور کی تشریح حضرت "سلیمان" کے عنوان میں ملے گی

دعوت انبیاء کرام کے دشمن

سورۂ انعام میں ہے کہ جن و انس (شہری اور بدوی آبادیوں کے سرکش و شریر انسان) حضرات انبیاء کرام کی دعوت الی الحق کے دشمن ہوا کرتے تھے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ (6/112)

اور (اے پیغمبر!) اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے (جب اس کی دعوت کا ظہور ہوا تو) انسانوں اور جنوں میں سے شیاطین (سرکش لوگوں) کو دشمن ٹھہرا دیا، جو ایک دوسرے کو خوشنما باتیں سکھاتے تاکہ لوگوں کو فریب دیں۔ اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو (یقیناً ایسا کر سکتا تھا کہ وہ دشمنی نہ کرتے (مگر چونکہ انسان کو صاحب اختیار پیدا کیا گیا ہے اس لئے ہم اس کے ارادے کو سلب نہیں کرنا چاہتے) پس (ان کی مخالفت سے دل گرفتہ نہ ہو اور انہیں ان کی افتراپردازیوں میں چھوڑ دو۔

اسی سورت میں ذرا آگے چل کر ارشاد ہے:-

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ۚ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَقَالَ اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ؕ قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ o (6/128)

اور (دیکھو) اس دن کیا ہوگا جب خدا ان سب کو ایک جا جمع کرے گا اور (کہے گا) "اے گروہ جن! تم نے گروہ انس میں سے بڑی تعداد اپنے ساتھ لی" اور گروہ انس (میں) سے جو لوگ ان کے رفیق و مددگار ہیں وہ اعتراف حقیقت پر مجبور ہو کر کہیں گے "اے پروردگار! ہم واقعی ایک دوسرے سے بہت فائدہ اٹھاتے رہے اور (بالآخر) مقررہ میعاد کی اس منزل تک پہنچ گئے جو تو نے ہمارے لئے ٹھہرا دی تھی۔ (اب ہماری قسمتوں کا فیصلہ تیرے ہاتھ ہے" (خدا کہے گا) "تمہارا ٹھکانا جہنم ہے۔ اسی میں ہمیشہ رہو گے۔ بجز ان کے جنہیں ہم (ان کے اعمال کی بدولت) نجات دینا چاہیں۔ (اے پیغمبر!) بلاشبہ تمہارا پروردگار (اپنے کاموں میں) حکمت رکھنے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

یہ کہ جن و انس سے مراد انسانوں ہی کے دو گروہ ہیں۔ دوسرے مقامات سے اور بھی زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ سورۂ

ہود میں ہے۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ۝ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝ (ہود ۱۱۸ - ۱۱۹ ۔ نیز ۳۲/۱۳)

اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک اُمّت بنا دیتا (یعنی سب ایک ہی راہ چلتے۔ لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ اس نے ایسا نہیں چاہا بلکہ انسان کو اختیار دار ادہ دیا جس سے یہاں الگ الگ گروہ اور الگ الگ راہیں ہیں) اور لوگ ایسے ہی رہیں گے کہ مختلف ہوں۔ مگر ہاں جو ندکے قانونِ ربوبیت کے مطابق اس کی رحمت کے سائے میں آجائے۔ اور اُن کی پیدائش ہی ایسی رکھی گئی ہے۔ اور (پھر دیکھو اسی اختلاف فکر و عمل کا نتیجہ ہے کہ تمہارے پروردگار کی ٹھہرائی ہوئی) بات پوری ہو کر رہی کہ البتہ ایسا ہوگا کہ میں جہنم کو کیا جن اور کیا انس سب سے بھرپور کر دوں۔

دیکھئے۔ پہلی آیت میں لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً فرمایا۔ یعنی اگر اللہ مناسب سمجھتا تو نوعِ انسانی کو اس طرح امّتِ واحدہ بنا دیتا کہ وہ آپس میں اختلاف نہ کرتے لیکن انسان کو پتھروں کی طرح نہیں بنایا گیا۔ اس کے بعد اگلی آیت میں ہے کہ جن و انس سے جہنم کو بھرا جائے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ جن و انس النّاس کے درخت ہی کی دو شاخیں ہیں۔ الگ الگ مخلوق نہیں ہیں اور دیکھئے سورہ اعراف میں ہے:۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (۷/۳۵)

(اور فرمانِ الٰہی ہوا تھا) "اے اولادِ آدم! جب کبھی ایسا ہو کہ ایسا ضرور ہوگا کہ میرے پیغمبر تم میں سے پیدا ہوں اور میری آیتیں تمہیں پڑھ کر سنائیں، تو جو کوئی (اُن کی تعلیم سے متنبہ ہو کر) تقویٰ شعار ہوگا اور اپنے آپ میں صلاحیت پیدا کرے گا اس کے لیے کسی طرح کا اندیشہ نہ ہوگا، نہ کسی طرح کی غمگینی

یہاں تخاطب بنی آدم سے ہے۔ اور سورہ انعام میں ہے:۔

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓى اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ۝ (۶/۱۳۰)

(نیز ہم اس دن پوچھیں گے کہ) اے گروہِ جن و انس! (تم جو اپنی گمراہیوں اور بدعملیوں کا آج اعتراف کر رہے ہو، تو) کیا تمہارے پاس ہمارے پیغمبر جو تم ہی میں سے تھے، نہیں آئے تھے؟ انہوں نے ہماری آیتیں تمہیں

تمہیں نہیں سنائی تھیں؟ اور اس دن سے جو تمہیں پیش آیا ہے نہیں ڈرایا تھا؟" وہ عرض کریں گے "خدایا! ہم اپنے اوپر آپ ہی گواہی دیتے ہیں (کہ بلاشبہ آئے تھے) اور انہوں نے ہمیں سب کچھ بتایا تھا۔ پر ہم نے اُن کا کہا نہ مانا" حقیقت یہ ہے کہ مفاد عاجلہ نے انہیں فریب میں ڈال دیا تھا۔ اور وہ اب خود ہی اپنے خلاف گواہ ہو گئے کہ وہ بلاشبہ سچائی سے انکار کرنے والے تھے۔

دیکھئے سورۂ اعراف (۳۵) کی آیت میں بنی آدم سے کہا گیا ہے کہ رسول تم ہی میں سے (منکم) آئیں گے۔ اور سورۂ انعام (۱۳۰) کی آیت میں "جن و انس کے گروہ" سے کہا گیا ہے کہ رسول تم میں سے (منکم) آئے تھے۔ قرآن کریم میں جنات (آتشیں مخلوق) کے کسی رسول کا ذکر نہیں۔ تمام رسولوں کے متعلق صراحت سے بیان ہے کہ وہ انسان (بنی آدم) تھے اور انسانوں میں سے ہی مرد (جیسا کہ ذرا آگے چل کر بیان ہوگا) اس لئے جب "گروہ جن و انس" سے کہا گیا کہ تم میں سے (منکم) رسول آئے تھے تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ "گروہ جن و انس" سے مقصود بنی آدم ہی کی دو جماعتیں ہیں۔ اس سے انسانوں سے الگ کوئی اور مخلوق مراد نہیں۔

سورۂ اعراف میں ہے:

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ۖ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ‎(۷/۱۷۹)

اور کتنے ہی جن اور انس ہیں جنہیں ہم نے جہنم کے لئے پیدا کیا (یعنی بالآخران کا ٹھکانا جہنم ہونے والا ہے) اُن کے پاس عقل ہے مگر اس سے سمجھ بوجھ کا کام نہیں لیتے۔ آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان ہیں مگر اُن سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ وہ (عقل و حواس کا استعمال کھو کر) چارپایوں کی طرح ہو گئے بلکہ اُن سے بھی زیادہ کھوئے ہوئے۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو یک قلم غفلت میں ڈوب گئے۔

یہاں سے یہ بھی واضح ہے کہ یہ بیان انسانوں ہی کی مختلف جماعتوں سے متعلق ہے یہ وہی جہنم ہے جس کے متعلق دوسری جگہ ارشاد ہے:

قَالَ ادْخُلُوا فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِكُم مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ فِي النَّارِ ‎(۷/۳۸)

اس پر حکم الٰہی ہوگا "جن و انس کی اُن امتوں (قوموں) کے ساتھ جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں، تم بھی آتش دوزخ میں داخل ہو جاؤ"

یہ آیت بھی کسی تشریح کی محتاج نہیں۔ یہ ایک دوسرے کو گمراہ کرنے والے انسانوں ہی کے گروہ ہیں۔ انسانوں نے کبھی آتشیں مخلوق (جنات) کو گمراہ نہیں کیا۔ یہ انسانوں ہی کی دو جماعتیں ہیں جن کے متعلق سورۂ حٰم سجدہ میں ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا
تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ ۝ (۴۱/۲۹)

اور جو کافر ہیں وہ کہیں گے۔ اے ہمارے پروردگار ہمیں اُن جن اور انس کو دکھا دے جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا۔
ہم انہیں اپنے پاؤں تلے روند ڈالیں۔ تاکہ وہ دونوں اچھی طرح ذلیل ہو جائیں۔

اس سے ذرا پہلے ہے:

وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ فَزَيَّنُوْا لَهُمْ مَّا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَحَقَّ عَلَيْهِمُ
الْقَوْلُ فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ ۝ (۴۱/۲۵)

اور ہم نے (دنیا میں) اُن کے لئے کچھ ساتھ رہنے والے (دوست) مقرر کر رکھے تھے۔ سو انہوں نے اُن کے اگلے پچھلے
اعمال اُن کی نظر میں مستحسن کر رکھے تھے اور اُن کے حق میں بھی ان لوگوں کے ساتھ اللہ کا قول (یعنی وعدۂ عذاب)
پورا ہو کر رہا جو اُن سے پہلے جن و انس (کفار) ہو گزرے ہیں۔ بلاشبہ وہ سب ہی خسارہ میں رہے۔

سورۂ احقاف میں اس کی تشریح واضح الفاظ میں آگئی ہے جہاں ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسَانًا ۝ (۴۶/۱۵)

اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔

اس سے آگے ان لوگوں کا ذکر ہے جو اس حکم خداوندی کے ماتحت اپنے والدین سے نیک سلوک کرتے ہیں۔ اور پھر ان کا
جو ان سے بدسلوکی کرتے ہیں۔ اس موخر الذکر جماعت کے متعلق فرمایا۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۭ
اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ ۝ (۴۶/۱۸)

یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے حق میں بھی ان لوگوں کے ساتھ اللہ کا قول پورا ہو کر رہا جو ان سے پہلے جن اور
انس ہو گزرے ہیں۔ بلاشبہ یہ لوگ خسارہ میں رہے۔

یہاں بھی واضح رہے کہ جن و انس انسانوں ہی کے دو گروہ ہیں جن کا ذکر آیہ ۴۶/۱۵ سے شروع ہوا تھا۔ سورۂ بقرہ کا
تیسرا رکوع ان آیات سے شروع ہوتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

اے افرادِ نسلِ انسانی! اپنے پروردگار کی عبودیت اختیار کرو۔ (اس پروردگار کی) جس نے تمہیں پیدا کیا اور ان
سب کو بھی پیدا کیا جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں تاکہ اس عبودیت خداوندی سے تم حفاظت الٰہیہ میں آ سکو۔

دیکھئے۔ یہاں تخاطب يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ (نوعِ انسانی) سے ہے۔ اس سے آگے ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ (۲۳/۲)

اور دیکھو اگر تمہیں اس (کلام) کی سچائی میں شک ہے جو ہم نے اپنے بندے (یعنی پیغمبر اسلام) پر نازل کیا ہے (اور تم خیال کرتے ہو کہ یہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔ (یا تمہیں رسالت اور وحی سے انکار ہے) تو اس کا فیصلہ بہت آسان ہے۔ اگر یہ محض ایک انسانی دماغ کی بناوٹ ہے تو تم بھی انسان ہو۔ زیادہ نہیں) اس کی سی ایک سورت ہی بنا لاؤ اور اللہ کے سوا جن (طاقتوں) کو تم نے اپنا حامی سمجھ رکھا ہے۔ ان سب کو بھی اپنی مدد کے لئے بلا لو۔

ظاہر ہے کہ یہ تحدی انسانوں سے ہی ہے لیکن سورۂ بنی اسرائیل میں ہے

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ○ (۸۸/۱۷)

اے پیغمبر! اس بات کا اعلان کر دے کہ اگر تمام جن و انس اکٹھے ہو کر چاہیں کہ اس قرآن کے مانند کوئی کلام پیش کر دیں تو کبھی پیش نہیں کر سکیں گے۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کا مددگار کیوں نہ ہو۔

یہاں سے بھی واضح ہے کہ انس و جن سے مراد انسانوں ہی کے گروہ ہیں جنہیں سورۃ البقرہ میں چیلنج دیا گیا تھا۔ انہیں مخاطب کر کے غیر مرئی جنات سے کہنا کہ اگر تمہیں قرآن کے منجانب اللہ ہونے میں شک ہو تو اس کی مثل لے آؤ۔ بے معنی ہوگا۔ اس لئے کہ قرآن کو نازل ہی انسانوں کے لئے کیا گیا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل کی جس آیت کو اوپر درج کیا گیا ہے، اس سے اگلی آیت یہ ہے:-

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ○ (۸۹/۱۷)

اور ہم نے اس قرآن میں انسانوں کے لئے ہر طرح کی مثالیں بار بار بیان کیں (کہ لوگ سمجھیں بوجھیں) لیکن ان میں سے اکثروں نے کوئی بات قبول نہیں کی اور قبول کی تو صرف ناسپاسی!

جنات کا قرآن سننا!

ان تصریحات سے واضح ہے کہ جنات سے مراد بدوی اور وحشی انسانوں اور اجنبی قبائل ہیں یا سرکش اور مفسد انسان۔ حقیقت یہ ہے کہ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، نزول قرآن کے زمانے میں، عرب کی آبادی کے دو مخصوص طبقے تھے۔ ایک طبقہ حضریت کی (شہری) زندگی بسر کرتا تھا اور دوسرا طبقہ صحرانشین بدوؤں کا تھا جو آبادیوں سے دور نگاہوں سے اوجھل رہا کرتے تھے جس طرح ہمارے ہاں خانہ بدوش قبائل رہتے ہیں۔ ان دونوں کی نفسیاتی کیفیات، تمدنی ضروریات اور طبعی خصائل و عادات

میں بڑا فرق تھا۔ قرآن کی دعوت ان دونوں گروہوں کے لئے تھی لیکن ظاہر ہے کہ ان دونوں سے اندازِ تخاطب اور طریقِ تبلیغ یکساں نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن نے ان صحرانشین قبائل کا ذکر الگ بھی کیا ہے۔ ان تمہیدی اشارات کی روشنی میں ذیل کی آیات کا مفہوم بآسانی سمجھ میں آجائے گا۔ جن میں فرمایا:-

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ۝ قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ وَمَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ وَلَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءُ ۚ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (۴۶ / ۳۲—۲۹)

اور جبکہ ہم جنات کی ایک جماعت کو تمہاری طرف لے آئے۔ جو قرآن سننے لگے تھے۔ غرض جب وہ لوگ قرآن کے پاس آپہنچے، کہنے لگے کہ خاموش رہو۔ پھر جب قرآن پڑھا جا چکا تو وہ اپنی قوم کے پاس خبر پہنچانے کے واسطے واپس گئے کہنے لگے کہ اے بھائیو! ہم ایک کتاب سُن کر آئے ہیں؛ موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے جو اپنی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے حق اور راہ راست کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اے بھائیو! اللہ کی طرف بلانے والے کا کہنا مانو اور اس پر ایمان لے آؤ۔ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔ اور تم کو عذاب دردناک سے محفوظ رکھے گا۔ اور جو شخص اللہ کی طرف بلانے والے کا کہنا نہ مانے گا تو زمین میں وہ خدا کو ہرا نہیں سکتا اور خدا کے سوا کوئی اس کا حامی بھی نہ ہوگا۔ ایسے لوگ صریح گمراہی میں ہیں۔

یہ یہودی تھے

ظاہر ہے کہ جنات کی اس جماعت سے مراد یہودیوں کا کوئی اجنبی یا بدوی قبیلہ یا اس قبیلہ کے بدوی سردار ہیں جنہوں نے قرآن سنا اور اس کی حقانیت ان کے دلوں پر اثر کر گئی۔ انہوں نے پھر اپنے قبیلہ میں جا کر اس کا چرچا کیا اور اس پر ایمان لانے کی دعوت دی۔ یہی وہ جماعت ہے جس کا ذکر سورۂ جن میں بھی آیا ہے۔ جہاں فرمایا:-

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝ يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ۭ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا ۝ (۷۲ / ۲—۱)

(اے پیغمبر اسلام!) کہہ دو کہ مجھے وحی کے ذریعہ سے بتلایا گیا ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے قرآن سنا اور انہوں نے اپنی قوم میں جا کر بیان کیا کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے جو نیکی کے رستہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ چنانچہ ہم اس پر ایمان لے آئے، اور ہم عہد کرتے ہیں کہ ہم ہرگز کبھی اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔

اجنبی قبائل کے یہ لوگ قرآن سن کر چلے گئے اس کے بعد اُن کے قلبی تاثرات اور اُن کی اپنے قبیلہ سے باہمی باتیں بذریعہ وحی معلوم ہوئیں جن کا تذکرہ آئندہ آیات میں کیا گیا ہے۔ آیہ ۳ سے ظاہر ہے کہ وہ اس سے پیشتر شرک کیا کرتے تھے اور۔

وَاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا ۝ وَّاَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا ۝ (۷۲-۳)

اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ) ہمارے پروردگار کی شان بہت بلند و بالا ہے۔ اس نے نہ کوئی بیوی بنائی ہے نہ لڑکا۔

اور ہمارے بیوقوف لوگ (خواہ مخواہ ہی) خدا کے ذمے غلط باتیں (بہتان) کہتے رہے ہیں۔

یعنی وہ لوگ شرک بھی کیا کرتے تھے اور (معاذ اللہ) خدا کی بیوی اور اولاد بھی قرار دیا کرتے تھے اور اسی قسم کی اور لغویات میں مبتلا تھے۔ (یہ تمام عقائد اس زمانہ میں عرب میں عام تھے) بدوی زندگی کے اعتبار سے یہ سادہ لوح سے لوگ تھے جو معتقدات کے بارہ میں سُنی سنائی باتوں کو سچا سمجھ کر مان لیا کرتے تھے۔

وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۝ وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ۝ (۷۲-۵-۶)

اور ہم نے یہ خیال کر لیا تھا کہ انس اور جن خدا کے ذمہ جھوٹ (بہتان) تو (کم از کم) ہرگز نہیں بولیں گے۔ اور بات یہ بھی کہ انس میں سے کچھ لوگ جنات کے کچھ آدمیوں کی پناہ لیا کرتے تھے۔ انہوں نے اُن کی بد دماغی اور بھی بڑھا دی۔

یعنی ان سادہ لوح لوگوں کا خیال یہ تھا کہ خدا کے بارے میں جھوٹ تو نہیں بولا جاتا ہوگا۔ حالانکہ اُن کے غلط معتقدات کے علمبردار (ارباب مذہب) کی یہ حالت تھی کہ بدوی قبائل کے پیشوا ہوں یا شہریوں کے، اس باب میں سب آپس میں ملے ہوئے اور ایک دوسرے کے معاون و مددگار تھے۔ بعض ان میں سے کسی آنے والے رسول کی بعثت کے بھی قائل نہ تھے۔

وَّاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا ۝ (۷۲-۷)

اور جیسا کہ تم خیال کرتے ہو، انہوں نے یہ بھی خیال کر لیا تھا کہ خدا کسی (پیغمبر) کو ہرگز نہیں بھیجے گا۔

سلسلۂ رشد و ہدایت صرف انسانوں کیلئے ہے جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، دنیا میں سلسلۂ رشد و ہدایت انسانوں ہی کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ قصۂ آدم پر ایک بار پھر نگاہ ڈالیئے۔ یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آجائے گی کہ رسولوں کی بعثت۔ ہدایتِ خداوندی کی ترسیل۔ سب بنی آدم کے لئے تھی۔ یہ سلسلۂ ہدایت بنی آدم کے علاوہ کسی اور مخلوق کے لئے نہیں ہے۔ قرآن کریم میں ہے:-

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا رَسُولًا ۝ قُلْ لَوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يَمْشُونَ مُطْمَئِنِّينَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَسُولًا ۝ (۱۷ / ۹۴ — ۹۵)

اور حقیقت یہ ہے کہ جب کبھی اللہ کی ہدایت (دنیا میں) ظاہر ہوئی تو صرف اسی بات نے لوگوں کو ایمان لانے سے روکا کہ (متعجب ہو کر) کہنے لگے "کیا اللہ نے (ہماری طرح کا) ایک آدمی پیغمبر بنا کر بھیج دیا ہے؟" (اے پیغمبر کہہ دے) "اگر ایسا ہوتا کہ زمین میں (انسانوں کی جگہ) فرشتے بسے ہوتے۔ اور اطمینان سے چلتے پھرتے، تو ہم ضرور آسمان سے ایک فرشتہ پیغمبر بنا کر اتارتے"

یعنی چونکہ زمین پر انسان بستے ہیں اس لیے ایک انسان ہی کا رسول بنا کر بھیجا جانا ضروری تھا۔ اگر فرشتے بستے تو فرشتوں کو رسول بنا کر بھیجا جاتا۔ اور علیٰ ہذا اگر یہاں آتشیں مخلوق کے جنات آباد ہوتے تو ان ہی میں سے رسول بھیجا جاتا۔ جیسے ایک فرشتہ انسانوں کے لیے رسول نہیں ہو سکتا اور نہ ہی آتشیں مخلوقات جنات کے لیے (تفصیل ان امور کی "رسالت" کے عنوان میں ملے گی)، یہی وجہ ہے کہ نبی اکرمؐ کی رسالت نوعِ انسانی ہی کے لیے ہے۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا (۷ / ۱۵۸)

(اے پیغمبر! تم لوگوں سے) کہو "اے افرادِ نسلِ انسانی! میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں۔"

سورۂ سبا میں ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝ (۳۴ / ۲۸)

اور (اے پیغمبر اسلام!) ہم نے آپ کو تمام نوعِ انسانی کے لیے (اعمالِ صالحہ کے نتائج کی) خوشخبری دینے والا اور (اعمالِ سیئہ کے انجام و عواقب سے) آگاہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔ لیکن (حقیقت یہ ہے کہ) بہت سے آدمی اس کو جانتے نہیں۔

اور قرآن کریم بھی نوعِ انسانی ہی کے لیے سرچشمۂ ہدایت و موعظت ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ ۝ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ (۱۰ / ۵۷)

اے نوعِ انسانی! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک ایسی چیز آ گئی جو موعظت ہے۔ دل کی تمام بیماریوں کے لیے شفا ہے اور ہدایت و رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو (اس پر) یقین رکھتے ہیں۔

سارے قرآن کریم میں یہ کہیں بھی نہیں کہ رسول اللہ جنات (آتشیں مخلوق) کی طرف بھی رسول تھے۔ اور قرآن ان کی ہدایت کے لیے بھی نازل کیا گیا تھا۔ ان حقائق کے پیشِ نظر ظاہر ہے کہ سورۂ جن کی متذکرہ صدر آیات

ہیں جنات سے مراد نوع انسانی ہی کا ایک (اجنبی اور بدوی) گروہ ہے۔ نہ کہ آتشیں مخلوق کے جنات۔ جن و انس کے یہی دو گروہ ہیں جنہیں سورہ رحمٰن میں تکرار مخاطب کیا گیا ہے :-

سَنَفْرُغُ لَكُمْ أَيُّهَ الثَّقَلٰنِ ۚ فَبِأَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ○ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ إِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ أَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ فَانْفُذُوْا ۚ لَا تَنْفُذُوْنَ إِلَّا بِسُلْطٰنٍ ○ فَبِأَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ○ (۵۵/۳۱—۳۴)

اے دونوں جماعتو! ہم بہت جلد تمہاری طرف متوجہ ہوں گے۔ سو تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کون سی قدرتوں کو جھٹلاؤ گے۔ اے جماعت جن و انس اگر تم میں اتنی طاقت ہو کہ تم آسمانوں اور زمین کی حدود سے باہر نکل سکو تو نکل جاؤ (یاد رکھو!) تم غلبہ (اور تسلط) کے بغیر باہر نہیں نکل سکتے۔ سو تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کون سی قدرتوں کو جھٹلاؤ گے؟

یہی جن و انس ہیں جن کے فیصلے مکافات عمل کے دن ہوں گے۔

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ إِنْسٌ وَّلَا جَاۗنٌّ ۚ فَبِأَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ○ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْأَقْدَامِ (۵۵/۳۹—۴۱)

سو آج کے دن نہ گروہ انس سے اس کے گناہ کے بارے میں سوال کیا جائے گا اور نہ گروہ جن سے۔ سو تم اپنے پروردگار کی کن کن قدرتوں کو جھٹلاؤ گے۔ مجرم اپنے اپنے نشانوں سے پہچانے جائیں گے۔ پھر پیشانی کے بالوں اور پاؤں سے پکڑے جائیں گے۔

یہی وہ گروہ ہے جن کے متعلق ذرا آگے چل کر ارشاد ہوا کہ :-

فِيْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَاۗنٌّ ۚ (۵۵/۵۶ نیز ۵۵/۷۴)

اُن جنتوں میں نگاہوں کو نیچی رکھنے والی ہوں گی جنہیں اُن سے پہلے نہ کسی انس نے ہاتھ لگایا ہوگا نہ کسی جن نے۔

یہی وہ گروہ ہے جن کے مفسدہ پردازسازشی لوگوں کی وسوسہ اندازیوں سے خدا کی پناہ مانگنے کی تاکید آئی ہے۔

الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۙ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ؏ (۱۱۴/۵—۶)

جو لوگوں کے سینوں میں وسوسے ڈالتا ہے جن و انس کے گروہوں سے۔

اور یہی وہ گروہ جن و انس (یعنی نوع انسانی) ہے جس کی تخلیق کا مقصد یہ ہے کہ وہ خدا کے قانون کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کریں۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ○ (۵۱/۵۶)

اور میں نے جن و انس کو پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ وہ صرف میری عبدیت اور اطاعت اختیار کریں۔

اور یوں اس صفحۂ ارض پر خدا کے نظام ربوبیت کو قائم کریں (جیسا کہ آیۂ مذکورہ صدر کے بعد کی آیت میں تصریح کی گئی ہے)
ان حقائق کو سامنے رکھئے اور پھر سوچئے کہ انسانوں کو چمٹ جانے والے جنات۔ بھوت۔ پریت۔ سایہ۔ چڑیل
ارواحِ خبیثہ وغیرہ قسم کے خرافات واباطیل کا ایک مسلمان کے دماغ میں کبھی گزر بھی ہو سکتا ہے؟ وہ جس کا ایمان ہے
کہ اللہ تعالیٰ نے ارض وسمٰوٰت کی ہر چیز کو انسان کے لئے تابعِ فرمان بنا دیا۔ اس قسم کی توہم پرستی کسی طرح اس کے
قریب بھی پھٹک سکتی ہے؟ جنہیں جنات، اور بھوتوں کا سایہ سمجھا جاتا ہے۔ اُن کی حقیقت اعصابی امراض کے سوا اور

بھوت اور جنات دراصل کیا ہوتے ہیں؟

کچھ نہیں۔ جب تک دنیا دورِ جہالت سے گزر رہی تھی ان امراض کو جن کے اسباب وعلل سمجھ میں نہیں آتے تھے
مافوق الفطرت قوتوں کے اثرات پر محمول کیا جاتا تھا۔ ابھی کل تک یورپ کی بھی یہی حالت تھی۔ لیکن انہوں نے ان چیزوں
کی تحقیق کی اور رفتہ رفتہ، علم وعقل کی روشنی سے توہم پرستی کی ان سیاہ چادروں کو ایک ایک کر کے الگ کر دیا۔
لیکن جہاں ابھی جہالت کا تسلط ہے۔ وہاں اس قسم کی توہم پرستی اچھے بھلے لوگوں کے سر پر سوار ہے۔ دنیا کی اور
قومیں اس قسم کے خرافات میں الجھ کر رہ گئی تھیں تو یہ امر کچھ ایسا تعجب خیز نہ تھا اس لئے کہ ان کے ہاں علم وبصیرت
تھا کہاں؟ لیکن سب سے بڑی بدقسمتی تو مسلمانوں کی ہے، کہ قرآن جیسی روشنی رکھتے ہوئے اس قسم کے خرافات
کے طلسم ہوش رُبا میں جکڑے چلے آ رہے ہیں۔ باقی رہا یہ کہ اس قسم کے امراض کا علاج عملیات سے ہو جاتا ہے سو
اس کی تشریح سحر کے عنوان میں ملے گی۔ یہاں صرف اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ اعصابی امراض کا بہت بڑا تعلق نفسیات سے
ہوتا ہے اور نفسیات پر قوتِ خیال کا اثر مسلم ہے۔ عملیات، وشعبدات سب قوتِ ارادی کے کرشمے ہیں۔ علم تجزیۂ نفس
کا مشہور امام (ڈاکٹر فرائڈ) اسی حقیقت مستور کی تحقیق میں نکلا اور ایک ایسے عامل کے ہاں پہنچا جو مسمریزم (قوتِ
ارادی) سے اس قسم کے اعصابی امراض کا علاج کیا کرتا تھا۔ فرائڈ نے مسمریزم سیکھا۔ اس پر عمل بھی کیا۔ لیکن اس کے
بعد اور آگے بڑھا تو اس پر یہ حقیقت بے نقاب ہو گئی کہ ان امراض کا تعلق یکسر اعصاب سے ہے۔ اور ان کا علاج نفسیاتی
مؤثرات سے کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ توہم پرستی کے اس طومار کی سائنٹفک توجیہات سامنے آتی
گئیں۔ یورپ میں آج اس فن کے "عامل" ہر جگہ موجود ہیں۔ لیکن وہ ڈاکٹر ہی کہلاتے اور سمجھے جاتے ہیں۔ اس سے
زیادہ اور کچھ قرار نہیں دیئے جاتے۔ اس لئے اُن کی پرستش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس قسم کے توہمات کی پرستش
تو "مسلمان" ہی کے حصہ میں آئی ہے جو دنیا کے ہر پتھر اور ہر بڑی دہلیز پر جھک جاتا ہے۔ اور اسے قربِ الٰہی کا ذریعہ
سمجھتا ہے۔ اسی قسم کی توہم پرستی میں ایسے واقعات بھی شامل ہیں جو آئے دن کہیں نہ کہیں رونما ہوتے رہتے ہیں
کہیں کسی مکان میں پتھر آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ کہیں خود بخود کپڑے جل اٹھتے ہیں۔ کہیں چیزیں غائب ہونی شروع
ہو جاتی ہیں۔ لیکن اگر محنت اور کاوش سے تحقیق کی جائے تو ان تمام حوادث کے اسباب کا سراغ لگایا جا سکتا ہے

لیکن اگر کسی وجہ سے سراغ نہ بھی لگے تو بھی یہ سمجھ لینے کے لئے کوئی بھی قرینہ نہیں کہ یہ کوئی غیر مرئی، آتشیں مخلوق ہے جو اس طرح انسانی معاشرے میں فساد انگیزیاں کرتی رہتی ہے۔ یاد رکھئے! قرآن کی رُو سے اس قسم کے عقیدے یا تصور کی کوئی گنجائش نہیں۔ قرآن کی رو سے انسانوں کی پیدائش سے پہلے یہاں کوئی مخلوق آباد تھی جس کا اب انسانوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ اسے آتشیں مخلوق کہا گیا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن میں "جن و انس" کے ضمن میں جن جنات کا ذکر ہے ان سے مراد عرب کے صحرا نشین، خانہ بدوش قبائل ہیں۔ ادریس!

جان بمعنی سانپ عربی زبان میں جان بمعنی سانپ بھی مستعمل ہوا ہے۔ غالباً اس کی شعلہ نفسی اور آتش مزاجی کے اعتبار سے۔ قصہ حضرت موسیٰ میں ہے۔

وَاَلْقِ عَصَاكَ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ اِنِّىْ لَا يَخَافُ لَدَىَّ الْمُرْسَلُوْنَ ○ (۲۷/۱۰)

(اور ہم نے کہا۔ اے موسیٰ) اپنی عصا ڈال دو۔ سو جب اسے ہلتے ہوئے دیکھا گویا کہ وہ ایک چھوٹا سا سانپ ہے تو وہ پیٹھ موڑ کر (ایسے) بھاگا کہ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ (ہم نے کہا، اے موسیٰ! ڈرو نہیں۔ میرے حضور میں پیغمبر ڈرا نہیں کرتے۔

اور سورۂ قصص میں ہے۔

وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ؕ يٰمُوْسٰى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ ؕ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ ○ (۲۸/۳۱)

(اور ہم نے کہا) کہ اپنا عصا ڈال دو۔ سو جب اسے ہلتے ہوئے دیکھا گویا کہ وہ ایک چھوٹا سا سانپ ہے تو وہ پیٹھ پھیر کر ایسے بھاگا کہ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ (تب ہم نے کہا) اے موسیٰ آگے آؤ۔ ڈرو نہیں۔ تم بلاشبہ امن پانے والوں میں سے ہو۔

خلاصہ بحث نفس انسانی اپنی مستور قوتوں اور خوابیدہ جوہروں کی نمود کے لئے متصادم عناصر سے مزاحمت و کشمکش کا محتاج ہے۔ دنیا کے میدان سعی و عمل میں ان متخاصم قوتوں کا نام ابلیس ہے۔ ابلیس کی فطرت میں سرکشی و طغیان ہے۔ یہ عقل بیباک اور علم سرکش کا مظہر ہے اس کی تخلیق شعور آدم کے ساتھ ہوئی اور جب تک اس دنیا میں بنی آدم کا وجود ہے یہ اس کے ساتھ موجود رہے گا۔ لہٰذا یہ ابلیسی قوتیں فنا نہیں ہو سکتیں۔ مومن کا شیوہ یہ ہے کہ انہیں مسخر کرے اور قوانین الٰہیہ کے تابع لے آئے۔ واضح رہے کہ یہ عقیدہ مجوسیوں کے عقیدہ ثنویت سے اساسی

طور پر مختلف ہے۔ جس کی رو سے نیکی کا خدا الگ اور برائی کا خدا الگ مانا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس بنیادی مسئلہ نے ذہنِ انسانی کو آج تک طلسم پیچ و تاب بنائے رکھا ہے وہ خیر و شر کا مسئلہ ہے۔ یہ ایک ایسی الجھی ہوئی ڈور ہے کہ ذہنِ انسانی نے اُسے جس قدر سلجھانے کی کوشش کی ہے یہ اور زیادہ الجھتی گئی ہے۔ دنیا میں جہاں جہاں نیکی کا تصور ہے اس کے مقابلے میں بدی کا تصور موجود ہے۔ جہاں خدا کا تصور ہے اس کے مقابل میں ابلیس یا شیطان کا تصور ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے حریف کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ انسانی تاریخ میں ہر "رام" کے ساتھ "راون" مصروفِ پیکار دکھائی دیتا ہے۔ ہر "یزداں" کے مقابلہ میں "اہرمن" ستیزہ کار نظر آتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ دونوں "متضاد قوتیں" شروع سے آج تک ایک دوسرے کے مدمقابل صف آرا نظر آتی چلی آ رہی ہیں۔ لیکن قرآن نے ابلیس کا جو تصور پیش کیا ہے وہ اس سے مختلف ہے۔ اس نے ابلیس کو ایک ایسی قوت کی حیثیت سے پیش نہیں کیا جو خدا کی حریف اور اس کے ساتھ پنجہ فگن ہو۔ کائنات میں کونسی قوت ایسی ہو سکتی ہے جسے خدا کی شریک سمجھا جائے اور شریک بھی ایسی کہ وہ خدا کے سامنے خم ٹھونک کر کھڑی ہو جائے؟ قرآن نے بتایا ہے کہ اختیار و ارادہ صرف خدا کو حاصل ہے۔ کائنات کی کسی چیز کو یہ قوت حاصل نہیں۔ خدا نے اپنی اس قوت کا ایک شمہ انسان کو عطا کیا ہے۔ جس کی رُو سے یہ اپنے محدود دائرے کے اندر صاحبِ اختیار و ارادہ ہو گیا ہے۔ اس قوت کے ماتحت وہ اپنے لئے آپ فیصلے کرتا ہے۔ کائنات میں خدا کا قانون جاری و ساری ہے۔ انسان کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ چاہے تو ایسی روش اختیار کرے جو قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ ہو اور چاہے تو اس کے خلاف راستہ اختیار کر لے۔ یعنی وہ چاہے تو اپنی قوتوں کو ایک طرف لے جائے اور چاہے تو اُن کا رُخ دوسری طرف موڑ دے۔ جب انسان اپنی قوتوں کو قانونِ خداوندی کی مطابقت میں صرف کرے تو اسے وحی کی اطاعت کہتے ہیں اس لئے کہ انسانی معاشرہ کے لئے خدائی قوانین صرف وحی کی رُو سے ملتے ہیں۔ اور جب وہ اپنی قوتوں کو اس راستے کے خلاف صرف کرے تو اس کا نام قانونِ خداوندی سے سرکشی ہے۔ اس کو قرآنی اصطلاح میں ابلیس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ ابلیس کسی خارجی قوت کا نام نہیں جو خدا کے مدمقابل کھڑی ہے۔ یہ محض انسانی قوتوں کے استعمال اور مصرف کی ایک شکل کا نام ہے۔ یعنی وہ شکل جس میں انسانی قوتیں وحی کے مقرر کردہ قاعدے کے خلاف صرف ہوتی ہیں۔ جب انسان اپنی قوتوں کو وحی کے مطابق صرف کرنے لگ جاتا ہے تو اس کے لئے کہا جاتا ہے کہ اس پر ابلیس کا غلبہ و تسلط نہیں رہا۔ درحقیقت اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ انسان نے اپنے اختیار و ارادہ کو صحیح طور پر استعمال کیا ہے اور اپنے لئے وہ راستہ چُنا ہے جو وحی نے اس کے لئے مقرر کیا تھا اور جس سے وہ منزلِ انسانیت تک بآسانی پہنچ جائے گا۔ ان تصریحات سے

یہ حقیقت واضح ہوگئی ہوگی کہ ابلیس کسی ایسی قوت کا نام نہیں جو خدا کے مدمقابل صف آرا ہو۔ ایسی قوت کا دنیا میں وجود ہی نہیں۔ لہذا، اہرمن و یزداں کو دو مستقل قوتیں تسلیم کرنا مجوسیت کی ثنویت ہے جس نے انسانی فکر کو بری طرح سے متاثر کیا ہے۔ یہی ثنویت، مختلف زمانوں میں مختلف لباس پہن کر سامنے آتی رہی ہے۔ روح اور مادہ کی ثنویت۔ (اس کو ہندی فلسفہ میں آتما اور پراکرتی کا بیر کہتے ہیں)۔ دنیا اور آخرت کی ثنویت۔ خیر و شر کی ثنویت۔ انسانی خواہشات اور روحانی لذات کی ثنویت۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ابلیس کے قرآنی تصور میں یہ ثنویت خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی رُو سے رُوح اور مادہ اور دنیا و آخرت میں نہ کوئی تضاد ہے نہ تخالف۔ نہ تزاحم ہے نہ تصادم۔ یہ ایک ہی حقیقت کے دو رُخ اور ایک ہی محل کے دو اطراف ہیں۔ مادہ، شرف انسانیت کے ارتقاء کے لئے ممد و معاون بنتا ہے اور دنیا، آخرت کی خوشگواریوں کا لاینفک ذریعہ ہے۔ اس نے بتایا کہ انسان کے اندر ایک ہی قوت ہے۔ اس قوت کے استعمال کی شکلیں مختلف ہیں۔ لہذا، قرآن کا عطا کردہ تصور زندگی کی وحدت کا تصور ہے جس میں کوئی عنصر بھی ایسا نہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہو۔ اور جن میں باہمی مطابقت نہ پیدا ہو سکتی ہو۔ لیکن یہ مطابقت پیدا ہوتی ہے وحی کی اتباع سے۔ لہذا ابلیس نام ہے اس فیصلہ کا جو انسان کو وحی کے خلاف چلنے پر آمادہ کر دے۔ اس کو عقلِ بے باک اور علم سرکش کہتے ہیں۔ اگرچہ اس فیصلہ کے نتائج شروع میں بڑے دیدہ زیب اور خوش آیند دکھائی دیتے ہیں لیکن مستقبل میں ان کا ثمر ہمیشہ تلخ ہوتا ہے جس سے انسان پر سخت نا امیدی طاری ہو جاتی ہے۔ نا امیدی کو عربی زبان میں **ملبس** کہتے ہیں اور یہیں سے ابلیس کا لفظ نکلا ہے۔ وحی کی اتباع مستقبل کو خوشگوار بناتی ہے اور اس کی مخالفت انسان پر یاس و نا امیدی طاری کر دیتی ہے۔

اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ

(ابلیس کا پیکرِ آتشیں)

بدل کے بھیس زمانہ میں پھر سے آتے ہیں
اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

شیطان (۴)

قصۂ آدم میں ایک چیز بڑی نمایاں طور پر سامنے آتی ہے۔ سجدہ سے انکار، قیامت تک کے لئے مُہلت۔ ذُریت آدم کو بہکانے کا چیلنج۔ سب ابلیس کی طرف سے ہے۔ لیکن جب اس کے بعد آدم کی لغزش کا ذکر ہے تو وہاں اُسے شیطان کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ عنوانِ آدم کے تحت اس ضمن میں مختلف آیات کو ایک مرتبہ پھر دیکھئے

سورۂ بقرہ میں انکارِ سجدہ اور آدم کو شجرِ ممنوعہ سے احتراز کے حکم کے بعد فرمایا:-

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا (۲/۳۶)

پھر شیطان کی وسوسہ اندازی نے ان دونوں کے قدم ڈگمگا دیئے۔

سورۂ اعراف میں فرمایا:-

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ (۷/۲۰)

لیکن پھر ایسا ہوا کہ شیطان نے ان کی طرف وسوسہ ڈالا۔

سورۂ طٰہٰ میں ہے:-

فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ (۲۰/۱۲۰)

لیکن پھر ایسا ہوا کہ شیطان نے اسکی طرف وسوسہ ڈالا۔

ابلیس اور شیطان ان مقامات سے ایسا مترشح ہوتا ہے گویا ابلیس اور شیطان دو الگ الگ ہستیاں ہیں لیکن ان ہی آیات میں ایسی چیزیں بھی ہیں جن میں ایک ہی فعل کو کبھی ابلیس کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور کبھی شیطان کی طرف۔ مثلاً ایک مقام پر ابلیس کے متعلق کہا ہے کہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ

فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَ ذُرِّیَّتَهٗۤ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِیْ وَ هُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ
بِئْسَ لِلظّٰلِمِیْنَ بَدَلًا ۝ (۱۸/۵۰ ؛ ۲/۱۱۶)

اور جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا تھا "آدم کے آگے جھک جاؤ" اور سب جھک گئے تھے، مگر ابلیس نہیں جھکا تھا وہ جن میں سے تھا۔ پس اپنے پروردگار کے حکم سے باہر ہوگیا۔ پھر کیا تم مجھے چھوڑ کر (کہ تمہارا پروردگار ہوں) اسے اور اس کی نسل کو کارساز بناتے ہو، حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں؟ (دیکھو) ظلم کرنے والوں کے لئے کیا ہی بُری تبدیلی ہوئی

تو دوسری جگہ شیطان کے متعلق بھی یہی کہا گیا ہے۔

فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَ طَفِقَا یَخْصِفٰنِ عَلَیْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ؕ وَ نَادٰىهُمَا رَبُّهُمَاۤ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَ اَقُلْ لَّكُمَاۤ اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ۝ (۷/۲۲)

غرض کہ شیطان (اس طرح کی باتیں سنا سنا کر) بالآخر انہیں فریب میں لے آیا۔ پھر جوں ہی ایسا ہوا کہ انہوں نے درخت کا پھل چکھا اُن کے ستر اُن پر کھل گئے اور (جب انہیں اپنی برہنگی دیکھ کر شرم محسوس ہوئی تو) باغ کے پتے اوپر تلے رکھ کر، اپنے جسم پر چپکانے لگے۔ اس وقت اُن کے پروردگار نے پکارا "کیا میں نے تمہیں اس درخت سے نہیں روک دیا تھا۔ اور کیا میں نے نہیں کہہ دیا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے"؟

سب سے بڑا واقعہ آدم کو جنت سے نکلوانے کا ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں کہا گیا ہے

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ؕ اَبٰی ۝ فَقُلْنَا یٰۤاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَ لِزَوْجِكَ فَلَا یُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰی ۝ (۲۰/۱۱۶—۱۱۷)

اور (پھر) وہ معاملہ یاد کرو جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا تھا "آدم کے آگے جھک جاؤ" سب جھک گئے تھے۔ مگر ابلیس نہیں جھکا اس نے انکار کیا۔ اس پر ہم نے کہا "اے آدم! (دیکھ لے) یہ (ابلیس) تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے ایسا نہ ہو۔ یہ تمہیں جنت سے نکال کے رہے اور تم محنت میں پڑ جاؤ۔

لیکن سورۂ بقرہ میں اسے شیطان کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّیْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِیْهِ ۪ وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَ لَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ ۝ (۲/۳۶)

پھر (ایسا ہوا کہ) شیطان کی وسوسہ اندازی نے ان دونوں کے قدم ڈگمگا دیئے۔ اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ جیسی کچھ راحت و سکون کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس سے نکلنا پڑا۔ خدا کا حکم ہوا۔ یہاں سے نکل جاؤ۔ تم میں سے ہر وجود دوسرے کا

دشمن ہوگا۔ اب تمہیں رجنت کی جگہ) زمین میں رہنا ہے۔ اور ایک خاص وقت تک کے لئے (جو علم الٰہی میں مقرر ہو چکا ہے) اُس سے فائدہ اٹھانا ہے۔

ایسا ہی سورۂ اعراف میں ہے:-

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ۭاِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۭاِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (۷/۲۷)

اور (خدا نے فرمایا) اے اولاد آدم! دیکھو کہیں ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں اسی طرح بہکا دے جس طرح تمہارے ماں باپ کو بہکا کر جنت سے نکلوا دیا تھا۔ اور ان کے لباس اتروا دیئے تھے کہ ان کے ستر انہیں دکھا دئیے وہ اور اس کا گروہ تمہیں اس طرح دیکھتا ہے کہ تم اسے نہیں دیکھتے۔ یاد رکھو ہم نے یہ بات ٹھہرا دی ہے کہ جو لوگ ایمان نہیں رکھتے ان کے رفیق و مددگار شیاطین ہوتے ہیں۔

ایک ہی سکّے کے دو رُخ

ان مقامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابلیس اور شیطان ایک ہی سکّہ کے دو رُخ ہیں یہ حقیقت سورۂ بنی اسرائیل میں اور بھی ابھر کر سامنے آگئی ہے جہاں ابلیس کے ذکر میں یہ آیت بھی ہے۔

وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ۭ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا (۱۷/۶۴)

ان میں سے جس کسی کو تو اپنی صدائیں سنا کر بہکا سکتا ہے۔ بہکانے کی کوشش کر لے اپنے لشکر کے سواروں اور پیادوں سے حملہ کر۔ ان کے مال اور اولاد میں شریک ہو جا۔ ان سے (طرح طرح کی باتوں کے) وعدے کر اور شیطان کے وعدے تو اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ سرتا سر دھوکا۔

اس سے اگلی آیت میں ہے۔

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ۭ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ۝ (۱۷/۶۵)

جو میرے سچے بندے ہیں تو ان پر قابو پانے والا نہیں۔ تیرا پروردگار کارسازی کے لئے بس کرتا ہے

یہی الفاظ ابلیس کے متعلق سورۂ حجر میں ہیں۔

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۝ (۱۵/۴۲)

جو میرے مخلص بندے ہیں، ان پر تیرا کچھ زور نہیں چلے گا۔ صرف ان ہی پر چلے گا جو (بندگی کی) راہ سے بھٹک گئے

آیت ([illegible]) سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ ابلیس اور شیطان دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔

ان آیات پر غور کرنے سے مترشح ہوتا ہے کہ جو شے انسانی خودی کی حریف اور اس کے مدمقابل بطور تصادم (Resistance) کام کرتی ہے اس کا ذاتی نام ابلیس ہے اور یہ تصادم جن صورتوں میں متشکل ہو کر مدمقابل آتا ہے وہ شیاطین ہیں۔ اس لئے ابلیس اور شیطان دو الگ الگ چیزیں بھی ہیں اور دونوں ایک بھی۔ لفظ شیطان یا ز شطن سے مشتق ہے جس کے معنی دوری کے ہیں۔ یعنی سعادت و رحمت سے محرومی۔ یا شاط یشیط سے۔ جس کے معنی شعلوں کا بھڑکنا یا آگ میں جلنا ہیں، یعنی ابلیسانہ شعلہ مزاجی کا مظاہرہ۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ عبرانی لفظ ہے اور اصل کے اعتبار سے اس کے معنی (Hinderer) کے ہیں۔ یعنی انسانیت کی ارتقار کے راستے میں مزاحمت کرنے والا۔

شیطان فطرتِ ابلیسی کا مظہر

بہر حال ہم نے مذکورہ بالا آیات سے دیکھ لیا کہ شیطان درحقیقت ابلیس کی مختلف خاصیتوں ہی کا پیکر ہے۔ یعنی ہر شیطان فطرتِ ابلیسی کا مظہر ہے۔ ذریتِ آدم (نوعِ انسانی) کو شیطان سے واسطہ پڑتا ہے جن میں سے ہر ایک روحِ ابلیسی کا محمل ہوتا ہے۔ لہٰذا شیاطین متنوع شکلوں اور مختلف صورتوں میں نمودار ہوں گے۔ قرآن کریم نے روحِ ابلیسی کی ان مختلف شکلوں کا ذکر مختلف انداز و طرق میں کیا ہے تاکہ سعید روحیں انہیں دوری سے پہچان لیں اور اپنے آپ کو قانون خداوندی کی حفاظت میں لے آئیں۔ اب یہ دیکھئے کہ یہ شیاطین کون کون سے بھیس بدل کر سامنے آتے ہیں۔

وساوس

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ شیطان نے آدم کے دل میں وسوسہ ڈالا تھا۔

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ ([illegible])

لیکن پھر ایسا ہوا کہ شیطان نے ان دونوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالا۔

یعنی وسوسہ اندازی عملِ شیطان ہے۔ دل کے یقین کو غیر محسوس انداز سے متزلزل کر دینا۔ کسی کے عزم راسخ میں پھونک مار دینا (نَفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ) چپکے ہی چپکے سرگوشیوں سے قوانین خداوندی سے انحراف پر مائل کر دینا یہ سب شیطانی حربے ہیں، لیکن اس کے لئے شیطان مختلف ذرائع سے کام لیتا ہے۔ سورۃ الناس میں ہے۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ مَلِكِ النَّاسِ ۙ اِلٰهِ النَّاسِ ۙ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۙ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۙ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ([illegible])

(اے پیغمبر! ان سے) کہدو کہ میں نوعِ انسانی کے پروردگار، شاہنشاہ اور ان کے الٰہ کی پناہ میں آتا ہوں۔ وسوسہ اندازی (کر کے) پاؤں پیچھے ہٹ جانے والے (شیطان) کے شر سے جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالا کرتا ہے (خواہ وہ) جن میں سے ہو اور (خواہ) انس میں سے۔

خناس کے معنی ہیں چپکے ہی چپکے سمٹ کر، سکڑ کر، دبے پاؤں پیچھے ہٹ جانے والا۔ کسی کے کان میں سرگوشی کی، دل میں وسوسہ ڈالا، اور چپکے سے پیچھے ہٹ کر چھپ گئے۔ گویا انہیں علم ہی نہیں کہ تخریب کے اس فعلِ شیطانی کا ذمہ دار کون ہے؟ اور یہ خناس کون ہیں؟ "مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ" جن کی تشریح سابقہ عنوان میں گزر چکی ہے اس سے ظاہر ہے کہ یہ شیاطین، وہ انسان ہی ہیں جو دوسروں کے عزمِ راسخ میں وسوسہ اندازیوں سے لغزش پیدا کرتے ہیں۔ دوسرے مقام پر ہے کہ خود انسان کا نفس بھی وسوسہ اندازیاں کرتا رہتا ہے اور اصل یہ ہے کہ انسانوں کو بہکانے کے لئے خود اپنا نفس۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ
مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ ۝ (۵۰/۱۶)

اور بلاشبہ انسان کو ہم نے پیدا کیا ہے۔ اور ہم خوب جانتے ہیں کہ اس کا نفس اس کے دل میں کیا کچھ وسوسے ڈالتا ہے اور ہم اس کی شہ رگ (رگِ جان) سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

یہ نفس (جو اس طرح وسوسہ اندازی کرتا ہے) انسان کی عقلِ حیلہ جو ہے جو اسے حق و صداقت کی راہ میں قدم اٹھانے سے روکتی رہتی ہے۔ یہی وہ شیاطین (یعنی انسان کے مختلف خیالات) ہیں جو ان مقامات سے حملہ کرتے ہیں جو انسان کو نظر نہیں آتے۔ شیطان کے اس لشکر کے متعلق کہا ہے کہ

يَا بَنِيٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ أَخْرَجَ أَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ
عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ؕ إِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ
لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ إِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ أَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (۷/۲۷)

اور (خدا نے فرمایا) اے اولادِ آدم! دیکھو کہیں ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں اسی طرح بہکا دے جس طرح تمہارے ماں باپ کو بہکا کر جنت سے نکلوا دیا تھا اور ان کے لباس اتروا دیئے تھے کہ ان کے ستر انہیں دکھا دے۔ وہ اور اس کا گروہ تمہیں اس طرح دیکھتا ہے کہ تم اسے نہیں دیکھتے۔ یاد رکھو ہم نے یہ بات ٹھہرا دی ہے کہ جو لوگ ایمان نہیں رکھتے ان کے رفیق و مددگار شیاطین ہوتے ہیں۔

نگاہ فریب آرزوئیں

پھر اگر ایک طرف شیطان صحیح راہِ عمل سے بہکانے کے لئے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے تو دوسری طرف دلوں میں نگاہ فریب اور سراب آسا غلط آرزوئیں پیدا کر کے انسان کو باطل کی طرف متوجہ کرتا ہے اور یوں اس کی قوتِ عمل کو رائیگاں کر دیتا ہے۔ اس کا دعویٰ یہی ہے کہ:-

وَلَأُضِلَّنَّهُمْ وَلَأُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْأَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ
فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ

خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِينًا ۝ (۴/۱۱۹)

اور ضرور انہیں بہکاؤں گا اور ضرور ایسا کروں گا کہ (حقیقت وعمل کی جگہ باطل) آرزوؤں میں انہیں مشغول رکھوں اور ضرور انہیں (مشرکانہ خرافات کا) حکم دوں گا پس وہ جانوروں کے کان ضرور ہی چیریں گے (اور انہیں بتوں کے نام پر چھوڑ دیں گے) اور البتہ انہیں حکم دوں گا پس وہ میری ہدایت کے مطابق خدا کی خلقت میں ضرور تغیر و تبدل کر دیا کریں گے (سو یہ مشرک ہی شیطان کی وسوسہ اندازیوں پر چلتے ہیں۔ اور جو کوئی اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا رفیق و مددگار بناتا ہے، تو یقیناً وہ تباہی میں پڑے گا، ایسی تباہی جو کھلی تباہی ہے

باطل آرزوئیں پیدا کرتا ہے اور ان آرزوؤں کے حصول کے لئے جتنی کوششیں کی جاتی ہیں انہیں نہایت خوشنما بنا کر پیش کرتا ہے تاکہ کسی قدم پر بھی اس کا احساس نہ ہو سکے کہ جس رستہ پر چل رہے ہیں وہ کامیابی اور کامرانی کے بجائے تباہی اور بربادی کے جہنم کی طرف لئے جا رہا ہے۔ اعمال کو مزین بنا کر دکھانا یہ سب سے بڑا فریب ہے جو شیطان کی طرف سے

زینت اعمال

دیا جاتا ہے۔ وہ باطل کی مورتیوں کو ایسے حسین وجمیل، مرصع اور منقش پردوں میں چھپاتا ہے کہ نگاہیں اُن کے نقش ونگار میں الجھ کر رہ جاتی ہیں اور بجاذبِ توجہ فریب کاریوں کے پیچھے چھپی ہوئی حقیقت تک پہنچنے نہیں پاتیں۔ اسی کا نام ہے زینتِ اعمال!

فَلَوْلَا إِذْ جَآءَهُم بَأْسُنَا تَضَرَّعُوا وَلَٰكِن قَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَٰنُ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ (۶/۴۳)

پھر (دیکھو) ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب ہماری طرف سے ان پر سختی آئی۔ تو ان کے دل پسیج جاتے۔ اس لئے کہ ان کے دل سخت پڑ گئے تھے، اور جو کچھ بدعملیاں کر رہے تھے، انہیں شیطان نے اُن کی نظروں میں خوشنما کر دکھایا تھا۔

شیطانی تلبیس، رستہ کو اس طرح خوشنما بناتی ہے کہ نہ رستہ کے خطرات نظر آتے ہیں۔ نہ منزل کی ہلاکت۔ سورۂ انفال میں ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا:۔

وَإِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَٰنُ أَعْمَٰلَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَإِنِّي جَارٌ لَّكُمْ ۖ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتَانِ نَكَصَ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ وَقَالَ إِنِّي بَرِيٓءٌ مِّنكُمْ إِنِّيٓ أَرَىٰ مَا لَا تَرَوْنَ إِنِّيٓ أَخَافُ اللَّهَ ۚ وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝ (۸/۴۸)

اور (پھر) جب ایسا ہوا تھا کہ شیطان نے ان کے کرتوت ان کی نگاہوں میں خوشنما کر کے دکھائے تھے اور کہا تھا آج ان لوگوں میں کوئی نہیں جو تم پر غالب آسکے اور میں تمہارا پشت پناہ ہوں، مگر جب دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو اُلٹے پاؤں واپس ہوا اور لگا کہنے "مجھے تم سے کچھ سروکار نہیں۔ مجھے وہ بات دکھائی دے رہی ہے جو تم نہیں دیکھتے۔ میں اللہ سے ڈرتا ہوں" اور اللہ (بدعملیوں کی پاداش میں) بہت سخت سزا دینے والا ہے۔

کتنا بڑا دھوکا ہے! لیکن انسان ہے کہ کس آسانی سے اُسے کھاتے چلا جاتا ہے۔ دیدہ و دانستہ سب کچھ دیکھتے بھالتے اس فریب رنگ و بو میں کھو جاتا ہے۔

وَعَادًا وَّثَمُودَا۟ وَقَد تَّبَيَّنَ لَكُم مِّن مَّسَاكِنِهِمْ ۖ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِينَ ﴿۲۹/۳۸﴾

اور ہم نے (قوم) عاد و ثمود کو ہلاک کیا۔ اور (یہ) ان کے مکانات (اور آبادیوں) سے تمہیں صاف نظر آرہا ہے (کہ وہ کس طرح ہلاک کئے گئے) شیطان نے ان کے لئے ان کے اعمال کو مزین بنا رکھا تھا چنانچہ انہیں (حق کی) راہ (کی پیروی) سے روک دیا۔ اور وہ لوگ سب کچھ دیکھتے بھالتے تھے۔

قوم سبا کے متعلق فرمایا۔

وَجَدتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُونَ لِلشَّمْسِ مِن دُونِ اللَّهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُونَ ﴿۲۷/۲۴﴾

میں نے اسے اور اس کی قوم کو اللہ کو چھوڑ کر آفتاب کو سجدہ کرتے ہوئے پایا۔ شیطان نے ان کے اعمال (سیئہ) کو ان کے لئے مزین بنا رکھا ہے چنانچہ انہیں (حق کی) راہ (کی پیروی) سے اس نے روک دیا ہے سو وہ سیدھی راہ پر نہیں چلتے۔

تمام امم سابقہ کے متعلق ارشاد ہے۔

تَاللَّهِ لَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ أُمَمٍ مِّن قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۶/۶۳﴾

(اے پیغمبر!) اس بات کی سچائی پر ہم شاہد ہیں کہ ہم نے تجھ سے پہلے کتنی ہی امتوں کی طرف رسول بھیجے۔ پھر ایسا ہوا کہ شیطان نے لوگوں کو ان کی بدعملیاں اچھی کر دکھائیں (اور وہ سچائی کی دعوت پر کار بند نہ ہوئے) سو وہی حال آج بھی ہو رہا ہے۔ وہی شیطان ان منکروں کا رفیق ہے، اور (بالآخر) ان کے لئے عذاب دردناک ہے۔

زینت اعمال کے مظاہر

اپنے گرد و پیش نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ "زینت اعمال" کے یہ مظاہر کس کن نظر فریب پیکروں میں سامنے آتے ہیں۔ کسی بڑے سے بڑے ہلاکو اور چنگیز یا دور حاضرہ کے ابلیسی نظام کے ارباب حل و عقد سے پوچھئے اور پھر دیکھئے کہ وہ کس طرح اپنے ہر فعل کو حق بجانب اور نوع انسانی کے لئے آیۂ رحمت قرار دیتے ہیں۔ دل ہے کہ اس میں خود غرضی، حق ناشناسی، جلب منفعت اور ہوس زر کے چور چھپے بیٹھے ہیں لیکن عقل حیلہ جو ہے کہ ان بنیادوں پر اٹھی ہوئی عمارت کو کمزوروں اور ضعیفوں، مظلوموں

اور کس مپرسوں کے لئے امن و حفاظت کا قلعہ بنا کر دکھاتی ہے۔ لیکن باطل کی ملمع کاری زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتی۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد دنیا دیکھ لیتی ہے کہ شیطان کا فریب کس قدر بودا تھا۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُم بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۝ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا ۝ ذَٰلِكَ جَزَاؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوا وَاتَّخَذُوا آيَاتِي وَرُسُلِي هُزُوًا ۝ (۱۸ / ۱۰۳ — ۱۰۶)

(اے پیغمبر!) تو کہہ دے "ہم تمہیں خبر دیدیں کون لوگ اپنے کاموں میں سب سے زیادہ نامراد ہیں؟ وہ جن کی ساری کوششیں (قانون مکافات سے بے نیاز ہو کر) مفاد عاجلہ کے حصول میں کھوئی گئیں۔ اور وہ اس دھوکے میں پڑے ہیں کہ بڑا اچھا کارخانہ بنا رہے ہیں؛ یہی لوگ ہیں کہ اپنے پروردگار کی آیتوں سے اور اس کے قانون کا سامنا کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ پس اُن کے سارے کام اکارت گئے اور اس لئے قیامت کے دن ہم اُن (کے اعمال) کا کوئی وزن تسلیم نہیں کریں گے۔ انہوں نے جیسی کچھ کفر کی راہ اختیار کی تھی اور ہماری آیتوں اور رسولوں کی ہنسی اُڑائی تھی، تو عذاب دوزخ، اس کا لازمی نتیجہ ہے۔

مذہبی دنیا میں زینتِ اعمال

یوں تو شیطان کی طرف سے پیش کردہ زینتِ اعمال انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں تخریب انگیز ہے۔ لیکن دنیائے مذہب میں اس کی سمیت بڑی ہلاکت آفریں ہو جاتی ہے۔ غور کیجئے بعض معتقدات و رسومات آبا و اجداد سے متوارث چلی آ رہی ہیں؛ انسان انہیں اس قدر مقدس و متبرک خیال کرتا ہے کہ انہیں دل کی انتہائی گہرائیوں میں جگہ دیئے پھرتا ہے۔ اُن کے خلاف اللہ تعالیٰ کی طرف سے کھلے کھلے احکام موجود ہوتے ہیں۔ لیکن شیطان ان غلط معتقدات و رسوم کو اس درجہ خوشنما بنا کر پیش کرتا ہے کہ انسان انہیں تنقید کی حد سے بالاتر خیال کرتا ہوا کبھی اتنا سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ ذرا احکام خداوندی کی روشنی میں انہیں پرکھ کر دیکھ تو لے۔ سورۂ اعراف میں شیطان کے فتنۂ عظیمہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ جن لوگوں پر شیطان کا جادو چل جاتا ہے اُن کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ:-

وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ ۖ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ (۷ / ۲۸)

اور یہ لوگ جب بےحیائی کی باتیں کرتے ہیں، تو کہتے ہیں "ہم نے اپنے بزرگوں کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے (اور چونکہ وہ کرتے رہے ہیں اس لئے) خدا نے ایسا ہی کرنے کا حکم دیا ہے۔" (اے پیغمبر!) تم کہہ دو "کہ خدا کبھی بےحیائی کی باتوں کا حکم نہیں دے گا۔ کیا تم خدا کے نام پر ایسی بات کہنے کی جرأت کرتے ہو جس کے لئے تمہارے پاس کوئی علم نہیں"؟

یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق ایک ہی آیت کے بعد تصریح فرما دی کہ

فَرِيقًا هَدَىٰ وَفَرِيقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلَالَةُ إِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ مِن دُونِ اللَّهِ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُم مُّهْتَدُونَ ○ (۷/۳۰)

راہ پانے والے دو گروہ ہوگئے) ایک گروہ کو اس کے ایمان و حسن عمل کی وجہ سے کامیابی کی) راہ دکھائی۔ دوسرے پر اُن کے انکار و بدعملی سے، گمراہی ثابت ہوگئی۔ ان لوگوں نے (یعنی دوسرے گروہ نے) خدا کو چھوڑ کر شیطانوں کو اپنا رفیق بنا لیا (یعنی مفسدوں اور شریروں کی تقلید کی) بایں ہمہ سمجھے کہ راہ راست پر ہیں!

وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُم مُّهْتَدُونَ پر نگاہِ تعمق غور فرمائیے اور پھر سوچیے کہ آج ہم ہیں کتنے ہیں جن کی بعینہ یہی حالت ہے کہ:۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۚ أَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطَانُ يَدْعُوهُمْ إِلَىٰ عَذَابِ السَّعِيرِ ○ (۳۱/۲۱)

اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ اس قانون کی اتباع کرو جو خدا نے نازل کیا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ (نہیں) بلکہ ہم تو اس (رستہ) کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے بزرگوں کو پایا ہے (شیطان نے بزرگوں کی پیروی کے خیال کو اس قدر مزین بنا رکھا ہے کہ وہ اسے کسی طرح بھی چھوڑنے کے لئے تیار نہیں) اگرچہ شیطان انہیں (راہ آرہیں) جہنم کے عذاب ہی کی طرف کیوں نہ بلا رہا ہو۔

لیکن پھر شیطان کے اس فریب کو کیا کیا جائے کہ مسلمان سمجھتا یہ ہے کہ یہ آیات یہود و نصاریٰ یا کفارِ عرب کے متعلق نازل ہوئی تھیں۔ ہم سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

وَلَٰكِن قَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ○ (۶/۴۳)

لیکن اُن کے دل سخت پڑ گئے تھے، اور جو کچھ بدعملیاں کر رہے تھے، انہیں شیطان نے ان کی نظروں میں خوشنما کر دکھایا تھا۔

لیکن قرآن کریم نے دو آیات میں ایک ایسا تمثیلی بیان پیش کیا ہے جس میں مسلمانوں کی ساری تاریخ سامنے آجاتی ہے فرمایا۔ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا انہیں ذرا اس کی داستان بھی سنا دو جسے ہم نے اپنا ضابطہ قوانین دیا اُس نے کچھ عرصہ تک اُس پر عمل کیا اور اُس کے بعد فَانسَلَخَ مِنْهَا) اس میں سے اس طرح باہر نکل گیا جس طرح کسی جانور کی کھال کھینچ لی جائے کہ گوشت پر اس کا نشان تک باقی نہیں رہتا۔ وہ اس ضابطہ خداوندی سے باہر نکلا تو (فَأَتْبَعَهُ الشَّيْطَانُ) شیطان نے اسے جھٹ سے آدبوچا اور اسے قانونِ خداوندی کی جگہ انسانوں کا خودساختہ مذہب دیدیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ (فَكَانَ مِنَ الْغَاوِينَ ۷/۱۷۵) منزل کی صحیح راہ اس سے بالکل گم ہوگئی۔ اس کے

بعد فرمایا

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ○ (۷/۱۷۶)

اگر وہ ہمارے قانون مشیت کے مطابق عمل کرتا تو اس کا مرتبہ بلند ہو جاتا۔ مگر وہ پستی کی طرف جھکا اور اپنے جذبات کی پیروی کرنے لگ گیا تو اس کی مثال کتے کی سی ہو گئی کہ اسے دھتکارو جب بھی ہانپے اور زبان لٹکائے اور نہ دھتکارو جب بھی ایسا ہی کرے۔ ایسی ہی مثال ان لوگوں کی ہے جنہوں نے ہمارے قانون کو جھٹلایا تو (اے پیغمبر!) یہ بات لوگوں کو سناؤ۔ تاکہ وہ اس میں غور و فکر کریں۔

جماعتی زندگی اور شیطان

یہ تو تھی قلوب میں وسوسہ اندازی، باطل تمناؤں کی تخلیق اور تزئینِ اعمالِ سیئہ۔ اب اس سے آگے ہیئتِ اجتماعیہ کی تعمیری زندگی کی طرف آئیے۔

قرآن کا منشاء یہ ہے کہ انسانی معاشرہ میں نظامِ ربوبیت رائج ہو۔ نظامِ ربوبیت کے معنی ہیں ایسا انتظام جس کی رو سے تمام افرادِ انسانیہ کی ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری معاشرہ پر ہو اور وہ ان سب کی صلاحیتوں کی کامل نشو و نما کا پورا پورا سامان مہیا کرے۔ اس کے لئے قرآن کا پروگرام یہ ہے کہ تمام افراد اپنی اپنی محنتوں کے ماحصل کو معاشرہ کی تحویل میں دیدیں اور وہاں سے اس کی مناسب تقسیم ہوتی جائے۔ اس کے لئے قرآن کی اصطلاح ہے "انفاق فی سبیل اللہ یعنی نظامِ خداوندی کے لئے ہر چیز کو کھلا رکھنا۔ عقلِ حیلہ جو، اس تصور کے خلاف یہ چاہتی ہے کہ ہر فرد اپنی ذات اور اپنی اولاد کے لئے زیادہ سے زیادہ سمیٹ کر رکھے۔ یہ ہے اصل بنیاد ابلیس اور وحی کی کشمکش کی۔ قرآن کہتا ہے کہ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ○ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ○ (۲/۲۶۷-۲۶۸)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! (جو کچھ محنت مزدوری یا تجارت سے) کمایا ہو۔ یا جو کچھ ہم تمہارے لئے زمین سے پیدا کر دیتے ہیں (اس کا بہترین حصہ نظامِ خداوندی کے لئے کھلا رکھو۔ یہ نہیں کرنا کہ ناخوشگوار اشیاء کو اس مقصد کے لئے الگ کر دو۔ اپنی ناخوشگوار کہ اگر وہی چیز تمہیں دی جائے۔ تو تم خود اسے دیکھتے بھالتے کبھی قبول نہ کرو) یاد رکھو، اللہ کی ذات بے نیاز اور ساری ستائشوں سے ستودہ ہے۔ (اسے تمہاری کسی چیز کی احتیاج نہیں یہ سب تمہاری ہی ربوبیت کے لئے ہے)۔ اسے بھی یاد رکھو کہ شیطان تمہیں قدم قدم پر یہ کہکر ڈرائے گا کہ تم نے

سب کچھ نظامِ خداوندی کے حوالے کر دیا تو (محتاج ہو جاؤ گے اس لئے وہ تمہیں کہے گا کہ سب کچھ اپنے پاس رکھو لیکن اس کے برعکس اللہ کا قانون تمہارے لئے سامانِ حفاظت کا ضامن بنتا ہے اور معاشی خوشگواریوں کا کفیل۔ اس کا قانون بڑی کشادگی اور علم رکھتا ہے۔

انفاق

حق و باطل کا معرکہ درپیش ہے۔ اجتماعی موت و حیات کا معاملہ سامنے ہے۔ نظامِ ربوبیت کے قیام کا سوال ہے لیکن شیطان کا فریب ہے کہ دل میں خوف پیدا کئے جا رہا ہے کہ اگر "اپنا" سرمایہ یوں "دوسروں" کی خاطر لٹا دیا تو خود بھوکے مر جاؤ گے! نفسِ انسانی کی یہی تنگ نگہی اور کوتاہ دامنی ہے جس سے بچنے میں فلاح و سعادت مضمر ہے وہ کہتا ہے کہ انسان کی ذات (انا یا خودی) کی پرورش کا راز اس میں ہے کہ انسان اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دے۔ چنانچہ اس نے نظامِ ربوبیت قائم کرنے والی جماعت کے افراد کی یہی خصوصیتِ عظمیٰ بتائی ہے۔

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ (۹/۵۹)

یہ لوگ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ خود تنگی کی حالت میں ہی کیوں نہ ہوں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جو شخص بھی (عقل خودبیں کی) تنگ نگہی سے بچ گیا تو ان ہی کی کھیتیاں سرسبز ہوں گی۔

بخل اور اسراف

بخل کرنے والے بھی شیطان کے متبعین ہیں اور دوسری طرف بیجا صرف کرنے والے بھی۔

إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ ۖ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا (۲۷/۱۷)

بے محل خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی بند ہیں۔ اور شیطان اپنے پروردگار کی نعمتوں کی ناشکری کیا کرتا ہے۔

فتنہ پردازی

نیز جماعت کے اتحاد و اتفاق میں خلل اندازی کے لئے جھوٹی خبریں اڑا دینا اور ان کی تحقیق کئے بغیر انہیں فضا میں منتشر کر دینا، یہ بھی شیطنت ہے۔ فرمایا۔

وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ ۖ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ ۗ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ (۸۳/۴)

اور جب ان لوگوں کے پاس امن کی یا خوف کی کوئی خبر پہنچ جاتی ہے، تو یہ (فوراً) اسے لوگوں میں پھیلا دیتے ہیں۔ اگر یہ اسے (لوگوں میں پھیلانے کی جگہ) اللہ کے رسول (یعنی مرکزِ ملت) کے سامنے اور ان

لوگوں کے سامنے جو ان میں صاحب حکم و اختیار ہیں (یعنی مقامی حکام) پیش کرتے، تو جو اصحاب علم و نظر بات کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں، وہ اس کی حقیقت معلوم کر لیتے (اور عوام میں تشویش نہ پھیلتی) اور (دیکھو) اگر اللہ کا تم پر فضل نہ ہوتا، اور اس کی رحمت نہ ہوتی، (تو تمہاری کمزوریوں کا یہ حال تھا کہ) معدودے چند آدمیوں کے سوا سب کے سب شیطان کے پیچھے لگ گئے ہوتے۔

علانیہ ایسی خبریں اڑا دینا یا چپکے چپکے بغاوت کی سرگوشیاں کرنا

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُولِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ○ (۵۸)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! (یاد رکھو) جب تم آپس میں سرگوشیاں کرو تو گناہ، سرکشی اور رسول کی نافرمانی کے متعلق سرگوشیاں نہ کرو۔ بلکہ نیکی اور تقویٰ کے متعلق تدبیریں کیا کرو۔ اور یاد رکھو! (اپنے) آپ کو اس خدا کے قانون کی حفاظت میں رکھو جس کی طرف تمہیں جمع ہونا ہے۔

نفرت اندازی یا ایسی باتیں کرنا جس سے وحدتِ ملت پارہ پارہ ہو جائے اور باہمی مودت و محبت کی جگہ بغض و عداوت پیدا ہو جائے۔

وَقُلْ لِعِبَادِي يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوًّا مُبِينًا ○ (۱۷/۵۳)

اور (اے پیغمبر!) میرے بندوں سے کہہ دو کہ (مخالفوں سے یا آپس میں گفتگو کرتے ہوئے) جو بات کہو ایسی کہو کہ خوبی کی بات ہو۔ شیطان لوگوں کے درمیان فساد ڈالتا ہے۔ یقیناً شیطان انسان کا صریح دشمن ہے۔

فواحش یا سوسائٹی میں عام برائی اور فواحش کے میلانات یا ان کے اسباب و ذرائع پیدا کر دینا۔

إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ○ (۲/۱۶۹)

وہ (شیطان) تو تمہیں (برائی اور بے حیائی اور بخل کی) باتوں ہی کے لئے حکم دے گا۔ نیز اس (گمراہی) کے لئے اکسائے گا کہ اللہ کے نام سے جھوٹی باتیں کہو جن کے لئے تمہارے پاس کوئی علم نہیں۔

یہی وہ سوء (برائی) ہے جس کی طرف نفسِ انسانی ترغیب دلاتا ہے۔

وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي ۚ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي ۚ إِنَّ رَبِّي غَفُورٌ رَحِيمٌ ○ (۱۲/۵۳)

(عزیز کی بیوی نے کہا) "میں اپنے نفس کی پاکی کا دعویٰ نہیں کرتی۔ آدمی کا نفس تو برائی کے لئے بڑا ہی ابھارنے والا ہے (اس کے غلبہ سے بچنا آسان نہیں) مگر ہاں اسی حالت میں کہ اس کی تربیت قانونِ خداوندی کے مطابق ہو۔ وہی قانون

اس کے لئے حفاظت اور رحمت کا سامان مہیا کر سکتا ہے)

برائیاں اور فواحشات کیا ہیں؟ مثلاً

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ ۝ (۵: ۹۰-۹۱)

مسلمانو! بلاشبہ شراب، جوا، استھان، اور پانسے۔ شیطانی کاموں کی خباثت ہے تو ان سے اجتناب کرو۔ تاکہ تمہیں کامیابی حاصل ہو۔ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوے کے ذریعہ تمہارے درمیان عداوت اور کینہ ڈلوا دے اور تمہیں خدا کی یاد اور صلوٰۃ سے باز رکھے رپھر بتلاؤ! ایسی برائیوں سے بھی، تم باز رہنے والے ہو یا نہیں۔

یا مثلاً مشرکانہ رسوم کی ترویج۔

وَلَأُضِلَّنَّهُمْ وَلَأُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ آذَانَ الْأَنْعَامِ وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللَّهِ وَمَنْ يَتَّخِذِ الشَّيْطَانَ وَلِيًّا مِنْ دُونِ اللَّهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُبِينًا ۝ (۴: ۱۱۹)

(شیطان نے کہا) اور میں ضرور انہیں بہکاؤں گا۔ اور ضرور ایسا کروں گا کہ (حقیقت وعمل کی جگہ باطل) آرزوؤں میں انہیں مشغول رکھوں، اور ضرور انہیں (مشرکانہ خرافات کا) حکم دوں گا پس وہ جانوروں کے کان ضرور ہی چیریں گے (اور انہیں بتوں کے نام پر چھوڑ دیں گے) اور البتہ انہیں حکم دوں گا پس وہ (میری ہدایت کے مطابق) خدا کی خلقت میں ضرور تغییر وتبدیل کر دیا کریں گے (رسوم مشرک اسی شیطان کی وسوسہ اندازیوں پر چلتے ہیں) اور جو کوئی اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا رفیق ومددگار بنا لیتا ہے تو یقیناً وہ تباہی میں پڑ گیا۔ ایسی تباہی میں جو کھلی تباہی ہے۔

بحث وجدل، بلا علم ودلیل اللہ تعالیٰ (اور اس کے احکام وقوانین) کے بارے میں بلا علم وبراہین مجادلہ کرنا (کہ قوانینِ الٰہیہ کے خلاف علم ودلیل ہو کس کے پاس ہو سکتی ہے؟) یہ وہ روش ہے جو کھلی ہوئی گمراہی کی طرف لیجاتی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطَانٍ مَرِيدٍ ۝ كُتِبَ عَلَيْهِ أَنَّهُ مَنْ تَوَلَّاهُ فَأَنَّهُ يُضِلُّهُ وَيَهْدِيهِ إِلَىٰ عَذَابِ السَّعِيرِ ۝ (۲۲: ۳-۴)

(اور دیکھو) کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں اور ان کے پاس کوئی علم نہیں۔ وہ ہر سرکش شیطان کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ شیطان کے لئے یہ بات لکھ دی گئی ہے کہ جو کوئی اس کا رفیق ہوا، وہ ضرور اسے گمراہی میں لے جائیگا

اور عذاب جہنم تک پہنچا کر رہے گا۔

اور یہ گمراہی آباؤ اجداد کے مسلک کی اندھی تقلید سے پیدا ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی کتاب منیر کے خلاف (بلا علم و براہین) مجادلہ کرتا ہی وہ ہے جو مسلک آباؤ اجداد پر اندھا دھند جما ہوا اور اُن کے مسلک کو کتاب اللہ کی کسوٹی پر پرکھنے کی ضرورت نہ سمجھے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۚ أَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطَانُ يَدْعُوهُمْ إِلَىٰ عَذَابِ السَّعِيرِ ۝ (۳۱/۲۱)

جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ اس (ہدایت اور روشنی) کی پیروی کرو جو خدا نے اتاری ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو اس طریقہ کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے بزرگوں کو پایا ہے۔ (یہ لوگ آنکھیں بند کئے اسی گمراہی کے رستہ پر چلتے رہیں گے) اگرچہ (اس طرح) شیطان انہیں جہنم کے عذاب ہی کی طرف کیوں نہ بلا رہا ہو۔

جس قدر آیات آپ کے سامنے آچکی ہیں ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آجائیگی کہ ان میں "شیطان" سے مراد کوئی خارجی ہستی نہیں ہے بلکہ یہ وہی لوگ ہیں جو معاشرے میں فتنہ و فساد پیدا کرتے رہتے ہیں۔ یا وہ ارباب مذہب جو لوگوں کو کتاب اللہ (قرآن) کی طرف نہیں آنے دینا چاہتے اور انہیں تلقین کرتے رہتے ہیں کہ

سہو و نسیان

تم آنکھ بند کئے اپنی اس روش پر چلتے جاؤ جو روش تمہارے پاس متوارث چلی آرہی ہے۔ قرآن نے ان سب کو شیاطین کہہ کر پکارا ہے۔ یا خود انسان کی اپنی عقل حیلہ جو جو انسانیت کے عالمگیر مفاد کے مقابلے میں ہمیشہ انفرادی مفاد کو ترجیح دیتی ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں یہ سب کچھ درحقیقت انسان کے جذبات کرتے ہیں۔ عقل تو جذبات کے فیصلوں کو بروئے کار لانے کا ذریعہ بنتی ہے۔ یہی جذبات ہیں جو حقیقت کو انسان کی نگاہوں سے اوجھل کر دیتے ہیں۔ اور صحیح باتوں کی یاد بھلا دیتے ہیں۔ اس لئے نسیان کو بھی شیطان کا کام کہا گیا ہے۔

وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ ۚ وَإِمَّا يُنسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرَىٰ مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝ (۶/۶۸)

اور جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو جو ہمارے احکام میں (انکار و شرارت سے) کاوشیں کرتے ہیں۔ تو (تم ان کے ساتھ بحث کرنے میں وقت ضائع نہ کرو، اور) ان سے کنارہ کش ہو جاؤ۔ یہاں تک کہ وہ کسی دوسری بات میں بحث و گفتگو کرنے لگیں۔ اور اگر ایسا ہو کہ شیطان تمہیں (یہ بات) بھلا دے (یعنی تم سہو و نسیان میں پڑ کر ان سے بحث و نزاع کرنے لگو) تو چاہیئے کہ یاد آجانے کے بعد ایسے گروہ (کی مجلسوں) میں نہ بیٹھو جو ظلم کرنے والے ہیں۔

قصہ حضرت یوسف میں ہے کہ آپ نے اپنے قید خانہ کے ان ساتھیوں میں سے جو رہا ہو رہے تھے ایک سے کہا کہ اُذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ لیکن

فَاَنْسٰهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ ۝ (۱۲/۴۲)

مگر شیطان نے اسے اپنے آقا کے سامنے ذکر کرنا بھلا دیا چنانچہ وہ (یوسفؑ) کئی سال تک قید خانہ میں رہے

حضرت موسیٰؑ کے مشہور سفر میں جب ان کا ساتھی ایک جگہ مچھلی رکھ کر بھول گیا تو اس نے بھی یہی کہا تھا کہ

قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ ؗ وَمَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ ۖ عَجَبًا ۝ (۱۸/۶۳)

اس نے کہا "کیا آپ نے نہیں دیکھا؟ جب ہم (سمندر کے کنارے) چٹان کے پاس ٹھہرے تھے، تو مجھے مچھلی کا کچھ خیال نہیں رہا تھا۔ اس نے عجیب طریقہ پر سمندر میں جانے کی راہ نکال لی اور یہ شیطان ہی کا کام ہے کہ میں اس کا ذکر کرنا بالکل بھول گیا۔

یعنی صحیح باتوں کی یاد بھلا دینا۔ یہ بھی حیل شیطانی میں سے ہے۔ اور ان چھوٹی چھوٹی باتوں ہی کو نہیں۔ بلکہ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے شیطان تو اللہ کی یاد ہی بھلا دیتا ہے۔

اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ (۵۸/۱۹)

شیطان نے اُن پر قابو پا لیا اور قوانین خداوندی کی یاد اُن سے بھلا دی۔ یہ لوگ شیطان کا گروہ ہیں۔ دیکھو! شیطان کا گروہ ہی خسارہ میں رہنے والا ہے۔

اور جو اللہ کی یاد بھلا دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ اُن کی خودی (نفس) کو نسیاً منسیاً کر دیتا ہے۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (۵۹/۱۹)

تم ان لوگوں کی طرح نہ بن جاؤ جو اللہ کو بھول گئے۔ چنانچہ اللہ نے انہیں اپنا آپ ہی بھلا دیا (احساس خودی مٹ گیا) یہی تو اصلی نافرمان لوگ ہیں۔

اور ابلیس کی جنگ میں یہی سب سے بڑی شکست ہے کہ انسان اپنی خودی ہی کو بھول جائے۔

قصۂ آدم میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ سب سے بڑی قوت جو شیطان کے مقابلہ میں انسان کو عطا کی گئی ہے۔

خوف و حزن

وحی آسمانی ہے۔ جس کی اتباع کا نتیجہ خوف و حزن سے مصؤنیت ہے۔ لہٰذا شیطان کا بڑا حربہ یہ ہے کہ وہ خوف و حزن پیدا کر کے پائے استقلال میں لغزش اور عزم راسخ میں تزلزل پیدا کر دے۔ سورۂ آل عمران میں مومنین کے متعلق فرمایا۔

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ

وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۝ (۳/۱۷۳)

یہ وہ لوگ ہیں جن سے بعض آدمی کہتے تھے "تم سے جنگ کرنے کے لئے دشمنوں نے بہت بڑا گروہ جمع کر لیا ہے پس چاہیئے کہ اُن سے ڈرتے رہو (اور مقابلہ کے لئے باہر نہ نکلو) لیکن (بجائے اس کے کہ یہ بات سن کر وہ خوف زدہ ہو جاتے) ان کا ایمان اور زیادہ مضبوط ہو گیا۔ وہ (بے خوف و خطر ہو کر) بول اٹھے "ہمارے لیے اللہ کا سہارا بس کرتا ہے۔ اور جس کا کارساز اللہ ہو تو کیا ہی اچھا کارساز ہے۔

اس کے بعد ہے:۔

إِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۳/۱۷۵)

یہ اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ شیطان تھا جو تمہیں اپنے ساتھیوں سے ڈرانا چاہتا تھا۔ اگر تم ایمان رکھنے والے ہو تو شیطان اور اس کے ساتھیوں سے نہ ڈرو، مجھ ہی سے ڈرو (اگر تم اللہ کے قانون سے ڈرتے رہے تو دنیا کی کوئی طاقت بھی تمہیں ڈرا نہ سکے گی!)

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ شیطان خوف پیدا کرنے کے لئے کیا ذرائع و اسباب اختیار کرتا ہے۔ یعنی وہ اسلام کے مقابلہ میں کفار کے پیکروں میں نمودار ہوتا ہے جو اپنی قوت و سطوت سے مسلمانوں کو ڈراتے ہیں۔ یہاں جس خاص شیطان کا ذکر ہے تاریخ بتاتی ہے کہ یہ وہ جاسوس تھا جسے قریش مکہ نے مسلمانوں کے دلوں میں خوف اور اُن کی قوت کا رعب ڈالنے کے لئے بھیجا تھا۔ یہی وہ اولیاء الشیطن ہیں جن سے مقاتلہ کا حکم دیا گیا ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْا أَوْلِيَاءَ الشَّيْطٰنِ ۚ إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ۝ (۴/۷۶)

جو لوگ ایمان رکھتے ہیں ان کا لڑنا اللہ کی راہ میں ہوتا ہے (کیونکہ وہ نفسانی خواہشوں کیلئے نہیں لڑتے۔ عدل و انصاف کی حمایت اور قوانین الٰہیہ کی ترویج و تنفیذ کے لئے لڑتے ہیں) اور جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں (یعنی شر و فساد کی شیطانی طاقتوں کی راہ اور ان کے غیر خدائی نظام کے تحفظ کے لئے لڑتے ہیں) سو (اگر تم ایمان رکھتے ہو، تو چاہیئے کہ) شیطان کے حمایتیوں سے لڑو اور ان کی طاقت و کثرت کی کچھ پرواہ نہ کرو) شیطان کی چالیں (دیکھنے میں کتنی ہی مضبوط کیوں نہ دکھائی دیں حق کے مقابلہ میں) کبھی جمنے والی نہیں ہوتیں۔

حق و باطل کے معرکہ میں

حق و باطل کے معرکہ میں شیطان، فریق مقابل (کفار) کے حوصلے بڑھاتا رہتا ہے جنگ بدر کے تذکرہ کے ضمن میں فرمایا۔

وَإِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ أَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَإِنِّيْ

جَارٌ لَّكُمْ فَلَمَّا تَرَاءَتِ الْفِئَتَانِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ ۭ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ؀ (۸/۴۸)

اور (پھر) جب ایسا ہوا تھا کہ شیطان نے اُن کے کرتوت ان کی نگاہوں میں خوشنما کرکے دکھا دیئے تھے اور کہا تھا، آج ان لوگوں میں کوئی نہیں جو تم پر غالب آسکے۔ اور میں تمہارا پشت پناہ ہوں۔ مگر جب دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو وہ اُلٹے پاؤں واپس ہُوا اور لگا کہنے "مجھے تم سے کچھ سروکار نہیں۔ مجھے وہ بات دکھائی دے رہی ہے جو تم نہیں دیکھتے۔ میں اللہ سے خوف کھاتا ہوں۔ اور اللہ (بدعملیوں کی پاداش میں) بہت سخت سزا دینے والا ہے۔

اور صرف میدانِ بدر ہی میں نہیں بلکہ میدانِ زندگی کی ہر صف میں شیاطین کا یہی شیوہ ہے کہ وہ سرکش لوگوں کو نور خداوندی کی مخالفت کے لئے ابھارتے رہتے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ تَـــؤُزُّهُمْ اَزًّا ؀ (۱۹/۸۳)

(اے پیغمبرِ اسلام!) کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ ہم نے کفار پر شیاطین کو بھیج رکھا ہے جو انہیں انگیخت کرکے ابھارتے اور اکساتے رہتے ہیں۔

کہ ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز		چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

سو ظاہر ہے کہ نور و ظلمت کی اس کشمکش میں حق سے منہ موڑ لینے والوں پر شیطان کا کھلا ہوا غلبہ ہوتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓي اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى ۙ الشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ ۭ وَاَمْلٰى لَهُمْ ؀ (۴۷/۲۵)

بلاشبہ وہ لوگ جو ہدایت (اور سعادت کا رستہ) واضح ہو جانے کے بعد پیٹھ موڑ کر ہٹ گئے ہیں۔ شیطان نے اُن کے لئے اُن کی بداعمالیوں کو مزین بنا دیا ہے اور ان کو بہت دور دور کی سوجھائی ہے۔

اور صرف منہ موڑ لینے والے ہی نہیں بلکہ ہر دروغ باف، تہمت تراش، فتنہ جو، بدکردار کا قلب روحِ شیطانی کا مہبط ہوتا ہے۔

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰي مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ؁ تَنَزَّلُ عَلٰي كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ؀ (۲۶/۲۲۱-۲۲۲)

(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) کیا میں تمہیں بتاؤں کہ کن لوگوں پر شیاطین اُترتے ہیں۔ وہ ہر دروغ باف اور بدکردار پر اُترتے ہیں

وحی شیطانی

یہی وہ وحیٔ شیطانی ہے جو اس کے رفقاء پر نازل ہوتی ہے۔

اِنَّ الشَّيٰطِيْنَ يُوْحُوْنَ اِلٰٓي اَوْلِيٰۗـــِٕــهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ

إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ ۝ (۶/۱۲۲–۱۲۱)

شیاطین تو اپنے مددگاروں کے دلوں میں (اپنی وحی کے ذریعے) وسوسے ڈالتے رہتے ہیں تاکہ تم سے کج بحثی کریں۔ اگر تم نے ان کا کہا مان لیا تو پھر سمجھ رکھو، تم بھی شرک کرنے والے ہو۔

اسی کی اتباع سے انسان کو روکا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ۝ (۲/۱۶۸)

اے افرادِ نسلِ انسانی! زمین میں جس قدر حلال اور پاکیزہ چیزیں (تمہاری غذا کیلئے) مہیا کر دی گئی ہیں۔ شوق سے کھاؤ، اور یہ جو لوگوں نے اپنے وہموں، خیالوں سے طرح طرح کی رسمی بندشیں اختیار کر رکھی ہیں، تو یہ شیطانی وسوسے ہیں۔ (تم) شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو۔ وہ تو تمہارا کھلا دشمن ہے۔

از فرق تا بقدم۔ زندگی کے ہر سانس اور لمحے میں کاملۃً احکامِ خداوندی کے سامنے جھکے رہنے اور اتباعِ شیطانی سے منہ موڑے ہوئے رہنا ہے شیوہ مومن

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ۝ (۲/۲۰۸)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! مسلم ہونے کے لئے صرف اتنا ہی کافی نہیں کہ زبان سے اسلام کا اقرار کر لو، بلکہ چاہیئے کہ پوری طرح اور (اعتقاد و عمل کی) ساری باتوں میں مسلم ہو جاؤ (یعنی قرآنی نظام پورے کا پورا قائم کرو۔ غیر خدائی نظام سے اس کے پیوند نہ لگاتے پھرو) اور دیکھو، شیطانی وسوسوں کی پیروی نہ کرو۔ وہ تو تمہارا کھلا دشمن ہے۔

شیطان کی محکومیت

خدائی احکام کے مقابلہ میں شیطانی احکام کے اتباع کا نام شیطان کی عبودیت (محکومیت) اختیار کرنا ہے۔ انسان سے اسی عبودیت سے احتراز کا عہد لیا گیا ہے۔

أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِي آدَمَ أَنْ لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ ۖ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ۝ وَأَنِ اعْبُدُونِي ۚ هَٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ۝ (۳۶/۶۰–۶۱)

اے افرادِ نسلِ انسانی! کیا میں نے تم سے یہ عہد نہیں لیا تھا کہ "شیطان کی عبودیت (پیروی اور فرمانبرداری) اختیار نہ کرنا بلاشبہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اور یہ کہ میری عبودیت (فرمانبرداری اور اتباع) اختیار کرنا (کیونکہ ایک) یہی سیدھا راستہ ہے۔

حضرات انبیائے کرامؑ۔ ابنِ آدم کو اسی فراموش کردہ عہد کی یاد دلانے (تذکیر و تنذیر) کے لئے تشریف لاتے رہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ سے کہا۔

يَا أَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَانَ ۖ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلرَّحْمَٰنِ عَصِيًّا (۱۹/۴۴)

اے ابا جان! شیطان کی عبودیت (پیروی، اطاعت) اختیار نہ کیجئے۔ بلاشبہ شیطان تو خدائے رحمان سے نافرمان ہو چکا ہے۔

ہر رسول کی یہی تعلیم تھی

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ ۖ فَمِنْهُمْ مَنْ هَدَى اللَّهُ وَمِنْهُمْ مَنْ حَقَّتْ عَلَيْهِمُ الضَّلَالَةُ ۚ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ (۱۶/۳۶)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے دنیا کی ہر امت میں کوئی نہ کوئی رسول ضرور پیدا کیا (تاکہ وہ پیام حق کا اعلان کر دے) کہ اللہ کی عبودیت (اطاعت اور پیروی) اختیار کرو اور سرکش قوتوں سے بچو۔ پھر ان امتوں میں سے بعض ایسی تھیں جن پر اللہ نے (کامیابی کی) راہ کھول دی۔ بعض ایسی تھیں جن پر گمراہی ثابت ہو گئی۔ پس دنیا میں چلو، پھرو اور دیکھو، جو قومیں (سچائی کی) جھٹلانے والی تھیں۔ انہیں بالآخر کیسا انجام پیش آیا؟

یہاں شیطان کے بجائے طاغوت کا لفظ آیا ہے اور یہ لفظ عبودیت کی نسبت سے بڑا جامع ہے۔ عبادت[1] یا عبودیت کی تشریح تو اپنے مقام پر آئے گی۔ یہاں صرف اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ اس سے مفہوم پرستش (یعنی پوجا پاٹ، worship) نہیں بلکہ غیر خدائی نظام کی محکومیت اختیار کرنا ہے۔

طاغوت کے معنی

چونکہ یہاں شیطان کے بجائے طاغوت کا لفظ استعمال ہوا ہے اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے پیشتر اس کا مفہوم متعین کر لیا جائے۔ طغیان کے معنی ہیں حد سے تجاوز کر جانا۔ چنانچہ طوفانِ نوحؑ کے وقت جب پانی کی موجیں پہاڑوں کی سی بلندیاں اختیار کر گئی تھیں وَهِيَ تَجْرِي بِهِمْ فِي مَوْجٍ كَالْجِبَالِ (۱۱/۴۲) (اور دیکھو، ایسی موجوں میں کہ پہاڑ کی طرح اٹھتی ہیں کشتی انہیں لئے جا رہی ہے) تو اس کیفیت کو پانی کی طغیانی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

---

[1] دنیا میں کوئی شخص (یا فرقہ) شیطان کی پرستش نہیں کرتا۔ عراق میں موصل کے قریب ایک باطنی قسم کے فرقہ (یزیدی) کے متعلق مشہور ہے کہ وہ شیطان کی پرستش کرتے ہیں۔ لیکن تحقیقات نے بتا دیا ہے کہ وہ بھی درحقیقت شیطان کی پرستش نہیں کرتے بلکہ اس کے ڈر کی وجہ سے اس کے خلاف کچھ نہیں کہتے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ خدا تو رحیم و کریم ہے۔ اس لئے اس سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں لیکن شیطان سے ضرور خوف کھانا چاہیے کہ وہ بہت نقصان پہنچا سکتا ہے۔ وہ (یزیدی) شیطان کو شیطان نہیں کہتے (کہ اس سے بے ادبی کا احتمال ہے) بلکہ اس کا نام ملک طاؤس رکھ چھوڑا ہے۔ بہرحال مطلب یہ ہے کہ شیطان کی عبادت سے مراد شیطان کی پرستش نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس سے مفہوم سرکش قوتوں کے احکام یعنی غیر خدائی نظام کی اتباع و اطاعت اختیار کرنا ہے۔ جیسا کہ متن میں آئندہ سطور سے واضح ہے۔

إِنَّا لَمَّا طَغَى الْمَاءُ حَمَلْنَاكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۝ (۶۹/۱۱)

(اور دیکھو) جب (ایسا ہوا تھا کہ) پانی حد سے بڑھنے لگا تو ہم نے تمہیں کشتی میں اٹھا لیا۔

یعنی کسی چیز کا اپنے اندازہ کے مطابق چلنا اعتدال ہے اور اس سے آگے بڑھ جانا سرکشی وطغیان۔ سورۂ رحمٰن میں اس مفہوم کی وضاحت اور بھی کھلے الفاظ میں فرمادی گئی ہے۔

وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ۝ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ ۝ وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ ۝ (۵۵/۷-۹)

آسمان کو اس نے بلند کیا اور میزان (عدل) کو قائم کیا تاکہ تم وزن کرنے میں حد سے تجاوز نہ کرو۔ اور وزن کو (صحیح طور پر) قائم رکھو اور (معاملات زندگی میں، تولنے جوکھنے میں کسی قسم کی) کمی نہ کرو۔

ترازو کے عدل کا سیدھا رکھنا اس کی صحیح حالت کا مظاہرہ ہے اس اندازہ سے ہٹ جانا۔ جادۂ مستقیم سے انحراف وسرکشی ہے۔ اب انسانی زندگی کی طرف آئیے۔ کائنات کی ہر شے انسان کے لئے مسخر کردی گئی ہے اس لئے ان پر حکمرانی انسان کے حیطۂ اقتدار کے اندر ہے۔ ان حدود کے اندر حکومت، سرکشی وطغیان نہیں لیکن خود انسان کسی دوسرے انسان کے تابع نہیں اس لئے کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کا حق حاصل نہیں۔ لہذا اگر کوئی انسان (یا گروہ) قوت فراہم کر کے دوسرے انسانوں کو اپنا محکوم بنا لیتا ہے تو یہ اس کا جائز حدود سے تجاوز ہے اور طغیان وسرکشی ایسی سرکشی جس میں یہ خدا کی ہمسری کا مدعی بن بیٹھتا ہے۔ اس لئے قرآن کریم کی رو سے نظام قرآنی کے علاوہ ہر قسم کا نظام اطاعت طاغوتی نظام ہے۔ اور اس کی فرماں پذیری شرف انسانیت کی تذلیل۔ اس نظام کا نتیجہ

ہر غیر خدائی نظام

فساد ہے جو صلاح کی ضد ہے۔ وہ اُمم سابقہ جنہوں نے قوانین الٰہیہ سے سرتابی اختیار کر کے خود ساختہ قوانین کی حکومت قائم کر رکھی تھی۔ طاغوتی نظام کی علمبردار تھیں جس کا نتیجہ فساد تھا۔ یعنی معاشرہ میں ناہمواریاں۔

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝ .... وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ ۝ الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ۝ فَأَكْثَرُوا فِيهَا الْفَسَادَ ۝ (۸۹/۶-۱۲)

(اے پیغمبر!) کیا تو نے دیکھا نہیں کہ تیرے پروردگار نے قوم عاد۔ یعنی اونچی اونچی عمارتوں والی قوم ارم کے ساتھ کیا برتاؤ کیا تھا۔ (ان جیسی مخلوق آج تک شہروں میں پیدا نہیں ہوئی اور اسی طرح کیا تمہیں معلوم نہیں کہ) قوم ثمود کے ساتھ جنہوں نے وادی میں چٹانیں تراش تراش کر عمارات بنائی تھیں۔ اور بڑے لشکروں والے فرعون (اور اس کے رفقاء) کے ساتھ جنہوں نے شہروں میں سرکشی (اور نافرمانی) اختیار کر رکھی تھی (کیا برتاؤ کیا گیا تھا؟) ان تمام قوموں نے ان بستیوں میں بہت زیادہ فساد مچایا تھا۔

بالخصوص فرعون جس کا جرم یہ تھا کہ اس نے طغیانی اختیار کر رکھی تھی۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ٥ (۲۰/۲۴)

(اے موسیٰ!) فرعون کی طرف جاؤ۔ بلاشبہ وہ بہت سرکش ہو گیا ہے۔

یہی طاغوتیت ان اقوام کی ہلاکت کا باعث تھی۔

فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ ٥ (۶۹/۵)

چنانچہ قوم ثمود بعض سرکشی کی وجہ سے ہلاک کی گئی

انسان سرتابی اس وقت اختیار کرتا ہے جب سمجھ لیتا ہے کہ مجھے کسی کی احتیاج نہیں۔ اسی زعم باطل کے ماتحت وہ کسی آئین و قانون کی پابندی کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰى ٥ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ٥ (۹۶/۶-۷)

ہرگز نہیں۔ یقیناً انسان سرکش ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو مستغنی سمجھنے لگتا ہے۔

یہ اس لئے کہ انسان سمجھتا ہے کہ زندگی صرف طبیعی جسم کے جینے کا نام ہے اور اس کے لئے میں نے اس قدر سامان اکٹھا کر لیا ہے کہ مجھے کسی کی احتیاج باقی نہیں۔

فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ٥ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا (۷۹/۳۷-۳۸)

سو جو کوئی حد سے گزر جائے اور زندگی کے مفاد عاجلہ کو مستقبل پر ترجیح دینے لگے۔

لیکن اگر وہ سمجھتا کہ زندگی صرف جسم کی پرورش کا نام نہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے اور اصل حیات اس کی تربیت و استحکام ہے تو وہ اپنے آپ کو کبھی دوسروں سے بے نیاز تصور نہ کرتا۔ اس لئے انسانی ذات کی تربیت و استحکام دوسرے انسانوں کی ربوبیت کا سامان فراہم کرنے سے ہوتی ہے۔ لہذا ایک فرد کبھی دیگر افراد انسانیہ سے بے نیاز ہو نہیں سکتا یہ اپنی تکمیل ذات کے لئے ایک ایسے معاشرے کا محتاج ہے جو قانون خداوندی کے مطابق متشکل ہو۔ بنا بریں یہ دوسرے انسانوں کا بھی محتاج ہے اور قوانین خداوندی کا بھی۔ لیکن جو لوگ اس حقیقت پر نگاہ نہیں رکھتے اور زندگی کو صرف جسم کی پرورش تک محدود خیال کر لیتے ہیں وہ قوانین خداوندی کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے اور اپنے خود ساختہ آئین و ضوابط کے مطابق معاشرہ متشکل کر لیتے ہیں یہی وہ لوگ جو طاغوتی نظام قائم کرتے ہیں جس میں خدائی قوانین کے بجائے ان کے خود ساختہ قوانین نافذ ہوتے ہیں۔ اس نظام کی طرف رجوع کرنے سے جماعت مومنین کو روکا گیا ہے۔ اس لئے کہ جن کا مقصد حیات آئین خداوندی کا نفاذ ہو ان کے لئے طاغوتی نظام کی طرف رجوع کرنا کیسے جائز قرار پا سکتا ہے

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ

يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ ۖ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا ۝ (4/60)

اے پیغمبر! کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر نظر نہیں کی جن کا دعویٰ یہ ہے کہ جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے اور جو کچھ تم سے پہلے نازل ہو چکا ہے۔ وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن عمل کا یہ حال ہے کہ، چاہتے ہیں، اپنے جھگڑے قضیے طاغوت کے پاس لیجائیں۔ حالانکہ انہیں حکم دیا جا چکا ہے کہ اس (کے نظام) سے انکار کریں۔ اور صرف اللہ کے نظام کی پیروی کریں۔ اصل یہ ہے کہ شیطان چاہتا ہے، انہیں اس طرح گمراہ کر دے کہ راہ راست سے بہت دور جا پڑیں

تحاکم الی الطاغوت تحاکم الی الطاغوت (یعنی زندگی کے معاملات کا تصفیہ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کے مطابق کرنا) سے یہ حقیقت بالکل واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ طاغوت سے مراد غیر خدائی نظام اطاعت ہے۔ جو لوگ اس نظام سے اجتناب کرتے ہیں ان کے لئے اس زندگی اور اس سے اگلی منزل دونوں میں سعادت و کامرانی کی بشارتیں ہیں۔

وَالَّذِينَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوتَ أَنْ يَعْبُدُوهَا وَأَنَابُوا إِلَى اللَّهِ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ ۚ فَبَشِّرْ عِبَادِ ۝ (39/17)

جو لوگ طاغوت کی محکومیت سے بچے اور قوانین الٰہیہ کی طرف جھکے اُن کے لئے (سعادت و کامرانی کی) بشارت ہے تو اے پیغمبر اسلام!) تو میرے بندوں کو (نظام خداوندی کی اطاعت کے نتائج حسنہ کی) خوشخبری دیدے۔

برعکس ان کے عباد الطاغوت کا ٹھکانا بہت بُرا ہے۔ (وَأَضَلُّ عَنْ سَوَاءِ السَّبِيلِ ۝ (5/60)) یعنی جہنم اس دنیا میں بھی جہنم (جس پر آج شعلہ زار یورپ کا ایک ایک ذرہ شاہد ہے) اور آخرت میں بھی جہنم۔

يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيهِمْ ۖ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا ۝ أُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَلَا يَجِدُونَ عَنْهَا مَحِيصًا ۝ (4/120-121)

شیطان اُن سے وعدے کرتا اور (باطل) آرزوؤں میں ڈالتا ہے، اور شیطان اُن سے جو کچھ وعدے کرتا ہے وہ فریب کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہی لوگ ہیں جن کا (بالآخر) ٹھکانا جہنم ہے اور یہ اس سے نکل بھاگنے کی کوئی صورت نہ پائیں گے

ابلیسی نظام قائم کرنے والے اور ان کے متبعین دونوں جہنم ہیں۔

فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيَاطِينَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ۝ ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيعَةٍ أَيُّهُمْ أَشَدُّ عَلَى الرَّحْمَٰنِ عِتِيًّا ۝ (19/68-69)

سو اے پیغمبر! تیرا پروردگار شاہد ہے کہ ہم ان سب کے اور ان کے ساتھ سارے شیطانوں کو ضرور اکٹھا کریں گے

پھر ان سب کو دوزخ کے گرد حاضر ہونے کا حکم دیں گے۔ زانوؤں پر گرے ہوئے۔ پھر ہر گروہ میں سے ان لوگوں کو چن چن کر، الگ کرلیں گے (جو اپنی زندگی میں) خدائے رحمان سے بہت ہی سرکش تھے۔

شیاطین اس لئے کہ انہوں نے ہی تو اپنی اطاعتوں اور فرماں پذیریوں سے اس نظام کی بنیادیں مستحکم کی تھیں۔

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَاۗءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ۝ (۴/۷۶)

جو لوگ ایمان رکھتے ہیں، تو ان کا لڑنا اللہ کی راہ میں ہوتا ہے (کیونکہ وہ نفسانی خواہشوں کے لئے نہیں لڑتے۔ نظام خداوندی کے قیام و بقا کے لئے لڑتے ہیں) اور جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں (یعنی شر و فساد کی قوتوں کے نظام کی تقویت کے لئے لڑتے ہیں) سو اگر تم ایمان رکھتے ہو تو چاہیئے کہ، شیطان کے حمایتیوں سے لڑو۔ (اور ان کی طاقت و کثرت کی کچھ پروا نہ کرو) شیطان کا مکر (دیکھنے میں) کتنا ہی مضبوط دکھائی دے۔ لیکن حق کے مقابلہ میں) کبھی جیتنے والا نہیں!

دیکھئے اس مقام پر طاغوت کے معنی پھر کس قدر ابھر کر سامنے آگئے ہیں۔ یعنی دنیا کی ہر وہ قوت جو انسانوں کے خود ساختہ قوانین کے مطابق حکومت قائم کرے اور نظام خداوندی کو قائم نہ ہونے دے۔

یہ تو ہے وہ طاغوتی نظام جو حکومت و سلطنت کی شکل میں مرتب ہوتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ایک اور طاغوتی نظام بھی ہے جو تقدس کا نقاب اوڑھ کر قائم کیا جاتا ہے۔ اس نظام میں انسانوں کی ایک جماعت دوسرے انسانوں کو اپنا محکوم و مطیع بناتی ہے

ایک اور طاغوتی نظام

لیکن بزور شمشیر نہیں بلکہ اُن کے دل کی گہرائیوں میں اپنی عقیدت و عظمت کا بُت اتار کر۔ جب اُن کی عقیدت یوں اُن کے دلوں میں گھر کرلیتی ہے تو پھر مقدسین کا یہ طائفہ اپنا ہر حکم ان سے منواتا ہے اور یوں اس قسم کی حکومت قائم کرتا ہے جس کی حفاظت کے لئے فوج اور سپاہ کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ وہ محکومیت ہے جس کی زنجیریں انسان خود نہایت تذلل و تعبد اور عجز و انکسار سے اپنے ہاتھوں اپنے پاؤں میں ڈالتا ہے۔ یہی وہ نظام ہے جس کے متعلق قرآن کریم میں ہے۔

اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ۝ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ۝ (۳۷/۲۲-۲۳)

(اور دیکھو) ان لوگوں کو جو (غیر اللہ کی محکومیت اختیار کرکے اپنے آپ پر) ظلم کیا کرتے تھے اور اُن کے ساتھیوں کو اور ان لوگوں کو جن کی وہ خدا کو چھوڑ کر عبودیت (اطاعت اور پیروی) اختیار کیا کرتے تھے جمع کرلو اور پھر اُن

سب کو دوزخ کے رستہ کی طرف لیجاؤ۔

اس کے بعد

وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ○ قَالُوْٓا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ ○ قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ○ وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ ۚ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ ○ (۳۷/۲۷-۳۰)

اور یاد کرو!) جب وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر سوال وجواب (یعنی اختلاف) کرنے لگیں گے۔ (چنانچہ پیروی کرنے والے) کہیں گے کہ تم تو ہمارے پاس (خیر و برکت کا مقدس نقاب اوڑھ کر) بہت زور و شور سے آیا کرتے تھے۔ (اب خدائی عذاب سے تو ہمیں بچاؤ) وہ لوگ (جواب میں) کہیں گے کہ (ہم تمہارے پاس کب آتے تھے؟) تم تو خود ہی (دل سے) مومن نہیں تھے (اس لئے غیر خدائی احکامات کی تلاش میں رہا کرتے تھے) ہمارا تم پر کوئی زبردستی بھی نہیں تھی بلکہ تم تو خود ہی سرکش جماعت کے افراد تھے (اس لئے خدا کی نافرمانی کے بغیر تمہیں خود ہی چین نہ آتا تھا۔)

غور فرمائیے۔ اس حقیقت کو کیسے واضح انداز میں بے نقاب کیا گیا ہے کہ ان متبوعین کی سیادت و قیادت اپنی قوت پر قائم نہیں ہوتی بلکہ متبعین کے جذبۂ عقیدت و ارادت پر مبنی ہوتی ہے اگر یہ انہیں ماننا چھوڑ دیں تو ان کی حکومت خود بخود ختم ہو جائے۔ بقول علامہ اقبالؒ

ایں ہمہ تا سجدہ اش کردی خداست
چوں یکے اندر قیام آئی فناست

(اور حقیقت تو یہ ہے کہ دنیا میں کسی قسم کا استبداد و تغلب کیوں نہ ہو اس کی بنیاد خود محکوم کی اپنی ہی کمزوری پر ہوتی ہے۔ وہ تو صرف ایک احکم الحاکمین کی ذات ایسی ہے جس کی حکومت دوسروں کی محکومیت کے جذبۂ اطاعت کی رہین منت نہیں بلکہ اپنی قوت پر قائم ہے۔ اس کے سوا یہ قوت کسی اور کو حاصل نہیں اس لئے حکومت کا حق بھی کسی اور کو نہیں)۔

بہرحال یہی وہ شیاطین ہیں جن کے متعلق فرمایا

وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ ...... اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ (۱۴/۲۲)

اور (دیکھو) جب فیصلہ ہو چکا تو شیطان بولا۔ بلاشبہ اللہ نے تم سے وعدہ کیا تھا۔ سچا وعدہ (اور وہ پورا ہو کر رہا) اور میں نے بھی تم سے وعدہ کیا تھا مگر اُسے پورا نہ کیا۔ مجھے تم پر کسی طرح کا تسلط نہ تھا (کہ تم میری پیروی پر مجبور ہو گئے ہو) جو کچھ پیش آیا وہ صرف یہ ہے کہ میں نے تمہیں بلایا اور تم نے میرا بلاوا قبول کر لیا۔ پس اب مجھے

ملامت نہ کرو۔ خود اپنے آپ کو ملامت کرو۔ آج کے دن نہ تو میں تمہاری فریاد کو پہنچ سکتا ہوں نہ تم میری فریاد کو پہنچ سکتے ہو۔ تم نے جو اس سے پہلے مجھے (اللہ کا) شریک ٹھہرا لیا تھا (کہ اس کے احکام کی طرح میرے حکموں کی بھی اطاعت کرنے لگے تھے) تو میں اس سے بیزاری ظاہر کرتا ہوں۔ بلاشبہ ظلم کرنے والوں کے لئے بڑا ہی دردناک عذاب ہے۔

دوسری جگہ ہے:

كَمَثَلِ الشَّيْطَانِ إِذْ قَالَ لِلْإِنسَانِ اكْفُرْ ج فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ إِنِّي بَرِيءٌ مِّنكَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ ۝ (۵۹/۱۶)

(ان منافقین کی حالت بعینہٖ) شیطان کی حالت کی طرح ہے کہ خود ہی تو انسان سے کہا کہ خدا کی ناشکری کر اور جب اس نے ناشکری کر لی (تو کہنے لگا کہ) "میں تجھ سے بالکل بری الذمہ ہوں، میں تو تمام جہانوں کے پروردگار خداوند تعالیٰ سے ڈرتا ہوں۔"

یہ ہے وہ طاغوتی نظام جس کے متعلق فرمایا کہ یہ ایمان باللہ کی ضد ہے۔

دو متمیز راستے لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ج فَمَن يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِن بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انفِصَامَ لَهَا ؕ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ؕ وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوتُ يُخْرِجُونَهُم مِّنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ ؕ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ (۲/۲۵۶-۲۵۷)

دین میں کسی قسم کا اکراہ نہیں۔ بلاشبہ ہدایت کی راہ گمراہی سے الگ اور نمایاں ہو گئی ہے (اور اب دونوں راہیں لوگوں کے سامنے ہیں جسے چاہیں اختیار کریں) پھر جو کوئی طاغوت سے انکار کرے (یعنی ہر اس نظام کی اطاعت سے انکار کر دے جو غیر خدائی قوانین پر مشتمل ہو) اور اللہ پر ایمان لائے (یعنی صرف اس نظام کی اطاعت کرے جو قوانین خداوندی کی ترویج کے لئے قائم ہو) تو بلاشبہ اس نے (فلاح و سعادت کی) مضبوط شاخ پکڑ لی۔ یہ شاخ ٹوٹنے والی نہیں (جس کے ہاتھ آ گئی وہ گرنے سے محفوظ ہو گیا) اور یاد رکھو۔ اللہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔ اللہ ان لوگوں کا ساتھی اور مددگار ہے جو ایمان کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ انہیں (ہر طرح کی) تاریکیوں سے نکالتا ہو روشنی میں لاتا ہے۔ مگر جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے، تو ان کے مددگار سرکش اور مفسد (طاغوت) ہیں۔ وہ انہیں روشنی سے نکالتے اور تاریکیوں میں لیجاتے ہیں۔ سو یہی لوگ ہیں جن کا گروہ دوزخی گروہ ہے۔ ہمیشہ عذاب جہنم میں رہنے والا۔

---

[1] فٹ نوٹ صفحہ ۱۷۱ پر دیکھئے۔

آپ اِلّا اللہ کے قائل نہیں ہو سکتے جب تک پہلے لَا اِلٰہَ کے عملی معترف نہ ہوں آپ نظامِ خداوندی کی اتباع نہیں کر سکتے جب تک ہر غیر خدائی نظام سے روگردانی نہ کریں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ بیک وقت آپ کا منہ مشرق اور مغرب دونوں کی طرف ہو جائے۔ ایک کی طرف منہ کرنے کے لئے دوسرے سے منہ موڑنا پڑے گا۔ یہی ہر رسول کی تعلیم تھی۔ یہی اسلام کا عروۃ الوثقیٰ ہے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّۃٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَی اللّٰہُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَیْهِ الضَّلٰلَۃُ ؕ فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الْمُکَذِّبِیْنَ ○ (16/36)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے (دنیا کی) ہر امت میں کوئی نہ کوئی رسول ضرور پیدا کیا، (تاکہ اس پیام حق کا اعلان کر دے) کہ اللہ کی محکومیت اختیار کرو، اور سرکش قوتوں (کے طاغوتی نظام) سے بچو۔ پھر ان امتوں میں سے بعض ایسی تھیں جن پر گمراہی ثابت ہو گئی۔ پس زمین میں چلو پھرو اور دیکھو، جو قومیں سچائی کی جھٹلانے والی تھیں انہیں بالآخر کیسا انجام پیش آیا۔

غور کیجئے! جو رسول بھی آیا اس دعوتِ انقلاب کو لے کر آیا کہ اطاعت و محکومیت صرف ایک خدائے واحد القہار کی ہے اس کے علاوہ کوئی نظامِ اطاعت ایسا نہیں جس کی اتباع کی جائے اور خدا کی اطاعت ہو نہیں سکتی جب تک ہر غیر خدائی نظام سے عملاً انکار نہ کیا جائے۔ کیسی عظیم الشان ہے یہ دعوت اور کتنا محیر العقول انقلاب!! ایسا

لہ فٹ نوٹ متعلقہ صفحہ) یہاں یہ فرمایا کہ اللہ تو ظلمات سے نور کی طرف لیجاتا ہے اور طاغوتی نظام نور سے ظلمات کی طرف۔ نور اور ظلمات کی تشریح تو اپنے مقام پر آئے گی۔ یہاں سورۂ ابراہیم کی ایک آیت پر غور کیجئے۔ جہاں فرمایا

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَاۤ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَکَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ۙ وَذَکِّرْهُمْ بِاَیّٰىمِ اللّٰہِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوْرٍ ○ (14/5)

اور دیکھو، یہ واقعہ ہے کہ ہم نے اپنی نشانیوں کے ساتھ موسیٰ کو بھیجا تھا کہ وہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکالے اور روشنی میں لائے اور انہیں اللہ کے (فیصلہ کن) واقعات کی یاد دلائے۔ کیونکہ ہر اس انسان کے لئے جو حق کی راہ میں مستقل مزاج ہے اور چاہے کہ اس کی کوششیں بھرپور نتائج مرتب کریں، ان واقعات میں (عبرت و موعظت کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں۔

ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ کا مشن یہ تھا کہ وہ بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی و محکومیت سے نکال کر قوانین الٰہیہ کے اتباع میں لے آئیں (تفصیل آگے چل کر ملے گی)۔ لہذا جس فضا میں قوانین الٰہیہ کا نفاذ ہو وہ نورانی فضا ہے اور جس میں طاغوتی نظام اطاعت قائم ہو وہ ظلمت ہے۔ طاغوت کا مقصد زندگی یہ ہوتا ہے کہ انسان کو انسانی نظامِ اطاعت کا محکوم رکھے اور جماعتِ مومنین کی سعی و عمل کا مرکز یہ کہ ایسے نظام کو توڑ کر نظامِ خداوندی قائم کیا جاوے

انقلاب جو انسان کو دوسرے انسانوں کی ہر قسم کی غلامی سے نجات دلاکر اسے اس قابل بنادیتا ہے کہ وہ اپنا سر اونچا کرکے چلے۔

شیطانی لغزش کے اسباب یہ ہے طاغوت یعنی انسانی پیکروں میں ابلیس۔ یہ بھی یاد رہے کہ شیطان کی طرف سے لغزش کے سامان خود انسانی اعمال فراہم کرتے ہیں جنگ احد میں جب مجاہدین کی ایک جماعت سے ذراسی لغزش ہوگئی تو اس کے متعلق فرمایا۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا ۖ وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ○ (۳/۱۵۵)

تم میں سے جن لوگوں نے اس دن لڑائی سے منہ موڑ لیا تھا جس دن دونوں لشکر ایک دوسرے سے مقابل ہو رہے تھے تو ان کی اس لغزش کا باعث صرف یہ تھا کہ بعض کمزوریوں کی وجہ سے جو انہوں نے پیدا کر لی تھیں شیطان نے اُن کے قدم ڈگمگا دیئے۔ (یہ بات نہ تھی کہ اُن کے ایمان میں فتور آ گیا ہو۔ بہرحال، یہ واقعہ ہے کہ خدا نے ان کی یہ لغزش معاف کر دی۔ اس کا قانون ایسا ہے کہ ایک بڑے نظام میں ایسی ایسی کوتاہیوں کی طرف سے سامانِ حفاظت مل جاتا ہے اور نظام یونہی اپنی جگہ سے ہل نہیں جاتا۔

خود اعمالِ انسانی یعنی شیطان کی طرف سے لغزش خود انسانی اعمال کا نتیجہ ہے۔ جب حضرت موسیٰؑ نے ایک قبطی نوجوان کو مار ڈالا (جس کی تفصیل اپنے مقام پر ملے گی) تو اس کے بعد کہا کہ هَٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ ۖ إِنَّهُ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِينٌ ○ (۲۸/۱۵) (یہ شیطان کے عمل کی وجہ سے ہوا۔ بلاشبہ وہ ایک گمراہ کرنے والا کھلا دشمن ہے) حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے ایک خاص سکیم کے ماتحت آپ کو حضرت یعقوبؑ سے الگ کیا تھا۔ لیکن حضرت یوسفؑ نے بھائیوں کی اس عداوت کو شیطان کی طرف منسوب کیا۔ (دیکھئے ۱۲/۱۰۰)

سورۂ زخرف میں ہے کہ جو شخص خدائے رحمان کے قانون سے آنکھیں بند کرلیتا ہے اللہ اس پر شیطان مسلط کر دیتا ہے۔ پھر ایسے لوگوں کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ غلط راہ پر چلے جا رہے ہیں لیکن بزعم خویش سمجھتے یہ ہیں کہ ہم راہ راست پر ہیں۔

وَمَن يَعْشُ عَن ذِكْرِ الرَّحْمَٰنِ نُقَيِّضْ لَهُ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهُ قَرِينٌ ○ وَإِنَّهُمْ لَيَصُدُّونَهُمْ عَنِ السَّبِيلِ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُم مُّهْتَدُونَ ○ (۴۳/۳۶-۳۷)

اور یاد رکھو! جو کوئی رحمٰن کے قانون سے آنکھیں بند کر لیتا ہے تو ہم ایک شیطان کو اس پر مسلط کر دیا کرتے ہیں۔ چنانچہ وہی اس کا ساتھی ہوتا ہے۔ اور یقیناً یہ شیاطین، ان لوگوں کو نظامِ خداوندی کی راہ سے روکتے ہیں۔ (مگر شیطانی

اثرات کے ماتحت یہ لوگ اس قدر بے حس ہو جاتے ہیں کہ اپنی گمراہی کا انہیں پتہ نہیں چلتا بلکہ، وہ خیال کرتے ہیں کہ وہ صحیح راستہ پر چل رہے ہیں۔

قرین آیات بالا سے واضح ہے کہ شیطان کی طرف سے لغزش۔ انسانی اعمال ہی کا نتیجہ ہوتی ہے اور ان اعمال کے محرکات بالعموم اس سوسائٹی کے اثرات ہوتے ہیں جسے وہ اپنے لئے اختیار کرتا ہے کیونکہ ہم نشینی کا اثر بہت گہرا ہوتا ہے۔ اسی کو قرآن کریم نے قرین (ہمنشین) کہا ہے۔ سورۂ نساء میں ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَاۗءَ قَرِيْنًا ۝ (۴/۳۸)

(اور ان لوگوں کو بھی خدا دوست نہیں رکھتا، جو محض لوگوں کے دکھانے کو (نام و نمود کے لئے) مال خرچ کرتے ہیں اور فی الحقیقت اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے (کیونکہ اگر اللہ پر سچا ایمان رکھتے، تو کبھی ایسا نہ کرتے کہ اسے چھوڑ کر انسانوں کے سامنے نمائش کرنی چاہتے) اور (دیکھو) جس کسی کا ساتھی شیطان ہوا تو کیا ہی برا یہ ساتھی ہے!

شیطان خود نفس انسانی کی گہرائیوں میں چھپا بیٹھا ہو یا دوستوں کی شکل میں اثر انداز، نتیجہ بہر حال ضلالت و گمرہی ہے۔

يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ۝ لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَاۗءَنِيْ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ۝ وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۝ (۲۵/۲۸-۳۰)

(اور ظالم کہے گا) میری بدبختی۔ کاش میں نے فلاں شخص کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا؛ اس کے بعد کہ خدا کا قانون میرے پاس آچکا تھا اس نے مجھے اس سے بھٹکا دیا۔ اور شیطان تو (بری راہ پر لگا دینے کے بعد) چھوڑ دینے والا ہے ہی) اور رسول کہے گا کہ "اے میرے پروردگار! بلاشبہ میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا[1]"

حاشیہ نشین! یہ ہم نوالہ و ہم پیالہ جھوٹی خوشامدیں اور فریب کارانہ قصیدہ خوانیوں سے اصل حقیقت کبھی سامنے نہیں آنے دیتے اور اپنے اغراض و مقاصد کی خاطر اپنے مصاحب کی لغویات و خرافات کو مزین بنا بنا کر دکھاتے رہتے ہیں۔

---

[1] غور کیجئے شیطان کا سب سے بڑا حربہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قرآن کی تعلیم کو نگاہوں سے اوجھل کر دیتا ہے اور لوگوں کو انسانوں کے خود ساختہ مذہب کے پیچھے لگا دیتا ہے۔

وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَاءَ فَزَيَّنُوا لَهُمْ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا خَاسِرِينَ ۝ (۴۱/۲۵)

اور دیکھو) اُن کے لئے ہم نے کچھ ایسے ہم نشین (ساتھی) مسلط کر دیئے ہیں جو اُن کے اگلے اور پچھلے کاموں کو (خواہ وہ کتنے ہی بُرے کیوں نہ ہوں) مزین کر کے دکھاتے رہتے ہیں۔ سو جن و انس کی اُن جماعتوں کے ساتھ جو اُن سے پہلے گزر چکی ہیں۔ اُن کے حق میں بھی یہ بات سچی ہی ہو کر رہی کہ بلاشبہ یہ سب لوگ خسارہ اُٹھانے والے ہیں۔
چنانچہ یہ اور اس کے ساتھی سب جہنم کی ہلاکت میں جا پہنچتے ہیں۔

وَقَالَ قَرِينُهُ هَٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيدٌ ۝ .... مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَا أَنَا بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيدِ ۝ (۵۰/۲۳—۲۹)

اور (یاد کرو جب ایسا ہوگا کہ قیامت کے دن بدعمل انسان کا ہر ساتھی (ہمنشین)، بجائے ساتھ دینے کے مخالفت میں) کہیگا "یہ ہے وہ سب کچھ جو میرے پاس (جہنم) کے لئے، تیار تھا، ہر ناشکر گزار دشمن (حق) کو جہنم میں ڈال دو! (خصوصیت کے ساتھ ہر اس شخص کو جو خیر سے روکنے والا۔ حد سے بڑھنے والا اور شک کرنے والا تھا جس نے اللہ کے ساتھ ایک دوسرا الٰہ بنا لیا۔ (ایسے شخص کو) سخت عذاب میں ڈال دو" (پھر بارگاہِ الٰہی میں اپنی برأت کرتے ہوئے) اُس کا ساتھی (ہمنشین) کہے گا کہ "اے ہمارے پروردگار میں نے تو اسے سرکش نہیں بنایا تھا وہ تو خود ہی بڑی دور کی گمراہی میں پڑا ہوا تھا" تو خدا ان سے فرمائے گا" میرے سامنے مت جھگڑو میں تو عذاب کا وعدہ تمہاری طرف پہلے ہی بھیج چکا ہوں۔ میرے یہاں بات بدلی نہیں جایا کرتی۔ اور نہ میں بندوں پر ظلم کرنے والا ہوں (کہ بلاوجہ بندوں کو عذاب میں مبتلا کر دوں)"
وہ قرین صاف مُکر جائے گا کہ اس نے اسے نہیں بہکایا۔ یہ تو خود ہی بہک جانے پر تُلا بیٹھا تھا۔

حَتَّىٰ إِذَا جَاءَنَا قَالَ يَا لَيْتَ بَيْنِي وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِينُ ۝ (۴۳/۳۸)

حتیٰ کہ جب وہ ہمارے سامنے آئے گا تو (اس شخص سے جسے دنیا میں بہکایا تھا) کہے گا" اے کاش میرے اور تیرے درمیان مشرق و مغرب کی دوری ہوتی" (کہ تیری بدعملی کی پاداش میں یہاں تو نہ پکڑا جاتا۔ ذرا خیال تو کرو کہ یہ کتنا بُرا ساتھی ہے لیکن جو لوگ خدا کے قانون کی اتباع کرتے ہیں اُن پر اس قسم کے قرین کا کوئی اثر نہیں ہوتا کیونکہ وہ ہر وقت خدا کو سامنے رکھتے ہیں۔ اہل جنت کے باہمی مکالمہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا

قَالَ قَائِلٌ مِنْهُمْ إِنِّي كَانَ لِي قَرِينٌ ۝ .... وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّي لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِينَ (۳۷/۵۱—۵۷)

(اور خیال) کرو کہ جب ایسا ہو گا کہ) اُن میں سے ایک کہنے والا کہے گا کہ میرا (دنیا میں) ایک ساتھی تھا جو کہا کرتا تھا کیا تو (ان رسولوں کی باتوں کی) تصدیق کرنے والوں میں سے ہے؟ کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں

(کا ڈھیر) رہ جائیں گے۔ تو (پھر بھی) ہم اپنے اعمال کا بدلہ دیئے جائیں گے؟ وہ (جنت کے ساتھیوں سے) کہیگا کیا تم (جہنم کی طرف) جھانک کر دیکھو گے؟ (بالآخر) وہ خود ہی جھانکے گا اور (اپنے) اُس (ساتھی) کو جہنم میں دیکھے گا۔ اور کہے گا۔ خدا کی قسم قریب تھا کہ تو مجھے ہلاک ہی کر ڈالتا۔ اگر میرے پروردگار کا مجھ پر احسان و فضل نہ ہوتا تو (آج) یقیناً میں بھی ان لوگوں میں سے ہی ہوتا جو (عذاب الٰہی میں) حاضر کئے گئے ہیں۔

اور ان شیاطین کے اثرات سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو قوانین الٰہیہ کی حفاظت میں لے آئے۔ چنانچہ فرمایا۔

وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

اور (اے پیغمبر اسلام!) اگر شیطان کی طرف سے تیرے دل میں کوئی خلش وسوسہ کی پیدا ہو تو فوراً قوانین الٰہیہ کی پناہ میں آجایا کرو۔ یقیناً وہ قانون اس خدا کا ہے جو سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔

٭ ٭ ٭

شیطان سے پناہ کا طریقہ

یہی ہیں وہ شیاطین جو پہلے دن سے ذریت آدم کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور قیامت تک سایہ کی طرح ساتھ رہیں گے۔ ان داخلی اور خارجی تباہ کاریوں سے بچنے کا طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ جوں ہی اُن کے شعلہ کی لپک دکھائی دے۔ فوراً اپنے آپ کو حدود اللہ کے اندر لے آؤ جہاں خدا کا قانون تمہاری حفاظت کرے گا۔

وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰۗىِٕفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ۝ وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ ۝ (۲۰۰-۲۰۲/۷)

اور اگر ایسا ہو کہ شیطان کی طرف سے وسوسہ کی کوئی خلش محسوس ہو، تو قوانین الٰہیہ کی حفاظت میں آجاؤ۔ بلاشبہ وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ جو لوگ قوانین خداوندی کی حفاظت میں رہتے ہیں اگر انہیں شیطان کی وسوسہ اندازی سے کوئی خیال چھو بھی جاتا ہے، تو فوراً چونک اٹھتے ہیں، اور پھر پردہ غفلت اس طرح ہٹ جاتا ہے گویا، اچانک ان کی آنکھیں کھل گئیں! مگر جو لوگ شیطانوں کے بھائی بند ہیں، تو انہیں گمراہی میں کھینچے لئے جاتے ہیں، اور پھر اس میں ذرا بھی کمی نہیں کرتے۔

شیاطین کی وسوسہ اندازیوں اور فریب کاریوں سے بچنے کے لئے یہ آرزو کرو کہ

وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ۝ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ۝ (۹۸-۹۷/۲۳)

"خدایا! میں شیطانی وسوسوں سے تیرے قانون کے دامن میں پناہ لیتا ہوں۔ میں اس سے بھی تیری حفاظت چاہتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں!"

حضرت مریمؑ کی والدہ نے ان ہی دعاؤں اور آرزوؤں کے ساتھ اپنی بچی کو اللہ کے حفظ امن میں سونپا تھا۔ جب کہا تھا کہ وَاِنِّیْٓ اُعِیْذُھَا بِکَ وَذُرِّیَّتَھَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ (۳۶/۳) (میں اسے اور اس کی نسل کو تیری پناہ میں دیتی ہوں کہ شیطان رجیم (کی وسوسہ اندازیوں) سے محفوظ رہے) اس لئے کہ جو ایسا کھلا دشمن، لیکن ایسا دام ہمرنگ زمین بچھا کر وار کرنے والا ہو۔ اس کے حربوں سے تو امین خداوندی کے علاوہ اور کہاں پناہ مل سکتی ہے؟ اسی حقیقت کو زیادہ گہرائی سے دل نشین کرنے کے لئے بار بار اس طرف توجہ دلائی گئی کہ یاد رکھو!

اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ۝ (۲/۱۶۸، ۲/۲۰۸، ۶/۱۴۲، ۳۶/۶۰، ۴۳/۶۲)

بلاشبہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

طاغوتی نظام کے سرغنہ ۔ شیاطین

چونکہ شیطان سرکشی و بغاوت کا مظہر ہے اس لئے قرآن نے خدا فراموش جماعتوں کے سرغنوں اور سرکردہ لیڈروں کے لئے بھی شیاطین کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور حق بھی یہ ہے کہ یہ لوگ جو اس کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ دنیا میں خدا کا قانون رائج نہ ہونے پائے، اگر شیاطین نہیں تو اور کیا ہیں؟ سورۂ بقرہ کے شروع ہی میں منافقین کے متعلق فرمایا:

وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِھِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَکُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَھْزِءُوْنَ ۝ (۲/۱۴)

جب یہ لوگ ان لوگوں سے ملتے ہیں جو (دعوتِ حق پر) ایمان لاچکے ہیں تو اپنے آپ کو مومن ظاہر کرتے ہیں لیکن جب اپنے شیطانوں کے ساتھ اکیلے میں بیٹھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو ان کے ساتھ تمسخر کرتے تھے۔ ورنہ (ویسے دل سے تو) ہم تمہارے ہی ساتھ ہیں۔

سورۂ انفال میں اس شیطان کا ذکر ہے جس نے کفار مکہ کو مسلمانوں کے خلاف ابھارا تھا۔ اور پھر میدانِ کارزار سے خود بھاگ نکلا تھا۔ تاریخ اس کا نام سراقہ ابن مالک ابن جعشم بتاتی ہے۔

وَاِذْ زَیَّنَ لَھُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَھُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَکُمُ الْیَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّیْ جَارٌ لَّکُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَکَصَ عَلٰی عَقِبَیْہِ وَقَالَ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْکُمْ اِنِّیْٓ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰہَ ۚ وَاللّٰہُ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۝ (۸/۴۸)

اور (پھر) جیسا ایسا ہوا تھا کہ شیطان نے ان کا یہ وگرام ان کی نگاہوں میں خوشنما کر کے دکھا دیا تھا اور کہا تھا آج ان لوگوں میں کوئی نہیں جو تم پر غالب آسکے اور میں تمہارا پشت پناہ ہوں، مگر جب دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو الٹے پاؤں واپس ہوا اور لگا کہنے "مجھے تم سے کچھ سروکار نہیں۔ مجھے وہ بات دکھائی دے رہی ہے جو

تم نہیں دیکھتے میں اللہ سے خوف کھاتا ہوں اور اللہ (مجرموں کی پاداش میں) بہت سخت سزا دینے والا ہے

سورۂ بقرہ کے بارہویں رکوع میں حضرت سلیمانؑ کا ذکر ہے جس کے ضمن میں فرمایا کہ یہود بجائے اس کے کہ قانون خداوندی کا اتباع کرتے، ان افتراپردازیوں اور افسانہ طرازیوں کے پیچھے لگ جاتے تھے جو "شیاطین" نے مملکت حضرت سلیمانؑ کے خلاف پھیلا رکھی تھیں۔

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا

...... (۲/۱۰۲)

یہ لوگ ان افسانہ طرازیوں کے پیچھے لگ گئے جو مفسدہ پرداز لوگوں نے مملکت سلیمانی کے خلاف پھیلا رکھی تھیں (جن کی رو سے وہ کہتے تھے کہ سلیمان کا خزانہ عقائد و اعمال کا مرتکب ہو چکا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ) سلیمان نے کبھی کفر کی روش اختیار نہیں کی۔ (نہ ہی وہ ایسا کر سکتا تھا) بلکہ ان مفسدہ پردازوں نے وہی روش اختیار کر رکھی تھی۔

یہاں بھی شیاطین سے مفہوم فتنہ جو اور فساد انگیز لوگوں کے سرغنوں سے ہے (تفصیل ان کی اپنے مقام پر آئے گی) سورۂ انعام میں فرمایا۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ۝ (۶/۱۱۲)

اور (اے پیغمبر!) اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے (جب اس کی دعوت کا ظہور ہوا تو) شہری اور بدوی لوگوں کے سرغنوں کو اس کا دشمن ٹھہرا دیا جو ایک دوسرے کو خوشنما باتیں سکھاتے تاکہ لوگوں کو فریب دیں۔ اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو (یقیناً ایسا کر سکتا تھا کہ) وہ دشمنی نہ کرتے (اس کا قانون یہی ہے کہ انسان کے اختیار کو سلب نہ کیا جائے) پس ان کی مخالفت سے دل گرفتہ نہ ہو اور انہیں ان کی افتراپردازیوں میں چھوڑ دو۔

عہد سلیمانی کے شیاطین

جن کی تفصیل عنوان سابقہ میں گزر چکی ہے۔ یہاں یہ واضح ہے کہ حضرات انبیاء کرامؑ کے پیغام اور مشن کے مخالفین کو شیاطین کہا گیا ہے۔ یعنی کفار کے سرکش لیڈر۔ اسی طرح غیر مہذب اور وحشی قبائل کے وہ قوی ہیکل، دیو پیکر شریر لوگ جنہیں حضرت سلیمانؑ نے ہیکل کی تعمیر کے سلسلہ میں مختلف کاموں پر لگا رکھا تھا شیاطین کے نام سے مذکور ہیں۔

وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ۝ (۲۱/۸۲)

اور سرکش قبائل کے وحشی انسان جو اس کے لئے دریاؤں میں غوطے لگاتے اور اس کے علاوہ اور بھی طرح طرح کے کام کرتے۔ اور ہم انہیں اپنی پاسبانی میں لئے ہوئے تھے۔

ان ہی کے متعلق سورۂ ص میں آیا ہے۔

وَالشَّیٰطِیْنَ کُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ ۝ وَّاٰخَرِیْنَ مُقَرَّنِیْنَ فِی الْاَصْفَادِ ۝ (۳۸/۳۷-۳۸)

اور (دیکھو) شیطانوں کو ہم نے اس کے لئے مسخر کر دیا تھا۔ کہ ان میں سے ہر ایک معمار یا غوطہ خور تھا (ان کے علاوہ) اور

بھی (شیاطین ایسے تھے جو) زنجیروں میں جکڑے ہوئے رہتے تھے

یہاں زنجیروں میں جکڑے ہونے کے واقعہ نے بالکل واضح کر دیا کہ یہ شیاطین سرکش اور شریر اقوام کے باشندے تھے جنہیں حضرت سلیمان نے کام پر لگا رکھا تھا (تفصیل اپنے مقام پر آئے گی)

قرآن کریم کے بعض مقامات پر شیاطین کا ذکر اس انداز سے بھی آیا ہے جس سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ کائنات کی کوئی ایسی قوتیں ہیں جن کا اثر مختلف اجرام سماوی کی نقل و حرکت پر پڑ سکتا ہے لیکن ان کے برعکس اس فضا میں نقل و حرکت کا کوئی ایسا قانون کارفرما ہے جو ان اثرات کو نتیجہ خیز نہیں ہونے دیتا۔ مثلاً سورۂ حجر میں ہے۔

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَیَّنّٰھَا لِلنّٰظِرِیْنَ ۝ وَحَفِظْنٰھَا مِنْ کُلِّ شَیْطٰنٍ رَّجِیْمٍ ۝ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِھَابٌ مُّبِیْنٌ ۝ (۱۵/۱۶-۱۸)

اور (دیکھو) یہ ہماری ہی کارفرمائی ہے کہ آسمان میں بُرج بنا دیئے (یعنی روشن کواکب پیدا کر دیئے) اور اُسے دیکھنے والوں کے لئے خوشنما کر دیا۔ نیز ہر دھتکارے ہوئے شیطان سے اس کی حفاظت کر دی۔ الّا یہ کہ کوئی کن سُن لینا چاہے، تو پھر ایک چمکتا ہوا شعلہ ہے جو اس کا تعاقب کرتا ہے۔

اس کے بعد کرۂ ارض اور اس کی ہواؤں اور بارشوں کا ذکر ہے۔ دوسری جگہ ہے۔

اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَةِ نِ الْکَوَاکِبِ ۝ وَحِفْظًا مِّنْ کُلِّ شَیْطٰنٍ مَّارِدٍ ۝ لَا یَسَّمَّعُوْنَ اِلَی الْمَلَاِ الْاَعْلٰی وَیُقْذَفُوْنَ مِنْ کُلِّ جَانِبٍ ۝ دُحُوْرًا وَّلَھُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۝ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِھَابٌ ثَاقِبٌ ۝ (۳۷/۶-۱۰)

اور ہم نے ورلے آسمان کو زینت کواکب سے آراستہ و پیراستہ کر رکھا ہے۔ اور ہر سرکش شیطان سے اُن کی حفاظت کر رکھی ہے۔ وہ ملاء اعلیٰ کی باتیں نہیں سُن سکتے اور ہر طرف سے روکے جاتے ہیں۔ دھتکارے ہوئے اور ان کے لئے لازم ہو جانے والا عذاب ہے۔ لیکن اگر کوئی ایک آدھ بات اچک کر لے بھاگے تو اس کے پیچھے ایک چمکتا ہوا انگارہ آتا ہے

ان مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملات فلکیات کے ان رموز و اسرار سے متعلق ہیں جو ہنوز علم انسانی کی آنکھ سے پوشیدہ ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ علم انسانی رفتہ رفتہ ان بلندیوں تک جا پہنچے کہ یہ معارف و حقائق بھی اس کے آئینۂ ادراک میں منعکس ہو جائیں۔ اور علم انسانی بایں ہمہ ادعائے فلک رسائی و عرش پیمائی۔ ہنوز حین طفلانہ مراحل سے گزر رہا ہے اس پر ہر نگہ بصیرت شاہد ہے (مزید تفصیل ملائکہ اور وحی کے عنوان میں ملے گی) جوں جوں اس کے تجربات و مشاہدات کی وسعت بڑھتی جاتی ہے کائنات کے پوشیدہ اسرار اس کی نگاہوں کے سامنے بے نقاب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ایک ایتھر ہی کو لیجئے کتنی بڑی قوت تھی جو ابھی کل تک انسان کے علم سے مستور تھی حالانکہ وہ پہلے دن سے اس فضا میں کارفرما تھی۔ نہ معلوم ابھی ایسی ہی کتنی اور قوتیں ہیں جو کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں انسانی آنکھوں سے اوجھل سرگرم عمل ہیں

جوں جوں ان غیر مرئی قوتوں کا علم ہوتا جائے گا، قرآن کے اس قسم کے مقامات سمجھ میں آتے جائیں گے۔ قرآن کسی ایک دور کے علم کے ساتھ وابستہ نہیں۔ وہ تمام زمانوں کے لئے کتاب حقائق ہے۔ جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا جائے گا اس کے حقائق و غوامض بے نقاب ہوتے چلے جائیں گے۔ سورۂ صافات کی مندرجہ صدر آیات میں البتہ ملاء اعلیٰ کا ذکر اس طرف توجہ دلاتا ہے

نجومی اور کاہن

کہ یہاں "شیاطین" کا ذکر ہے جن کی کوششیں یہ ہوتی تھیں کہ کسی طرح عالم ملکوت کے اسرار و غوامض تک رسائی ہو سکے۔ یعنی کاہن یا نجومی۔ انسان کے عہد جاہلیت میں سحر و کہانت ایک خاص فن تھا جس کے ماہرین لوگوں کی توہم پرستی سے فائدہ اٹھا کر اپنی پرستش کراتے تھے۔ سورۂ طور کے دوسرے رکوع میں دیکھئے۔ مذکور ہے۔

اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَائِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ ۝ (۵۲/۳۷)

(اے پیغمبر!) کیا ان کے پاس تیرے پروردگار کے خزانے ہیں یا وہ (یہ سمجھتے ہیں کہ وہ خود ہی دنیا جہان کے) داروغہ ہیں۔

سلسلۂ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان کاہنوں یا نجومیوں کا ذکر ہے جن کی اس زمانہ میں پرستش ہوتی تھی۔ اس کے بعد ہے

اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ ۚ فَلْيَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ (۵۲/۳۸)

یا اُن کے پاس کوئی سیڑھی ہے (جس پر چڑھ کر وہ آسمانوں سے راز کی) باتیں سن آتے ہیں۔ تو (اے پیغمبر! تو اُن سے کہہ کیوں نہیں دیتا کہ) جو اُن میں سے سننے والا ہے اسے کوئی واضح دلیل لانی چاہیئے؟

یہاں اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ یہ سب ان لوگوں کی حیلہ کاری اور فسوں سازی ہے جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہیں آسمانی باتوں کا بھی علم ہو جاتا ہے۔ وحیٔ آسمانی تک ان لوگوں کی رسائی نہیں۔ یہ حقائق تو کتاب اللہ میں ہی مل سکتے ہیں جس کا نزول ملاء اعلیٰ سے ہوتا ہے۔ کتاب اللہ کسی شیطان کا کلام نہیں ہے۔

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۝ (۸۱/۲۵)

اور وہ (قرآن) کسی مردود شیطان کا کلام نہیں ہے۔

قرآن اُن کے اثرات سے منزہ ہے

بلکہ شیاطین تو اس کے سننے تک سے باز رکھے گئے ہیں۔

وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ۝ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ۝ (۲۶/۲۱۰–۲۱۲)

اور (دیکھو اے پیغمبر اسلام!) اس قرآن کو شیاطین لیکر نہیں اُترے نہ انہیں لیکر اترنا چاہیئے اور نہ ہی وہ اتر سکتے ہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ سننے سے بھی باز رکھے گئے ہیں۔ (کیونکہ قرآن ایک مکمل صداقت اور حقانیت ہے اور صداقت و حقانیت سے شیاطین کو کیا سروکار؟)

قرآن آسمان کی نورانی فضاؤں سے براہ راست قلب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مقدس قندیل میں اترا ہے اور راستہ

کی کثافتوں سے یکسر پاکیزہ اور منزہ رہا ہے اس کی توکیفیت یہ ہے کہ

از تاک بادہ گیرم و در ساغر افگنم

شیاطین کی کیا مجال کہ اس کے بلند و بالا سرچشمہ کو جھانک سکیں یا کوثر و سلسبیل کی اس جوئے شفاف میں کسی قسم کا تکدر پیدا کرسکیں اِنَّہٗ نَزَّلَ عَلٰی قَلْبِكَ۔

سحر و کہانت کی شعبدہ بازیاں عہد جاہلیت و ظلمت میں اپنا سکہ جما سکتی تھیں۔ لیکن قرآن کریم کے نزول کے بعد جو سراپا علم و بصیرت اور نور و حکمت ہے ان افسانہ طرازیوں کی حکومت ختم ہوگئی۔ اب بارگہِ علم و دانش سے اُن پر آگ کے کوڑے برسائے جاتے تھے۔ آپ تاریخ کے اوراق اُلٹ کر دیکھئے کہ سحر و کہانت کا ذہنِ انسانی پر کس قدر گہرا اثر تھا۔ لیکن آج وہ اثرات صرف جہالت اور تاریکی کی وادیوں میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں۔ قرآن کریم کے آفتاب نے ان ظلمتوں کو چاک کر دیا۔ نورِ سحر سے رات کی تاریکیاں کافور ہوگئیں۔ ان ساحروں، کاہنوں یا نجومیوں پر گویا وہ دروازے بند ہوگئے جن کی راہوں سے وہ عوام کو فریب دیا کرتے تھے۔ یہی وہ کاہن اور نجومی تھے جن کا ذکر سورۂ جن کی ذیل کی آیات میں بھی آیا ہے

وَاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا ۝ وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ؕ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۝ (۷۲ : ۸ — ۹)

اور یہ کہ ہم نے (تمام آسمان کو) ٹٹول کر دیکھ لیا (آجکل) ہم نے اسے سخت سنگین پہرہ دار شعلوں سے بھر پور پایا۔ اور (آپ لوگ خوب جانتے ہیں، کہ ہم (کچھ راز کی) باتیں سننے کے لئے آسمان کے (خاص خاص) ٹھکانوں پر بیٹھ جایا کرتے تھے (مگر اب وہ ناممکن ہوگیا ہے) جو کوئی اب سنتا ہے وہ اپنے تعاقب میں ایک شعلہ کو پاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے انسانی دنیا میں ایک محیر العقول انقلاب پیدا کر دیا۔ اس نے کہا کہ اب ذہنِ انسانی اپنے سِنِّ شعور میں داخل ہو رہا ہے۔ اس لئے اب دنیائے انسانیت میں کسی قسم کی توہم پرستی کی گنجائش نہیں رہے گی۔ قرآن کی دعوت سرتاسر علم و بصیرت اور دلائل و براہین کی دعوت ہے۔ وہ انسانی عقل و دانش سے اپیل کرتا ہے اور فکر و تدبر سے کام نہ لینے والوں کا ٹھکانہ جہنم قرار دیتا ہے۔ لہٰذا نزولِ قرآن کے بعد، اس توہم پرستی کا دور ختم ہوگیا جس میں پیشوائیت (Priest-hood) کا مقدس طائفہ لوگوں کو اس فریب میں مبتلا رکھا کرتا تھا کہ وہ غیب کی خبریں جانتے ہیں اور انہیں آسمانی راز معلوم ہیں۔ یہی وہ "شیاطین" ہیں جنہیں قرآن کی بارگاہِ علم و دانش سے آتشیں کوڑے پڑتے ہیں۔

تحریف کتب سماوی عمل شیطانی تھا

قرآن سے پیشتر تمام کتب سماوی کے ساتھ یہ ہوتا رہا کہ رسول کی تشریف بری کے بعد "شیاطین" رسول کی تلاوت فرمودہ وحی میں اپنی طرف سے بہت کچھ ملا دیتے تھے اور یوں اس خالص آسمانی تعلیم کو محرف بنا دیتے تھے۔ جب یہ صورت

پیدا ہو جاتی تو اس کے بعد اللہ کی طرف سے ایک دوسرا رسول آجاتا جو ذہنِ انسانی کے داخل کردہ رطب و یابس کو الگ کر کے خدائی تعلیم کو پھر سے منزہ و مطہر کر دیتا۔ سورۂ حج میں فرمایا۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِیٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِیْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ
.... اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (۲۲/۵۲-۵۴)

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تجھ سے پیشتر جتنے رسول اور نبی بھیجے سب کے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا کہ جو کچھ انہوں نے تلاوت کیا اس میں شیطان نے (کچھ اپنی طرف سے) ملا دیا۔ اور پھر اللہ نے اس کی آمیزش کا اثر مٹا دیا۔ اور اپنی آیات کو اور زیادہ مضبوط کر دیا۔ وہ (سب کچھ) جاننے والا (اپنے سارے کاموں میں) حکمت والا ہے۔ یہ اس لئے ہوتا کہ شیطان کی آمیزش ان لوگوں کی آزمائش کا ذریعہ ہو جائے۔ جن کے دل روگی ہیں اور سچائی کی طرف سے سخت پڑ گئے ہیں اور بلاشبہ یہ ظلم کرنے والے بڑی ہی گہری مخالفت میں پڑے ہیں اور اس لئے کہ جن لوگوں نے علم پایا ہے وہ جان لیں کہ (اس نئے رسول کی وحی) فی الحقیقت تیرے پروردگار ہی کی طرف سے ہے اس طرح اس پر ایمان لے آئیں اور ان کے دلوں میں عجز و نیاز پیدا ہو جائے۔ یقیناً اللہ ایمان والوں کو (سعادت و کامرانی کی متوازن راہ پر چلانے والا ہے۔

وضعی روایات اس کے علاوہ ان ہی شیاطین کی ایک اور اسی قسم کی حرکت کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی یہ لوگ وحی آسمانی میں تحریف نہیں کرتے بلکہ ایسی ایسی دلچسپ باتیں وضع کر کے انہیں دین کا نگاہ فریب نقاب اُڑھا دیتے ہیں کہ رفتہ رفتہ یہی باتیں عین دین بن جاتی ہیں اور اس طرح دینِ خداوندی نقش و نگار کے ان مزین پردوں کے پیچھے چھپ کر یوں نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے کہ اگر اسے کبھی بے نقاب کر کے سامنے لانے کی کوشش بھی کی جائے تو لوگ اسے حقیقت پر محمول ہی نہیں کرتے۔ سورۂ انعام میں ہے:۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِیْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ۝ (۶/۱۱۲)

اور (اے پیغمبر!) اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے شہری اور بدوی لوگوں کے سرغنوں کو دشمن ٹھہرا دیا، جو ایک دوسرے کو خوشنما باتیں سکھاتے، تاکہ لوگوں کو فریب دیں۔ اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا، تو یقیناً (ایسا کر سکتا تھا کہ) وہ دشمنی نہ کرتے (مگر اس کی حکمت کا فیصلہ یہی ہوا کہ انسانوں کے اختیار و ارادہ کو سلب نہ کیا جائے) پس تو ان کی مخالفت سے دل گرفتہ نہ ہو) اور انہیں ان کی افترا پردازیوں میں چھوڑ دو۔

لوگ اس کذب و افترا کے دامِ ہمرنگ زمین میں پھنس جاتے ہیں اور یوں حقیقت سے دور جا پڑتے ہیں

وَلِتَصْغٰٓى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ

مُقْتَرِفُوْنَ ٥ (۶/۱۱۴)

(اور خدا کے نبیوں کے یہ دشمن اس طرح کی باتیں اس لئے سکھاتے ہیں) تاکہ جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے اُن کے دل پُر فریب باتیں سُن کر، اُن کی طرف جُھک پڑیں، اور اُن کی باتیں پسند کریں۔ اور جیسی بدکرداریاں وہ خود کرتے رہتے ہیں، ویسی ہی یہ بھی کرنے لگیں۔

حالانکہ اطاعت ان نظر فریب اور دل چسپ باتوں کی نہیں بلکہ کتاب خداوندی کی کرنی چاہیئے۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ۭ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ٥ (۶/۱۱۵)

(اے پیغمبر! ان لوگوں سے پوچھو) کیا (تم یہ چاہتے ہو کہ) میں (معاملات کے فیصلوں کے لئے) خدا کے سوا کوئی دوسرا حکم ڈھونڈوں؟ حالانکہ وہی ہے جس نے تم پر الکتاب نازل کر دی، جو تفصیل کے ساتھ سب کچھ) بیان کرنے والی ہے۔ اور (دیکھو) جن لوگوں کو (تم سے پہلے) ہم نے کتاب دی ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ قرآن تمہارے پروردگار کی طرف سے سچائی کے ساتھ نازل ہوا ہے۔ پس ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو (فیصلہ الٰہی کے بارہ میں) شک کرنے والے ہیں۔

وہ کتاب محکم جس کی خصوصیت یہ ہے کہ

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ٥ (۶/۱۱۶)

اور (بیشک) تیرے پروردگار کے قوانین سچائی اور انصاف کے ساتھ پورے ہو کر رہیں گے (بلکہ یوں سمجھو کہ وہ پورے ہو گئے) اس کے کلمات کا کوئی بدلنے والا نہیں۔ وہ (سب کچھ) سننے والا (سب کچھ) جاننے والا ہے!

یقینی تعلیم اسی کتاب کی ہے۔ لیکن لوگ ہیں کہ اس یقینی تعلیم کو چھوڑ کر ظنیات کی پیروی میں ہی لذت محسوس کرتے ہیں۔

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ٥ (۶/۱۱۷)

اور (اے پیغمبر!) اگر تم اُن لوگوں کا کہا مانو جو آج روئے زمین میں سب سے زیادہ ہیں، تو وہ تمہیں خدا کی راہ سے بھٹکا دیں گے (کیونکہ وہ خود سب کے سب بھٹکے ہوئے ہیں) وہ پیروی نہیں کرتے مگر محض گمان کی۔ اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ شک و گمان میں قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔

شیطان بمعنی سانپ | عربی زبان میں شیطان سانپ کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ قرآن کریم میں بھی دو تین مقامات پر یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ناگ پھن تھوہر کے متعلق ہے۔

طَلْعُهَا كَأَنَّهُ رُءُوسُ الشَّيَاطِينِ ۝ (۳۷/۶۵)

اُس (درخت زقوم) کے پھول (ایسے ہوتے ہیں) گویا کہ سانپوں کے پھنّے ہوں۔

سود خوار کی نفسیاتی کیفیت بیان کرتے ہوئے ارشاد ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۭ (۲/۲۷۵)

جو لوگ (حاجتمندوں کی مدد کرنے کی جگہ اُلٹا ان سے) سود لیتے اور اس سے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ وہ یاد رکھیں (اُن کے ظلم و ستم کا نتیجہ اُن کے آگے آنے والا ہے۔ وہ) کھڑے نہیں ہو سکیں گے مگر اس آدمی کا سا کھڑا ہونا جسے سانپ نے ڈسکر خبطی (پاگل، بے شعور و بے حس) بنا دیا ہو۔ یہ اس لئے ہوگا کہ انہوں نے (سود کے ناجائز ہونے سے انکار کیا، اور) کہا خرید و فروخت کرنا بھی ایسا ہی ہے جیسے قرض دیکر سود لینا۔ حالانکہ خرید و فروخت کو تو خدا نے حلال ٹھہرایا ہے اور سود کو حرام (دونوں باتیں ایک طرح کی کیسے ہو سکتی ہیں؟)

اسی طرح حضرت ایوب کے قصہ میں مذکور ہے۔

وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ ۘ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ ۝ (۳۸/۴۱)

اور (اے پیغمبر اسلام!) ہمارے بندہ ایوب کو یاد کر! جب اس نے اپنے پروردگار کو پکارا کہ (خدایا!) مجھے سانپ نے ڈسکر سخت تکلیف و ایذا میں مبتلا کر دیا ہے (مجھ پر رحم فرما اور تکلیف سے نجات دے!)

ظاہر ہے کہ یہاں بھی شیطان کے معنی ابلیسی شیطان نہیں۔ اس لئے کہ حضرت ایوبؑ خدا کے عبد (عبدنا ایوب) ہیں اور قرآن کریم نے صاف طور پر اس حقیقت کا اعلان فرما رکھا ہے کہ خدا کے بندوں پر شیطان کا تسلط کبھی نہیں ہو سکتا۔ (تفصیل اس اجمال کی حضرت ایوبؑ کے بیان میں ملے گی) شیطان بمعنی سانپ سے بائبل کے قصۂ آدم کی طرف ذہن منتقل نہیں ہونا چاہیئے جس کا ذکر گذشتہ اوراق میں گزر چکا ہے۔ لیکن یہ عجیب حقیقت ہے کہ قرآن کریم نے جنات آتشیں کے ساتھ جان (بمعنی سانپ) کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ اور شیاطین کے ساتھ شیطان بمعنی سانپ کا بھی۔ سانپ کی شعوا نفسی کے متعلق شاید مزید تحقیقات کچھ اور بھی منصۂ شہود پر لا سکیں۔

خلاصۂ مبحث

ابلیس کے متعلق ہم سابقہ عنوان میں دیکھ چکے ہیں کہ اس کا کام تکمیلِ شرفِ انسانیت کی راہوں میں رکاوٹیں پیدا کرنا ہے۔ اب جن ذرائع و اسباب سے یہ رکاوٹیں پیدا کرتا ہے انہیں شیاطین کہا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شیطان روحِ ابلیسی کا مظہر ہے۔ اس کے کارنامے یہ ہیں کہ انسانوں کے دلوں میں وساوس پیدا کئے جائیں تاکہ اُن کے عزم و

ایقان میں تنزلزل واقع ہو جائے۔ اُن کے راستے میں باطل تمناؤں اور حسین آرزوؤں کے ایسے نظر فریب مناظر سجا کر رکھ دیئے جائیں جن میں ان کا دامن نگاہ الجھ کر رہ جائے اور وہ یوں سفر زندگی میں سوئے منزل رواں دواں جانے کے بجائے رنگ تماشائے رنگ و بو میں کھو کر رہ جائیں۔ پھر اُن کی سعی و کاوش کو ایسا خوشنما بنا کر دکھایا جائے کہ انہیں احساس تک بھی نہ ہو کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں، وہ غلط اور بے نتیجہ ہے۔ اس قسم کے نگہ فریب مناظر اور زینت اعمال کے لئے مذہب کی دنیا بہت راس آتی ہے۔

شیطان کا کام یہ بھی ہے کہ جوں ہی انسان کے سامنے اجتماعی مفاد انسانیت کا گوشہ آئے اس کے ذاتی منافع کو ابھار کر سامنے رکھ دیا جائے تاکہ وہ ایثار و قربانی کی راہوں سے کتراتا ہوا نکل جائے۔ اس کے علاوہ مختلف انداز کی فتنہ پردازیوں اور مفسدہ انگیزیوں سے ایسی صورت حالات پیدا کرتا ہے جس سے حیات اجتماعیہ کا شیرازہ بکھر جائے۔ اور سب سے بڑی چیز یہ کہ وہ قلب انسانی کو خوف و حزن کا کاشانہ بنا کر اس کی غیرت و حمیت اور جرأت و بیباکی کی دنیا کو برباد کر دیتا ہے اس لئے حق پرستوں کی جماعت کو ہمیشہ شیطانی رجحانات و عواطف کی اطاعت سے روکا گیا ہے۔

شیطان کے علاوہ قرآن کریم نے اسی مقصد کے لئے طاغوت کا لفظ بھی استعمال کیا ہے جس کے معنی ہر وہ غیر خدائی نظام ہے جو انسانوں کو خدا کی محکومیت سے ورغلا کر انسانوں کی اتباع و اطاعت سکھاتا ہے۔ یہ نظام حکومت و سلطنت کے علاوہ دنیائے مذہب میں بھی عجیب کشش و جاذبیت سے کارفرما رہتا ہے۔ لیکن کسی غیر خدا کی اطاعت۔ خواہ وہ حکومت و سلطنت کے رنگ میں ہو یا مذہب و عقیدت کے نقاب میں۔ بہرحال خدا سے کھلا ہوا شرک ہے۔

پھر یہ بھی یاد رکھئے کہ شیطانی لغزشوں کے اسباب کہیں باہر سے نہیں آتے بلکہ اس کے ذمہ دار خود انسانی اعمال ہوتے ہیں اور اس سوسائٹی کے اثرات جسے انسان اپنے لئے اختیار کرتا ہے، اسی کو "قرین" کہا گیا ہے۔

قرآن کریم نے طاغوتی نظام کے سرغنوں کے لئے بھی شیطان کا لفظ استعمال کیا ہے۔ نیز ہر سرکش و شعلہ مزاج وحشی قبائل کے لئے بھی اور دنیائے مذہب میں اُن کے لئے بھی جو وحیٔ خداوندی میں تحریف و الحاق کرتے ہیں۔ یا بڑی بڑی خوشنما اور دلچسپ باتیں وضع کر کے لوگوں کو کتاب خداوندی کی اطاعت سے دوسری راہوں کی طرف لیجاتے ہیں۔

وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ [١]

(پیکرانِ اطاعت)

یا عطا فرما خرد با فطرتِ روح الامین

ملٰئکہ (۵)

قصۂ آدم میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ملائکہ کو حکم دیا گیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں۔ اور انہوں نے اس حکم کی تعمیل میں اپنا سر جھکا دیا۔

ملائکہ ملاک کی جمع ہے جس کی دوسری صورت ملک ہے اور اس کا مادہ الگ ہے۔ الوکۃ کے معنی ہیں پیغام رسانی۔ لہٰذا ملائکہ کے معنی قاصد، پیغام رساں اور ایلچی کے ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم میں ملائکہ کے لئے رُسُل کا لفظ بھی آیا ہے جس کے معنی پیغام رساں ہیں۔

اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ ۝ (۲۲/۷۵)

اللہ نے فرشتوں میں سے بعض کو پیام رسانی کے لئے برگزیدہ کر لیا۔ اسی طرح بعض انسانوں کو بھی (لیکن اس برگزیدگی سے انہیں معبود ہونے کا درجہ نہیں مل گیا۔ جیسا کہ ان گمراہوں نے سمجھ رکھا ہے) بلاشبہ اللہ ہی ہے سننے والا، دیکھنے والا۔

لیکن یہی لفظ "ملاث" سے بھی مشتق ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں ملائکہ کے معنی ہوں گے مختلف قوتیں۔ قرآن کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ملائکہ سے مفہوم وہ قوتیں (Forces) ہیں جو کائنات کی عظیم القدر مشینری کو چلانے میں مصروف العمل ہیں اور چونکہ کائنات کی تمام قوتیں اس لئے قانونِ خداوندی کی زنجیر کے ساتھ جکڑی ہوئی ہیں کہ ان سے انسان کام لے سکے اس لئے قصۂ آدم میں کہا گیا ہے کہ ملائکہ نے آدم کو سجدہ کر دیا۔ مطلب یہ کہ کائنات کی تمام غیر مرئی قوتیں انسان کے لئے تابعِ فرمان بنا دی گئی ہیں۔ یہ تمام قوتیں خدا کی اسکیم (plan) کے مطابق (جسے مشیت کہا جاتا ہے) مختلف امور کی سرانجام دہی میں سرگرمِ عمل ہیں۔ نظامِ کائنات کے اس طرح چلانے کا نام قرآن کی اصطلاح میں "تدبیر امور" ہے۔ ان تمام تدابیر (schemes) کا مرکزی کنٹرول خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اسے "استوا علی العرش" یعنی خدا کا مرکزِ حکومتِ کائنات پر مسلط ہونا کہا جاتا ہے۔ سورۂ یونس میں ہے۔

اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی

الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ (۱۰/۳)

اے لوگو! تمہارا پروردگار تو اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ ایام میں پیدا کیا (یعنی چھ معین زمانوں میں پیدا کیا)

پھر اپنے تختِ حکومت پر متمکن ہو گیا۔ وہی تدبیر امور کرتا ہے (یعنی کائناتِ ہستی پیدا بھی اسی نے کی اور اس میں قانون بھی اسی

کا کارفرما ہے اور فرماں روائی بھی اُسی کی ہے۔

یہی وہ امر ہے جس کی بنا پر کائنات کا یہ عظیم الشان سلسلہ قائم ہے

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ؕ

اور (دیکھو! اس کی نشانیوں میں سے ایک زبردست) نشانی یہ بھی ہے کہ آسمان اور زمین اس کے امر (حکم اور

ارادہ) سے قائم ہیں۔

ملائکہ مدبراتِ امور ہیں

یہ تدبیر امور کس طرح نافذ العمل ہوتی ہے یہ چیز ہماری سمجھ سے بالا ہے لیکن قرآن نے بتایا ہے کہ قوانینِ مشیت کے تابع ان امور الٰہیہ کو جاری و ساری کرنے کے فرائض جن کے ذمہ ہیں انہیں ملائکہ کہا جاتا ہے۔ یعنی کائنات کی وہ غیر مرئی قوتیں جو ان امور کو سر انجام دیتی ہیں۔ اسی لئے ملائکہ کو مدبراتِ امور کہا گیا ہے۔

فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ۝ (۷۹/۵)

وہ ملائکہ شاہد ہیں جو تدبیر امر کرتے ہیں!

دوسری جگہ انہیں اَلْمُقَسِّمٰتِ امور

فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ۝ (۵۱/۴)

وہ ملائکہ شاہد ہیں جو امر الٰہی کی تقسیم کرنے والے ہیں!

قرار دیا گیا ہے۔ یعنی امر الٰہی کے تقسیم کرنے والے۔ سورۂ طلاق میں ہے:-

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ

لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۙ۝ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ۝ (۶۵/۱۲)

اے افرادِ نسلِ انسانی! دیکھو، اللہ ہی کی تو وہ ذات ہے جس نے متعدد فضائی کرے پیدا کئے اور ان ہی کی طرح زمین کو پیدا کیا (اور) ان سب میں اللہ کا امر نازل ہوتا ہے (یہ تمام باتیں بار بار ہم اس لئے بیان کرتے ہیں) تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور یہ کہ وہ ہر چیز کو (اپنے) احاطہ علمی میں لئے ہوئے ہے۔

دوسری جگہ اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا گیا ہے

فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ؕ وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا

بِمَصَابِيحَ ۖ وَحِفْظًا ۚ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ﴿۴۱/۱۲﴾

سو دو مراحل میں اس نے متعدد فضائی کرّے بنا دیئے اور ہر کرّے میں اپنا حکم بھیج دیا۔ اور ہم نے اس قریب والے آسمان[1] کو ستاروں سے زینت دی اور اس کی حفاظت کی۔ یہ اندازے ہیں خدائے زبردست واقف الکل کے۔

وسائط و ذرائع یعنی اللہ نے ان فضائی کروں میں اپنی وحی نافذ کر رکھی ہے کہ وہ اپنے فرائض مفوضہ کی تکمیل میں سرگرداں رہیں۔ اس وحی کا "نزول" بھی ملائکہ ہی کے ذریعے ہوا ہے۔ کیونکہ ملائکہ تقسیم امور کرنے والے ہیں۔ لہٰذا ملائکہ وہ وسائط و ذرائع ہیں جن کی رو سے امور الٰہیہ کائنات میں نافذ ہوتے ہیں۔ اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے امور کی تنفیذ میں وسائط و ذرائع کا محتاج ہے۔ اس کی ذات صمدیت احتیاج کے ہر تصور سے منزہ اور اسبابیہ و ذرائع کے ہر شائبہ سے مستغنی ہے۔ لیکن یہ اس کا قائم کردہ نظام ہے کہ دنیائے خلق ہو یا عالم امر[2] تو واقعات اس کے متعین فرمودہ نظام کے مطابق وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ احتیاج اور انتظام میں بدیہی فرق ہے۔ اسی نہج سے فرشتوں کو عرش الٰہی کے اٹھانے والے اور اس کے گرد طواف کرنے والے بتایا

حاملین عرش گیا ہے۔

وَتَرَى الْمَلَائِكَةَ حَافِّينَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۖ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيلَ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۳۹/۷۵﴾

اور (اے پیغمبر اسلام! تو دیکھے گا کہ فرشتے عرش کے گرداگرد حلقہ باندھے ہوں گے (اور) اپنے پروردگار کی تسبیح و تحمید کر رہے ہوں گے۔ اور (اس دن) تمام بندوں میں ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دیا جائے گا کہ ساری خوبیاں (صرف) خدا (ہی) کو زیبا ہیں، جو تمام عالم کا پروردگار ہے۔

سورۂ مومن میں ہے۔

الَّذِينَ يَحْمِلُونَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُونَ بِهِ وَيَسْتَغْفِرُونَ لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِينَ تَابُوا وَاتَّبَعُوا سَبِيلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ ﴿۴۰/۷﴾

جو فرشتے عرش (الٰہی) کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو فرشتے اس کے گرداگرد ہیں وہ اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرتے رہتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور ایمان والوں کے لئے (اس طرح) استغفار کیا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! تیری رحمت (عامہ) اور (علم) ہر چیز پر حاوی ہے سو اُن لوگوں کو بخش دے جنہوں نے (شرک و کفر سے) توبہ کر لی ہے۔

---

[1] اسی لئے فرشتے اللہ کے حکم کے سوا کبھی نازل نہیں ہو سکتے۔ ملاحظہ ہو (۱۹/۶۴)۔ [2] اس سے مراد دنیا میں خدا کے نظام ربوبیت کے ارباب حل و عقد بھی ہو سکتے ہیں۔

اور تیرے رب کے راستہ پر چل رہے ہیں، اور رسلے پروردگار! انہیں جہنم کے عذاب سے محفوظ رکھ۔

تذکرۂ قیامت کے ضمن میں فرمایا:۔

وَالْمَلَكُ عَلَىٰ أَرْجَائِهَا ۚ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمَانِيَةٌ ۝ (۶۹ پ)

اور فرشتے اس کے تمام اطراف پر ہوں گے اور اُن سے بھی اوپر تیرے پروردگار کے عرش کو اُس (قیامت کے) دن آٹھ (بہت بزرگ) فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے عرش وہ مرکز حکومت خداوندی ہے۔ جہاں سے کائنات کی تدبیر امور ہوتی ہے۔ اور چونکہ یہ تدبیر امور ملائکہ کی وساطت سے سر انجام پاتی ہے اس لئے ملائکہ عرش الٰہی کے اٹھانے والے اور کمربستہ اس کے گرد گھومنے والے ہیں تعمیل ارشاد خداوندی میں ان کی یہ سرگردانی اور انہماک ہی ہے۔ جس سے یہ کارگہ عالم اس حُسن و خوبی سے چل رہا ہے، اس لئے کہ وہ ان احکامات کو نافذ کرتے ہیں۔ ان میں اپنا دخل کچھ نہیں دیتے۔ انہیں ان میں دخل اندازی یا خلاف ورزی احکام کی قدرت ہی نہیں۔

ملائکہ میں معصیت کی قدرت نہیں

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مِنْ دَابَّةٍ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ۝ يَخَافُونَ رَبَّهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ۝ (۱۶/۵۰)

اور آسمانوں میں جتنی چیزیں، اور زمین میں جتنے جانور ہیں، سب اللہ کے آگے سربسجود ہیں نیز فرشتے اور وہ سرکشی نہیں کرتے اور اپنے پروردگار سے ڈرتے رہتے ہیں جو ان کے اوپر موجود ہے۔ اور جو کچھ حکم، انہیں دیا جاتا ہے، اس کی تعمیل کرتے ہیں!

ذرا قصۂ آدم پر ایک نگاہ پھر ڈالئے۔ ملائکہ کی اطاعت و فرماں پذیری نکھر کر سامنے آجائے گی " فسجدوا " کے معنی ہی یہ ہیں کہ انہوں نے تعمیل ارشاد میں اپنا سر جھکا دیا۔ نظامِ عالم میں جس قدر قوتیں سرگرم عمل ہیں وہ جب تک ایک مرکزی حکم کے تابع نہ ہوں، یہ سلسلہ قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر مشین کا ہر پرزہ اپنی اپنی مرضی کے ماتحت چلنے لگ جائے تو نتیجہ ظاہر ہے ملائکہ کی اس بے چون و چرا تعمیل ہی کا نتیجہ ہے کہ کائنات میں کہیں فساد نظر نہیں آتا۔ فساد ہوتا وہاں ہے جہاں ایک سے زیادہ حکمرانوں کے فیصلے نافذ ہوتے ہوں۔ جہاں حکومت صرف ایک خدا کی ہو، اور اس کے کارندے ایسے فرماں پذیر، تو ایسی مملکت میں فساد کا شائبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ملائکہ کی یہ فرماں پذیری اس امر کی زندہ و پائندہ شہادت ہے، کہ اللہ کے سوا کوئی دوسری ہستی ایسی نہیں جس کا قانون کائنات میں چلتا ہو۔

---

[1] ملائکہ کی تسبیح و تحمید سے مطلب یہ ہے کہ وہ ان امور کی سر انجام دہی میں سرگرم عمل رہتے ہیں جن کے نتائج خدا کی ربوبیت کی حمد و ستائش کے پیکر بن جاتے ہیں۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُؕ (۳/۱۸)

اللہ نے اس بات کی شہادت آشکارا کر دی کہ کوئی صاحبِ اقتدار نہیں ہے، مگر صرف اسی کی ذاتِ یگانہ عدل کے ساتھ (تمام کارخانۂ ہستی میں) تدبیر انتظام کرنے والی۔ فرشتے بھی (اپنے اعمال سے) اسی کی شہادت دیتے ہیں، اور وہ لوگ بھی جو علم رکھنے والے ہیں۔ یہاں کسی کا اقتدار نہیں ہے اس ایک طاقت وغلبہ والے خدا کا اقتدار ہے اس کے سوا کسی اور کا قانون نافذ العمل نہیں ہے۔

وحی الٰہی کا پہنچانا سورۂ شوریٰ میں ہے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ (۴۲/۵۱)

کسی انسان کے لئے یہ ممکن نہیں کہ اللہ اس سے ہمکلام ہو بجز ان تین طریقوں کے۔ یعنی رسولوں کی طرف (فرشتوں کے ذریعے) وحی بھیجے یا ان سے پسِ پردہ بات کرلے اور (غیر رسولوں یعنی دوسرے انسانوں کی طرف) اپنا رسول بھیجے جو ان تک خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق وحی پہنچا دیں۔ بلاشبہ اللہ بلند مرتبہ والا اور حکمت والا ہے۔

جہاں تک رسولوں کی طرف وحی بھیجنے کا تعلق ہے یہ فریضہ منتخب ملائکہ کے ذمہ عائد کیا جاتا تھا۔

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ (۲۲/۷۵)

اللہ نے فرشتوں میں سے بعض کو پیام رسانی کے لئے منتخب کرلیا۔ اسی طرح بعض انسانوں کو بھی۔ بلاشبہ اللہ ہی ہے سننے والا۔ دیکھنے والا!

اس آیت مقدسہ میں ملائکہ اور انسانوں میں سے "رسولوں" کے انتخاب کا ذکر ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ نوعِ انسانی کی رشد و ہدایت کے لئے حضرات انبیاء کرامؑ یا تو انسان ہوتے تھے، یا فرشتے۔ انسانی ہدایت کے لئے انسان ہی رسول ہوتے تھے۔ ملائکہ اللہ کی طرف سے انبیاء کرامؑ پر وحی نازل کرتے تھے انبیاء کرامؑ اس وحی کو آگے عام انسانوں تک پہنچاتے تھے

ملائکہ نبی نہیں ہوتے تھے قرآن کریم نے تصریح فرمادی ہے کہ، ملائکہ انسانی رشد و ہدایت کے لئے بطور رسول نہیں بھیجے جاتے تھے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا (۱۷/۹۵)

(اے پیغمبر!) کہدے کہ اگر ایسا ہوا ہوتا کہ زمین میں (انسانوں کی جگہ) فرشتے بسے ہوتے، اور اطمینان سے چلتے پھرتے تو ہم ضرور آسمان سے ایک فرشتہ پیغامبر بنا کر اتار دیتے۔"

یہاں سے ملائکہ کی رسالت اور حضرات انبیاء کرام کی رسالت کا فرق بیّن طور پر سامنے آجاتا ہے۔ ایک رسالت (پیغام رسانی) تو یہ ہے کہ اللہ نے پیغام دیا اور اُسے رسول تک پہنچا دیا۔ جس طرح ایک چٹھی رساں مکتوب الیہ تک چٹھی پہنچا دیتا ہے۔ یہ پیغام رسانی ملائکہ کی ہے۔ دوسری پیغام رسانی حضرات انبیاء کرام کی ہے جن کے متعلق فرمایا کہ چونکہ انہیں انسانوں کی رشد وہدایت کے لئے بھیجا جاتا تھا اس لئے اس غرض کے لئے انسان ہی منتخب کئے جاتے تھے۔ تاکہ وہ پیغام خداوندی کو ایک عملی نظام کی صورت میں متشکل کر کے بتا دیں کہ انسانی معاشرہ کی صحیح تصویر کیسی ہونی چاہیئے۔ سورۂ زخرف میں حضرت عیسیٰ کے متعلق یہ ارشاد فرما کر کہ:۔

إِنْ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنَاهُ مَثَلًا لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ ۝ (۴۳/۵۹)

عیسیٰ تو محض ایک ایسے بندے ہیں جن پر ہم نے (کمالاتِ نبوت سے اپنا) فضل کیا تھا اور ان کو بنی اسرائیل کے لئے ہم نے (اپنی قدرت کا) نمونہ بنا دیا تھا۔

فرمایا

وَلَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَا مِنكُم مَّلَائِكَةً فِي الْأَرْضِ يَخْلُفُونَ ۝ (۴۳/۶۰)

اور اگر ہم چاہتے تو تم میں سے فرشتوں کو پیدا کر دیتے کہ وہ زمین پر یکے بعد دیگرے رہا کرتے

"انسانوں کے لئے انسانوں میں سے رسول" یہ ایک ایسی حقیقتِ باہرہ تھی جس کی حکمت پر ہر چشم بصیرت شاہد تھی لیکن نہ ماننے والوں (کفّار) کے نزدیک یہی شے محل نظر تھی اور وہ اعتراض کرتے تھے کہ ہمارے جیسا ایک انسان اور رسول! بھلا یہ کیا؟ قوم نوحؑ نے یہی اعتراض پیش کیا تھا جب کہا کہ:۔

فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ مَا هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيدُ أَن يَتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَنزَلَ مَلَائِكَةً مَّا سَمِعْنَا بِهَٰذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ ۝ (۲۳/۲۴)

اس قوم کے جن سرداروں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی، وہ یہ سن کر کہنے لگے "یہ آدمی اس کے سوا کیا ہے کہ تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہے؟ مگر چاہتا ہے کہ تم پر اپنی بڑائی جتائے۔ اگر اللہ کو کوئی ایسی ہی بات منظور ہوتی تو کیا وہ فرشتے نہ اتار دیتا؟ (وہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی کو اپنا پیامبر کیوں بنانے لگا؟) ہم نے اپنے اگلے بزرگوں سے تو کوئی ایسی بات کبھی سنی نہیں۔"

یہی قوم عاد وثمود نے کہا:۔

إِذْ جَاءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِن بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ۖ

قَالُوْا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً فَاِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ (۴۱/۱۴)

جب اُن کے پاس اُن کے آگے سے بھی اور اُن کے پیچھے سے بھی (بکثرت) پیغمبر (متعدد راہوں میں سے ہر ایک یہی کہتا آیا کہ اللہ کے سوا کسی اور کی عبودیت (اطاعت و فرمانبرداری) اختیار نہ کرو۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ اگر ہمارے پروردگار کو یہ منظور ہوتا (کہ وہ کسی کو پیغمبر بنا کر بھیجے) تو وہ ہرگز ہمارے پاس ہمارے ہی جیسا ایک انسان نہ بھیجتا بلکہ فرشتوں کو بھیجتا۔ (ہم تمہاری اس رسالت کو نہیں مانتے) لہٰذا ہم اُن تمام احکام (توحید وغیرہ) سے منکر ہیں جنہیں لے کر تم اپنے دعوے کے مطابق خدا کی طرف سے بھیجے گئے ہو۔

حالانکہ حضرات انبیاء کرامؑ خود اعتراف کرتے تھے کہ ہم فرشتے نہیں ہیں۔ حضرت نوحؑ نے فرمایا۔

وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ

اور دیکھو! میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں، نہ میرا یہ دعویٰ ہے کہ میں فرشتہ ہوں۔

نبی اکرمؐ نے بھی یہی فرمایا۔

وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۭ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۭ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ (۶/۵۰)

(اے پیغمبر! تم ان لوگوں سے) کہدو "میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے غیبی خزانے ہیں۔ نہ یہ کہتا ہوں کہ غیب کا جاننے والا ہوں۔ نہ میرا یہ کہنا ہے کہ میں (انسانیت سے ماوراء) فرشتہ ہوں۔ میری حیثیت تو فقط یہ ہے کہ اسی بات پر چلتا ہوں جس کی خدا نے مجھ پر وحی کی ہے" (اور اسی کی طرف تمہیں بھی بلاتا ہوں پھر ان سے پوچھو) "کیا وہ جو اندھا ہے (حقیقت کے لئے کوئی علم و یقین نہیں رکھتا) اور وہ جو بینا ہے (کہ حقیقت کی روشنی دیکھ رہا ہے) وہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ پھر کیا تم غور و فکر نہیں کرتے؟"

عجیب عجیب اعتراضات کفار کا اعتراض فقط اتنا ہی نہیں تھا۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اگر یہ حضرات خدا کے رسول ہیں تو ان کے جلو میں فرشتوں کی قطاریں کیوں نہیں ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کے متعلق یہی اعتراض کیا کہ اگر یہ رسول ہیں تو

فَلَوْلَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ۝ (۴۳/۵۳)

(اگر وہ سچ مچ نبی ہے، تو اس کے (ہاتھوں میں) سونے کے کنگن کیوں نہیں ڈالے گئے یا پرے باندھے ہوئے اس کے جلو میں فرشتے کیوں نہیں آئے۔

یہیں تک بس نہیں! بلکہ وہ تو کہتے تھے، کہ خود اُن پر بھی فرشتے کیوں نہیں نازل ہوتے تھے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ۭ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ۝ (۲۵/۲۱)

اور وہ لوگ جو ہمارے قانون کا آمنا سامنا کرنے کی امید نہیں رکھتے) کہتے ہیں کہ (ان پیغمبروں میں کیا خصوصیت ہے کہ ان پر فرشتے آتے ہیں!) ہم پر فرشتے کیوں نہیں اتارے جاتے۔ یا ہم (کھلی آنکھوں) اپنے پروردگار کو کیوں

نہیں دیکھ پاتے (کہ شک وشبہ کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ یہ لوگ اپنے دلوں میں اپنے کو بہت بڑا سمجھ رہے ہیں (نہیں بلکہ) یہ لوگ تو (حدِ انسانیت) سے بھی دور نکل گئے ہیں۔

(اس کی تفصیل چند قدم آگے چل کر ملے گی)

نزول ملائکہ

لیکن اس نفی کا یہ مطلب نہیں کہ حضرات انبیا کرام کے علاوہ اور کسی پر فرشتے نازل نہیں ہوتے حضرات انبیا کرامؑ پر نزول ملائکہ، اللہ کی وحی کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور رسالت کی، وحی، رسول کے علاوہ اور کسی پر نازل نہیں ہوسکتی۔ لیکن ابلاغِ وحی کے علاوہ فرشتے اور مقاصد کے لئے بھی نازل ہوتے ہیں۔ ہم اس سے پیشتر دیکھ چکے ہیں کہ ابلیس کا کام خوف و حزن پیدا کرنا ہے۔ اس کے برعکس ملائکہ قلبِ مومن میں وہ تسکین طمانیت، پیدا کرتے ہیں جس سے خوف و حزن پاس نہیں پھٹکنے پاتا۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ۝ (۳۰/۴۱)

(اور دیکھو!) بلاشبہ جو لوگ اقرار کرلیں کہ ہمارا حقیقی پروردگار (صرف) اللہ ہی ہے پھر دل سے اور عمل سے اس پر) ثابت قدم رہیں تو (خدا کے) فرشتے ان پر نازل ہوتے ہیں (وہ کہتے ہیں) کہ تم نہ اندیشہ کرو نہ غم کرو اور اس جنت (کے ملنے) سے خوش ہو جاؤ جس کا تم سے پیغمبروں کی معرفت) وعدہ کیا جایا کرتا تھا۔

ذرا نزول ملائکہ کی شرط پر پھر غور فرما لیجیے۔ إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا! اللہ کی ربوبیت پہ ایمان اور پھر اس ایمان پہ استقلال۔ محکم ایمان۔ غیر متزلزل ایمان۔ کوہ شکن ایمان ایسا ایمان کہ ابلیس کی بڑی سے بڑی قوت بھی اس میں جنبش نہ پیدا کرسکے۔ اس سے نزولِ ملائکہ ہوتا ہے جس سے قلبِ انسانی تسکین و طمانیت کی نورانی بارشوں

تسکین و طمانیت کی بارش

کا مہبط بن جاتا ہے۔ یہی وہ استقلال و استقامت تھی جس کی بنا پہ بدر و حنین کے میدانوں میں اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کی نصرت، ملائکہ کے ان جنود عظیم سے فرمائی جنہوں نے آکر مخالفین کے قلوب میں خوف اور رعب اور مسلمانوں کے دلوں میں سکون و طمانیت پیدا کردی سورۂ آل عمران میں ہے:-

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنتُمْ أَذِلَّةٌ ۔۔۔۔۔۔۔۔ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ۝ (۳/۱۲۳-۱۲۶)

اور دیکھو! یہ واقعہ ہے کہ اللہ نے بدر کے میدان میں تمہیں فتحمند کیا تھا۔ حالانکہ تم بڑی گری ہوئی حالت میں تھے (اور

لہ وحی کی دیگر اقسام و تفصیل کے لئے وحی کا عنوان دیکھئے۔

تمہاری کامیابی کا کوئی وہم و گمان بھی نہیں کر سکتا تھا) پس تم سے کہا گیا کہ اللہ کے قانون کی حفاظت میں آجاؤ (اور اس کی نافرمانی سے بچو) تاکہ تمہاری کوششیں بھرپور نتائج پیدا کریں۔ (اے پیغمبر! وہ وقت بھی) یاد کرو جب تم (میدانِ جنگ میں) ایمان والوں سے یہ کہہ رہے تھے کہ "کیا تمہارے لئے یہ بات کافی نہیں کہ اللہ (دشمن کے تین ہزار آدمیوں کے مقابلہ میں) تین ہزار نازل کئے ہوئے فرشتوں سے تمہاری مدد فرمائے؟" ہاں بلاشبہ اگر تم استقامت پذیر رہو اور تقویٰ کی راہ اختیار کرو اور پھر ایسا ہو کہ دشمن اسی دم تم پر چڑھ دوڑے تو تمہارا پروردگار (صرف تین ہزار فرشتوں ہی سے نہیں بلکہ) پانچ ہزار نشان رکھنے والے فرشتوں سے تمہاری مدد کریگا (اور دشمنوں کی کثرت و طاقت تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکے گی!) اور یاد رکھو، یہ بات جو کہی گئی ہے تو صرف اس لئے کہ تمہارے لئے (فتحمندی کی) خوشخبری ہو اور تمہارے دل اس کی وجہ سے مطمئن ہو جائیں۔ اور مدد و نصرت جو بھی ہے۔ اللہ کے قانون کے مطابق ہی آتی ہے۔ اس کی طاقت سب پر غالب ہے اور وہ اپنے تمام کاموں میں حکمت رکھنے والا ہے!

سورۂ انفال میں ان ہی ملائکہ کے متعلق فرمایا:-

إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا ۚ سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ (8/12)

(اے پیغمبر!) یہ وہ وقت تھا کہ تیرے پروردگار نے فرشتوں پر وحی کی تھی، میں تمہارے ساتھ ہوں (یعنی میری مدد تمہارے ساتھ ہے) پس مومنوں کو استوار رکھو۔ عنقریب ایسا ہوگا کہ میں کافروں کے دلوں میں (مومنوں کی) دہشت ڈال دوں گا۔ سو (مسلمانو!) ان کی گردنوں پر ضرب لگاؤ۔ ان کے ہاتھ پاؤں کی ایک ایک انگلی پر ضرب لگاؤ!

یومِ حنین کے متعلق ارشاد ہے:-

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ ۙ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ ...... وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ (9/25-26)

(مسلمانو!) یہ واقعہ ہے کہ اللہ بہت سے موقعوں پر تمہاری مدد کر چکا ہے (جبکہ تمہیں اپنی قلت و کمزوری سے کامیابی کی امید نہ تھی) اور جنگ حنین کے موقع پر بھی، جب کہ تم اپنی کثرت پر اترا گئے تھے (اور سمجھتے تھے کہ محض اپنی کثرت سے میدان مار لو گے) تو دیکھو، وہ کثرت تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی ساری وسعت پر بھی تمہارے لئے تنگ ہو گئی۔ بالآخر ایسا ہوا کہ تم میدان کو پیٹھ دکھا کر بھاگنے لگے۔ پھر اللہ نے اپنے رسول پر اور مومنوں پر اپنی جانب سے دل کا سکون و قرار نازل فرمایا۔ اور ایسی فوجیں اتار دیں جو تمہیں نظر نہیں آتی تھیں۔ اور (اس طرح) ان لوگوں کو عذاب دیا جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی، اور یہی جزا ہے ان لوگوں کی جو کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں! (یعنی ان کی

بدعملی کا لازمی نتیجہ یہ ہی ہے)۔

ان تمام مقامات پر غور کیجئے۔ "ملائکہ کی مدد" کے متعلق بتایا گیا ہے کہ اس سے جماعت مومنین کے دلوں کو تسکین ملی تھی اور ان کے عزائم پختہ ہو گئے تھے۔ دوسری طرف دشمنوں کے دل اس سے خوف زدہ ہو گئے تھے اور ان کے حوصلے چھوٹ گئے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان مقامات میں ملائکہ سے مراد وہ نفسیاتی محرکات ہیں جو انسانی قلوب پر اثرات مرتب کرتے ہیں، اور چونکہ انسان کے عزائم و اعمال پر نفسیاتی کیفیات بڑا گہرا اثر کرتی ہیں اس لئے فتح و شکست اور کامیابی و ناکامی کا بیشتر انحصار ان ہی پر ہوتا ہے۔ اسی قلبی سکون اور دلی اطمینان کا تذکرہ اس واقعہ میں بھی کیا گیا ہے۔ جب نبی اکرمؐ (صرف اپنے ایک ساتھی جناب صدیقؓ کی معیت میں) صبح ہجرت ایک غار میں پناہ گزین تھے۔ دنیاوی نقطۂ اعتبار سے بالکل بے کس و بے بس۔ بے سروسامان۔ بے یار و مددگار۔ گھر بار چھوڑ کر وطن سے نکلے ہوئے۔ دشمن اپنے پورے ساز و سامان سے تعاقب میں۔ ذرا تصور میں لائیے خوف و ہراس کے اس حوصلہ شکن منظر کو۔ اس بے کسی کی حالت میں چھپے بیٹھے ہیں۔ دشمنوں کے گھوڑوں کی ٹاپ کی آواز کانوں میں آ رہی ہے۔ اس یارِ غارؓ کی پیشانی پر اپنی خاطر نہیں بلکہ بپاس خاطر رفیق اعظمؐ تردد و پریشانی کے آثار ظاہر ہوتے ہیں اس دوست کی نگاہوں نے اسے دیکھا اور یاس و ناامیدی کے اس ہولناک سماں میں پورے جزم و یقین کے ساتھ فرمایا کہ "لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا" مت گھبراؤ اللہ ہمارے ساتھ ہے" اس تثبیت قلب اور تسکین خاطر کو بھی "نزول ملائکہ" سے تعبیر کیا گیا ہے جب فرمایا کہ:۔

إِلَّا تَنصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا...... وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (۹/۴۰)

اگر تم اللہ کے رسول کی مدد نہیں کرو گے تو (نہ کرو) اللہ نے اس کی مدد کی ہے، اور اس وقت مدد کی ہے جب کافر و نے اسے اس حال میں گھر سے نکالا تھا کہ (صرف دو آدمی تھے، اور) ان میں دوسرا (اللہ کا رسول تھا اور دونوں غار ثور) میں چھپے بیٹھے تھے اور اس وقت اللہ کے رسول نے اپنے ساتھی سے کہا تھا، غمگین نہ ہو، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے" (وہ دشمنوں کو ہم پر قابو پانے نہ دے گا) پس اللہ نے اپنا سکون و قرار اس پر نازل کیا، اور پھر ایسی فوجوں سے مددگاری کی جنہیں تم نہیں دیکھتے، اور بالآخر کافروں کی بات پست کی اور (تم دیکھ رہے ہو کہ) اللہ ہی کی ذات ہے جس کے لئے بلندی ہے۔ اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

اللہ ملائکہ اور جماعت مومنین کی یہی تائید و نصرت تھی جس کے متعلق دوسرے مقام پر فرمایا:۔

فَإِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيرٌ ۝ (۶۶/۴)

اگر پیغمبر کے مقابلہ میں تم نے کچھ کیا تو (یاد رکھو! پیغمبر تمہارا محتاج نہیں) خدا۔ جبرئیل اور نیک مسلمان اس کے رفیق ہیں اور اس کے بعد عام فرشتے بھی اس کے مددگار ہیں!

تفصیل اپنے مقام پر آئے گی)

درود و صلوٰۃ

یہی تائید و نصرت ہے جسے درود و صلوٰۃ کہا گیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۭ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ (۳۳/۵۶)

اے جماعتِ مومنین! (دیکھو) خدا اور اس کے فرشتے (سب) نبی کی تائید و نصرت کرتے ہیں۔ سو اے ایمان والو! تم بھی اس کی تائید و نصرت کرو۔ یعنی اس نظامِ خداوندی کی پوری پوری اطاعت کرو۔

صرف نبی اکرمؐ کی تائید و نصرت نہیں بلکہ تمام مومنین کی

هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ۝ (۳۳/۴۳)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! خدا ہی کی تو وہ ذات ہے جو تمہاری تائید و نصرت کرتا ہے۔ اور اس کے فرشتے (بھی) تاکہ وہ تمہیں (غیر اللہ کی محکومی کی) تاریکیوں سے نکال کر (حکومتِ الٰہیہ کی وادی) نور تک پہنچا دے۔ اور وہ ایمان والوں پر بڑا ہی مہربان ہے!

محافظ و نگہبان

یہی ملائکہ، حضرات انبیاء کرامؑ کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے محافظ و نگہبان مقرر ہوتے ہیں، تاکہ وہ ابلاغِ رسالت کا فریضہ سر انجام دے سکیں۔

فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۝ لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ۝ (۷۲/۲۸)

اس پیغمبر کے آگے اور پیچھے محافظ فرشتے بھیج دیتا ہے (اور یہ انتظام اس لئے کیا جاتا ہے) تاکہ معلوم ہو جائے کہ انہوں نے اپنے پروردگار کے پیغام بحفاظت تمام پہنچا دیئے۔ اور اللہ تعالیٰ (ان پہرہ داروں) کے تمام احوال کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اور اس کو ہر چیز کی گنتی معلوم ہے۔

تبشیر

ملائکہ ہی نے حضرت زکریاؑ کو حضرت یحییٰؑ کی خوشخبری دی تھی۔

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَاۗئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ (۳/۳۹)

پھر ایسا ہوا کہ فرشتوں نے زکریاؑ کو پکارا اور وہ محراب میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا "خدا تمہیں یحییٰ کی (یعنی ایک لڑکے کی جو پیدا ہوگا اور اس کا نام یحییٰ رکھا جائے گا) بشارت دیتا ہے۔ وہ خدا کے حکم سے ایک ہونے والے ظہور کی تصدیق کرنے والا جماعت کا سردار، پارسا و مرتاض اور خدا کے صالح بندوں میں سے ایک نبی ہوگا۔"

حضرت مریمؑ کے پاس بھی ملائکہ ہی حضرت عیسیٰؑ کی بشارت لیکر آئے تھے۔

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ○ (۳/۴۲ نیز ۳/۴۵ و ۱۹/۱۶)

اور پھر جب ایسا ہوا تھا کہ فرشتوں نے کہا تھا "اے مریم! اللہ نے تجھے اپنی قبولیت کے لئے چن لیا ہے، اور برائیوں کی آلودگی سے پاک کر دیا ہے اور اقوامِ عالم کی عورتوں پر برگزیدگی عطا فرمائی ہے"

(ان اشارات کی تفصیل اپنے اپنے مقام پر آئے گی)

عذابِ خداوندی کے حامل

اگر ایک طرف ملائکہ، ایمان و استقامت کی بنا پر اللہ کی رحمتوں کی نور افشانی کرتے ہیں تو دوسری طرف کفر و سرکشی کے لئے عذابِ خداوندی کے حامل بھی یہی ہوتے ہیں۔ "عذابِ خداوندی" سے مفہوم ہے، ان قوموں کی غلط روش کے تباہ کن نتائج۔ لہٰذا اس باب میں ملائکہ سے مراد ہیں وہ قوتیں جو قانونِ خداوندی کے مطابق، انسانی اعمال کے نتائج مرتب کرنے کے لئے سرگرمِ عمل رہتی ہیں۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ○ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ○ (۱۶/۳۳–۳۴)

(اے پیغمبر!) یہ لوگ جو انتظار کر رہے ہیں، تو اس بات کے سوا اب اور کون سی بات باقی رہ گئی ہے کہ فرشتے اُن پر اتر آئیں، یا تیرے پروردگار کا مقررہ حکم ظہور میں آجائے؟ ایسا ہی ان لوگوں نے بھی کیا تھا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں (کہ سرکشی و فساد سے باز نہ آئے یہاں تک کہ حکمِ الٰہی ظہور میں آگیا) اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتے رہے! اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ جیسے کچھ ان کے کام تھے، ویسے ہی بُرے نتیجے ملے اور جس بات کی ہنسی اڑایا کرتے تھے، وہی انہیں آلگی۔

سورۂ فرقان میں ہے

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ...... وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ○ (۲۵/۲۱، ۲۵/۲۵ و نیز ۲/۲۱۰)

اور وہ لوگ جو ہمارے قانونِ مکافات کا سامنا کرنے کی توقع نہیں رکھتے کہتے ہیں "ہم پر فرشتے کیوں نہیں اتارے جاتے؟ (آخر ان پیغمبروں میں ہی کیا خصوصیت ہے کہ فرشتے ان ہی کے پاس آتے ہیں) یا (اگر کوئی واقعی خدا ہے تو) ہم اپنے (اس) پروردگار کو کیوں نہیں دیکھتے؟ یہ لوگ اپنے دلوں میں اپنے کو بہت بڑا سمجھنے لگے ہیں اور حد و دِ انسانیت سے بھی بہت

دور نکل گئے ہیں۔ جس دن یہ فرشتوں کو دیکھ لیں گے اُس دن ان مجرموں کے لئے (یہ بات) کوئی خوش خبری (کی) نہیں ہوگی (پھر) کہیں گے "پناہ ہے پناہ ہے" اور ہم (اس روز) اُن (کفار) کے ان کاموں کی طرف متوجہ ہوں گے جو وہ کر چکے تھے۔ سو ہم ان کو ایسا (بیکار) کر دیں گے جیسا پریشان غبار (البتہ) اہل جنت اس روز قیام گاہ میں بھی اچھے رہیں گے اور آرام گاہ میں بھی خوب اچھے ہوں گے۔ اور جس روز آسمان ایک بدلی پر سے پھٹ جائے گا اور فرشتے بکثرت اتارے جائیں گے۔

سورۂ انعام میں ہے:۔

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۭ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ (۸/۶)

اور انہوں نے کہا کہ اگر یہ شخص اپنے دعوے میں سچا ہے، تو) کیوں اس پر فرشتہ نہیں اترتا (کہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں؟") اگر ہم فرشتہ نازل کرتے تو ساری باتوں کا فیصلہ ہی ہو جاتا۔ پھر اُن کے لئے مہلت ہی نہ رہتی (کہ نہ مانیں)

قُضِيَ الْاَمْرُ اس حقیقت کو بھی واضح کر رہا ہے، کہ قانونِ مجازات کے ماتحت عذاب خداوندی کی آمد امر الٰہی کے مطابق ہوتی ہے جس کی تدبیر کے وسائط و ذرائع ملائکہ ہیں۔ دوسری جگہ ہے۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ۭ...... قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ۝ (۱۵۸/۶)

پھر یہ لوگ (جو سچائی کی نشانیاں دیکھنے پر بھی سرکشی سے باز نہیں آتے تو) کس بات کے انتظار میں ہیں؟ اس بات کے انتظار میں ہیں کہ (آسمان سے) فرشتے اُن کے پاس آجائیں، یا خود تمہارا پروردگار اُن کے سامنے آ کھڑا ہو، یا تمہارے پروردگار کی بعض نشانیاں نمودار ہو جائیں؟ (تو اگر یہ لوگ اسی بات کی راہ تک رہے ہیں، تو انہیں معلوم ہونا چاہیئے) کہ جس دن تمہارے پروردگار کی بعض نشانیاں نمودار ہوں گی، اس دن کسی انسان کو جو پہلے سے ایمان نہ لا چکا ہو یا اپنے ایمان (کی حالت) میں اس نے نیکی نہ کما لی ہو، ایمان لانا سود مند نہ ہوگا۔ (اے پیغمبر!) تم کہہ دو (اگر تمہیں انتظار ہی کرنا ہے تو) انتظار کرتے رہو۔ ہم بھی (فیصلۂ حق و باطل کا) انتظار کرتے ہیں!

سورۂ حجر میں ہے:۔

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ۝........ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰۗىِٕكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ۝ (۸-۴/۱۵)

ہم نے کبھی کسی بستی کے باشندوں کو ہلاک نہیں کیا، مگر اسی طرح کہ اس کے لئے ایک ٹھہرائی ہوئی بات تھی (یعنی ایک مقررہ قانون تھا کہ جب کوئی حالت اس طرح کی ہوگی اور اس مقدار میں ہوگی، تو ایسا نتیجہ ضرور نکلے گا) کوئی اُمت نہ تو اپنے وقت سے آگے بڑھ سکتی ہے نہ پیچھے رہ سکتی ہے! اور (اے پیغمبر!) اُن لوگوں نے تم سے کہا

"اے وہ آدمی کہ تجھ پر نصیحت اتری ہے، تو (ہمارے خیال میں) یقیناً دیوانہ ہے۔ اگر تو اپنے دعوے میں سچا ہے تو ایسا کیوں نہیں کرتا کہ فرشتے اتار کر ہمیں دکھا دے؟" ہم فرشتے بیکار نہیں اتارا کرتے۔ جب ہی اتارتے ہیں کہ کوئی مصلحت ہوتی ہے، اور جب فرشتے اتریں گے، تو اس وقت انہیں مہلت عمل نہ ملے گی (وہ تو فیصلۂ عمل کا دن ہوگا۔!)

اگر ایمان و اعمالِ صالحہ کے بدلہ میں فرشتوں کی طرف سے درود و صلوٰۃ کی بارشیں ہیں تو کفر و ارتداد کے عوض میں "لعنتوں کی بوچھار" بھی ہے۔

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ...... اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝ (پ ۳)

یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ اللہ ایک ایسے گروہ پر (فلاح و کامیابی کی) راہ کھول دے، جس نے ایمان کے بعد کفر کی راہ اختیار کر لی۔ حالانکہ اس نے گواہی دی تھی کہ اللہ کا رسول برحق ہے اور (حقیقت کی) روشن دلیلیں اس کے سامنے واضح ہو گئی تھیں؟ اللہ کا قانون تو یہ ہے کہ وہ ظلم کرنے والے گروہ پر (فلاح و سعادت کی) راہ نہیں کھولتا! ان لوگوں کو (ان کے ظلم و شرارت کا) جو بدلہ ملنے والا ہے، وہ تو یہ ہے کہ اُن پر اللہ کی، فرشتوں کی انسانوں کی، سب کی لعنت برس رہی ہے!

لعنت کے معنی ہیں دور رہنا۔ محروم ہو جانا۔ یعنی جو لوگ قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی نہیں بسر کرتے وہ ان قوانین کے خوشگوار نتائج کی یمن و سعادت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ نہ انہیں صالح انسانوں کی رفاقت نصیب ہوتی ہے اور نہ ہی وہ کائنات کی تدبیر امور کرنے والی قوتوں ہی سے صحیح طور پر نفع یاب ہو سکتے ہیں۔

پیغامِ موت کے حامل

چونکہ موت بھی قانونِ خداوندی کے مطابق آتی ہے اس لئے اس کی تدبیر بھی ملائکہ کے سپرد ہے۔ انہی کے "ہاتھوں" انسان کی وفات ہوتی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ۭ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُھَاجِرُوْا فِيْھَا ۭ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىھُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ۝ (پ ۵ ع ۱۴)

جو لوگ (دشمنوں کے ساتھ رہ کر) اپنے ہاتھوں اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں۔ اُن کی روح قبض کرنے کے بعد فرشتے اُن سے پوچھتے ہیں "تم کس حال میں تھے؟" (یعنی دین کے اعتبار سے تمہارا کیا حال تھا؟) وہ جواب میں کہتے ہیں "ہم کیا کرتے؟ ہم ملک میں مغلوب و بے بس تھے:" اس پر فرشتے کہتے ہیں (اگر تم اپنے ملک میں مغلوب و بے بس تھے، تو) کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ کسی دوسری جگہ ہجرت کر کے چلے جاتے؟ غرضکہ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہے، اور (جس کا

ٹھکانا دوزخ ہو، تو کیا ہی بُری جگہ ہے!)

سورۂ انعام میں ہے

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُونَ ۝ (۶۱)

اور وہی اپنے بندوں پر زور و غلبہ رکھنے والا ہے اور تم پر محافظ (فرشتے) بھیجتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت آتی ہے تو اُس کے بھیجے ہوئے (فرشتے) اسے وفات دیدیتے ہیں، اور وہ (ہمارے مقررہ احکام کی ٹھیک ٹھیک تعمیل کرتے ہیں۔ اس میں کسی طرح کا قصور نہیں کرتے!

اس سے ذرا آگے چل کر ہے

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا...... وَكُنتُمْ عَنْ آيَاتِهِ تَسْتَكْبِرُونَ ۝

(۶/۹۳ نیز ۸/۵۰ ؛ ۴۷/۲۷ ؛ ۴/۹۷)

اور اس سے بڑھ کر ظلم کرنے والا کون ہے جو خدا پر جھوٹ بول کر افترا کرے؟ یا کہے مجھ پر وحی کی گئی ہے، اور حقیقت میں اس پر کوئی وحی نہیں آئی! اور نیز اس سے جو (خدا کی وحی کا مقابلہ کرے اور) کہے میں بھی ایسی ہی بات اتار دکھاؤں گا، جیسی خدا نے اتاری ہے! (اور اے پیغمبر! تم تعجب نہ کرو۔ اگر ظالموں کو اس حالت میں دیکھو جب وہ جاں کنی کی بیہوشیوں میں بے دم پڑے ہوں گے، اور فرشتے (اُن کی جان نکالنے کے لئے) ہاتھ بڑھائے ہوں گے کہ "اپنی جانیں (اپنے جسم سے) خارج کرو۔ آج کا دن وہ دن ہے کہ جو کچھ تم خدا پر تہمتیں باندھتے تھے۔ اور اس کی آیتوں کی تصدیق سے گھمنڈ کرتے تھے اس کی پاداش میں تمہیں رسواکن عذاب دیا جائے گا!"

سورۂ سجدہ میں فرشتۂ اجل کو مَلَكُ الْمَوْتِ کہا گیا ہے۔

قُلْ يَتَوَفَّاكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ ۝ (۳۲/۱۱)

(اے پیغمبر اسلام!) تم کہدو کہ (اے افرادِ نسلِ انسانی!) تمہیں وہ موت کا فرشتہ وفات دیتا ہے جو تم پر مقرر کر دیا گیا ہے پھر (مرنے کے بعد) تم سب اپنے پروردگار کی طرف لوٹائے جاؤ گے (جہاں تمہیں تمہارے اعمال کی جزا و سزا دی جائے گی)

حفاظت و نگرانی ان مقامات سے ظاہر ہے کہ جو طبعی تغیرات انسان کے جسم میں رونما ہوتے ہیں اور جن کا آخری نتیجہ انسان کی طبعی موت ہوتی ہے، انہیں بھی ملائکہ کی قوتوں سے تعبیر کیا گیا ہے حقیقت یہ ہے کہ خارجی کائنات ہو یا انسان کی داخلی زندگی ہر جگہ، ہر شے خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق واقع ہوتی ہے۔ ان قوانین میں سے کچھ ایسے ہیں جو انسانی علم کے احاطے میں آگئے ہیں یا رفتہ رفتہ آتے جائیں گے، باقی ایسے

ہیں جو اس کے حیطۂ ادراک سے باہر ہیں۔ ان تمام قوتوں کو "ملائکہ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہی قوتیں زندگی بھر انسان کی محافظت کرتی ہیں۔

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً (۶/۶۱)

اور وہی اپنے بندوں پر زور و غلبہ رکھنے والا ہے اور تم پر محافظ (قوتیں) بھیجتا ہے۔

اور یہی قوتیں انفرادی اور اجتماعی اعمالِ حیات کے نتائج مرتب کرتی ہیں۔

لَهُ مُعَقِّبَاتٌ مِّن بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُونَهُ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ ۗ وَإِذَا أَرَادَ اللَّهُ بِقَوْمٍ سُوءًا فَلَا مَرَدَّ لَهُ ۚ وَمَا لَهُم مِّن دُونِهِ مِن وَالٍ (۱۳/۱۱)

انسان کے آگے اور پیچھے ایک کے بعد ایک آنے والی (قوتیں) ہیں جو اللہ کے حکم سے اس کی حفاظت کرتی ہیں۔ اللہ کبھی اس حالت کو نہیں بدلتا جو کسی گروہ کو حاصل ہوتی ہے، جب تک وہ خود ہی اپنی نفسی کیفیات کو نہ بدل ڈالے۔ اور پھر، جب اللہ چاہتا ہے کہ اس کے قانون کے مطابق کسی گروہ کو (اس کی تغیرِ صلاحیت کی پاداش میں) مصیبت پہنچے، تو مصیبت پہنچ ہی کر رہتی ہے۔ (وہ) کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی، اور اللہ کے سوا کوئی نہیں جو اس کا کارساز ہو۔

یہ محافظ ہر نفس کے ساتھ ہوتے ہیں۔

إِن كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ (۸۶/۴ نیز ۸۲/۱۰)

کوئی نفس ایسا نہیں ہے جس پر کوئی محافظ مقرر نہ ہو۔

اعمالِ انسانی کے مسجّل

یہی وہ محافظ (وسائط) ہیں جو اعمالِ انسانی کو محیط ہوتے ہیں اور یوں انسان کا کوئی عمل، اس کے قلب و نگاہ کی کوئی جنبش نہ اللہ سے چھپ سکتی ہے، نہ کہیں ضائع ہو سکتی ہے۔ ہر ایک کا نتیجہ مرتب ہو کر رہتا ہے۔

قُلِ اللَّهُ أَسْرَعُ مَكْرًا ۚ إِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُونَ مَا تَمْكُرُونَ (۱۰/۲۱)

(اے پیغمبر!) تم کہہ دو "اللہ کا قانون تمہاری تدابیر سے زیادہ تیز ہیں واقع ہوا ہے۔ ہمارے فرشتے تمہاری یہ ساری سازشیں اور تدبیریں قلمبند کرتے رہتے ہیں۔

انسان کے سینوں کے اندر چھپے ہوئے راز، سکوت افزارات کے اندھیروں میں چپکے چپکے سرگوشیاں سب محفوظ ہوتی چلی جاتی ہیں۔

أَمْ يَحْسَبُونَ أَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُم ۚ بَلَىٰ وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُونَ (۴۳/۸۰)

(اور خیال تو کرو) کیا وہ (منکرینِ حق یہ) سمجھتے ہیں کہ ہم ان کی راز داریاں اور سرگوشیاں نہیں سنتے (اگر وہ ایسا خیال کرتے ہیں تو قطعاً غلط ہے) کیوں نہیں (ہم ان کی ایک ایک بات سنتے ہیں) اور ہمارے فرستادہ (فرشتے) ان کے پاس رہی ان کی تمام بداعمالیاں) قلمبند کر رہے ہیں!

جو وساوس اس کے دل کے اندر گزرتے ہیں۔ یا ان میں سے جو خیالات، الفاظ کے پیکروں میں مشہود ہو جاتے ہیں۔ وہ حلقہ قانونِ مجازات سے نکل کر کہیں باہر نہیں جا سکتے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ○ اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ○ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ○ (۵۰/۱۶-۱۸)

اور (دیکھو) ہم نے ہی تو انسان کو پیدا کیا ہے (لہذا) اس کے جی میں جو کچھ وساوس (وخیالات) آتے ہیں ہم اُن کو (بھی) جانتے ہیں۔ اور ہم (علم وارادہ کے اعتبار سے) انسان کی رگِ جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔ جب دو اخذ کرنے والے (ریکارڈ کرتے) رہتے ہیں جو اس کے دائیں اور بائیں رہتے ہیں (حتیٰ کہ) وہ کوئی لفظ منہ سے نکالنے نہیں پاتا۔ مگر اس کے پاس ہی ایک نگران تیار رہتا ہے۔

ان مقامات میں کتابت، اعمالِ انسانی کو ملائکہ کا فریضہ بتایا گیا ہے۔ لیکن دوسرے مقامات پر اسے اللہ تعالیٰ نے خود اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

كَلَّا ۚ سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ○ (۱۹/۷۹)

ہرگز نہیں (ایسا کبھی نہیں ہو سکتا) وہ جو کچھ کہتا ہے، ہم اسے لکھ لیں گے (یعنی اس کی یہ بات بھلائی نہیں جائے گی) اور اس کے عذاب کی رسی لمبی کرتے جائیں گے۔

نامۂ اعمال خود انسان کے گلے میں

اس سے واضح ہے کہ یہ ملائکہ درحقیقت خدا کے قانون ہی کی قوتیں ہیں جو اس طرح اثرات مرتب کرتی ہیں۔ اور یہ "کتابتِ اعمال" خدا کے قانونِ مکافات ہی کا دوسرا نام ہے۔ اس کی وضاحت دوسری جگہ کر دی جہاں فرمایا کہ یہ نامۂ اعمال کہیں باہر نہیں رکھا ہوتا، بلکہ ہر انسان کے "گلے" میں حمائل ہوتا ہے۔

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ۭ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ○ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ○ (۱۷/۱۳-۱۴)

اور ہم نے ہر انسان کی شامت خود اس کی گردن سے باندھ دی ہے (کہیں باہر سے اس پر آ کر نہیں گرتی) قیامت کے دن ہم اس کے لئے (نامۂ اعمال کی) کتاب نکال کر پیش کر دیں گے۔ وہ اسے اپنے سامنے کھلا دیکھ لے گا۔

(ہم کہیں گے) "اپنا نامہ اعمال پڑھ لے آج کے دن خود تیرا وجود ہی تیرے احتساب کے لئے بس کرتا ہے!"

کہ نفسِ انسانی خود اپنے خلاف محاسب اور نگراں ہے۔

بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۝ (۷۵/۱۴)

بلکہ انسان خود (بھی) اپنی حالت پر بصیر ہے *

لہذا یہ ملائکہ ہماری اپنی ہی داخلی قوتیں ہیں یعنی ہمارے اعمال کے وہ اثرات جو ہماری ذات پر مرتب ہوتے رہتے ہیں جب انسانی اعمال کے نتائج محسوس شکل میں سامنے آتے ہیں، قرآن اسے قیامت سے تعبیر کرتا ہے۔ اور چونکہ انسانی زندگی اس کی موت کے ساتھ ہی ختم نہیں ہو جاتی بلکہ آگے بڑھتی ہے اس لئے اعمال کے ظہور نتائج کا یہ سلسلہ بھی موت کے بعد تک قائم و دائم رہتا ہے اسی اعتبار سے فرمایا کہ ملائکہ کا نزول قیامت میں بھی ہوگا یعنی انسان کی موجودہ زندگی میں بھی ظہور نتائج ملائکہ کی قوتوں سے ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد موت کے بعد بھی ظہور نتائج اسی طرح ہوگا۔

وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَاءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلَائِكَةُ تَنْزِيلًا ۝ (۲۵/۲۵)

اور (اس دن کا خیال کرو) جس دن آسمان ایک بدلی پر سے پھٹ جائے گا۔ اور فرشتے بکثرت اتارے جائیں گے

دوسری جگہ ہے۔

يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا ۖ لَا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ۝ (۷۸/۳۸)

(اور خیال کرو) جس روز تمام ذی روح اور فرشتے صف بستہ کھڑے ہوں گے (اس روز) کوئی نہ بول سکے گا۔ بجز اس کے جس کو (خدائے) رحمٰن بولنے کی اجازت دیدے اور وہ شخص بات ٹھیک کہے۔

اعمال کے ذرہ ذرہ کی پرکھ ہوگی اور جن میں قانونِ ارتقاء کے مطابق جنت کی بلند و بالا اور ارفع و اعلیٰ زندگی بسر کرنے کی صلاحیت ہوگی۔ ملائکہ ان خوش بخت، سعادت مند نفوس کا استقبال بابِ فردوس پر کریں گے۔

لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ وَتَتَلَقَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ هَٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ (۲۱/۱۰۳ نیز ۴۱/۳۰)

انہیں بڑی سے بڑی ہولناکی بھی ہراساں نہ کرے گی۔ فرشتے انہیں بڑھ کر لیں گے۔ (اور کہیں گے) "یہ ہے تمہارے (اعمال کی جزا کا وہ) دن جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا!"

یہ فرشتے جنت کے ہر دروازے سے جوق در جوق آئیں گے اور جوشِ مسرت و بہجت میں اہلِ جنت پر تبریک و تحسین کے پھول برسائیں گے۔

جَنَّاتُ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ ۖ وَالْمَلَائِكَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِمْ مِنْ كُلِّ بَابٍ ۝ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ ۚ فَنِعْمَ

عُقْبَى الدَّارِ (۱۳/۲۲—۲۴ نیز ۱۶/۳۲)

ہمیشگی کے باغ جن میں وہ خود بھی داخل ہوں گے اور ان کے آباؤ اجداد، بیویوں اور اولاد میں سے جو نیک کردار ہونگے وہ بھی جگہ پائیں گے۔ اور (وہاں کی زندگی ایسی ہوگی کہ) ہر دروازے سے فرشتے ان پر آئیں گے اور کہیں گے "یہ جو تم نے (ایمان و عمل میں) استقامت دکھائی تو اس کی وجہ سے (آج) تم پر سلامتی ہے!" پھر کیا ہی اچھا عاقبت کا ٹھکانا ہے جو ان لوگوں کے حصہ میں آیا!

ادھر اہلِ جنت کی یہ کیفیت ہوگی، اور ادھر اہلِ دوزخ کی یہ حالت کہ:-

وَسِيقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَى جَهَنَّمَ زُمَرًا ..... وَلَكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكَافِرِينَ (۳۹/۷۱ نیز ۴۰/۴۹)

اور کفار کو دوزخ کی طرف گروہ در گروہ لے جائیں گے۔ یہاں تک کہ جب اس کے قریب آجائیں گے تو اس کے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور اس کے چوکیدار ان سے کہیں گے۔ کیا تمہارے پاس تم میں سے رسول نہیں آئے تھے جو تمہارے رب کے احکامات بتلاتے تھے اور تمہیں اس دن کی حضوری سے آگاہ کرتے تھے؟ وہ کہیں گے کہ ہاں (ایسا تو ہوا تھا) لیکن نہ ماننے والوں پر عذاب کی بات (اسی طرح) پوری ہوتی تھی۔

جہنم کے ان چوکیداروں کو ایک مقام پر "اصحاب النار" بھی کہا گیا ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا أَصْحَابَ النَّارِ إِلَّا مَلَائِكَةً ص (۷۴/۳۱)

اور ہم نے جہنم کے کارکن (آدمی نہیں) بلکہ فرشتے بنائے ہیں۔

بڑے زبردست اور قوی فرشتے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلَائِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ۝ (۶۶/۶)

اے ایمان والو! تم اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو (دوزخ کی) آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن سوختہ آدمی اور پتھر ہیں۔ جس پر تند خو اور مضبوط فرشتے (متعین) ہیں، جو خدا کی ذرا نافرمانی نہیں کرتے، اور جو انہیں حکم دیا جاتا ہے اس کو بجا لاتے ہیں۔

جن میں سب سے بڑے محافظ و نگراں کا لقب (یا نام) مَالِكٌ ہے۔

وَنَادَوْا يَا مَالِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ط قَالَ إِنَّكُمْ مَاكِثُونَ ع (۴۳/۷۷)

اور وہ (دوزخ کے داروغہ کو) پکاریں گے کہ "اے مالک[۱] ! (تم ہی دعا کرو کہ) تمہارا پروردگار (ہم کو موت دے کر) ہمارا کام ہی تمام کر دے۔" وہ (فرشتہ) جواب دے گا کہ "تم ہمیشہ اسی حال میں رہو گے۔"

---

[۱] فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھیے۔

رجنت اور دوزخ اور ان کے لوازم و متعلقات کی قرآنی تصریحات کے لئے آخری جلد کا انتظار کرنا چاہیئے) ان آیات میں ہم نے جنت اور جہنم کی تشریح نہیں کی۔ اس لئے کہ ان چیزوں کی تشریح کا یہ مقام نہیں۔ البتہ یہاں اس قدر بتا دینا ضروری ہے کہ جنت اور جہنم کا سلسلہ اس دنیا سے شروع ہو جاتا ہے۔ انسانی اعمال ہر آن اپنا نتیجہ مرتب کرتے رہتے ہیں۔ ان میں سے بعض نتائج اسی دنیا میں مشہود و متشکل میں سامنے آجاتے ہیں اور بعض کا ظہور موت کے بعد کی زندگی میں ہوتا ہے۔ انفرادی زندگی کے علاوہ اجتماعی طور پر دیکھئے تو جو معاشرہ قوانین خداوندی کے مطابق متشکل ہو وہ انسانوں کے لئے جنت کی زندگی کا حامل ہوتا ہے اور جب انسان غیر خداوندی نظام میں زندگی بسر کریں تو اس کا نتیجہ جہنم ہوتا ہے۔ قرآن میں بیان شدہ جنت، جہنم، میزان قیامت، عذاب، ثواب، جزا، سزا مرنے کے بعد کی دنیا ہی سے متعلق نہیں۔ اس دنیا سے بھی متعلق ہیں (اس کی تشریح کا یہ مقام نہیں) ملائکہ (یعنی وہ مخفی وغیر مرئی قوتیں جو اعمال انسانی کے نتائج مرتب کرتی ہیں) ہر وقت اس کے لئے جنت کی تعمیر اور جہنم کی تشکیل میں مصروف رہتی ہیں۔ ہمارے لئے یہ جنت و جہنم ان اثرات و کیفیات کی صورت میں وجود پذیر ہوتی ہے جو ہمارے انفرادی اور اجتماعی اعمال کا فطری نتیجہ ہوتے ہیں۔

ملائکہ پر ایمان

یہ ہیں وہ خصوصیات جن کے حامل ملائکہ پر ایمان لانے کے لئے کہا گیا ہے۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ٥ (۲/۱۷۷ نیز ۴/۱۳۶)

لیکن کشادگی راہ تو اس کی ہے۔ جو اللہ۔ آخرت۔ ملائکہ۔ کتب اور انبیا پر ایمان رکھے ٭ اور ان سے انکار و عداوت اجزائے کفر میں سے ہے۔

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ٥ (۲/۹۸)

جو کوئی اللہ کا، اس کے ملائکہ کا، اس کے رسولوں کا اور جبریل اور میکال کا دشمن ہے تو یقیناً اللہ بھی منکرین حق کا دوست نہیں ہے۔

ملائکہ کا عقیدہ امم سابقہ میں بہت عرصے سے چلا آتا تھا۔ لیکن جس طرح ذات و صفات باری تعالیٰ کے متعلق انسانی تصورات

(فٹ نوٹ صفحہ ...)

لہ کس قدر عبرت انگیز ہے یہ منظر! خدا کے سوا مالک (master) جو ذہن انسانی نے اپنی عبودیت و محکومیت کے لئے تراش رکھا ہو اس دنیا میں بھی جہنم کا دارو غہ ہے۔ اور اس دنیا میں بھی۔ انسان صرف اللہ کے قانون کی اطاعت کرے تو سکون و طمانیت کی جنت میں ہے۔ اور اس کے علاوہ کسی اور کی محکومیت اختیار کرے تو جہنم ہی جہنم ہے۔ (غالباً مالک کا لفظ اسی رعایت سے استعمال ہوا ہے)

افراط و تفریط کی عجیب عجیب شکلیں پیدا کر کے حقیقت کو مسخ کر رکھا تھا۔ اسی طرح ملائکہ کے متعلق بھی عجیب عجیب انداز کے تصورات

ایمان کا مفہوم

پیدا کر رکھے تھے۔ قرآن کریم نے افراط و تفریط کے ان خود ساختہ پردوں کو الگ کر کے ملائکہ کی صحیح حقیقت نگاہوں کے سامنے واضح کر دی۔ اسلام سے پیشتر کہیں ملائکہ کی الوہیت کا عقیدہ تھا جسے قرآن کریم نے باطل قرار دیا۔

وَلَا يَأْمُرَكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ أَرْبَابًا ۗ أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ٥ (۳/۷۹)

(ایک ربانی انسان کبھی) تمہیں اس بات کا حکم نہیں دے گا کہ فرشتوں یا نبیوں کو اپنا پروردگار بنا لو۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں کفر کرنے کا حکم دے حالانکہ تم مسلم (یعنی خدا کے تابع فرمان) ہو چکے ہو؟

سورۂ سبا میں ہے:-

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ يَقُولُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ أَهٰٓؤُلَآءِ إِيَّاكُمْ كَانُوا يَعْبُدُونَ ٥ قَالُوا سُبْحٰنَكَ أَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُونِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّ ۚ أَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُؤْمِنُونَ ٥ (۳۴/۴۰—۴۱ نیز ۴۳/۱۹—۲۰)

اور (اس دن کا خیال کرو) جس روز (خدا) ان سب کو جمع کرے گا پھر (مشرکین کی طرف اشارہ کر کے) فرشتوں سے کہے گا کہ کیا یہی وہ لوگ ہیں جو تمہاری پرستش کیا کرتے تھے؟ (اس پر) وہ (فرشتے) عرض کریں گے۔ تیری ذات پاک ہے۔ تو ہی ہمارا (آقا و مالک اور) مددگار ہے۔ نہ کہ یہ لوگ۔ (وہ ہماری پرستش نہیں کرتے تھے) بلکہ وہ تو ہر نگاہ سے مخفی (طاقت کی) عبودیت (اطاعت و پرستش) کیا کرتے تھے۔ اُن میں سے اکثر اُن ہی پر ایمان لانے والے تھے[1]۔

توہم پرستی کی وادیوں میں بھٹکنے والے لوگ سمجھتے تھے کہ چونکہ ملائکہ کو قرب الٰہی میسر ہے اس لئے وہ خدا کے ہاں اُن کے سفارشی ہو سکتے ہیں۔ قرآن نے اس عقیدۂ باطل کی بھی تردید کر دی۔

وَكَمْ مِنْ مَلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا إِلَّا مِنْ بَعْدِ أَنْ يَأْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَشَآءُ وَيَرْضٰى ٥ (۵۳/۲۶)

اور (دیکھو) کائنات کی بلندیوں میں کتنے ہی (بے شمار) فرشتے موجود ہیں (مگر) اُن کی شفاعت (اگر بالفرض وہ کریں) تو کچھ بھی تو کام آنے والی نہیں ہے۔ مگر بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے اپنے قانون کے مطابق اجازت دیدے اور اس کے لئے شفاعت اس قانون کے مطابق ہو۔

(شفاعت کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔ لیکن اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن کی رو سے یہ عقیدہ قطعاً غلط ہے

---

[1] اسے ہمیشہ ملحوظ رکھئے کہ قرآن کے اس قسم کے بیانات تمثیلی ہوتے ہیں۔

کہ کوئی سفارشی، خدا کے حضور کسی مجرم کی سفارش کر کے اسے چھڑا لے گا۔ اس قسم کے تصورات ہماری اس ذہنیت کے پیدا کردہ ہیں جس کی رو سے ہم نے خدا کو "دنیاوی بادشاہ" کی سی حیثیت دے رکھی ہے جو ذرا سی بات میں غصے میں آجاتا ہے تو سخت سزا دے دیتا ہے۔ اور خوش ہو جاتا ہے تو انعام و اکرام سے مالا مال کر دیتا ہے۔ جس کے دربار میں "مقربین" ہوتے ہیں جو لوگوں کی سفارشیں کرتے ہیں اور راستے میں حاجب و دربان ہوتے ہیں جن کے وسیلے سے اس تک رسائی ہوتی ہے۔ قرآن نے خدا کا جو تصور پیش کیا ہے وہ اس تصور سے بالکل الگ اور بلند و برتر ہے۔ کائنات میں اس کا قانون کارفرما ہے اور یہاں ہر فیصلہ اس قانون کے مطابق ہوتا ہے جس میں نہ کسی کی رعایت ہوتی ہے نہ کسی پر کسی قسم کی زیادتی۔ وہ انسانی جذبات سے بلند ہے کہ ناراض ہو کر سزا دینی شروع کر دے اور خوش ہو کر انعامات بانٹ دے۔ (تفصیل ان امور کی دوسرے مقام پر ملے گی)

کفارِ عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھا کرتے تھے۔ قرآن نے اس کی بھی تردید کر دی۔

أَفَأَصْفَاكُمْ رَبُّكُم بِالْبَنِينَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلَائِكَةِ إِنَاثًا ۚ إِنَّكُمْ لَتَقُولُونَ قَوْلًا عَظِيمًا ۝ (۱۷/۴۰)

کیا ہو سکتا ہے کہ تمہارے پروردگار نے تمہیں تو اس برگزیدگی کے لئے چن لیا ہو کہ بیٹے والے ہو اور خود اپنے لئے یہ پسند کیا ہو کہ فرشتوں کو بیٹیاں بنائے (افسوس تم پر!) کیسی سخت بات ہے جو تم کہہ رہے ہو۔

کہیں ویسے ہی عورتیں سمجھا جاتا تھا۔

إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ لَيُسَمُّونَ الْمَلَائِكَةَ تَسْمِيَةَ الْأُنثَىٰ ۝ (۵۳/۲۷)

(اور دیکھو کس قدر عجیب بات ہے کہ) جو لوگ مستقبل کی زندگی پر ایمان نہیں لاتے وہ فرشتوں کے نام عورتوں کی طرح رکھتے ہیں (گویا فرشتے ان کے نزدیک عورتیں ہیں)

کہیں انہیں خدا کے بیٹے قرار دیا جاتا تھا۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَٰنُ وَلَدًا ۗ سُبْحَانَهُ ۚ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُونَ ۝ لَا يَسْبِقُونَهُ بِالْقَوْلِ وَهُم بِأَمْرِهِ يَعْمَلُونَ ۝ (۲۱/۲۶-۲۷)

اور (دیکھو) انہوں نے کہا "خدائے رحمان نے اپنے لئے اولاد بنائی ہے" وہ اس سے بہت بلند ہے (فرشتے تو) اس کے معزز بندے ہیں۔ وہ اُس کے آگے بڑھ کے بات نہیں کر سکتے۔ وہ اُس کے حکم پر سرتاسر کاربند رہتے ہیں!

ان امور کی تصریحات کے لئے اصنامیات یونان کے افسانے اور ہندوستان کی قدیم مذہبی کتابوں کی داستانیں دیکھئے جہاں ان غیر مرئی ہستیوں کو خدا کی بیویاں اور بیٹیاں بنایا جاتا ہے۔ دیوی اور دیوتاؤں کا تصور ایسے ہی عقائد کا نتیجہ تھا۔

حقیقتِ حال

قرآن نے ان تمام عقائدِ باطلہ کی یک سر تردید کر دی اور ملائکہ کی حقیقت کو واضح الفاظ میں بیان کر دیا۔ سب سے پہلے اس کی وضاحت کر دی کہ ملائکہ کو خود خدا نے بنایا ہے۔ اس لئے

وہ خدا کیسے ہو سکتے ہیں؟

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا اُولِیْٓ اَجْنِحَۃٍ مَّثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ؕ یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۳۵/۱)

ہر تحسین خدا کے قانون کو زیبا ہے جو کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کا پیدا کرنے والا ہے (اور) فرشتوں کو پیغام رساں بنانے والا۔ جو دو دو۔ تین تین۔ چار چار قسم کی قوتوں کے حامل بنائے گئے ہیں وہ (اپنی) مخلوق میں (اپنے قانون مشیت کے مطابق) مناسب اضافے کرتا رہتا ہے۔ بلاشبہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

دو تین اور چار پروں سے قوت کے اعتبار سے ملائکہ کے مختلف مدارج و طبقات کا ذکر مقصود ہے (عربی محاورہ میں "مقصوص الجناح" (جس کے پر کتر دیئے جائیں) سے مراد عاجز و ناکارہ اور بے کس و بے بس ہوتا ہے۔ جیسے ہمارے ہاں "بے بال و پر" کہتے ہیں) ملائکہ خدا کی مخلوق اور اس کے عبد محکوم ہیں۔ اور اس عبدیت (اطاعت) سے نہیں شرماتے۔

لَنْ یَّسْتَنْکِفَ الْمَسِیْحُ اَنْ یَّکُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰہِ وَلَا الْمَلٰٓئِکَۃُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَمَنْ یَّسْتَنْکِفْ عَنْ عِبَادَتِہٖ وَیَسْتَکْبِرْ فَسَیَحْشُرُھُمْ اِلَیْہِ جَمِیْعًا ۝ (۴/۱۷۲)

مسیح کو ہرگز اس بات میں عار نہیں کہ وہ خدا کا بندہ سمجھا جائے، اور خدا کے مقرب فرشتوں کو اس سے ننگ و عار ہے اور جو کوئی خدا کی بندگی میں ننگ و عار سمجھے اور تکبر کرے (تو وہ تکبر کر کے کہاں جا سکتا ہے؟) خدا ان سب کو اپنے حضور اکٹھا کرے گا۔

اللہ کے عبد اور عبد مکرم

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَہٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّکْرَمُوْنَ ۝ (۲۱/۲۶)

اور دیکھو) انہوں نے کہا "خدائے رحمٰن نے اپنے لئے اولاد بنا لی ہے" وہ اس سے بلند ہے۔ (یہ جنہیں اس کی اولاد بناتے ہیں، وہ اس بات کا وہم و گمان بھی نہیں کر سکتے) بلکہ وہ تو اس کے معزز (و مکرم) بندے ہیں۔

یہ تکریم و تعظیم اس لئے ہے کہ اس کے احکام کی بلا چون و چرا تعمیل کرتے ہیں

یَخَافُوْنَ رَبَّھُمْ مِّنْ فَوْقِھِمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ (۱۶/۵۰)

وہ اپنے پروردگار سے ڈرتے رہتے ہیں جو اُن کے اوپر موجود ہے اور جو حکم انہیں دیا جاتا ہے اس کی تعمیل کرتے ہیں۔

کائنات کی تمام قوتیں (ملائکہ) اپنے اپنے فرائض مفوضہ کی سرانجامی میں ہمیشہ سرگرداں رہتی ہیں (اسے تسبیح کہتے ہیں) اور چونکہ ان تمام قوتوں کی سرگرمیٔ عمل کا نتیجہ ہمیشہ تعمیری ہوتا ہے جو کائنات کے حسن میں اضافے کا موجب بنتا ہے اس لئے اُن کی یہ سرگرمیٔ عمل خدا کے نظامِ کائنات و ربوبیت کی تحسین و ستائش کی زندہ پیکر ہوتی ہے (اسے حمد کہا جاتا ہے)۔

وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ ۚ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ وَهُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ ۝ (۱۳ ؛ ۱۳)

اور بادلوں کی گرج اس کی ستائش کرتی ہے، دوسری قوتیں بھی اس کے قانون کی گرفت میں رہتے ہوئے سرگرم ستائش رہتی ہیں۔ وہ بجلیاں گراتا ہے اور جسے چاہتا ہے اپنے قانون کے مطابق اُس کی زد میں لے آتا ہے، لیکن یہ منکرین کہ (اللہ کی قدرت و حکمت کی ان ساری نشانیوں سے آنکھیں بند کئے ہوئے) اس کے قانون کائنات کے بارے میں جھگڑ رہے ہیں، حالانکہ وہ (قانون) بڑا ہی سخت اور اٹل ہے۔

یہ ہے ملائکہ کی حقیقت۔ اور جب اس کے ساتھ اس چیز کو بھی سامنے رکھ لیا جائے کہ وہ انسان کے خادم ہیں اور آدم کا مسجود ہے تو یہ حقیقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کے

ملائکہ کا تعلق انسان کے ساتھ

ساتھ ان کا کیا تعلق ہے جو خادم اور تابع فرمان ہو اُسے اپنا معبود و مسجود بنا لینا حقیقت سے بے خبری کی دلیل نہیں تو اور کیا ہے؟

کیا ملائکہ دکھائی دے سکتے ہیں؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ملائکہ ہمیں دکھائی دے سکتے ہیں؟ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ قرآن نے اس کی تصریح کر دی ہے کہ ہم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔ سورۂ توبہ میں ہے:-

وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا (۹)

اور خدا نے ایسی فوجوں سے امداد کی جنہیں تم نے نہیں دیکھا۔

دوسری جگہ ہے:-

وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا (۹)

اور خدا نے ایسی فوجیں اتار دیں جنہیں تم نے نہیں دیکھا۔

چونکہ ملائکہ نام ہی ان غیر مرئی قوتوں کا ہے جو نظامِ کائنات میں مختلف فرائض سر انجام دیتی ہیں اس لئے طبعی آنکھوں (physical Eyes) سے ان کے دیکھ سکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم ان قوتوں کے اثرات کا علم حاصل کر سکتے ہیں (اور وہ بھی اس حد تک جہاں تک ہماری عقل ہماری راہ نمائی کر سکتی ہے) انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتے۔

باقی رہا ملائکہ کا انبیاء کرام پر نازل ہونا۔ تو اس کا تعلق وحی سے ہے جس کی تفصیل ذرا آگے چل کر آتی ہے۔ یہاں اتنا بتا دینا کافی ہے کہ وحی کی ماہیت نبی کے علاوہ اور کوئی نہیں جان سکتا کیونکہ وحی کوئی ایسا ملکہ

نہیں جسے ہر انسان اکتسابی طور پر اپنے اندر پیدا کرے۔ لہذا ہم نہیں جان سکتے کہ وحی کے سلسلہ میں ملائکہ کی مخفی قوتوں کی کیفیت کیا ہوتی تھی۔ (" ہوتی تھی " اس لئے کہ نبی اکرمؐ کے بعد وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا۔)

روح

قرآن کریم میں ملائکہ کے ضمن میں روح کا بھی ذکر آتا ہے۔ لیلۃ القدر کے متعلق کہا ہے۔

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ (۹۷/۴)

اس رات میں فرشتے اور روح اپنے پروردگار کے قانون کے مطابق امر خیر کو لے کر (زمین کی طرف) اترتے ہیں۔

عربی زبان میں روح کے معنی قوت کے ہیں اسی کو دوسری جگہ روح القدس کہا گیا ہے یعنی بڑی وسعتوں والی قوت۔

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ۝ (۱۶/۱۰۲)

(اے پیغمبر!) تم کہدو " یہ میرے جی کی بناوٹ نہیں ہے، اور نہ ہو سکتی ہے) یہ تو فی الحقیقت تمہارے پروردگار کی طرف سے روح القدس نے اتاری ہے۔ اور اس لئے اتاری ہے کہ وہ (اس سے ایمان والوں کے دل جمادے۔ فرمانبردار بندوں کے لئے رہنمائی ہو، اور کامرانی وسعادت کی خوشخبری!

روح القدس کا لقب روح الامین بھی ہے

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ (۲۶/۱۹۳)

روح الامین اسے لے کر نازل ہوا۔

یعنی ایسی قوت جو امین ہے یعنی امانت کی بہترین حامل۔ اور امن عالم کی علمبردار۔

جبریل اور روح

اس کا نام جبریل ہے۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (۲/۹۷)

(اے پیغمبر!) جو لوگ جبریل کے دشمن ہیں اُن سے کہدو کہ (یہ اللہ کا کلام ہے جو) اُس نے خدا کے حکم سے تمہارے قلب پر اتارا ہے۔ اور جو کچھ اس سے پہلے نازل ہو چکا ہے اس میں اس کی تصدیق موجود ہے۔ اس میں انسان کے لئے ہدایت ہے اور ان لوگوں کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں (فلاح وکامیابی کی) بشارت!

دوسری جگہ جبریل کے ساتھ میکائیل کا بھی نام لیا گیا ہے۔ یہ نام عبرانی زبان کے ہیں۔

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ۝ (۲/۹۸)

(پھر اگر یہ لوگ اللہ کے سلسلۂ وحی و نبوت کے مخالف ہیں اور شدتِ جہل و تعصب سے کہتے ہیں کہ ہم جبریل کا اتارا ہوا کلام نہیں مانیں گے، اس سے ہماری دشمنی ہے، تو تم کہدو، جو کوئی اللہ کا، اس کے ملائکہ کا، اس کے رسولوں کا اور جبریل و میکال کا دشمن ہے، تو یقیناً اللہ بھی منکرینِ حق کا دوست نہیں ہے۔

روح اور ملائکہ

سورۂ معارج میں ہے:

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۝ (۷۰/۴)

ملائکہ اور الروح اللہ تعالیٰ کی طرف لمبے مرحلے میں جس کی مقدار (دنیا کے) پچاس ہزار سال (کے برابر) ہے عروج کرکے جاتے ہیں۔

سورۂ نبا میں ہے:

يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ۝ (۷۸/۳۸)

جس روز روح اور ملائکہ صف بستہ کھڑے ہوں گے (اس روز) کوئی نہ بول سکے گا بجز اس کے جسے خدائے رحمٰن (بولنے کی) اجازت دیدے، اور وہ شخص بات بھی ٹھیک کہے۔

یہی روح القدس تھے جن کی تائید حضرت عیسیٰ کو حاصل تھی۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۝ (۲/۸۷)

اور (پھر دیکھو!) ہم نے (تمہاری رہنمائی کے لئے) موسیٰ کو کتاب دی، پھر موسیٰ کے بعد سلسلۂ ہدایت پے درپے رسولوں کو بھیج کر جاری رکھا، بالآخر مریم کے بیٹے عیسیٰ کو سچائی کی روشن نشانیاں دیں۔ اور روح القدس کی تائید سے ممتاز کیا۔

روح سے مراد وحی خداوندی

قرآن کریم میں روح سے مراد وحی خداوندی بھی ہے سورۂ نحل میں ہے:

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ۝ (۱۶/۲)

اور وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس غرض سے چن لیتا ہے کہ اپنے حکم سے فرشتے الروح کے ساتھ

اس پر بھیجے (یعنی وحی کے ساتھ بھیجے) اور اسے حکم دے کہ لوگوں کو اس حقیقت سے خبردار کر دو" میرے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے پس مجھ سے ڈرو" (اور انکار و بدعملی سے باز آجاؤ)

دوسری جگہ ہے

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۙ (۴۲/۵۲)

اور (اے پیغمبر اسلام!) اسی طرح ہم نے تمہارے پاس بھی الرّوح (وحی) یعنی اپنا حکم بھیجا ہے۔ (ورنہ) تمہیں (اس سے پہلے) یہ خبر نہ تھی کہ کتاب (اللہ) کیا چیز ہے۔ اور نہ یہ خبر تھی کہ ایمان (کی حقیقت و ماہیت) کیا ہے لیکن ہم نے اس قرآن کو ایک نور (ہدایت) بنا کر تمہیں دیدیا ہے جس کے ذریعہ ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں (اپنے قانون کے مطابق) ہدایت کر دیتے ہیں۔ اور بلاشبہ تم (بھی اسی نور کی بدولت لوگوں کو) سیدھے راستہ (نیکی اور صداقت کی راہ) کی طرف ہدایت کر رہے ہو!

سورۂ مومن میں ہے:۔

رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ ۚ يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ۙ (۴۰/۱۵)

وہ رفیع الدرجات ہے۔ عرش کا مالک ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے الرّوح (یعنی وحی) اپنے حکم سے بھیج دیتا ہے۔ تاکہ (وہ صاحب وحی، لوگوں کو) اجتماع (قیامت) کے دن سے ڈرائے۔

ان مقامات میں رُوح کے معنیٰ وحیِ خداوندی ہیں جو حضرات انبیائے کرام پر نازل ہوتی ہے۔ لیکن ان تمام آیات میں روح کے ساتھ مِنْ اَمْرِہٖ (یا مِنْ اَمْرِنَا) کا اضافہ ہے۔ ان آیات کی روشنی میں سورہ بنی اسرائیل کی اس مشہور آیت جلیلہ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں جہاں فرمایا کہ

وَيَسْـَٔـلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (۱۷/۸۵)

اور (اے پیغمبر!) یہ لوگ تجھ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں تو کہدے "روح میرے پروردگار کے امر سے ہے" اور تمہیں (اسرار کائنات کا) علم جو کچھ دیا گیا ہے، وہ بہت تھوڑا ہے" (اس سے زیادہ تم نہیں پا سکتے!)

یعنی یہاں رُوح سے مراد وحیِ خداوندی ہے۔ اس کی تفصیل اس سے اگلی آیت میں ہو جاتی ہے، جہاں فرمایا۔

وَلَىِٕنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا

وَكِيلًا ۝ (۱۷/۸۶)

اور (اے پیغمبر!) جو کچھ ہم نے تجھ پر وحی کی ہے۔ اگر ہم چاہیں تو اسے بھی سلب کرلیں۔ پھر تجھے کوئی نہ ملے جو اس کے لئے ہم پر اپنی وکالت چلائے۔

"رُوحٌ مِّنْ أَمْرِ رَبِّي" وہی ہے جو "أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ" ہے یعنی وہ وحی جو رسول اللہ کی طرف نازل ہوئی تھی۔ سورۂ مجادلہ میں "روح منہ" کے الفاظ آئے ہیں جہاں مومنین (جماعت حزب اللہ) کے متعلق آیا ہے کہ

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ .... كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُمْ بِرُوحٍ مِّنْهُ .... أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ (۵۸/۲۲)

(اے پیغمبر اسلام!) جو لوگ اللہ پر اور قیامت کے دن پر (پورا پورا) ایمان رکھتے ہیں تو اُن کو (ہرگز) نہ دیکھے گا کہ وہ ایسے شخصوں سے دوستی رکھتے ہوں جو اللہ اور اس کے رسول کے برخلاف ہیں گو وہ اُن کے باپ، یا بیٹے یا بھائی یا کنبہ ہی کیوں نہ ہو۔ ان لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے ایمان ثبت کر دیا ہے۔ اور اپنی طرف سے ایک رُوح سے اُن کی تائید کی ہے۔ خدا اُن کو ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ اُن سے راضی ہوگا اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہوں گے۔ یہ لوگ ہیں اللہ کا گروہ۔ یاد رکھو اللہ کا گروہ ہی فلاح پانے والا ہے۔

یہ تائید یا تو ملائکہ کی ہے (جس کی بابت ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) اور یا قرآن کی تائید جس کے بغیر نہ قلوب کو اطمینان نصیب ہو سکتا ہے نہ مقصدِ پیشِ نظر میں کامیابی۔

ایک اہم نکتہ آگے بڑھنے سے پیشتر اس آیت مقدسہ پر نگہ بازگشت ڈالئے جس میں ارشاد ہے کہ:

تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ ۝ (۷۰/۴)

فرشتے اور الرُّوح اللہ کی طرف ایسے دن میں عروج کر کے جاتے ہیں جس کی مقدار (دنیا کے پچاس ہزار سال کے برابر) ہوتی ہے۔

اور اس کے ساتھ اس آیت جلیلہ کو ملائیے جس میں قانونِ ارتقاء کے اس اصل الاصول کو بیان فرمایا گیا ہے جو رموزِ اسرارِ کائنات کے مہمات امور میں سے ہے۔ فرمایا۔

يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ

اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ○ (۳۲/۵)

(اور دیکھو) وہ (رب) امر کی تدبیر آسمان سے زمین کی طرف کرتا ہے۔ پھر (ہر) امر اسی کے حضور میں پہنچ جاتا ہے

ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہارے شمار کے مطابق ایک ہزار برس ہوتی ہے۔

ان دونوں آیات کا مفہوم "انسان" کے عنوان میں آپ کے سامنے آچکا ہے جہاں بتایا گیا تھا کہ قانونِ ارتقا کی رو سے کس طرح ایک ننھا سا بیج، جو ممکنات کی ہزاروں حدود فراموش وسعتیں اپنے اندر لئے ہوتا ہے، آہستہ آہستہ بتدریج بالیدگی حاصل کر کے اپنے نقطۂ تکمیل تک پہنچتا ہے۔ یہ ربوبیت (یعنی کسی شے کا اپنے نقطۂ آغاز سے مقامِ تکمیل تک پہنچنا) ان قوتوں کی رو سے ہوتا ہے جو کائنات میں قانونِ خداوندی کے نتیجہ خیز ہونے کے لئے کارفرما ہیں اور جنہیں ملائکہ کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ایک حقیقت کی وضاحت

قبل اس کے کہ اس باب کو ختم کر کے ہم دوسرے عنوان تک پہنچیں۔ ایک حقیقت کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ قصۂ آدم اگرچہ (جیسا کہ لکھا جا چکا ہے) خود انسان کا ایک تمثیلی بیان ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جن چیزوں کا اس میں ذکر ہے وہ محض تشبیہات و استعارات ہیں اور خارج میں اپنا وجود نہیں رکھتیں۔ اس میں انسانی ذات کا تذکرہ ہے تو انسان خود ہمارے سامنے

ملائکہ وغیرہ غیر مرئی ہستیوں کا وجود

موجود ہے لیکن چونکہ اس کا وجود مرئی صورت میں ہے۔ اس لئے اس کے متعلق کبھی خیال بھی نہیں گزرتا کہ یہ محض ایک استعارہ ہے۔ انسان کے علاوہ ابلیس اور ملائکہ کا بھی ذکر ہے، تو کیا ان کی ہستی سے محض اس لئے انکار کر دیا جائے کہ یہ مرئی نہیں ہیں؟ اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم تمام غیر مرئی مجرد قوتوں (Abstracts powers) کے وجود کا انکار کر دیں، حالانکہ ہم ایسا نہیں کرتے؟ خود دنیائے سائنس میں دیکھئے کہ کس قدر غیر مرئی و غیر محسوس موجودات ہیں جن کی ہستی کا ہمیں اقرار ہے اور پھر ان کی قوتوں کا اندازہ لگائیے تو انسانی تصور چکر میں آجاتا ہے۔ ذرا اس ایتھر کو دیکھئے اور اس کی عالمگیر قوتوں کا اندازہ فرمائیے۔ ایک شخص (مثلاً) لندن کے کسی کمرے کے ایک گوشہ میں زبان کو حرکت دیتا ہے اور ایتھر کی امواج ان الفاظ کو بیک وقت تمام کرۂ ارض کے آخری کناروں تک پہنچا دیتی ہیں۔ اتنا ہی نہیں۔ بلکہ ایتھر کی امواج کے راستہ میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی۔ یہ موٹی موٹی سنگین دیواروں میں سے بھی اسی طرح گزر جاتا ہے جس طرح روشنی کی کرنیں شیشے میں سے۔ یہ ہیں سائنس کی رو سے ایتھر کی کرشمہ سازیاں! لیکن خود ایتھر کیا ہے؟ سائنس "سرگرداں ہے کہ اسے کیا کہیئے"! اس وقت تک کی تحقیقات کے مطابق یہ اتنی بڑی قوت جس نے زمان و مکان کی حدود کو گویا ناپید کر دیا ہے۔ بیش از یں نیست، کہ فقط ایک نام ہے جس کی ماہیت کا کچھ علم نہیں۔ لیکن چونکہ سائنس

اس کا کچھ نام رکھدیا ہے، اس لئے سب مانتے ہیں۔ فرض کیجئے اگر آج سے پچاس سال پیشتر کوئی شخص کہتا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر ایک ایسا "فرشتہ" مقرر کر رکھا ہے کہ آپ کہیں زبان سے ایک لفظ نکالئے وہ اسے اپنے پروں پر اٹھا کر آنکھ جھپکنے سے پیشتر دنیا کے اطراف واکناف میں گوشہ گوشہ تک پہنچا دیتا ہے! تو، اور تو اور، خود ارباب سائنس ہنس دیتے اور آپ اسے دورِ "جاہلیت" کی توہم پرستی کہہ کر اپنی روشن خیالی کا ثبوت دیتے۔

سوال یہ ہے کہ کیا علوم سائنس آج یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ وہ اس وسیع و عریض کائنات کے تمام اسرارِ غوامض اور مستور و مجرد قوتوں کی ماہیت دریافت کر چکے ہیں؟ سنیئے کہ ماہیتِ اشیاء کے متعلق دنیائے علوم کی کیا کیفیت ہے!

افلاطون نے کیا کہا؟

آج سے اڑھائی ہزار سال پیشتر جب افلاطون سے یہ سوال کیا گیا تو اُس نے کیا جواب دیا؟ کہا:۔

"اب میں ایک تمثیل کے رنگ میں بتاتا ہوں کہ ہماری عقل کہاں تک روشنی حاصل کر چکی ہے۔ اور کہاں تک ہنوز اندھیرے میں ہے۔ ذرا تصور میں لائیے کہ نوعِ انسانی ایک زیرِ زمین غار میں سکونت پذیر ہے۔ اس غار کا مُنہ روشنی کی طرف کھلتا ہے اور اندر سب اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ نوعِ انسانی اپنے عہدِ طفولیت سے اس غار کے مُنہ پر اس طرح زنجیروں میں جکڑے بیٹھی ہے، کہ ان میں سے کوئی پیچھے کی طرف مُڑ کر نہیں دیکھ سکتا۔ اُن کے پیچھے آگ کے بڑے بڑے درخشاں شعلے نور افشاں ہیں۔ جس سے غار کے آخری بند حصے پر روشنی پڑتی ہے۔ ان شعلوں اور آدمیوں کے درمیان (جو غار کے منہ پر بیٹھے ہیں اور پیچھے کی طرف مُڑ کر نہیں دیکھ سکتے) بہت سے لوگ گزر رہے ہیں جن کے پاس قسم قسم کے ظروف۔ مختلف سامان۔ طرح طرح کے مجسّمے۔ اور دنیا بھر کی چیزیں ہیں۔ یہ لوگ ایک طرف سے دوسری طرف گزر رہے ہیں اور ان کا اور ان تمام چیزوں کا سایہ جو انہوں نے اُٹھا رکھی ہیں غار کے اندر سامنے کی دیوار پر پڑتا ہے۔ غار کے مُنہ پر بیٹھے ہوئے انسان ان تمام اشیاء کا سایہ سامنے کی دیوار پر دیکھ سکتے ہیں۔ پیچھے مُڑ کر ان اشیاء کی حقیقت کو نہیں دیکھ سکتے۔ ان کے نزدیک حقیقت فقط اس سائے کا نام ہے جو، ان کے سامنے دیوار پر ادھر سے ادھر گزرتا دکھائی دے رہا ہے"۔

(جمہوریت کتاب ہفتم)

یہ تھی حقیقتِ اشیاء کے متعلق آج سے اڑھائی ہزار سال پیشتر انسان کی حالت۔ لیکن اس اڑھائی ہزار سال کی مدت کے

اور آج کیا کہا جا رہا ہے؟

بعد انسان کہاں تک پہنچا ہے۔ یہ بھی ہم سے نہیں دورِ حاضرہ کے ایک ممتاز سائنسدان سر جیمس جینز (Sir James Jeans) کی زبان سے سنیئے۔ وہ کہتا ہے:۔

"اس امر کا ہر شخص کو اعتراف ہے کہ ہم ہنوز حقیقتِ مطلقہ تک پہنچ نہیں سکے۔ افلاطون کی مشہور تمثیل کے الفاظ میں ہم ابھی تک اپنے غار کے منہ پر زنجیروں میں جکڑے بیٹھے ہیں۔ روشنی کی طرف پیٹھ اور اندھیرے کی طرف رُخ۔ اور جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے وہ محض دیوار پر چلنے والے سائے ہیں!

(The Mysterious Universe, p 127)

اور دنیائے سائنس کا یہ بطلِ جلیل اپنی اس مختصر لیکن بلند تصنیف کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتا ہے۔

"جو کچھ کہا گیا ہے اور جن جن نتائج پر ہم پہنچ سکے ہیں۔ سچ پوچھئے تو وہ سب محض ظن و قیاس اور غیر یقینی ہے ہم نے اس مسئلہ پر گفتگو کرنے کی کوشش کی ہے کہ آیا دورِ حاضرہ کی سائنس ان اہمات مسائل کے متعلق جو شاید سرحدِ ادراک انسانی کے باہر ہیں۔ حتمی طور پر کچھ کہہ سکتی ہے۔ ہم اس سے زیادہ کچھ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ہم زیادہ سے زیادہ روشنی کی ایک دھندلی سی جھلک دیکھ پائے ہیں۔ اور شاید یہ بھی ہمارا فریبِ نگاہ ہی تھا۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں کچھ دیکھنے کے لئے اپنی آنکھوں پر بڑا ہی زور دینا پڑا۔ لہٰذا ہم مشکل کہہ سکتے ہیں کہ دورِ حاضرہ کی سائنس (حقیقت کے متعلق) کوئی دعویٰ پیش کر سکتی ہے۔ شاید یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ سائنس کو یہ دعویٰ کرنا ترک کر دینا چاہیئے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ دریائے علم نے خود اپنے بہاؤ کے خلاف پلٹا لیا ہے۔" (صفحہ ۱۴۹)

اشیاء کی حقیقت و ماہیت کے بارے میں یہ ہے وہ مقام جہاں تک دنیا اس وقت تک پہنچی ہے تو کیا اس دنیا کو یہ حق پہنچتا ہے کہ کسی شے کے وجود سے محض اس لئے انکار کر دے کہ وہ ہنوز اس کے حیطۂ ادراک میں نہیں آسکی! (مزید تصریحات وحی کے عنوان میں دیکھئے!)

اب افراط کی طرف آیئے

یہ تو تھی تفریط۔ لیکن دوسری طرف افراط بھی اس سے کچھ کم نہیں! ملائکہ۔ ابلیس۔ جنات (آتشیں مخلوق) یا اسی قبیل کی دیگر غیر مرئی چیزوں کے متعلق اقرار کرنے والے بھی اس قسم کا استدلال چاہتے ہیں جو اُن کے اپنے ذہن میں ہوتا ہے۔ انسان کے لئے مشکل یہ ہے کہ چونکہ اس کا ذہن غیر محسوس اشیاء مجردہ کا تصور نہیں کر سکتا۔ اس لئے وہ انہیں محسوسات کے پیکر میں ڈھال لیتا ہے۔ ملائکہ وغیرہ تو ایک طرف، اس کا ذہن تو اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مطلق کا تصور بھی انسانی پیکر ہی میں کرتا ہے۔ یہ صنم تراشی اور بُت پرستی اسی ذہنیت کے مظاہر ہیں۔ افراط پسند لوگوں کی یہ کیفیت ہے کہ وہ ان غیر مرئی اشیاء کا اقرار اُس وقت درست سمجھتے ہیں جب انہیں ان ہی تفاصیل و جزئیات کے ساتھ مانا جائے جو اُن کے ذہن میں منقوش ہوں۔ اور اگر کوئی اس سے اختلاف کرے تو اسے راندۂ درگاہ قرار دیدیتے ہیں۔ اور خدا کی قدرت کا منکر سمجھتے اور جھٹ سے تکفیر پر اتر آتے ہیں لیکن وہ نہیں سمجھتے کہ ان اشیاء کی ماہیت کے متعلق اختلافِ تصور (بشرطیکہ وہ قرآنی حدود و دوائر سے باہر نہ ہو) خدا کی قدرت کے انکار کا مرادف نہیں ہو سکتا۔ فرض کیجئے ایک شخص شیطانی وساوس کو نفسِ انسانی کی ترغیبات و تحریکات۔ جذبات و تاثرات۔ میلانِ

دعواطف سمجھتا ہے، جو انسان کو خدا کے متعین فرمودہ صراطِ مستقیم سے بہکاتے ہیں تو اس سے اللہ تعالیٰ کی قدرت پر کوئی حرف نہیں آجاتا بشرطیکہ وہ نفسِ انسانی کو تخلیقِ خداوندی سمجھتا ہو۔ اگر ابلیسی اور ملکوتی قوتیں خارج میں اپنا وجود رکھتی ہیں تو۔ اور اگر یہ نفسِ انسانی کے داخلی خواص ہیں تو، دونوں صورتوں میں یہ خالقِ انفس و آفاق کی لامحدود قدرت کی کرشمہ سازیاں ہیں!

لیکن ان امور میں مفروضات کا دخل ہی کیوں ہو۔ ان چیزوں کے متعلق جس حد تک قرآن کریم لے جائے وہیں تک جانا درست ہے۔ قرآن کریم ان چیزوں کا اقرار چاہتا ہے۔ اس کا مطالبہ ان کے عرفان (اور اک ماہیت) سے نہیں ان اشیاء کے بیان کرنے سے اس کا مقصود صرف یہ ہے کہ ان کا انسانی زندگی کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ اس تعلق کا نفسِ انسانی پر کیا اثر پڑتا ہے اور ان اثرات کے رد و قبول کے لئے قرآن کریم نے جو کچھ تجویز کیا ہے اس پر عمل درآمد کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر ابلیس کی ماہیت دریافت کرتے کرتے انسان خود ابلیس کے تسلط میں آجائے تو یہ علم اسے جہنم میں لے جائے گا۔ لہٰذا ہمیں ان امور میں قرآن کی حدود کے اندر رہنا ہوگا کیونکہ وہ سرتا سر علم پر مبنی ہے۔

ملائکہ یا ابلیس کا جہاں تک ہماری زندگی سے تعلق ہے، قرآن کریم نے قصۂ آدم میں اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے۔ ملائکہ (جیسا کہ اوپر دیکھا جا چکا ہے) وہ قوتیں ہیں جن کی بدولت نظامِ عالم کے مختلف پرزے (قانونِ خداوندی کے مطابق) اپنے اپنے فرائض کی تکمیل میں سرگرمِ عمل ہیں۔ نظامِ عالم کی یہ قوتیں انسان کے لئے مسخر کر دی گئی ہیں۔ یہ قوتیں عالمِ آفاق سے بھی متعلق ہیں اور عالمِ انفس سے بھی۔ لیکن چونکہ سب کی سب احکامِ خداوندی کے مطابق کارفرما ہیں اس لئے ان میں شر کا کوئی حصہ نہیں۔ یہ خیر ہی خیر ہیں۔ اس کارگہِ عالم میں انسان ان تمام قوتوں کا حاکم بنا کر بھیجا گیا ہے۔ لیکن احکامِ الٰہیہ کا محکوم۔ لہٰذا اس کا فریضۂ زندگی یہ ٹھہرا کہ عالمِ انفس و آفاق کی ان تمام قوتوں کو مسخر کرے۔ پستیوں اور بلندیوں کی اس خارجی دنیا اور نفسِ انسانی کی داخلی کائنات، دونوں کی تمام امکانی قوتوں کو اپنا تابع فرمان بنائے۔ لیکن ان قوتوں سے اپنی مرضی کے مطابق کام نہ لے۔ بلکہ اپنی مرضی کو احکامِ خداوندی کے تابع رکھے اور اس طرح ان تمام محیر العقول قوتوں سے ایسا نظام قائم کرے جس میں شرفِ انسانیت کی بالیدگی و برومندی کے پورے پورے سامان موجود ہوں، اور انسان ایک اللہ کے سوا کسی کا محکوم نہ رہے۔ یہ ہیں ملکوتی قوتیں۔ باقی رہا ابلیس۔ سو وہ متصادم قوت ہے جس کا کام اس نظام کے قیام و بقا میں مزاحمت پیدا کرنا ہے۔ انسان کا کام یہ ہے کہ انفس و آفاق کی ملکوتی قوتوں کی مدد سے اس متصادم قوت کو شکست دے۔ ملکوتی اور ابلیسی قوتوں کے تزاحم و تصادم سے شمشیرِ خودی کو تیز کرتے ہوئے آگے بڑھتے جانا۔ یہ ہے منصبِ انسانیت۔ یہ تمام ہنگامۂ کائنات اسی کشمکش کے لئے سرگرمِ عمل ہے۔

خلاصۂ مبحث یہ تمام سلسلۂ کائنات اللہ تعالیٰ کے اس قانونِ مشیت کے ماتحت سرگرمِ عمل ہے جس کا تعلق عالمِ امر سے ہے۔ جن قوتوں سے عالمِ امر کے احکام اور فیصلے نفوذ پذیر ہوتے ہیں، انہیں ملائکہ کہا جاتا ہے۔ چونکہ اس نظامِ کائنات کے صحیح صحیح طریق پر چلنے کے لئے ضروری ہے کہ اس سے متعلقہ احکام و ضوابط

کی تعمیل ہیں نہ کسی قسم کا نقص ہو نہ کسی کے ذاتی ارادے اور اختیار کو کوئی دخل۔ اس لئے ملائکہ کا منصب بلاچون وچرا احکام الٰہیہ کی اطاعت ہے۔ معصیت پر انہیں قدرت ہی نہیں۔ ملائکہ کا ایک اہم فریضہ وحی الٰہی کا رسولوں تک پہنچانا ہے۔ رسول پھر اس وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچاتے ہیں اور اس پر عمل کر کے دکھاتے ہیں، کہ اس دنیا میں "آسمان کی بادشاہت" کس طرح قائم ہوتی ہے۔ اس جماعت مومنین (حزب اللہ) کے ساتھ جس کے ہاتھوں خدا کی حکومت کا قیام عمل میں آتا ہوتا ہے۔ ملائکہ کی تائید شامل ہوتی ہے۔ وہ ان کے قلوب پر تسکین و طمانیت کی نورانی بارشیں برساتے ہیں جس سے ان کے قدموں میں استقامت اور ان کے عزائم میں استقلال پیدا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس وہ حق و صداقت کی دشمن جماعتوں کے لئے عذاب خداوندی کے حامل بھی ہوتے ہیں۔ یہی موت کے پیغامبر بھی ہوتے ہیں۔ اور انسانی اعمال کے ریکارڈ کیپر (سجّل) بھی۔ قیامت میں ان کا منصب اہل جنت کے لئے حیات طیبہ کی بشارتیں، اور اہل دوزخ کے لئے خدا کے رسوا کن عذاب کا تسلط ہے۔ یہ ہیں وہ ملائکہ جن پر از روئے قرآن کریم ایمان لانا ضروری ہے۔ عہد جہالت میں فرشتوں کے متعلق بھی ذہن انسانی نے طرح طرح کے باطل تصورات تراش رکھے تھے۔ قرآن کریم نے تمام اوہام پرستیوں اور غلط اندیشیوں کو ایک ایک کرکے الگ کر دیا اور ملائکہ کے متعلق صحیح صحیح تصور پیش کر دیا۔ لیکن قرآن کریم نے ملائکہ (اور اسی قسم کے دیگر غیر محسوس و غیر مرئی چیزوں) کے متعلق صرف اقرار کا مطالبہ کیا ہے۔ ان کی کنہ و حقیقت دریافت کرنے کا تقاضا نہیں کیا۔ ہمیں صرف یہ دیکھنا ہوگا کہ ان چیزوں کا ہماری زندگی سے کیا تعلق ہے۔ ملائکہ وہ قوتیں ہیں جو عالم انفس و آفاق میں بطور مؤثرات کارفرما ہیں۔ لیکن یہ سب قوتیں انسان کے لئے مسخر کر دی گئی ہیں (سجدۂ آدم سے یہی مفہوم ہے) لہٰذا انسان کا یہ فریضہ ہے کہ ان تمام قوتوں کو مسخر کر کے قانون خداوندی کے مطابق (جو اسے قرآن کے اوراق میں ملے گا) ان سے کام لے۔ باقی رہا ملائکہ کا معاملہ حضرات انبیاء کرام کے ساتھ۔ سو چونکہ نبوت کی دنیا ہم سے بالکل الگ ہے۔ اس لئے ہم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ اس معاملہ کی چگونگی کیا ہے۔

روح کے لفظ کو قرآن کریم نے جبریل امین کے لئے بھی استعمال کیا ہے اور وحی کے لئے بھی۔ ملائکہ اور روح کائنات کے سلسلۂ ارتقاء کے اہم وسائط و ذرائع ہیں جو عالم انفس و آفاق دونوں میں کارفرما ہیں۔ ان کی یہ کارفرمائی کس انداز کی ہے؟ اس حقیقت کا ہمیں علم نہیں ہو سکتا!

فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲/۳۸)

(رہبر منزل حیات)

اگرچہ عقلِ فسوں پیشہ لشکرے انگیخت

تو دِل گرفتہ نباشی کہ عشق تنہا نیست

وحیؐ (۶)

انسان، وادیٔ آدمیت میں اُترنے کو تو اُترا، لیکن ابلیس کی بے پناہ قوتوں کو دیکھ کر سہم گیا۔ جو قدم قدم پر تصادم و تزاحم کے لئے آمادۂ پیکار تھیں۔ ایسی مہیب اور خوفناک وادی اور یہ بالکل تنہا! کشمکشِ زندگی ایسی جانکاہ اور بے سروسامان!! آنے والے خطرات کے تصور سے اس کا جی بیٹھ گیا۔ خوف اور دہشت سے قدم لڑکھڑانے لگے۔ اس ہولناک منظر میں اس نے چاروں طرف دیکھا لیکن کوئی معین و مددگار نظر نہ آیا۔ حسرت بھری نگاہیں اوپر کو اٹھیں اور ہمہ تن التجا بن کر کسی بلند و بالا چوکھٹ سے جا ٹکرائیں۔ پکارنے والے نے یوں پکارا۔ اور جواب دینے والے نے اپنے ترحم ربوبیت سے اس طرح نوازا کہ سکون و طمانیت کی ہزار جنتیں اس کے قلبِ مضطرب میں آباد کر دیں۔ فرمایا کہ:-

لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ (۳/۱۳۸)

دیکھو، نہ تو ہمت ہارو، نہ غمگین ہو، تم ہی سب سے برتر و اعلیٰ ہو۔

کیوں گھبراتے ہو۔ کیوں خوف کھاتے ہو؟ تم تو دنیا میں سب سے بڑے ہو۔ لیکن اس بلندی تک پہنچنے کا طریقہ یہ ہے کہ

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲/۳۸)

جب ہماری جانب سے تمہاری طرف ہدایت آئے تو جو ہدایت کی پیروی کرے گا اس کے لئے کسی طرح کا کھٹکا اور کسی طرح کی غمگینی نہیں ہوگی۔

اے آدم کے بیٹے! یہ مت خیال کر کہ اس ظلمتکدہ میں تجھے تنہا چھوڑ دیا گیا ہے، نورِ ازلی کی شمع فروزاں تیرے ساتھ ہے۔ پھر گھبرانا کیسا؟

اگرچہ عقل فسوں پیشہ لشکرے انگیخت
تو دل گرفتہ نباشی، کہ عشق تنہا نیست

ابلیس کی تمام لرزہ انگیز اور حوصلہ شکن قوتیں ایک طرف، اور ان کے مقابلہ کے لئے، ہدایتِ خداوندی دوسری طرف۔ اس کے بعد انسان کو کسی دوسری چیز کی ضرورت نہ تھی۔

یہ سوال کہ کشمکشِ حیات میں متصادم قوتوں کے مقابلہ کے لئے انسان خود اپنا خضرِ راہ ہوسکتا ہے۔ یا اس کی راہنمائی کے لئے کسی خارجی روشنی کی بھی ضرورت ہے؟ بڑا اہم اور بنیادی ہے، اور شروع سے آج تک اربابِ فکر و نظر کی توجہات کا مرکز بنا چلا آرہا ہے۔ اس مقام تک پہنچنے سے پیشتر چند ایک ابتدائی مراحل کی وضاحت نہایت ضروری ہے۔ اصل بحث شروع ہونے سے پہلے یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ مذہب کا سارا دارومدار وحی کے عقیدے پر ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ خدا کا ماننا ایک حقیقت کا اعتراف ہے۔ لیکن جس مقصدِ عظیم کے لئے خدا پر ایمان ضروری ہے وہ وحی کے ذریعے ہی پورا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ہدایتِ خداوندی، وحی کے توسط ہی سے ملتی ہے اور یہی وہ ہدایت ہے جس سے انسان قوانینِ الٰہیہ کے تابع زندگی بسر کرکے شرفِ انسانیت کی تکمیل کرسکتا ہے۔ لہذا جس شخص کا صحیح معنوں میں، خدا پر ایمان ہے۔ اس کے لئے وحی کا ماننا بھی ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا اور خدا کا تعلق ہی وحی کے ذریعے قائم ہے۔ اگر وحی نہ ہو تو ہم جان ہی نہیں سکتے کہ خدا کیا ہے اور اس کا انسانوں کے ساتھ واسطہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سے خدا کی معرفت (پہچاننے) کا مطالبہ نہیں۔ مطالبہ اس کی نازل کردہ وحی کی رو سے اس پر ایمان لانے کا ہے۔ وحی کے معنی ہیں وہ قانون یا ضابطہ جس کے مطابق انسانوں کو زندگی بسر کرنا چاہیئے۔ یہ ضابطہ، یا قانون، عقلِ انسانی کا پیدا یا تجویز کردہ نہیں بلکہ انسانی عقل سے ماوراء، خود خدا کی طرف سے ملا ہے۔

مشکل یہ ہے کہ مغربی تعلیم نے ہماری ذہنیت کو اس درجہ محسوسات کی چار دیواری میں محبوس کر دیا ہے کہ وہ مادہ سے آگے کسی اور دنیا کو بمشکل تسلیم کرتی ہے۔ انیسویں صدی کے اخیر تک کائنات کے متعلق مغرب کے سائنسدانوں کا تصور میکانکی تھا جس میں ماورائے مادہ کسی عقیدے کی گنجائش نہ تھی۔ وہ تصور، یورپ کی فکرگاہوں سے ایک عرصہ ہوا مردود قرار پاکر رخصت ہوچکا۔ لیکن ہمارے ہاں کی ذہنیتیں ابھی تک اسی تصور سے مانوس چلی آرہی ہیں۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ ان کی تسکینِ خاطر کے لئے یورپ کے مفکرین اور اربابِ سائنس کی جدید تحقیقات و نظریات کو سامنے لاکر دیکھا جائے کہ وحی پر ایمان، خلافِ علم و بصیرت تو نہیں؟

سب سے پہلے دیکھنا یہ ہے کہ کیا نوعِ انسانی کے سامنے کوئی سوال (problem) بھی ہے جسے

لہ عقل اور ماورائے عقل مباحث کا تعلق علمِ فلسفہ سے ہے اس لئے موضوعِ زیرِ نظر کا انداز بھی فلسفیانہ ہی ہونا چاہیئے لیکن چونکہ فلسفہ کے فنی غوامض اور اصطلاحی رموز کا سمجھنا۔ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اس لئے کوشش یہ کی گئی ہے کہ فلسفہ کے فنی اسلوب سے ہٹ کر عام فہم انداز میں بات سمجھائی جائے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

ایک بنیادی سوال

اس کو بہ حیثیتِ انسان حل کرنا ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ کسی دوسری نوع کے سامنے ایسا کوئی سوال نہیں۔ سلسلۂ ارتقاء میں انسان سے نچلی کڑی حیوانات کی ہے۔ ان کی زندگی محض طبیعی زندگی (pysical life) ہے جس کی ضروریات و داعیات کی تسکین ان کا مقصودِ حیات ہے اور ان کی دنیا میں یہ سب کچھ میکانکی طور پر ہوتا رہتا ہے۔ جب کھانے پینے کو مل گیا (یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ ہستی پا انتاد؟ خطرات سے حفاظت و صیانت کا اطمینان ہو گیا) تو تمام مسائلِ حیات حل ہو گئے۔ اس کے بعد کوئی ہیجان کا دش نہیں جو اُن کے پیکرِ سکون میں وجۂ اضطراب ہو۔ کوئی نشترِ تجسس نہیں جو ان کی رگِ طمانیت کے لئے باعثِ خلش ہو، کوئی اسرار و بواطن نہیں جن کی پردہ کشائی "کاجنون" انہیں حیران و سرگرداں رکھے۔ کوئی رموز و غوامض نہیں جن کی کنہ و حقیقت سے آگہی کا تقاضا ان پر دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام کر دے۔ لیکن کیا انسان کی بھی یہی کیفیت ہے؟ کیا اس کے دوائرِ حیات بھی محض کھانے پینے اور سو رہنے تک محدود ہیں؟[1] اس کا جواب؟ نظر جھکائیے اور اپنے دل سے پوچھئے۔ اور نگاہ اٹھائیے، تو انسانیت کی تاریخ سے دریافت کیجئے۔ اور پھر دیکھئے کہ عالمِ انفس و آفاق اس کے متعلق کیا کہتے ہیں؟ اس میں شبہ نہیں کہ انسانی زندگی کا ایک حصہ اسی طرح طبعی قوانین کے تابع ہے جس طرح حیوانات کا۔ اس سطح تک انسان کی زندگی حیوان کی سطح کی زندگی ہے۔ لیکن (جیسا کہ انسان کے عنوان میں لکھا جا چکا ہے) انسان کی زندگی، حیواتی سطح پر ہی نہیں۔ اس سے بلند بھی ہے۔ یہ سطح انسانی زندگی کی سطح ہے۔ حیوانی سطح تک تو اس کے سامنے بھی کوئی "سوال" نہیں ہوتا۔ لیکن جونہی یہ حیوانی سطح سے ابھر کر انسانی زندگی میں پہنچتا ہے، اس کی دنیا میں ایک حیرت انگیز انقلاب واقع ہو جاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر اس کی تسکین محض "آم کھانے" سے نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے بعد یہ "پیڑ گننے" کی بھی کوشش کرتا ہے۔ "کیا ہے؟" "کیوں ہے"؟ "کیسے ہے"؟ کے سوال رہ رہ کر اس کے دل میں کھٹک پیدا کرتے ہیں۔ قصۂ آدم پر ایک مرتبہ پھر نگاہ ڈالئے۔ یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی۔ اس کی ابتدائی زندگی، جو ہنوز خلشِ تجسس سے لذت آشنا نہ ہوئی تھی اتنی ہی تھی کہ۔ وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا۔ (۲/۳۵) "اور ہم نے کہا کہ اے آدم! تو اور تیری بیوی اس جنت میں رہو۔ اور اس میں جہاں سے چاہو جی بھر کر کھاؤ پیو" گویا اس عہدِ طفولیت میں زندگی کے تقاضے خورد و نوش سے آگے کچھ نہ تھے۔ یہ آدم کے آب و گل کا زمانہ تھا یہ محض گندھا ہوا خمیر تھا ....

---

[1] قرآن کریم اس نہج زندگی کو کفر (شرفِ انسانیت سے انکار) کی زندگی قرار دیتا ہے۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ (۴۷/۱۲)

کفر کی زندگی بسر کرنے والوں کی یہ کیفیت ہے کہ وہ (حظائظِ دنیوی سے) متمتع ہوتے ہیں اور حیوانات کی طرح کھاتے پیتے (اور سو رہتے) ہیں۔

(فٹ نوٹ ۲ اگلے صفحے پر دیکھئے)

جو ہنوز انسانی پیکر میں متشکل نہیں ہوا تھا۔ یہ اس کی آرزوؤں کا بچپن تھا، نہ دل میں کوئی کانٹا تھا، نہ اس کانٹے کی کھٹک۔ نہ درد تھا، نہ درد کی کسک۔ لیکن "عہدِ شباب" میں پہنچ کر بچپن کے کھلونے کس طرح جی بہلا سکتے تھے؟ اب تقاضوں کی دنیا نرالی تھی۔ آرزوؤں کا عالم جداگانہ تھا۔ اب رہ رہ کر جی چاہتا تھا کہ عروسِ حقیقت بے نقاب سامنے آجائے تاکہ حسن اپنی انتہائی بے باکیوں اور رعنائیوں کے ساتھ جلوہ ریز ہو۔ آپ نوعِ انسانی کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے۔ ہر زمانہ اور ہر ملک میں، انسان کسی لاینحل مسئلہ کی تلاش میں سرگرداں دکھائی دے گا۔ رموزِ فطرت کی عقدہ کشائیوں میں اُس کے ذہن کی تگ و تاز۔ امورِ عالم کے سمجھنے اور سلجھانے میں اس کے فکر کی جد و جہد، ہر شے میں غور و تدبر۔ ہر چیز میں تفکر و تفحص۔ گاہ اپنے ماحول سے جنگ و پیکار۔ گاہ ستاروں کی دنیا سے چشمک و ستیز۔ کبھی اُن سے بھی آگے فضا کی لامحدود پہنائیوں میں کھو جانے کی آرزو۔ کبھی خود اپنے دل کی دنیا میں کسی نامعلوم مدعا کے حصول کی تڑپ۔ غرضیکہ جہانِ فکر و نظر میں اس کا جہدِ مسلسل اور تب و تابِ پیہم، اس خلش و کاوش کا آئینہ دار ہے جو کسی "سوال" کے حل کے لئے اس کے دل و دماغ کی دنیا میں حشر برپا کئے ہوتے ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ سوال کیا ہے؟

وہ سوال کیا ہے؟

تفصیل اس اجمال کی طویل ہے لیکن اصل حقیقت تک راہنمائی کے لئے قصۂ آدم کے ایک اور لطیف گوشے کی طرف نگاہ اٹھائیے۔ آپ نے غور کیا ہے کہ ابلیس نے کیا کہہ کر آدم کو ورغلایا تھا؟ اُس نے اس کے کان میں کیا سحر پھونکا تھا کہ یہ سب کچھ بھول بھلا کر اس کے پیچھے ہو لیا ظاہر ہے کہ وہ کوئی ایسی ہی بات ہوگی جو اس کے دل کی گہرائیوں میں مچل رہی ہوگی جو اُس کی آنکھوں میں انتہائے شوق بن کر آتی اور حسرت بن کر لوٹ جاتی ہوگی! ابلیس نے اس کے اسی وفورِ شوق و اضطراب کو بھانپ کر، اس کے اس کمزور پہلو سے فائدہ اٹھایا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ دیا کہ آدم جس چیز کی تلاش میں ہو تمہیں اس کا سراغ بتاؤں۔

انسان کی آرزو کیا تھی؟ ابلیس نے کیا کہہ کر اسے اپنے پیچھے لگا لیا تھا؟ قرآن کریم نے اسے دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے:-

قَالَ يَآدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ○ (۲۰/۱۲۰)

---

۵۲ اس سے اگلی آیت میں آدمؑ اور اس کی بیوی کو "شجر" کے قریب جانے سے روکا گیا ہے۔ اس "شجر" کے متعلق کچھ تو عنوانِ آدم میں لکھا جاچکا ہے۔ کچھ ذرا آگے چل کر ملے گا۔ ان مقامات سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ جس چیز سے روکا گیا تھا وہ یہ تھی کہ زندگی کو محض طبیعی زندگی سمجھ کر اس پیکرِ آب و گل کے بقائے دوام کی فکر کو منتہی نہ سمجھ لینا۔ زندگی اس سے آگے ہے اور اسی کی بقا در حقیقت بقا ہے نہ ہی اسے محض انفرادی زندگی سمجھ لینا بلکہ زندگی، نوعِ انسانی کی عالمگیر زندگی کا نام ہے۔ (تفصیل ان امور کی ذرا آگے چل کر ملے گی)

(ابلیس نے) کہا: اے آدم! کیا میں تجھے ہمیشگی کے درخت کا پتہ نشان دوں۔ اور ایک ایسی بادشاہت کا جو فنا پذیر نہ ہو۔

غور فرمایا آپ نے کہ قلبِ انسانی کی یہ آرزو کیا تھی؟ بقائے دوام اور حیاتِ جاوداں!! انسان ہمیشہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ حیاتِ جاوید کی خواہش اس کے دل کی گہرائیوں میں ہے۔ یہی ہے وہ سوال جو روزِ اول سے اس کے سامنے ہے۔ یہی ہے وہ معمہ جس کے حل کی تلاش نے اسے یوں نعل بر آتش بنا رکھا ہے۔

ابلیس کے متعلق ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ عقلِ بیباک کا مظہر ہے اس کے دعوئے انکار کا مدار اس منطقی توجیہہ پر تھا کہ أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۔ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَّخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ (۷/۱۲) "میں آدم سے بہتر ہوں مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے۔ اس لئے میں اسے سجدہ کیوں کروں؟ اور اپنے اس منطقی استدلال کو ایسا حرفِ آخر سمجھ لیا کہ جس نے اسے آگ سے اور اُسے مٹی سے پیدا کیا تھا اپنے استدلال کے مقابلہ میں اُس کی حکمت کی بھی کوئی حیثیت نہ سمجھی۔ اسی کا نام عقلِ بے باک ہے۔

انسان کے دل میں حیاتِ جاوید اور بقائے دوام کی خواہش بجا اور درست۔ لیکن اس کے حصول کا جو ذریعہ عقلِ بے باک نے بتایا وہ یکسر غلط اور گمراہ کن تھا اور اس کا نتیجہ ہبوط و تنزل۔ اس نے جو کچھ بتایا تھا قرآن کریم نے ایک لفظ میں اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْآتُهُمَا (۲۰/۱۲۱) یعنی اس سے انسان کا جنسی شعور بیدار ہو گیا[1]۔ ابلیس نے اس کے کان میں یہ سحر پھونکا کہ حیاتِ جاوید افزائشِ نسل کے ذریعے حاصل کی جا سکتی ہے۔ مرنے والا باپ۔ اپنی زندگی کا تسلسل اپنے بیٹے کے آئینۂ حیات میں دیکھتا ہے۔ وہ خوش خوش مرتا ہے کہ میرا اور میرے خاندان کا نام دنیا میں باقی ہے۔ میرا چراغ روشن ہے۔ میرے شجرِ زندگی کی شاخ آگے بڑھ رہی ہے۔ اس سے اسے اطمینان ہو جاتا ہے کہ میں ہمیشہ زندہ رہوں گا۔ وہ اس سے حیاتِ جاوید کی خواہش کی تسکین حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ ابلیس کا فریب ہے یہ عقلِ بے باک کا دھوکا ہے۔ اسے حیاتِ جاوید سمجھ لینا ہبوط و تنزل ہے۔ اگر یہی حیاتِ جاوید ہے تو یہ حیوانات کی ہر اس نوع کو حاصل ہے جس نے ناموافق مادی حالات کا مقابلہ کر کے اپنی نسل کو آگے بڑھانے کی صلاحیت پیدا کر لی (تفصیل انسان کے عنوان میں گزر چکی ہے) گائے، بھینس، بھیڑ، بکری، اونٹ، گھوڑا۔ اس دنیا میں شاید انسان سے بھی پہلے سے موجود ہیں اور ان کی نسل برابر آگے بڑھتی جا رہی ہے۔ اس قسم کی حیاتِ جاوید کا تو مطلب یہ ہے کہ انسان اور حیوان میں کچھ فرق ہی نہیں۔ بلکہ ایک حیثیت سے انسان درجۂ حیوانات سے بھی گر جاتا ہے کیونکہ افزائشِ نسل سے یہ خود اپنے دشمن پیدا کرتا جاتا ہے۔ ایک فرد دوسرے فرد کی جان کا لاگو۔ ایک قوم دوسری قوم کے مٹانے کی فکر میں بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (۲/۳۶)

---

[1] تفصیل ان امور کی قصۂ آدم میں گزر چکی ہے۔

مختلف افراد میں ایسی (wedges) ٹھک جاتی ہیں (مدد کے یہی معنی ہیں) جن سے ایک فرد دوسرے فرد سے الگ ہو جاتا ہے جس سے انسان کی عالمگیر برادری ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔ علاوہ بر[illegible] لیے حیات جاوید کے تصور کا مفہوم یہ ہے کہ انسان حیوانی ارتقاء کے میکانکی عمل ہی کی ایک کڑی ہے اور اس [illegible] فقط طبیعی زندگی (physical life) ہے لہٰذا اس کے سامنے مسئلہ صرف اس قدر ہے کہ طبیعی حوائج و ضروریات کو کس طرح پورا کیا جائے اور اس میں، دیگر افراد و اقوام سے کس طرح مسابقت و منافست حاصل کی جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ چونکہ عالمِ طبیعیات سے متعلق ہے اس لئے اس کا حل بھی علم محسوسات (یعنی دنیائے عقل) کے دائرہ کے اندر ہے۔ لہٰذا انسانی مسئلہ صرف اسی قدر ماننے والے نہ انسانی زندگی کو طبیعی زندگی سے زیادہ کچھ مانتے ہیں۔ اور نہ اس کے لئے عقلِ انسانی کے علاوہ کسی اور روشنی کی راہنمائی کی ضرورت کے قائل ہیں۔ آج کی اصطلاح میں اس روشِ فکر و اسلوبِ حیات کا نام مادہ پرستی سمجھ لیجئے۔ اس کے برعکس خالقِ کائنات نے بتایا کہ یہ تصور غلط ہے۔ انسان کو جو فنا ہو جانے کا خوف اور مٹ جانے کا غم ستا رہا ہے اس کا علاج علم محسوسات (عقل) کے بس کی بات نہیں۔ اس لئے کہ انسان، طبیعیات و محسوسات کے ماوراء کچھ اور بھی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ رازِ حیات سے آگاہ ہو۔ یہ حقیقت کا ادراک کر سکے۔ یہ اس سرِ عظیم کو سمجھے کہ زندگی اپنے طول و عرض دونوں میں ایک غیر منقطع وحدت (Indivisible Unit) ہے طول میں اس طرح کہ زندگی کی جوئے رواں مرنے کے بعد بھی مسلسل جاری رہتی ہے۔ اور عرض میں اس طرح کہ تمام نوعِ انسانی کی تخلیق اور نشوونما ایک فردِ واحد کی طرح ہوتی ہے۔ لیکن ان امور کا سمجھ پا لینا عقلِ انسانی کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے ایک خارجی روشنی کی اسی طرح ضرورت ہے جس طرح آنکھ کے لئے سورج کی روشنی کی۔ ظاہر ہے کہ یہ نہجِ فکر اس اندازِ نگاہ سے بالکل مختلف ہے جو زندگی کو محض حیوانی سطح پر دیکھتی ہے۔ یہ دونوں اسالیبِ فکر دو الگ الگ بنیادیں ہیں جن پر دو مختلف تہذیبوں کی عمارت اٹھتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی نظامِ فکر و تمدن پر غور کرنے سے پیشتر یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس اساس و بنیاد کو دیکھا جائے جس پر وہ نظام قائم ہے جو نظام انسان کی طبیعی زندگی ہی کو منتہیٰ و مقصود سمجھے، اس کے نتائج عالم طبیعیات میں کتنے ہی درخشندہ و تابناک کیوں نہ ہوں۔ اس گروہ کے لئے کبھی وجہ اطمینان نہیں ہو سکتا جو انسان کو اس کے طبیعی پیکر سے کچھ ماوراء بھی سمجھتا ہے۔ اور جس کا مقصود یہ ہے کہ انسان کی طبیعی اور ماوراء طبیعی دونوں زندگیاں سربلند و شاداب ہونی چاہئیں۔

سوال ہمارے سامنے یہ ہے کہ کیا انسان محض پیکرِ آب و گِل ہی کا نام ہے یا اس سے ماوراء کچھ اور بھی ہے! اور کیا رازِ حیات و ادراکِ حقیقت (یعنی انسان کا اپنی اور کائنات کی حقیقت کو سمجھ لینا) تنہا عقلِ انسانی کے لئے ممکن ہے؟ آئندہ صفحات میں اسی اجمال کی تفصیل اور اسی سوال کا حل پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم [آئندہ صفحات میں "رازِ حیات" اور "ادراکِ حقیقت" کی اصطلاحات اسی مفہوم کے لئے استعمال ہوئی ہیں]

علم الاشیاء

انسان کے شرف و مجد کا راز علم میں ہے۔ لہٰذا علم ہی وہ ذریعہ ہو سکتا ہے جس سے اسے حقیقت حاصل ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کونسا علم ہے جس سے یہ امکان واقعہ کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ علم کی دنیا پر نگاہ ڈالیے تو سب سے پہلے ہمارے سامنے محسوسات کا علم آتا ہے۔ یہی وہ علم ہے جسے قصۂ آدم میں "علم الاسماء" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ذرا آگے چل کر معلوم ہوگا "اسماء" کا لفظ ایسا جامع ہے کہ محسوسات و تصورات کی پوری دنیا اس کے اندر سمٹ کر آجاتی ہے۔ محسوسات کی دنیا میں کسی شے کا علم ممکن نہیں جب تک اس کا تصور آپ کے ذہن میں نہ آجائے اور کسی چیز کا تصور ممکن نہیں جب تک اس کا نام نہ رکھ دیا جائے اس لئے علم الاسماء یا علم الاشیاء درحقیقت تصوراتی علم (conceptual knowledge) ہے۔ اس علم سے انسان، کائنات کے محسوس و مرئی پہلو کے متعلق آگہی حاصل کر سکتا ہے۔ لہٰذا اس علم کی دنیا، انسانی حواس (senses) کے دائرہ تک محدود ہے۔ یعنی انسانی حواس (senses) اسے جو معلومات (Data) بہم پہنچاتی ہیں ان سے اسے اشیائے کائنات کا محسوس علم (perceptual knowledge) حاصل ہوتا ہے۔ اور اس کا ذہن اس محسوس علم کے مختلف گوشوں میں باہمی امتزاج سے جو تصورات قائم کرتا ہے انہیں (conceptual knowledge) کہا جاتا ہے۔ انسان کے لئے یہ علم بھی کچھ کم شرف و منزلت کا موجب نہیں۔ دنیائے طبیعیات (physical world) کی تسخیر اسی علم کی بنا پر ہے۔ انسان کو غاروں سے نکال کر آسمان کی وسعتوں میں اڑن بال کشائی اسی علم نے عطا کیا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان کو صرف حواس ہی نہیں دیئے گئے بلکہ ان کے ساتھ قوتِ فکر و تمیز (Intellect) بھی ودیعت کی گئی ہے۔ قوتِ عقل کا فریضہ تنقید ہے۔ یعنی اس کی خبر رساں ایجنسیاں جو معلومات بہم پہنچاتی ہیں عقل ان پر تنقید کر کے استدلال کے ذریعے، اپنے حدود کے اندر، صحیح اور غلط کا موازنہ کرتی ہے۔

عقل انسانی

آنکھ دکھاتی ہے کہ چاند میں آدمی بیٹھا ہے۔ عقل اس "خبر" پر تنقید کرتی ہے اور استدلال کے ذریعے اس نتیجہ پر پہنچتی ہے کہ اس میں آدمی نہیں ہو سکتا۔ یہ فریبِ نگاہ ہے۔ یا، ہم دور سے دھواں اٹھتا دیکھتے ہیں تو عقل فیصلہ کر دیتی ہے کہ نیچے آگ ہے۔ اس طرح عقل انسانی جزئیات سے استنباطِ نتائج کے بعد کلیات۔ یا علت (couse) سے معلول (effect) تک پہنچتی ہے۔ علم اور اس کے ساتھ عقل کی قوتِ تنقید، انسان کی مابہ الامتیاز خصوصیت ہے۔ تجارب و مشاہدات سے اصول متعین کرنا، ان اصولوں کی روشنی میں اشیائے کائنات سے کام لینا اور پھر ان سب کے ماحصل کو آگے منتقل کرنا، اسی قوت کے بل بوتے پر ہے۔ انسان کے پاس اپنے اسلاف کا جس قدر سرمایہ ہے وہ اسی قوت کی بدولت جمع ہوا۔ اسی کی وجہ سے محفوظ ہے۔ اور اسی کے ذریعے آگے منتقل ہوتا ہے۔ اس کے تمدن و عمرانیت کی متاعِ گراں بہا، قوتِ عقل و فکر کی بنا پر روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ فلسفہ، کلام۔ تاریخ۔ طبقات الارض۔ ہیئت۔ فلکیات۔ حیاتیات۔ طبیعیات۔ ماوراء الطبیعیات۔ علم النفس۔ معاشیات۔ سیاستِ مدن۔ تدبیرِ منازل

غرضیکہ دنیائے محسوسات کے قدیم و جدید علوم و فنون، عقل و بصیرت۔ فہم و فراست۔ دانش و بینش۔ تدبر و تفکر اور شعور و ادراک ہی کے کرشمے ہیں۔ اس لئے قوت عقل کی عظمت سے کسے انکار ہو سکتا ہے؛ لیکن عقل کی اس عظمت و تفوق

کیا عقل ادراکِ حقیقت کرسکتی ہے؟

کے باوجود سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا عقل اس حقیقت کا ادراک کر سکتی ہے جس کی طرف شروع میں اشارہ کیا گیا ہے اور جو ہماری اس بحث کا نقطۂ ماسکہ اور مرکز ثقل ہے؟ کیا وہ اس سوال کا حل پیش کر سکتی ہے جس نے قلب انسان کو طلسم پیچ و تاب بنائے رکھا ہے؟

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ عقل (یا علم استدلالی) کا دائرہ' عالم محسوسات ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ دنیائے طبیعیات (Physical world) میں' جو محسوسات کی دنیا کا دوسرا نام ہے عقلی انکشافات کی کیا کیفیت ہے؟ کیا اس دائرہ میں انسانی تحقیقات' اشیاء کی حقیقت کا علم حاصل کر سکی ہیں؟ طبیعیات کی دنیا، مادہ (Matter) سے متعلق ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کے اخیر تک سائنس دانوں کی دنیا میں عام طور پر سمجھا یہ جاتا تھا کہ یہ کائنات فضا کی پہنائیوں (space) میں ایک بے جان ڈلے کی طرح پڑی ہے اور چند قوانین کی رو سے، جنہیں "اندھی فطرت" بروئے کار لاتی ہے' اس میں میکانکی عمل جاری و ساری ہے۔ کل تک یہ تحقیق، سائنس کے مسلمات میں سمجھی جاتی تھی۔ کائنات کے متعلق اس میکانکی تصور — Mechanistic conception of universe) کا اثر یورپ کی تمام دنیائے فکر پہ چھا رہا تھا۔] جس کا نتیجہ وہ تمدن ہے جو آج یورپ اور اس کے ساتھ باقی دنیا کو جہنم کے عمیق و مہیب گڑھوں کی طرف کشاں کشاں لئے جا رہا ہے۔ لیکن بیسویں صدی کے شروع سے، یورپ کی دنیائے سائنس میں ایک عظیم الشان انقلاب کے آثار ابھرنے شروع ہوئے جس نے چند ہی سال کے عرصہ میں مادیت (Materialism) اور کائنات کے میکانکی تصور کی بنیادوں میں تزلزل پیدا کر دیا۔ سب سے پہلے تحقیقات کا رخ اس طرف مڑا کہ جس چیز کو ہم ٹھوس اور جامد (Solid - and inert) مادہ کہتے ہیں۔ وہ نہ ٹھوس ہے نہ جامد اور نہ ہی (اپنے اصطلاحی معنوں میں) مادہ۔ بلکہ وہ برقیات[1] (Eleclrones) کا مجموعہ ہے جو ہر وقت گردش کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ برق (Electricity) توانائی (Energy) کے سوا اور کچھ نہیں۔

---

[1] ہم برق (Electricity) کا تصور صرف برقائی ہوئی اشیاء (clectrified objects) سے کر سکتے ہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ برقائی ہوئی اشیاء اور ہیں اور خود برق اور۔ برقیات (Electrones) برقائی ہوئی اشیاء (Clectrified objects) نہیں بلکہ برق کی مثبت (positive) اور منفی (negative) قوتوں کا کرشمہ ہیں۔ اس لئے ہمارے لئے مجرد برق کا تصور ممکن نہیں۔

مادہ کیا ہے؟

"تمام مادہ توانائی ہی کی ایک شکل ہے۔ درحقیقت کسی شے میں آخر کار ٹھوس پن (Solidity) اور مادیت کا تصور ہی غلط ہے۔ جو کچھ موجود ہے محض توانائی ہے۔"

(Outlines of Man's Knowledge; p. 192)

اس نظریہ کی رو سے، مادہ کی دنیا درحقیقت "غیر مادی" دنیا قرار پا جاتی ہے۔ توانائی مادہ کی تعریف (Definition) میں آتی ہی نہیں۔ اس لئے اب کائنات کی اصل، مادہ نہیں بلکہ ماوراء مادہ سمجھی جاتی ہے۔ یہی چیز ہے جس کے متعلق (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) سر جیمس جینز نے اپنی کتاب (The Mysterious Universe) میں کہا ہے کہ کائنات "نور کی سر بمہر لہریں ہیں"۔ لیکن اس سے بھی آگے بڑھئے تو حکیم آئن سٹائن (Einstein) کے نظریۂ اضافیت (Relativity Theory) نے اس تصور میں مزید انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ اس کا نظریۂ زمان و مکان (Of Time and Space) ایک بہت دقیق فنی مسئلہ ہے لیکن اس نظریہ کی رو سے قائم شدہ تصور کے متعلق رسل (Russell) کے الفاظ میں اتنا سمجھ لینا کافی ہو گا کہ:۔

> "نظریہ اضافیت نے زمان کو "زمان ـــ مکان" میں سمو کر، مادیت کے روایتی تصور کو، فلاسفروں کے دلائل سے کہیں زیادہ مجروح کیا ہے۔ عقل عامہ کے نزدیک مادہ وہ ہے جو زمان میں قائم اور مکان میں گردش کرتا ہے لیکن اضافیت کے قائل (عالم) طبیعیات کے نزدیک یہ تصور اب باطل ہے۔ اب مادہ کا ٹکڑا، مختلف خصوصیات کا حامل، ٹھوس ٹکڑا نہیں رہا۔ بلکہ باہمی مربوط حوادث کا مجموعہ قرار پا گیا ہے۔"
>
> (Reconstruction of Religious thoughts in Islam)[1]

یعنی حکیم آئن سٹائن کی تحقیق کی رو سے مادہ کوئی ایسی شے نہیں جو ٹھوس اور جامد وجود رکھتی ہو بلکہ وہ چند مربوط حوادث (Inter-related Events) یا خیالات منجمد (Condensed thoughts) کا مجموعہ ہے جس کی اصل حرکت یا توانائی ہے۔ لہٰذا

> "طبیعی سائنس نے اب تمام اشیاء کو حرکت (Movement) میں تبدیل کر دیا ہے...... کائنات جو ہمیں اشیاء کا مجموعہ نظر آتی ہے ایک ٹھوس شے نہیں جو فضا میں پڑی ہے۔ یہ شے (thing) ہے ہی نہیں بلکہ عمل (act) ہے یا حوادث (Events) کی عمارت۔" (خطبات صفحہ ۵۳ و ۴۹)

اندازہ فرمائیے کہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں عالم طبیعیات میں کائنات کی اساس و بنیاد کے متعلق کس قدر عظیم الشان تبدیلی واقع ہو چکی ہے۔ یہ وہ تبدیلی ہے جس سے "سائنس کو اپنی کوتاہیوں کا خود اعتراف

---

[1] یہ کتاب علامہ اقبالؒ کے مشہور لیکچرز کا مجموعہ ہے۔ آئندہ اوراق میں جہاں جہاں اس کتاب کے حوالہ کی ضرورت ہو گی اختصار و ایجاز کی خاطر ہم اسے صرف "خطبات" کہہ کر پکاریں گے۔

ہوگیا ہے۔"

([1]Belief and Action, by Viscount Samuel; p. 39)

کائنات کا تصور

اور اس کی وجہ سے اب مادیت کے بجائے "کائنات کا روحانی تصور اب قرار پا گیا ہے"۔ اپنا منہ لئے نہادی سائنس جو انیسویں صدی کے اخیر تک، کائنات کے میکانکی تصور سے یورپ کی دنیا کو خالص مادیت کی طرف لئے جا رہی تھی۔ اب اپنی ہی تحقیقات کی رو سے ماوراء المادیت (یعنی کائنات کے "روحانی تصور") کی طرف لئے آ رہی ہے۔ سچ ہے۔ بقول بیکن:۔

"فلسفہ کا تھوڑا سا علم انسان کو دہریہ بنا دیتا ہے۔ لیکن اس کی گہرائیوں میں اتر کر انسان (یکسر) مذہب پرست بن کے نکلتا ہے۔

(samuel; p. 41)

اب تحقیق کے ایک دوسرے رُخ کی طرف آیئے۔ مشہور فلاسفر برکلے (Berkeley) کا نظریہ تھا کہ جن چیزوں کا علم ہمیں حواس کے ذریعے حاصل ہوتا ہے ان کا وجود خارج میں نہیں ہوتا۔ وہ ہمارے ذہن کی پیداوار ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک پھول آپ کو سرخ نظر آ رہا ہے۔ تو اس کی یہ سرخی پھول کے اندر موجود نہیں ہوتی، بلکہ روشنی کی لہریں، دیکھنے والے کے دماغ پر ایسا اثر مرتب کرتی ہیں جس سے اسے سرخ رنگت کا احساس ہوتا ہے (ہمارے زمانہ میں پروفیسر (Whitehead) نے اس نظریہ کو مزید دلائل سے مستحکم کرنے کی کوشش کی ہے) اس سے ظاہر ہے کہ حواس کے ذریعے اشیاء کا جو علم ہمیں حاصل ہوتا ہے وہ درحقیقت "فریبِ نگاہ" ہے۔ اس حسین فریب کے متعلق پروفیسر (Eddington) نے اپنے مختصر لیکن نہایت جامع لیکچر (science and the Un-seen world.) میں بڑے دل کش انداز میں بحث کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "ہم سب[2] اس فریب میں مبتلا ہیں کہ نفسِ انسان کی گہرائیوں تک پہنچنا تو خیر ناممکن ہے لیکن مادہ کی حقیقت آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے۔ لیکن ذرا سوچئے تو سہی کہ مادہ کی حقیقت کا

حقیقتِ اشیاء

علم ہمیں حاصل کس طرح ہوتا ہے۔ یہی ہوتا ہے نا، کہ مادی شے سے کوئی اثر (Influence) باہر آتا ہے اور ہمارے نظامِ عصبی کے کسی انتہائی کنارہ سے ٹکراتا ہے۔ اس سے ہمارے اندر کچھ طبیعیاتی اور کیمیائی (physical and chemical) تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں جو اعصاب کے تاروں سے دماغ تک پہنچتی ہیں۔ وہاں پہنچنے پر ایک معمہ (mystery) ظہور میں آتا ہے۔ یعنی انسان کے دل (mind) میں ایک خیالی تصور (Image) یا حسی کیفیت (sensation) پیدا ہوتی ہے

---

[1] اس کتاب سے ماخوذ اکثر اقتباسات آئندہ اوراق میں ملیں گے جہاں اس کتاب کا ذکر صرف (Samuel) کے نام سے کیا جائیگا۔

[2] ترجمہ کے بجائے مفہوم پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

جو اس تحریک یا ہیجان سے مختلف ہوتی ہے جو اعصاب میں پیدا ہوئی تھی۔ یعنی اعصاب نے اس شے کا اثر کچھ اور لیا تھا اور دل میں اس کا اثر کچھ اور پیدا ہوا۔ اس اثر سے جو نتیجہ حاصل کیا جاتا ہے وہی اس شے کا علم کہلاتا ہے۔ اس علم کے متعلق جو جی میں آئے کہیے۔ لیکن اتنا تو یقینی ہے کہ یہ علم بہر حال شے متعلقہ کی اصل حقیقت کا علم نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ اس شے کی اصل حقیقت اعصاب کے تاروں کے ذریعے ذہن انسانی تک پہنچ ہی نہیں سکتی۔ اعصاب کے ذریعے صرف وہ اثرات منتقل ہوتے ہیں جو انہوں نے اخذ کئے تھے۔ ان اثرات سے ہم ایک نتیجہ مستنبط کر لیتے ہیں۔ لہٰذا یہ استنباطی یا استخراجی علم (Inferred-knowledge) مادہ کے پیکر کا عکس ہوتا ہے نہ کہ اس کی حقیقت۔ یہی وجہ ہے کہ مادی اشیاء سے متعلقہ علم کو محض رموز و اشارات (Symbols) کے ذریعے بیان کیا جاتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اشارات اسی صورت میں استعمال کئے جاتے ہیں جب کسی شے کی حقیقت کا علم نہ ہو جیسے الجبرا میں (x) کی علامت ایک نامعلوم مقدار (un-known-Quantity) کی قائم مقام ہوتی ہے۔ ذہن انسانی ان اشارات کو اخذ کرتا رہتا ہے۔ ایک ہی قسم کے اشارات کو بار بار اخذ کرنے سے ان سے مرتب شدہ عکس پختہ ہو جاتا ہے لیکن اس عکس کو اصل شے کی حقیقت سے کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ لہٰذا ان اشارات سے ہم حقیقت کا علم نہیں حاصل کر سکتے جس طرح محطہ نشر القوت (Broad-casting Statian) سے نشر شدہ آوازوں سے ہم براڈکاسٹنگ اسٹیشن کی حقیقت کا علم حاصل نہیں کر سکتے۔ آج آپ اگر کسی عالم طبیعیات سے پوچھیں کہ اس نے ایتھر (Aether) یا برقیہ (Electrone) کے متعلق بالآخر کیا تحقیق کیا ہے تو اس کا جواب ایسا نہیں ہوگا جیسے کسی میز یا کرسی کے متعلق کچھ بتا دیا جائے بلکہ وہ چند اشارات (Symbols) اور ریاضی کی چند مساوات (Equations) گنا دے گا۔ اب اگر اس سے پوچھا جائے کہ یہ اشارات کیا بلا ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ملے گا کہ علم طبیعیات کو اس سے کچھ واسطہ نہیں۔ اس علم کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں جس سے یہ اشارات کے نیچے اصل حقیقت کی گہرائی تک اتر سکے۔ دنیائے طبیعیات کے متعلق ان اشارات اور مساوات ہی کا علم حاصل ہو سکتا ہے نہ کہ اس فطرت کا جس کے مظہر یہ اشارات ہیں۔"

(Science and the UA seen World, Chap: III)

عقل کے بس کی بات نہیں

ان تصریحات کو سامنے رکھئے اور پھر سوچئے کہ عقل (علم استدلالی) کے ذریعے (غیر مرئی و غیر محسوس دنیا تو ایک طرف) خود محسوسات کی دنیا میں حقیقت کا علم کس قدر حاصل ہو سکتا ہے اور سائنس اپنے نتائج مستخرجہ کے متعلق حتمی اور یقینی طور پہ کیا کہہ سکتی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ خود یورپ کے جلیل القدر محققین اب رفتہ رفتہ اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ علم محسوسات کے ذریعے ادراک حقیقت ممکن نہیں۔ سر جیمز جینز کائنات کے مسئلہ پر نہایت عالمانہ بحث کرنے کے بعد جس نتیجہ پر پہنچا ہے وہ یہ ہے کہ:-

جو کچھ کہا گیا ہے اور جو جو نتائج تجربتاً پیش کئے گئے ہیں سچ تو یہ ہے کہ وہ تمام محض قیاسی اور غیر یقینی ہیں۔ ہم نے اس

مسئلہ پر بحث کرنے کی کوشش کی ہے کہ کیا عہد حاضر کی سائنس ان مشکل مسائل کے متعلق جو ہمیشہ کے ادراک رکھے گئے ہیں کچھ کہہ سکتی ہے؟

ہم زیادہ سے زیادہ روشنی کی ایک مدھم کرن دیکھ پائے ہیں۔ اس سے زیادہ ہم کوئی دعویٰ اور نہیں کرسکتے کہ یہ کرن بھی فریب نگاہ ہی ہو اس لئے کہ اس باب میں ہمیں کچھ دیکھنے کے لئے اپنی آنکھوں پر بہت بوجھ ڈالنا پڑا ہے۔ سو آج یہ دعویٰ قطعاً نہیں ہو سکتا کہ دور حاضرہ کی سائنس کوئی (یقینی) اعلان کرسکتی ہے۔ بلکہ انسب یہ ہے کہ سائنس کو چاہیئے کہ اس قسم کے اعلان کرنا چھوڑ دے۔ علم کے دریا کا رُخ اکثر اوقات پیچھے کی طرف لوٹتے بھی دیکھا گیا ہے۔ (The Mysterious Universe)

ریڈنگ یونیورسٹی کا طبیعیات کا پروفیسر ڈاکٹر جیمس آرنلڈ کروتھر لکھتا ہے:۔

نظام فطرت اپنی گہری بنیادی سادگی میں اس قدر تحیر انگیز ہے کہ دنیائے سائنس میں کسی موضوع پر حرف آخری، آخری انسان کے لئے ہی چھوڑ دینا پڑتا ہے۔ (THE GREAT Design; P. 52)

اسی کتاب میں علم الافلاک کا ماہر، کیلیفورنیا کی رصدگاہ کا ڈائرکٹر۔ ڈاکٹر ایٹکن، ستاروں کی دنیا کی کرشمہ سازیوں سے متحیر ہو کر لکھتا ہے:۔

کائنات کی ابتدا اور اس کی انتہا کے متعلق ہم کچھ بھی نہیں جانتے" (ایضاً صفحہ ۳۵)

سر فرانسس ینگ ہسبنڈ اپنے مقالہ میں لکھتا ہے:۔

ہم سائنس سے جو کچھ معلوم کرسکتے ہیں وہ اتنا ہی ہے کہ علم کا سمندر بے کنار ہے۔ ہم یہی معلوم کرسکتے ہیں کہ ہم فطرت کے متعلق کبھی بھی سب کچھ نہیں جان سکتے (صفحہ ۲۵۴)

یہ تو تھے علماء طبیعیات اب ایک عالم تاریخ کی زبان سے سنئے۔ پروفیسر (Alfred Cobban) نے ۱۹۴۱ء میں (تہذیب مغرب کی شکست و ریخت) پر ایک کتاب لکھی تھی جس میں اس نے ان تمام عناصر سے بحث کی تھی جو اس تہذیب کے اجزاء ہیں اور اس کے بعد بتایا تھا کہ اس تہذیب کی تعمیر میں کس طرح خرابی کی صورت مضمر تھی۔ دنیائے سائنس پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے

ہم کبھی یہ تصور نہیں کرسکتے کہ (اور تو اور) سائنس کی محدود دنیا میں بھی قطعی حقیقت کا ادراک کر لیا گیا ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا جب تک اس تمام محسوس کائنات کا علم حاصل نہ ہو جائے۔

The crisis of Civilisation pp. 94-95)

عقل (Reason) کے متعلق پروفیسر صاحب کا بیان یہ ہے کہ

گذشتہ کچھ عرصہ سے عقل (Reason) کچھ ایسی راندۂ درگاہ ہوئی ہے کہ اب اسے چند فریب خوردہ مادرالطبیعی

لوگوں کی شرک توہم پرستی خیال کیا جاتا ہے۔ (ایضاً صفحہ)

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

عہد حاضر کا سب سے بڑا امتیازی کارنامہ یہ ہے کہ اب چاروں طرف سے عقل اور عقل پرستی پر حملے ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ سائنس نے خود عقل کے قلعہ پر دھاوا بول دیا ہے۔ جدید ریاضیات کے انکشافات نے کائنات کے معمہ کو پھر سے اجاگر کر دیا ہے......... علاوہ بریں علم النفس کے ماہرین نے دنیا کے علم میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ جس کی رو سے عقل کو اب نفس انسانی کی کائنات میں۔ وحید تو ایک طرف، کوئی ممتاز مقام بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ قانون عقل پر سب سے آخری اور کاری ضرب علم تصورات (ideaology) کے تجزیہ نے لگائی ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر (Karl Mannheim) نے ثابت کیا ہے، مفکرین دور حاضرہ اب رفتہ رفتہ اس حقیقت سے آشنا ہو رہے ہیں کہ تصورات (ideas) کو اس معاشری اور تاریخی پس منظر سے کبھی الگ نہیں کیا جا سکتا جن میں وہ موجود ہوں (ایضاً صفحہ)

یہ ہے اُس عقل کی حقیقت جس کی ابھی چار دن پہلے یورپ میں پرستش ہو رہی تھی اور جس سے مرعوب ہو کر مشرق کا ذہنی غلام کسی ماوراء عقل نظریہ کو ارباب دانش و بینش کے سامنے پیش کرنے (یا اس پر ایمان کے اظہار) سے شرماتا تھا! آج انہی پرستاروں نے خود اپنے ہاتھوں اس بت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ لیکن ہماری غلامانہ ذہنیت کی یہ کیفیت ہے کہ ان پریشان ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے اٹھاتے پھر رہے ہیں تاکہ انہیں جوڑ کر اس بت کو پھر سے کعبہ دل میں بٹھا لیں ! سچ ہے۔

وفاداری، بشرط استواری اصل ایماں ہے

یہ ہے عقل کی محدودیت۔ لہٰذا جس طرح حدِ نگاہ سے آگے آنکھوں والا اور اندھا دونوں برابر ہوتے ہیں، سرحد عقل سے آگے عقلمند اور بے عقل، دونوں یکساں ہوتے ہیں۔

اس مقام پر اس حقیقت کا بیان کر دینا ضروری ہے کہ جو کچھ عقل (یا علم استدلالی) کے متعلق اوپر لکھا گیا ہے اس سے عقل کی تنقیص یا تحقیر مقصود نہیں ہے۔ اس سے مفہوم صرف اتنا ہے کہ عقل کا دائرہ اپنا ہے اور ادراک حقیقت اس کے بس کی چیز نہیں۔ نیز یہ کہ دنیائے طبیعیات میں جو کچھ ابھی کل تک عین مطابق عقل سمجھا جاتا تھا آج کی عقل خود اس کی تغلیط کر رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جیسا کہ گزشتہ صفحات میں ہم دیکھ چکے ہیں، عقل کا مدارِ کلی اس علم پر ہے جو حواس کے ذریعے مرتب ہوتا ہے اور حواس ادلتے بدلتے رہتے ہیں اس لئے اس بنیاد پر استوار عمارت بھی غیر متبدل نہیں ہو سکتی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:-

فروغِ دانش ما از قیاس است قیاسِ ما ز تقدیرِ حواس است

چو حس دیگر شد ایں عالم دگر شد	سکون و سیر و کیف و کم دگر شد

خلافِ عقل کا مفہوم یہیں سے ہم ضمناً اس سوال تک بھی پہنچ جاتے ہیں کہ جس چیز کو عام طور پر "خلافِ عقل" کہا جاتا ہے اس سے مراد کیا ہوتی ہے؟

سب سے پہلے ایک فرد کی عقل کو لیجئے۔ بچپن میں اس کی عقل کچھ اور ہے۔ جوانی کے عالم میں کچھ اور۔ ایامِ پختگی میں اس سے الگ اور بڑھاپے میں ان سب سے جدا۔ جس بات کو ایک شخص بچپن میں عین مطابق عقل خیال کرتا ہے، دس برس بعد ان کھلونوں پر خود ہی ہنستا ہے۔ جن نظریاتِ زندگی کو وہ عالمِ شباب میں عین تقاضائے عقل خیال کرتا ہے، ذرا پختگی کو پہنچ کر ان پر خود ہی نادم ہوتا ہے۔ بڑھاپے میں پہنچ کر کیفیت ہی بدل جاتی ہے وہ ساری دنیا کو بے عقل سمجھتا ہے اور دنیا خود اس پر ہنستی ہے۔

وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ۚ أَفَلَا يَعْقِلُونَ ۝ (۳۶/۶۸)

اور (دیکھو) جسے ہم طویل عمر دیتے ہیں اسے الٹ کر دیا کرتے ہیں۔ کیا یہ لوگ پھر بھی نہیں سمجھتے؟

ایک طرف زمانہ کے اسباب و عواطف بدل چکے ہوتے ہیں۔ دوسری طرف اس کی قوتِ حافظہ کا یہ حال ہوتا ہے کہ جو کچھ پہلے سے جانتا ہے اسے بھی بھول چکتا ہے۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝ (۱۶/۷۰)

اور (دیکھو) اللہ ہی نے تمہیں پیدا کیا۔ پھر وہی ہے جو تمہاری زندگی پوری کر دیتا ہے۔ اور تم میں سے کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جو (بڑھاپے کی) بدترین عمر تک پہنچ جاتا ہے کہ ذہن و عقل کی سمجھ بوجھ رکھنے کے بعد پھر نادان ہو جائے بیشک اللہ (سب کچھ) جاننے والا، ہر بات کی قدرت رکھنے والا ہے!

ان حالات میں کہئے کہ جب کوئی شخص کسی چیز کے متعلق کہتا ہے کہ یہ خلافِ عقل ہے تو اس سے کیا سمجھا جائے؟ یہ تو "خلافِ عقل" کا سوال ہے۔ جس چیز کو وہ آج عین مطابق عقل کہتا ہے کل ہی اسے خلافِ عقل کہنے لگ جائے گا۔ پھر ایک شخص کی عمر کے مختلف ادوار کو چھوڑ کر ایک ہی عمر کے مختلف افراد کو دیکھئے۔ ان کی عقلوں کا تفاوت اس قدر بیّن ہوتا ہے کہ جو چیز ایک شخص کے نزدیک عین مطابق عقل ہے اسے دوسرا شخص سمجھنے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتا۔ پھر افراد کو چھوڑ کر زمانہ کی عقل کو لیجئے۔ جس چیز کو ابھی پچاس برس اُدھر خلافِ عقل کہا جاتا تھا، وہ آج عین مطابقِ عقل ہے۔ اگر کسی سے تیس تیس برس ادھر کہا جاتا کہ ایک آدمی لندن کے کسی گوشے میں بات کرے تو دنیا کے کونے کونے میں بیک وقت پہنچ جاتی ہے تو وہ اسے پاگل خانے بھجوانے کی کوشش کرتا لیکن آج یہی "خلافِ عقل" بات ہر شخص کے مشاہدہ کی چیز ہے۔ لہذا جس چیز کو ہم آج خلافِ عقل کہتے ہیں، اس کی کیا دلیل ہے کہ وہ فی الواقعہ عقل کے خلاف ہے؟ خود مادہ اور دنیائے طبیعیات کے متعلق سائنس کی تحقیقات کے اختلافات (اور وہ بھی صدیوں میں نہیں بلکہ چند سال کے عرصہ میں) گذشتہ صفحات میں ہماری

نظر سے گزر چکے ہیں۔ ایسے اختلاف جو فرعی اور جزئی نہیں بلکہ اصولی اور کلی ہیں۔

سوچئے کہ جو چیز یوں اوپنے بدلنے والی ہو اسے ادراکِ حقائق کا قابلِ اعتماد ذریعہ کیسے قرار دیا جا سکے؟

لہٰذا عقل و فکر کو چھوڑ کر کسی بات کو اندھا دھند مان لینا خلافِ شرفِ انسانیت ہے تو کسی بات سے محض اس لئے انکار کر دینا کہ وہ میری یا میرے زمانہ کی عقل کے خلاف ہے یہ بھی انتہائی حماقت اور ضد ہے۔ قرآن کریم نے سورۂ یونس کی دو جلیل القدر آیات میں ان دونوں گروہوں کا ذکر نہایت دلآویز اور بصیرت افروز انداز میں فرمایا ہے پہلے اس گروہ کا ذکر کیا جو عقل و فکر سے کام نہیں لیتا اور محض ظن و تخمین کی اتباع کرتا ہے۔

وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا ۚ إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ ۝ (۱۰/۳۶)

اور ان لوگوں میں زیادہ تر ایسے ہی لوگ ہیں جو صرف وہم و گمان کی باتوں پر چلتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ حق کے مقابلے میں ظن و گمان کچھ کام نہیں دے سکتا۔ یہ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ اس سے بے خبر نہیں:

دوسرا گروہ وہ ہے جو حقیقت سے محض اس لئے انکار کر دیتا ہے کہ وہ اس کی عقل کے خلاف ہے اور اس کے اپنے احاطۂ علم میں نہیں آسکتی

بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۖ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ ۝ (۱۰/۳۹)

نہیں، یہ بات نہیں ہے، اصل حقیقت یہ ہے کہ جس بات پر یہ اپنے علم سے احاطہ نہ کر سکے، اور جس بات کا نتیجہ ابھی پیش نہیں آیا اس کے جھٹلانے پر آمادہ ہو گئے۔ ٹھیک اسی طرح ان لوگوں نے بھی جھٹلایا تھا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ تو دیکھو ظلم کرنے والوں کا کیسا کچھ انجام ہو چکا ہے:

غور سے دیکھئے تو انکارِ وجود کے جس قدر گوشے نظر آئیں گے وہ ان ہی دو کیفیتوں کے مظہر ہوں گے۔ صحیح روش یہ ہے کہ ظن و تخمین پر بھروسہ کرنے والوں کو چاہیئے کہ فکر و نظر سے کام لیں اور تنہا اپنی عقل پر بھروسہ کرنیوالوں کو چاہیئے کہ عقل کی محدودیت کو بھی پیشِ نظر رکھیں۔

گذشتہ صفحات میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ سائنس (یا علم محسوسات) کی رو سے کلی حقیقت کا ادراک نہیں ہو سکتا (J. W. N. Sullivan) اپنی کتاب (Limitations of Science) میں لکھتا ہے۔

سائنس کو اب اپنے متعلق احساس ہو گیا ہے، اس لئے اب اس میں فروتنی اور انکسار بھی آگیا ہے۔ اب نہیں یہ

نہیں پڑھایا جاتا کہ حقیقت کا علم حاصل کرنے کے لئے سائنس کا طریقہ ہی واحد طریقہ ہے (واحد طریقہ تو ایک طرف)
اب تو دنیائے سائنس کے مشاہیر اس امر پر مصر ہیں اور بڑی شدت سے مصر کہ جہاں تک ادراکِ حقیقت کا تعلق
ہے سائنس صرف جزوی سا علم ہم پہنچا سکتی ہے۔

دنیائے معاملات اور عقل

ہم دیکھ چکے ہیں کہ اور تو اور خود عالمِ طبیعیات میں بھی حقیقت کا ادراک عقل کے بس کی چیز نہیں[1]۔ اب سائنس اور فلسفہ کی دنیا سے نیچے اتر کر معاملات کی دنیا میں آئیے اور دیکھئے کہ کیا اس دنیا میں بھی عقل، انسانی راہ نمائی کے لئے کافی ہو سکتی ہے؟ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ وہی نظامِ انسانی ذات کے داعیات و مقتضیات کی تسکین کر سکتا ہے جو حقیقت پر مبنی ہو۔ اور چونکہ عقل، ادراکِ حقیقت نہیں کر سکتی اس لئے یہ ظاہر ہے کہ عقل کی رو سے وضع و متشکل کردہ نظام، انسانی معاملات کی دنیا میں کبھی فلاح و سعادت کے نتائج پیدا نہیں کر سکتا۔ اس باب میں عقل کی ناقصیت فقط اتنی ہی نہیں کہ اس کا دائرہ محدود ہے۔ بلکہ اس کی کمزوری اس سے بھی کہیں گہری ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان پتھر نہیں، اس کے سینے میں جذبات کا ایک طوفان ہے جو ہر وقت متلاطم رہتا ہے۔ جذبات اور عقل کی کشمکش ایسی بدیہی ہے جس کے لئے کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں۔ جب جذبات (مثلاً غصہ۔ حسد۔ انتقام۔ یا دوسری طرف جذبۂ محبت) انسان پر غالب آ جاتے ہیں تو وہ کچھ کر بیٹھتا ہے جس پر طوفانِ جذبات کے فرو ہونے پر خود ہی نادم ہوتا ہے۔ اور اتنا نقصان اٹھاتا ہے کہ بعض اوقات اس کا عمر بھر افسوس رہتا ہے حتیٰ کہ بعض مقامات پر انسان جذبات سے مغلوب ہو کر جان تک پر کھیل جاتا ہے۔ ایک بیمار جانتا ہے کہ فلاں چیز کھانے سے مرض بڑھ جائے گا۔ لیکن جاننے کے باوجود اسے کھا لیتا ہے اس کی سزا بھگتتا ہے۔ ایک شخص جانتا ہے کہ قتل کی سزا موت ہے۔ لیکن جوشِ انتقام میں اندھا ہو جاتا ہے اور پھانسی کے تختے پر لٹک جاتا ہے۔ یہاں تک تو بدیہیات کی حدیں تھیں جن کے اندر ہم محسوس کر لیتے ہیں کہ فلاں عمل جذبات کے ماتحت سرزد ہوا ہے اور فلاں تقاضائے عقل سے۔ لیکن قیامت تو اس سے آگے بڑھ کر شروع ہوتی ہے۔ جہاں عقل، حیلہ جو، خود جذبات سے متاثر

---

[1] ہو سکتا ہے کہ سائنس کی تحقیقات اسی طرح آگے بڑھتی رہیں تو انسانی علم کم از کم دنیائے طبیعیات میں کسی یقینی مقام تک پہنچ جائے۔ لیکن یہ صرف حقیقت کے ایک گوشہ (Aspect) کی جھلک ہوگی۔ پھر اس چیز کو بھی پیشِ نظر رکھئے کہ یہ نہیں کہ اگر حقیقت کے مختلف پہلوؤں (aspects) کو یکجا کر دیا جائے تو ان کا مجموعہ حقیقتِ کلی بن سکتا ہے۔ حقیقتِ کلی اور شے ہے اور اس کے مختلف پہلو اور۔ آپ ایک شخص کے مختلف عادات و خصائل کا علم حاصل کر لینے کے بعد یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ نے اس کی ذات (Personality) کا بھی علم حاصل کر لیا ہے۔ عاداتِ و خصائل (صفات) اس کی ذات کا پرتو ضرور ہیں۔ لیکن ان پرچھائیوں کا مجموعہ اصل ذات نہیں ہو سکتا۔

چونکہ انسان کو نابع شفق کے نقاب میں فریب دیتی ہے۔ اس باب میں علم تجزیۂ نفس (Psycho-Analysis) نے ایک حد تک ان حقیقتوں کا انکشاف کیا ہے جو اس سے پیشتر پردۂ شہود پر نہ آئی تھیں (ہر چند یہ فن ابھی اپنے عہد طفولیت میں ہے لیکن بایں ہمہ اس نے نفسیاتی دنیا میں فی الواقعہ ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے) یعنی ہوتا یہ ہے کہ انسانی خواہش کا ایک تقاضا ہوتا ہے۔ عقل اس کے جواز کے لئے منطقی توجیہات تراشتی ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے ایسے ایسے دلائل پیش کرتی ہے کہ یہ سب کچھ عین مطابق عقل معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ یکسر جذبات کے داعیات پر مبنی ہوتا ہے۔

فریب کشمکش عقل دیدنی دارد
کہ میر قافلہ و ذوق رہزنی دارد

کہیئے کہ تنہا عقل کی راہنمائی انسان کو ہلاکت و بربادی کے کس جہنم کی طرف لیجائے گی؟ فلسفۂ قدیم و جدید دونوں اس حقیقت پر متفق ہیں کہ ہماری اسی دعمل کے محرکات ہمارے جذبات ہوتے ہیں۔ ارسطو کے الفاظ میں "عقل ہماری کسی قوت کو متحرک نہیں کر سکتی" اس لئے

> ہر عمل جو ارادۃً سرزد ہو بظاہر کتنا ہی معقول (مبنی بر عقل) کیوں نہ نظر آئے، درحقیقت ہمارے "مفاد" پر مبنی ہوتا ہے۔ اور مفاد کے لئے ضروری ہے کہ اس کی بنیاد جذبات پر ہو...... قوت ارادی کو آمادہ بہ عمل کرنے کے لئے مفاد کا احساس نہایت ضروری ہے۔ اس کے سوا اس کے لئے اور کوئی جذبہ محرک نہیں ہو سکتا۔"

(Mysticism by Evelyn Underhill)

ڈاکٹر جوڈ اپنی کتاب (Guide to Modern Thoughts) میں رقمطراز ہے۔

> عقل درحقیقت ہماری خواہشات کی لونڈی ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ ہم جن مقاصد کو غیر شعوری طور پر حاصل کرنیکی خواہش کریں ان کے حصول کے لئے ذرائع بہم پہنچائے اور جو کچھ ہم کرنا چاہیں اس کے جواز کے لئے دلائل تلاش کر کے مہیا کر دے!

دنیا میں آج جس قدر فتنہ و فساد برپا ہے محض اس لئے ہے کہ ہر شخص اور ہر گروہ اپنے جذبات کی تسکین اور اپنی خواہشات کی تکمیل چاہتا ہے، عقل کی ہنرمندی ان جذبات و خواہشات کی تکمیل کے لئے ذرائع بہم پہنچاتی ہے۔ اب مختلف عقول کی جنگ (Battle of wits) شروع ہو جاتی ہے۔ ہر شخص کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ دوسرے کو بیوقوف بنا کر اپنا الو سیدھا کرے۔ دوکاندار اس کوشش میں ہوتا ہے کہ اپنی عقل کے زور پر گاہک کو بیوقوف بنا کر روپیہ کی چیز سوا میں بیچے۔ اور گاہک اس کوشش میں کہ اپنی عقل کے زور پر دوکاندار کو بیوقوف بنا کر بارہ آنے میں خرید لائے۔ یہ چھوٹے پیمانے پر ہے۔ بڑے پیمانے پر سلطنتوں اور مملکتوں کے معاملات اسی نہج پر طے پاتے ہیں۔ عقل پرستوں کی ساری

سیاست کا مدار ان ہی حیلوں پر ہے۔ بقولِ بعض علاوہ

قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے۔

جس کی عقل غالب آجائے، وہی کامیاب و کامران۔ اس کے سامنے سب قوانین و دساتیر، اصول و مسلمات دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ دنیا میں یہی کچھ ہوتا چلا آیا ہے اور یہی کچھ آج ہو رہا ہے۔

دانہ ایں می کارد آں حاصل برد ۔۔۔ لئے بر اسپے دیگر چہ برد

از ضعیفاں ناں ربودن حکمت است ۔۔۔ از تنِ شاں جاں ربودن حکمت است

شیوۂ تہذیبِ نو آدم دری است ۔۔۔ پردۂ آدم دری سوداگری است

یہی وجہ ہے کہ جو شخص اپنے جذبات کی تسکین ہی کو مقصدِ زندگی سمجھتا ہے علم و عقل کے باوجود فلاح و سعادت کی راہ سے محروم رہتا ہے۔ اس لئے کہ اس کا علم اور اس کی عقل اس کی صحیح راہ نمائی کے بجائے اس کی خواہشات کی تکمیل کے اسباب و ذرائع بہم پہنچاتے ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے علم و عقل کی اہمیت پر اس قدر زور دینے کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی بے نقاب کر دیا کہ جب "عقل" جذبات کے تابع ہو کر چلے تو انسان سعادت کی راہ نہیں پا سکتا۔ ارشاد ہے۔

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوَاهُ .... أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ٥ (۴۵/۲۳)

(کیا) تم نے ایسے لوگوں کی حالت پر غور کیا جنہوں نے اپنے جذبات ہی کو اپنا خدا بنا رکھا ہے؟ چنانچہ (ایسے شخص کی اس بے راہ روی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے علم (و عقل) کے باوجود خدا کا قانون (صحیح راستے کو اس کی نگاہوں سے اوجھل کر دیتا ہے۔ اس کے کانوں پر اور دل پر مہریں لگ جاتی ہیں۔ اور اس کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ خدا کے قانون کی رو سے جس شخص کی حالت یہ ہو جائے تو اسے کون صحیح راستے پر لا سکتا ہے۔ کیا تم لوگ ایسی کھلی کھلی باتوں کے بعد بھی نصیحت حاصل نہیں کرتے؟

سماعت و بصارت و قلبِ سلیم، یہی تو ذرائع علم تھے۔ لیکن جب عقل و علم جذبات و خواہشات کے تابع ہو جائیں تو کانوں اور آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں اور دل غلافوں میں لپٹ جاتا ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے کہہ دیا کہ العلم کے لئے (یعنی علمِ حقیقی جس کی تفصیل چند قدم آگے چل کر آئے گی) کسی کے جذبات کی اتباع جائز نہیں۔

وَكَذٰلِكَ أَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ۚ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ٥ (۱۳/۳۷)

اور اسی طرح یہ بات ہوئی کہ ہم نے اُسے (یعنی قرآن کو) بالکل واضح انداز میں اتارا اگر حصولِ علم کے بعد تو نے ان لوگوں کے جذبات کی پیروی کی۔ تو سمجھ لے کہ پھر اللہ کے مقابلہ میں نہ تو تیرا کوئی کارساز ہوگا نہ بچانے والا۔

انسانی جذبات، راستہ کے پُر فریب مناظرِ رنگ و بو میں الجھ کر رہ جانا چاہتے ہیں۔ لیکن جس کی نگاہوں کے سامنے حقیقت کی

روشنی ہو، وہ منزل کی سوچتا ہے۔ خواہ وہ منزل دور اور راستہ پُرخطر ہی کیوں نہ ہو۔ قصۂ قارون کے ضمن میں فرمایا۔

فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِهٖ فِیْ زِیْنَتِهٖ ...... وَلَا یُلَقّٰهَاۤ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ۝ (۲۸/۷۹-۸۰)

چنانچہ (جب ایسا ہوا کہ) قارون اپنی قوم کے سامنے اپنی آرائش (اور ساز و سامان) کے ساتھ نکلا تو جو لوگ صرف حیات دنیوی (اور اس کے ساز و سامان) ہی کے طالب تھے وہ کہنے لگے "اے کاش ہمارے پاس بھی یہی (عیش و عشرت کے) سامان (اور اسباب تنعم) ہوتے جو قارون کو دیئے گئے ہیں۔ بلاشبہ وہ بڑا ہی نصیبہ ور ہے"۔ مگر ان لوگوں نے جو علم کی روشنی رکھتے تھے (اُن کی یہ باتیں سُن کر) یہ کہا۔ تمہارا ناس ہو! جو حصہ خدا کے قانون کے مطابق (دنیا اور آخرت میں ملتا ہے وہی) ان لوگوں کے لئے بہترین چیز ہے جو ایمان لے آئے ہوں اور (ساتھ ہی) نیکو کار (بھی) ہوں۔ مگر وہ حصہ صرف ان ہی لوگوں کو دیا جاتا ہے جو اپنے پروگرام پر استقامت کے ساتھ عمل پیرا ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مفادِ عاجلہ ہی کو اصل حیات سمجھنے والوں (اور یوں اپنے جذبات کی تسکین میں کامیابی محسوس کرنے والوں) کا علم جذبات کی چار دیواری میں سمٹ کر رہ جاتا ہے اور اس کی نگاہوں کو محمل حقیقت تک نہیں پہنچنے دیتا۔

وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ...... وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰی ۝ (۵۳/۲۸-۳۰)

اور (دیکھو) انہیں اس کے متعلق کچھ بھی علم نہیں ہے۔ وہ لوگ محض ظن و گمان کی پیروی کر رہے ہیں۔ اور (ظاہر ہے کہ) حقیقت کے متعلق یہ ظن و تخمین ذرا بھی فائدہ نہیں دے سکتے۔ تو (اے پیغمبر اسلام!) جو لوگ ہمارے ذکر (کو سننے اور اس پر کاربند ہونے) سے اعراض اور روگردانی کا معاملہ کریں اور صرف دنیوی زندگی ہی کے طلبگار ہوں تو تم بھی اُن سے اعراض کرو (اور ان کی مطلق پرواہ نہ کرو) اُن (بدنصیبوں) کا مبلغ علم اتنا ہی ہے (وہ اپنی قبول حق کی صلاحیت کو کھو چکے ہیں اور اس کے علاوہ اب کچھ کر نہیں سکتے۔) یقیناً جو لوگ خدا کے راستہ سے گم ہو گئے ہیں۔ تمہارا پروردگار انہیں خوب جانتا ہے۔ اور وہ انہیں بھی خوب جانتا ہے جو (حقیقت کا) راستہ پا گئے ہیں۔

رفتہ رفتہ اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ اس کی عقل یکسر جذبات کے تابع ہو جاتی ہے اور وہ غلط راستہ پہ چلنے کے باوجود سمجھتا یہ ہے کہ بالکل راہ راست پر ہوں۔ یہ شقاوتِ انسانی کی آخری حد ہے۔

وَمَنْ یَّعْشُ عَنْ ذِکْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَیِّضْ لَهٗ شَیْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِیْنٌ ۝ وَاِنَّهُمْ لَیَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِیْلِ وَیَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ (۴۳/۳۶-۳۷)

اور (دیکھو) جو لوگ خدائے رحمان کے ذکر (نصیحت و احکام الٰہی سے) منہ موڑ لیتے ہیں۔ ہم ان کے لئے ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں (جو ان پر مسلط ہو جاتا ہے) بس! پھر وہی ان کا ساتھی (اور ہم نشین) ہوتا ہے۔ اور (دیکھو) پھر (ایسا ہوتا ہے کہ) یہی لوگ خود افرادِ نسلِ انسانی کو (حقیقت کے) راستے سے روکنے لگتے ہیں (اور خود ہی ایک دوسرے کے لئے شیطان بن جاتے ہیں) اور یہی سمجھتے رہتے ہیں کہ وہ صحیح راستہ پر چل رہے ہیں۔

یہی وہ مقام ہے جس کے متعلق فرمایا کہ باوجود آنکھیں رکھنے کے انسان اندھا ہو جاتا ہے۔ سب کچھ دیکھتا بھالتا ہے لیکن تباہی کے جہنم کی طرف چلا جاتا ہے۔ اقوام سابقہ کے قصص کے سلسلہ میں فرمایا

وَعَادًا وَّثَمُودَاْ وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُم مِّن مَّسَاكِنِهِمْ ۖ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِينَ ۝ (۲۹/۳۸)

اور (دیکھو) ہم نے عاد و ثمود (جیسی زبردست قوموں) کو بھی تباہ و برباد کر دیا (اُن کی تباہی کچھ چھپی ہوئی نہیں ہے) ان کی آبادیوں سے تمہیں یہ (تباہی کی داستان) خوب آشکارا ہو چکی ہے۔ (یہ تباہی کیوں آئی؟ محض اس لئے کہ) شیطان نے ان کی بدعملیوں کو اُن کی نگاہوں میں خوشنما بنا رکھا تھا اور وہ انہیں راستوں حق کے راستے سے روکتا رہا۔ (چنانچہ بار بار کی خدائی تنبیہوں کے باوجود انہیں اپنی بے راہ روی کا احساس تک نہ ہو سکا۔ اور یہ بات نہیں تھی کہ وہ اندھے ہو چکے ہوں یا انہیں نظر نہ آتا ہو۔ دنیوی معاملات میں) وہ ویسے بڑے ہوشیار اور دیدہ ور تھے؛

اس کی تفسیر دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔

وَلَقَدْ مَكَّنَّاهُمْ فِيمَا إِن مَّكَّنَّاكُمْ فِيهِ .... وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۝ (۴۶/۲۶)

اور (دیکھو) ہم نے (زمین میں) انہیں اتنا اقتدار دے رکھا تھا جتنا تمہیں بھی نہیں دیا۔ اور ہم نے انہیں (دیکھنے کے لئے) آنکھیں (سننے کے لئے) کان۔ اور (سمجھنے کے لئے) دل دے رکھے تھے۔ مگر اُن کی وہ آنکھیں، کان اور دل کچھ بھی کام نہ آسکے۔ (کیونکہ وہ ان کی قبول حق کی صلاحیت کو خود ہی کھو چکے تھے) اس وجہ سے کہ وہ آیاتِ الٰہی کا ضد اور ہٹ دھرمی سے انکار کیا کرتے تھے (اور اس حد تک پہنچ کر صلاحیت باقی نہیں رہا کرتی) اور بالآخر جن چیزوں کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے (یعنی عذابِ الٰہی) وہ اُن پر نازل ہو کر رہیں۔

اور اگر آپ کے نزدیک عاد و ثمود کی یہ داستانیں اتنی پرانی ہیں کہ اُن کا اثر زائل ہو چکا ہے تو خود اپنی آنکھوں کے سامنے یورپ کے مستبصرین کی حالت کو دیکھ لیجئے۔ کس طرح وہ خود اور اُن کے ساتھ پوری دنیا ہلاکت میں گھر چکی ہے اور باوجود آنکھیں رکھنے کے کوئی نجات کی راہ دکھائی نہیں دیتی؟ دکھائی دے بھی کس طرح؟ ایک تو عقل خود محدود۔ پھر اس پر وہ اسیال و عواطف سے متاثر اور جذبات کے نرغے میں گھری ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی نگاہ محض سطح پر رہتی ہے۔ معاملات کی گہرائی تک نہیں اتر سکتی۔ اسی لئے فرمایا کہ

وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝ (۲/۲۱۶)

بہت ممکن ہے، ایک بات کو تم بُرا سمجھتے ہو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو۔ اور ایک بات تمہیں اچھی لگتی ہو۔ اور

اچھی یں تمہارے لئے برائی ہو (پس اپنے نفس کی پسندیدگی، اور ناپسندیدگی کی بنا پر اعمال کی اچھائی برائی کا فیصلہ نہ کرو)

اللہ جانتا ہے (کہ تمہارے لئے کس ناگواری میں خوشگواری اور کس پسندیدگی میں ناپسندیدگی ہے) مگر تم نہیں جانتے!

عقل کی یہی کوتاہ دامنی ہے جس کی بنا پر انسان ان چیزوں کی آرزو کرتا رہتا ہے۔ جو درحقیقت اُس کے لئے مضر ہوتی ہیں۔

وَيَدْعُ الْإِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ ۖ وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا ‎(١٧/١١)

اور دیکھو، جس طرح انسان اپنے لئے بھلائی کی دعائیں مانگتا ہے۔ اسی طرح (بسا اوقات) برائی بھی مانگنے

لگتا ہے۔ (اگرچہ نہیں جانتا کہ یہ اُس کے لئے برائی ہے) اور حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی جلد باز ہے۔

انسان کی اس کمزوری پر پھر غور کیجئے کہ وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا (یہ بڑا جلد باز واقع ہوا ہے)۔ ادھر ایک چیز سامنے آئی اور اُدھر اس کے جذبات نے اسے نہایت حسین و دل کش نقاب اوڑھا کر اس کی نگاہوں کو فریب دیا۔ اُس نے عقل سے پوچھا اور عقل نے جذبات کے غلام ہونے کی حیثیت سے فوراً ایک منطقی توجیہہ اس کے جواز میں تراش دی۔ بس پھر کیا تھا! اس مقصد کے حصول کے لئے ہو پائی ایک کر دیا۔ گویا اس کی تمام زندگی کا دار و مدار اسی مقصد کے حصول میں مضمر ہے۔ اور کبھی خیال نہ کیا کہ ان فریب نگاہ پردوں کے پیچھے بھی جھانک کر دیکھ لیا جائے کہ اُن میں چھپا کیا ہے؟ سچ ہے كَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا بقول علامہ اقبالؒ

آدمی اندر جہانِ خیر و شر ۔۔۔ کم شناسد نفع خود را از ضرر

کس نداند زشت و خوب کار چیست ۔۔۔ جادۂ ہموار و ناہموار چیست

تمدن کی زندگی اور تنہا عقل کی رہبری

اگر انسان کو ایسی زندگی بسر کرنی ہوتی کہ ایک انسان کسی ایک جزیرہ میں تنہا رہتا اور دوسرا دور کسی اور میں تنہا۔ تو بھی گزارہ ہو جاتا، لیکن انسان، ارسطو کے الفاظ میں "سیاسی حیوان" (political animal) ہے۔ یہ مدنی الطبع واقع ہوا ہے۔ اسے آپس میں مل جل کر رہنا ہے۔ اس نہج کی زندگی کا تقاضا ہے کہ انسانوں کے مفاد میں باہمی تصادم ہو۔ یہ تصادم جذبات پر مبنی ہوتا ہے (کہ مفاد کا تعلق جذبات سے ہے) اور جذبات کے تقاضوں کو بروئے کار لانے والی قوت عقل ہے۔ اس لئے مدنی الطبع انسان کے لئے، تنہا عقل کی راہنمائی (جسے صحیح الفاظ میں جذبات کی کا سہ لیسی کہنا چاہیئے) بڑی ہلاکت آفریں ہے۔ غور فرمایئے انسانی حقوق اور ان کا تحفظ، یہی وہ بنیاد ہے جس پر انسانی تمدن کی فلک بوس عمارت قائم ہے۔ مملکت اور اس کا نظام۔ حکومت اور اس کا انصرام۔ سلطنت اور اس کا نظم و نسق۔ ایک قبیلہ کا دوسرے قبیلہ سے برسر پیکار رہنا۔ ایک قوم کا دوسری قوم سے نبرد آزمائی کرنا۔ ایک ملک کا دوسرے ملک پر دھاوا بول دینا۔ یہ سب کیا ہیں؟ انسانی حقوق و مفاد کے تصادم اور اُن کے تحفظ اور سلب و نہب کی آگ اور خون سے لکھی

ہوئی داستانیں (بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ کی تفسیریں ہیں۔ اس باب میں ہلاکو اور چنگیز خاں سے لیکر دورِ حاضر کی (بظاہر) مہذب لیکن (در حقیقت) "وحشی اقوام تک سب ایک ہی رنگ میں رنگی ہوئی چلی آرہی ہیں۔ عقل نے انہیں کیا سکھایا ہے؟ یہی نا کہ قتل و غارتگری۔ تباہی اور بربادی کے موثر ترین ذرائع کس طرح ایجاد کئے جاسکتے ہیں۔ چنگیزی اور ہلاکو خانی دور، وحشت و جہالت کا دور تھا، اس لئے وہاں ایک انسان دوسرے انسان کو بمشکل دو چار گھنٹے میں مار سکتا تھا۔

خون کی ہولی

آج علم و عقل اپنی انتہائی بلندیوں پر ہے اور انسانی درندگی کی حالت یہ ہے کہ ایک ساعت میں لاکھوں انسان آگ اور خون کے جہنم میں دھکیل دیئے جاسکتے ہیں۔ بستیوں کی بستیاں ملکوں کے ملک اس طرح ویران اور برباد کئے جاتے ہیں (كَاَنْ لَّمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا) میدانِ جنگ میں سپاہی آگ کے شعلوں سے کھیل رہے ہوتے ہیں اور ادھر شہروں کے اندر سائنسدانوں کی جماعتیں اپنے علم و عقل کے تمام مایۂ ناز سرمایہ کو لیکر اس فکر میں غرق کہ کوئی ایسی نئی ایجاد ہاتھ لگ جائے جس سے انسانوں کی بربادی جلد از جلد عمل میں لائی جاسکے۔ پہلی جنگِ عظیم کے دس سال بعد، دنیا کی ۶۸ حکومتوں میں سے ۶۳ نے ایک میثاق پر دستخط کئے جو (Kellogg pact) کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں انہوں نے نہایت جوش و خروش سے اعلان کیا کہ

> اس مقدس فریضہ کے شدید احساس کے ساتھ کہ ہمیں نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کو ترقی دینا ہے۔ اس جذبہ سے متاثر ہو کر کہ وقت آگیا ہے کہ اس امر کا اعلان کر دیا جائے کہ جنگ کو قومی حکمتِ عملی کی حیثیت سے یکسر ترک کر دینا چاہیئے۔ اس یقین کے ساتھ کہ حکومتوں کے باہمی معاملات میں تغیر و تبدل امن و صلح کے طریقوں سے ہی ہونے چاہئیں اس میثاق پر دستخط کرنے والی حکومتیں (اپنی اپنی اقوام کے نام پر) حلفاً اعلان کرتی ہیں کہ وہ بین الاقوامی معاملات کے تصفیہ کے لئے جنگ کے طریق کار کو مذموم سمجھتی ہیں اور آپس کے باہمی تعلقات کے لئے بہ حیثیت قومی حکمتِ عملی اختیار کرنے سے بیزاری کا اظہار کرتی ہیں۔ اس میثاق پر دستخط کرنے والی جماعتیں اس امر پر متفق ہیں کہ تمام باہمی تنازعات کا حل یا تصفیہ (خواہ وہ کسی نوعیت کے ہوں اور ان کی ابتدا کسی طرح ہوئی ہو) پر امن طریقوں کے علاوہ اور کسی طریق سے نہیں کیا جائے گا۔

لیکن اس میثاقِ امن کی ابھی روشنائی بھی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ یہی اقوام پھر اسی طرح آپس میں گتھم گتھا ہو گئیں۔ اور یہ سب کچھ کس چیز کے لئے؟ "روٹی" کی خاطر اور اپنی اپنی قوم (نسل) کے تحفظ کے لئے! کیا اس کے بعد بھی اس حقیقتِ باہرہ کے ثبوت کے لئے کسی دلیل کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ مدنی الطبع انسان کی راہنمائی کے لئے عقل کی راہنمائی (جو درحقیقت اس کے جذبات کی برومندی کا آلۂ کار ہوتی ہے) راہنمائی نہیں رہزنی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ یورپ اپنے موجودہ نظام سے، جو تنہا عقل پر مبنی تھا، اس درجہ تنگ آچکا ہے کہ وہ کسی نظامِ جدید کی تلاش میں پاگلوں کی طرح مارا مارا پھر رہا ہے۔ پروفیسر کو ہن (جس کا تعارف پہلے کرایا جاچکا ہے) تہذیبِ مغرب کی تباہی کے سلسلہ میں چاروں طرف سے مجبور ہو کر لکھتا ہے،

اب صرف اتنا پوچھنا باقی رہ گیا ہے کہ عقل کے علاوہ کوئی ایسی بنیاد بھی ہے جس پر ہم قانون حکومت کی دوبارہ تشکیل کر سکیں؟ اگر دنیا میں کوئی عالمگیر مذہب ہوتا تو اس کے آسمانی قوانین پر جدید نظامِ حکومت کی بنیاد رکھی جا سکتی تھی لیکن ایک ایسی دنیا میں جہاں مختلف مذاہب موجود ہوں یہ کوشش کرنا کہ ان میں سے کسی ایک کے ضابطے کے مطابق "قانونِ فطرت" کو قائم کر دیا جائے۔ نہ یہ کہ نظری طور پر اس کا جواز مشکل ہوگا بلکہ عملی طور پر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم پھر سے لڑائیوں کے دور کو واپس بلالیں گے۔ (صفحہ ۹۲)

سردست اس چیز کو نظرانداز کر دیجئے کہ پروفیسر صاحب نے اپنے اس بیان کے آخری حصہ میں کتنی بڑی ٹھوکر کھائی ہے۔ (اس کا جواب اپنے مقام پر آئے گا۔ جہاں یہ بتایا جائے گا کہ دنیا میں عالمگیر مذہب (یعنی دین) ہونے کی اہلیت کس میں ہے) یہاں صرف یہ دیکھئے کہ یورپ کس طرح اپنے نظامِ تمدن سے، کہ جس کی بنیاد عقل پر تھی تنگ آ کر اب ایک ایسے نظام کی تلاش میں ہے جس کی بنیاد وحیِ آسمانی پر ہو۔ اس سے بڑھ کر تنہا عقل کے ناکافی ہونے کی اور کیا دلیل ہوگی؟

یورپ کیسا نظام چاہتا ہے؟

پروفیسر کوہن کو چونکہ کوئی عالمگیر مذہب دکھائی نہیں دیا (اس لئے کہ ان کے سامنے حقیقی اسلام نہیں۔ اور ہم میں بدقسمتی سے آج کوئی ایسا ہے نہیں جو اسلام کو دنیا کے سامنے صحیح معنوں میں پیش کر سکے۔ ورنہ یورپ تو اسلام کے لئے تڑپ رہا ہے) اس لئے آگے چل کر وہ اس امر سے بحث کرتے ہیں کہ دنیا آج کس قسم کا نظام چاہتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"ہمارے اس کہنے سے کہ کیا کوئی ایسا قانون ہے جو انسانی فطرت کے اندر موجود ہو۔ دراصل مطلب یہ ہے کہ کیا کہیں کوئی ایسا ضابطۂ اخلاق ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے قابلِ قبول ہو۔ اور جسے خود انسانی انداز زندگی سے، اخذ کر کے مرتب کیا جائے؟ محض عدل و انصاف کے نظری اصول کے طور پر نہیں۔ بلکہ جس طرح حق (Right) کے مثبت تصورات کو فی الواقعہ محسوس کیا جاتا ہے۔ اگر کہیں کوئی ایسا ضابطہ ہے تو وہی نظامِ فطرتِ انسانی بن سکتا ہے۔" (صفحہ ۱۰۱)

اس کے بعد وہ حقوقِ انسانی اور فطرتِ انسانی کے اجمال کی وضاحت کر کے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ:-

"ایسا مان لینا غیر معقول نہیں کہ اس قسم کے عالمگیر اخلاقی تصورات کا وجود ثابت کیا جا سکتا ہے۔ (لیکن) ضابطۂ اخلاق ایسی چیز نہیں جسے عقل سے ثابت کیا جا سکے۔ اس لئے کہ اس کی بنیاد ہی حق و باطل اور خیر و شر کی تمیز پر ہوتی ہے اور اس یقین پر کہ انسان کو حق اور خیر قبول کرنا چاہیئے اور باطل و شر سے مجتنب رہنا چاہیئے۔ لہٰذا فطرتِ انسانی کے اس اخلاقی تحکم کو عقلاً کس طرح ثابت کیا جا سکتا ہے؟ اگر کوئی پوچھے کہ انسان کو کیوں حق اختیار کرنا اور باطل سے اجتناب کرنا چاہیئے تو اس سوال کا جواب بجز ان الفاظ کے جن میں یہ سوال پوچھا گیا ہے۔ اور کیا دیا جا سکتا ہے۔ اس کا جواب اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا کہ جواب خود سوال کے اندر موجود ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ اخلاقی ضابطہ جبلی طور پر انسانوں کے اندر موجود نہیں۔ اس لئے کہ باطل پرستی بھی

دنیا میں کچھ کم نہیں ہے" (صفحہ ۱)

آپ نے غور فرمایا کہ علم و عقل اور تہذیب و سائنس کے علمبردار اپنے نظامِ تمدن کے ہاتھوں تنگ آ کر کس چیز کی تلاش میں ہیں؟ ایک ایسے ضابطۂ حیات کی جو "فطرتِ انسانی" کے عین مطابق - بلکہ خود فطرت ہی پر مبنی ہو۔ جسے تمام نوعِ انسانی داعیاتِ فطرت کی حیثیت سے قبول کر لے اور یوں یہ ضابطہ، عالمگیر نظامِ حکومت بن سکے۔ پروفیسر کوجن کے نزدیک اس قسم کا ضابطہ نہ تو جبلّی طور پر انسانوں کے اندر موجود ہے اور نہ ہی عقل کی رو سے قائم کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا کوئی اور ذریعہ ہونا چاہیئے جس کی رو سے اس قسم کا ضابطہ وجود میں آسکے (اس کی تفصیل آئندہ اوراق میں آئے گی)

※

یورپ کا قلبی اضطراب

یورپ کے موجودہ قلبی اضطراب اور ذہنی خلفشار کے متعلق پروفیسر جوڈ کا بیان بھی قابلِ غور ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

اس زمانہ میں مشین نے انسان کو بے پناہ قوت دیدی ہے اور اس قوت سے وہ تعمیر اور تخریب کے بے حد حساب کام کر سکتا ہے۔ وہ چاہے تو سمندروں کو پھاڑ دے۔ پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دے۔ آسمان اس کے سامنے گرد ہے اور کائنات سرنگوں۔ لیکن اتنی قوت پا کر بھی وہ سکھی نہیں ہوا۔ بلکہ وہ اور دکھی ہے۔ آج مشین کی طاقت انسان کو مطمئن کرنے کے کام نہیں آرہی۔ بلکہ الٹا، اسے تباہ و برباد کیا جا رہا ہے...... اگر اس طاقت کو قابو میں رکھنے کی کوئی سبیل نہ کی گئی تو انسانیت کا انجام اچھا نظر نہیں آتا۔

انسان کی ہزارہا سال کی جد و جہد کا یہ انجام کیوں ہوا؟ اور آج وہ مشین کے ہاتھوں کیوں ایسا بے بس نظر آرہا ہے؟ بات دراصل یہ ہے کہ ہم نے طاقت تو حاصل کر لی اور آگ اور پانی اور معدنیات کو کام میں لانے کے وسیلے ڈھونڈ لیے۔ لیکن اس طاقت کو صحیح طور پر استعمال کرنے کی عقل ہم نے حاصل نہ کی۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج انسان اس مصیبت میں گرفتار ہے۔ ضرورت ہے کہ طاقت کو صحیح راہ پر چلانے کی عقل بہم پہنچائی جائے۔ اور اگر طاقت اور عقل میں صحیح توازن ہو جائے تو آج ہماری مصیبتیں دور ہو سکتی ہیں اور انسانیت آنے والی تباہی سے بچ سکتی ہے۔

بے شک انسان، مظاہرِ فطرت کو مسخر کرنے میں اپنے آباؤ اجداد سے بہت آگے بڑھ گیا ہے لیکن جہاں تک اس کے اپنے رہنے سہنے اور دوسروں سے مل کر زندگی گزارنے، یعنی اخلاقیات و سیاسیات کا تعلق ہے۔ وہ اب تک وہیں ہے جہاں ہزاروں برس پہلے یونان کے قدیم باشندے تھے۔ ہم نے گو، مادی ترقی تو بہت کر لی ہے۔ لیکن روحانی اور اخلاقی لحاظ سے ہم ذرا بھی آگے نہیں بڑھے۔ اور آج دنیا بھی اسی بات کا ہے اور ساری ضرورت بھی یہی ہے کہ ہم اپنی مادی طاقت کے مطابق اپنے اندر روحانی اور اخلاقی عقل پیدا کریں تاکہ

اس طاقت کا صحیح مصرف ہو سکے۔ ورنہ یہ طاقت وبال جان ہو جائے گی۔"

غور کیا آپ نے کہ مغرب کے یہ مفکرین کشاں کشاں کس طرح اس مقام کی طرف بڑھ رہے ہیں جس کی طرف قرآن کریم نے راہنمائی کی ہے؟ اس کے بعد پروفیسر موصوف لکھتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ عقل (یعنی اخلاقی عقل) ہم کیسے سیکھیں اور موجودہ اخلاقی و روحانی مردنی کو زندگی سے کیسے بدلیں؟ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کہیں سے کچھ زیادہ امید نظر نہیں آتی اور آثار بھی کچھ ایسے ہیں کہ نا امید ہو کر کہنا پڑتا ہے کہ مشینی طاقت کو قابو میں رکھنا اور نئی اخلاقی قدروں کو پیدا کرنا اس دور میں مشکل ہو گیا ہے۔ نوجوان اپنی مذہب سے بالکل برگشتہ ہو چکے ہیں۔ کوئی اخلاقی ضابطہ انہیں پسند نہیں آتا۔ اعلیٰ نصب العین سے وہ بیزار ہو چکے ہیں اور زندگی کی شب روز کی مسرتوں ہی میں راحت پاتے ہیں کسی وعدۂ فردا کا انتظار ان کو گراں ہے اور عشرت امروز ہی اب ان کا عقیدہ بن گیا ہے "آج" کھا لو۔ پی لو۔ کل کو نہیں مرنا ہے" یہ ہے اصول آج کے نوجوان کا۔ اور شاید یہ وہی دور ہے جو "سپینگلر"[1] کے الفاظ میں کسی کلچر کی موت کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ کیا ہم سمجھ لیں کہ موجودہ تمدن فنا کے ہاتھ سے نہیں بچ سکتا اور یورپ پر اب دم نزع طاری ہے۔ اور جو کچھ روما کے ساتھ ہوا۔ اب بعینہٖ یہی حشر یورپ کا ہوگا؟

مغربی فلاسفر پسکال نے لکھا ہے کہ انسانی ذہن اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ کسی نہ کسی چیز پر ایمان رکھے اور اسی طرح انسان کا ارادہ بھی کسی نہ کسی سے محبت کرنے پر مجبور ہے اور جب ایمان و محبت کے لئے اس کو کام کی باتیں نہیں ملتیں تو وہ بیکار اور خراب مقصدوں پر ریجھ جاتا ہے۔ خلا قدرت کے کارخانے میں محال ہے اور محض مادی دنیا میں نہیں بلکہ اخلاقی اور روحانی دنیا میں بھی خلا ناممکن ہے۔ انسان جب خدا پر ایمان چھوڑ دے تو شیطان کی پرستش کرنے لگتا ہے۔ اور اچھے نصب العینوں سے دستکش ہو جائے تو برے راستے اس کو خوش آتے ہیں۔ یورپ کو اگر اس دلدل سے نکلنا ہے تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہے۔ اور وہ یہ کہ بے یقینی کی جگہ یقین اور ایمان لے لے۔ بے راہ روی ختم ہو اور یورپ والے نئی قدروں پر ایمان اور نئے اخلاقی ضابطوں سے محبت پیدا کریں۔ وہ زندگی جس میں نہ ایمان کی گرمی ہو اور نہ اخلاقی ضابطہ کی کشش، وہ زندگی موت سے بدتر ہوتی ہے۔ ایچ۔ جی۔ ویلز کی رائے میں اس دور کی سب سے بڑی لعنت یہ ہے کہ طاقت اور قوت ہے لیکن اس کا کوئی مصرف موجود نہیں۔ یعنی ایسا کوئی نصب العین موجود نہیں جو نوجوانوں کی امنگوں۔ ولولوں اور حوصلوں کو بروئے کار لاسکے۔ ایک طرف اتنی زیادتی اور دوسری طرف

---

[1] "سپینگلر" کی کتاب (Decline of the West) اپنے موضوع پر ایک بلند پایہ تصنیف ہے۔ ارباب ذوق کے لئے اس کا مطالعہ فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

اتنی کمی۔ یہ ہمارا سب سے بڑا روگ ہے۔ لیکن ہمارے اندر اس نصب العین کی تلاش کا مادہ فنا نہیں ہوا۔ اور اس سے امید ہوتی ہے کہ شاید ہم نئے دور کو پیدا کر سکیں۔ اور اخلاقی اور مذہبی قدروں کے نہ ہونے سے ہماری زندگیوں میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے وہ بھرا جا سکے۔ اگر یہ نہ ہوا تو ہماری تہذیب آپس میں ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گی۔ اگر ہمیں بچنا ہے تو اپنے لئے کوئی مذہب تلاش کرنا ہوگا۔ جس کو ہم دل سے مانیں اور اس کے اصولوں پر زندگی ڈھالیں۔

(ماخوذ از "کتاب" لاہور۔ فروری ۱۹۴۶ء)

یورپ کا یہ تمام اضطراب و خلفشار۔ یہ سب بے چینی اور پریشانی۔ یہ سب وحشت اور سراسیمگی۔ یہ عدم اطمینان و فقدانِ سکون کا جہنم۔ نتیجہ ہے اس تمدن کا جسے تنہا عقل کی بنیادوں پر کائنات کے میکانکی تصور کے مطابق قائم کیا گیا۔ تنہا عقل ادراکِ حقیقت نہیں کر سکتی اس لئے اس کا قائم کردہ نظام کبھی انسانی ذات کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا۔ اور میکانکی تصور چونکہ انسان کو ایک مشین بنا دیتا اور اس کی زندگی کو جوئے رواں قرار دینے کے بجائے، اسی محبسِ آب و گل میں ختم کر دیتا ہے۔ اس لئے مایوسیوں کے زہریلے سانپ اس کے تحت الشعور میں بری طرح سے زہر افشاں اور شعلہ ریز رہتے ہیں۔

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار

اس طرح بقول علامہ اقبالؒ یورپ کا نوجوان۔

اپنے فکر کی دنیا میں خود اپنی ذات کے خلاف ستیزہ کار رہتا ہے اور سیاسی دنیا میں دوسروں کے خلاف بر آما۔ وہ نہ اپنی کھٹ پر وہاں سرکشی کو ضبط میں لا سکتا ہے۔ اور نہ ہی ہوسِ زر پرستی کے استفسار کی تسکین کا سامان فراہم کر سکتا ہے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو اس کے تمام بلند مقاصد کو (ایک ایک کر کے) ہلاک کر رہی ہیں اور ایسی کیفیت پیدا کر رہی ہیں کہ وہ زندگی کے ہاتھوں بیزار ہے۔ وہ نگاہ فریب مناظر میں جذب ہو کر اپنی ذات کی گہرائیوں سے یکسر منقطع ہو چکا ہے۔ اس کی منظم مادہ پرستی کے میدان میں اس کی توانائی پر وہ فالج گر چکا ہے جسے ہیگل کی نگاہ نے بھانپا اور اس پر اظہار تاسف کیا تھا۔ (خطبات صفحہ ۱۸۸)

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ادراکِ حقیقت علم استدلالی (عقل) کے ذریعے ممکن نہیں۔ اب یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا اس علم کے علاوہ انسان کے پاس کوئی اور علم بھی ہے۔ لیکن اس کڑی تک پہنچنے سے پہلے، یہ دیکھنا ضروری ہے کہ آیا پیکرِ انسانی میں ذریعۂ علم و احساس دماغ[1] ہی ہے یا اس کے علاوہ کچھ اور بھی۔ بالفاظِ دیگر یہ کہ انسان محض اسی آب و گل کے پیکر کا نام ہے جسے ارتقا کے میکانکی

---

[1] ہم اس مقام پر دماغ (brain) اور قلب (Mind) کے اصطلاحی اور فنی فرق کی بحث میں نہیں الجھنا چاہتے۔ دماغ سے ہمارا مفہوم علم استدلالی کا مقام ہے جسے مادہ پرست سائنسدان عمل ارتقاء کا میکانکی نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

عمل کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے یا اس سے ماوراء کچھ اور بھی

انسان کے گرد و پیش کی دنیا کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) مادہ (Matter) (۲) حیات (Life) اور (۳) شعور (Consciousness)

شعور انسانی کیسے پیدا ہوتا ہے؟

علم طبیعیات (Physics) مادہ سے متعلق ہے اس سے آگے علم الحیات (Biology) ہے اس کے بعد شعور۔ کائنات کے میکانکی تصور کی رو سے (جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے اور جس کے سب سے بڑے علمبردار ڈارون اور اس کے رفقاء کار ہیں اور ان کا مابہ الامتیاز کارنامہ نظریۂ ارتقاء کے مادیت ہے) مادہ کے مختلف عناصر کے امتزاج سے "کسی نہ کسی طرح"[ل] زندگی کی شاخ پھوٹ نکلی اور مختلف ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ زیادہ نفیس ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ حیوانی قالب نے انسانی پیکر اختیار کر لیا، جو سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی قرار دی جاتی ہے۔ (چنانچہ اس نظریہ کی رو سے" دنیائے سائنس میں اس خیال کے لئے کوئی بنیاد نظر نہیں آتی کہ انسان کے موجودہ امتزاجی پیکر میں کوئی بھی مادی اضافہ ممکن ہے" (خطبات صفحہ ۱۱) ان لوگوں کا خیال یہ تھا کہ انسانی شعور کا مقام، دماغ (Brain) ہے جو ارتقاء کے میکانکی عمل کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا جب پیکر انسانی کا یہ میکانکی عمل ختم ہو جائے گا تو پھر کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔ لیکن دورِ حاضرہ کی تحقیقات نے جہاں مادہ کی اصل و بنیاد کے متعلق محیر العقول

فکر کے متعلق تحقیق جدید

انکشافات بہم پہنچائے ہیں۔ وہاں حیات کی دنیا میں بھی قدیم زوایائے نگاہ کو بڑی حد تک بدل دیا ہے۔ عصرِ رواں کے اربابِ سائنس کی تحقیق یہ ہے کہ انسانی قوتِ فکر (Intellect) مادہ کے میکانکی عمل کا نتیجہ نہیں۔ مشہور عالم حیات (J. S. Haldane) اس مسئلہ پر تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ انسانی شعور، مشینی عمل نہیں ہے۔ اس لئے کہ " ایک مشین کے متعلق یہ تصور ہی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے قیام و بقاء اور مزید نشو و ارتقاء کا ذریعہ بن سکتی ہے" (خطبات صفحہ ۱۷) پروفیسر (A. V. Hill) اپنے ایک لیکچر میں خود حیات کے متعلق بیان کرتا ہے:۔

> "میں آج آپ کے سامنے یہ نہیں کہنا چاہتا (اس لئے کہ آپ اس سے پہلے متعدد بار اس غلط نظریہ کو سن چکے ہیں) کہ مسئلہ حیات موجودہ زمانہ کی طبیعیات اور کیمیا سے سمجھایا جا سکتا ہے۔ خواہ سمجھانے والا کیسا ہی ہوشیار کیوں نہ ہو (ایسا ممکن نہیں) آیا مستقبل کے علم طبیعیات اور کیمیا کے ذریعے ایسا ممکن ہو گا۔ اس کے متعلق میں قیاس آرائی نہیں کرنا چاہتا۔ جب علم طبیعیات کے حوادث غیر متعین ہو جائیں ..... جب علم الکیمیا علم طبیعیات بن جائے۔ اس وقت صورتِ حالات اور ہو گی۔ لیکن اس وقت تک میں (Haldane) کی ہم نوائی میں ہی

ل یہی اس کی سب سے بڑی غلطی ہے۔ "کسی نہ کسی طرح" نہیں۔ بلکہ ایک حکیم مطلق کے ارادہ سے ایک عظیم الشان مقصد کے ماتحت۔

کہتا رہوں گا کہ جب ہم علم حیات (یا اشیاء کی قوت نمو) کو تماما دیکھتے ہیں تو ہمارے سامنے ایک بالکل مختلف صورت آجاتی ہے۔ ایسی صورت جس کی وحدت اور بنیادی فطرت ایسی ہی اہم ہے جیسی طبیعیات کے کسی اور تصور کی۔

(The Physical Reasonableness of Life)

حیات میکانکی عمل نہیں

یعنی زندگی "عناصر میں ظہور ترتیب" کا نام نہیں۔ یہ اپنے امتزاجی عناصر کا میکانکی مجموعہ نہیں۔ اس کی بنیادی فطرت، ان عناصر کی فطرت و اساس سے بالکل مختلف ہے جن سے یہ مرکب ہے۔ لہذا، جب خود زندگی، مادی ارتقاء کے میکانکی عمل کا نتیجہ نہیں تو ظاہر ہے کہ زندگی کا لطیف جوہر یعنی فکر انسانی (Intellect) میکانکی عمل کا نتیجہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ پروفیسر (C. Lloyd Morgan) اپنی مشہور تصنیف (The Emergence of Novelty) میں اس مسئلہ پر مبسوط بحث کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ فکر انسانی، سلسلۂ ارتقاء کی سابقہ کڑیوں کی پیداوار نہیں۔ اسی طرح علم الحیات کا مشہور محقق (Dr. Driesch) لکھتا ہے کہ "نظریۂ میکانکی کی راہ میں۔ ایک بڑی مشکل شعور کا وجود تھا۔ اس لئے کہ شعور بداہتا مادی چیز نہیں" اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ سنہ ۱۹۰۰ء کے بعد، رفتہ، رفتہ علم الحیات اور علم النفس کے محققین کے تصور میں کس طرح بنیادی تبدیلی پیدا ہوتی گئی جس سے یہ میکانکی تصور عہد پارینہ کی داستان بن کر رہ گیا۔ ان محققین کے نزدیک شعور، مادی ارتقاء کا نتیجہ نہیں ہے۔ (The Great Design)

(Wildon Carr) کا حسب ذیل اقتباس (جسے علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں نقل کیا ہے) اس باب میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔

> اگر عقل ارتقاء کی پیداوار ہے تو سارا حیات اور ماہیت حیات کا سارا میکانکی تصور مہمل پڑتا ہے اور صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ جو اصول سائنس نے اختیار کیا ہے اس پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔ اس اصول کو الفاظ میں ادا کرتے ہی ہمیں یہ نظر آجاتا ہے کہ اس کے اندر تناقض موجود ہے۔ بھلا یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ خود عقل؛ جو ادراک حقیقت کی ایک جہت ہے، نتیجہ ہو ایک ایسی چیز کے ارتقاء کا جس کا وجود محض ایک تصور منتزع ہے اسی جہت ادراک کا جسے عقل کہتے ہیں۔ اگر عقل ارتقائے حیات سے وجود میں آئی ہے تو وہ تصور حیات، جس کی رو سے عقل کا بہ حیثیت ادراک حقیقت کی جہت کے نشوونما پانا ممکن ہے، ایک مقرون فعل کا تصور ہونا چاہیئے نہ کہ صرف ایک مجرد میکانکی حرکت کا تصور جس کا خیال

---

[1] مغرب کے مادی تصور سے ماؤف ذہن کا مظاہرہ ان ہی الفاظ میں ہوتا ہے۔

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے؟ ان ہی اجزاء کا پریشاں ہونا

عقل نے اپنے مشہول ادراک کی تحلیل کے ذریعے قائم کرلیا ہے۔ اس کے علاوہ اگر عقل ارتقائے حیات کا نتیجہ ہے تو وہ قائم بالذات نہیں بلکہ منحصر ہے اس چیز کے عمل پر جس سے اس نے ارتقا پائی ہے۔ تو پھر ایسی صورتوں میں سائنس کو کیا حق ہے کہ علم کے موضوعی پہلو کو نظر انداز کرکے معروضی ادراک کو قائم بالذات سمجھ بیٹھے۔ غرض حیاتیات کا سرگ انقتضا ہے کہ سائنس کے اصول پر دوبارہ غور کیا جائے۔"

ان تصریحات سے یہ حقیقت سامنے آگئی کہ انسانی فکر، مادی عناصر کے امتزاج کا نتیجہ نہیں۔ اس سے الگ کچھ اور ہے اور اسکی کنہ و حقیقت دریافت کرلینا، علم الحیات کی دسترس سے باہر ہے۔ چنانچہ (Samuel) اس موضوع پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے۔

یہ کہنا بھی غلطی ہے کہ چونکہ علم الحیات، طبیعیات اور کیمیا کے ذرائع اختیار کرکے ایک خاص حد تک کامیابی حاصل کرچکا ہے اس لئے اس حد سے آگے بھی وہی ذرائع استعمال کئے جائیں۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ اس علم کی کامیابی جس نقطہ پر جاکر رک گئی ہے اس سے آگے ایک نیا موضوع شروع ہو جاتا ہو۔ جو ان (سابقہ) ذرائع کی حدود سے آگے ہو۔

یہاں تک ہم نے یہ دیکھ لیا کہ فکر انسانی ارتقاء کے میکانکی عمل کا نتیجہ نہیں اس سے ہم کم از کم، اس نتیجہ تک تو ضرور پہنچ گئے کہ پیکرِ انسانی میں کسی غیر مادی شے کا انکار محض اس بنا پر نہیں کیا جاسکتا کہ اس کا وجود علم طبیعیات یا علم الحیات کی رو سے میکانکی طور پر ثابت نہیں ہوتا۔ پیکرِ انسانی میں اس قسم کی چیزوں میں سے ایک تو قوتِ فکر (Intellect) ہے جسے ہم نے علم استدلال کے مرکز سے تعبیر کیا ہے اور جسے عرف عام میں دماغ[1] (Brain) کہا جاتا ہے۔ لیکن انسان کی دنیا میں اس کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جس کا دائرہ استدلالی قوت کی حدود سے بھی ماورا ہے۔ قرآن کریم اس چھپی ہوئی دنیا کو نفس کہہ کر پکارتا ہے۔ فلسفہ اسے انا (SELF) یا خودی (EGO) کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ اسی سے انسان کی شخصیت (Personality) عبارت ہے اور اسی سے اس کی انفرادیت (Individuality) قائم ہے۔ جب آپ "میں" کہتے ہیں تو اس سے مفہوم نہ آپ کا گوشت پوست کا جسم ہوتا ہے نہ دماغ بلکہ ان سے کچھ الگ۔ کائنات کا تمام ہنگامہ

نفس انسانی

اسی "میں" سے قائم ہے۔ اسی کا نام "نفس انسانی" ہے جس کا مقام استدلال کی دنیا سے آگے ہے نفسِ انسانی کے متعلق، سائنس کی دنیا ابھی کچھ بھی مفید مطلب معلومات بہم نہیں پہنچا سکی۔ اس باب میں بقول (Samuel)

"سائنس نے بہت تھوڑا فاصلہ طے کیا ہے۔ زندگی اور نفس کے متعلق آج ہمارا علم قریب قریب اسی مقام پر ہے جہاں مادہ کے متعلق ہمارا علم تین چار صدیاں پیشتر تھا۔"

---

[1] دماغ سے مفہوم، کاسہ سر میں مادی خلیات (cells) کا مجموعہ (بھیجا) نہیں بلکہ قوتِ عقل و فکر ہے۔

دل اور دماغ۔ نظر اور فکر (عشق و عقل) میں کیا باہمی تعلق ہے؟ یہ ایک دوسرے پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں؟ ان کے دوائر عمل و نفوذ کے حدود کہاں ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا ابھی تک کوئی جواب نہیں مل سکا — (Sir Charles Sherring) رقمطراز ہے۔

> دل اور دماغ کا باہمی تعلق کیا ہے؟ اس کے متعلق نہ صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ عقدہ لاینحل ہے بلکہ یہ بھی کہ ہنوز وہ بنیاد بھی نہیں معلوم ہو سکی جہاں سے اس سوال کے حل کی ابتدا کی جا سکے (The Brain and its Mechanism)۔

مسٹر (Sullivan) لکھتا ہے۔

> نظریۂ ارتقاء اگرچہ ہمارے جسم کی ارتقائی منازل کے متعلق ہمیں بہت کچھ بتاتا ہے۔ لیکن ہمارے نفس کی ارتقائی منازل پر بہت ہی کم روشنی ڈالتا ہے (Limitations of Science)

علم النفس (Psychology) یا اس کے دوسرے شعبے، نفس کی قوتوں اور اس کے شعوری مظاہر سے بحث کرتے ہیں لیکن نفس کی ماہیت کے متعلق یہ علوم بھی کچھ نہیں بتا سکتے۔ ماہیت تو ایک طرف۔ لارڈ بلفور کے الفاظ میں۔

> کوئی شخص نہ یہ محسوس کر سکتا ہے اور نہ اس امر کو حیطۂ تصور میں لا سکتا ہے کہ طبیعی تبدیلیاں کس طرح نفسیاتی تجارب پیدا کرتی ہیں۔ (The Foundations of Belief)

لارڈ (Lord Belfour) دوسرے مقام پر نفسِ انسانی کی ماہیت کے متعلق جو کچھ لکھتا ہے وہ اسی کے الفاظ میں سنئے۔ وہ کہتا ہے۔

An "I" must have character quite apart from the experiences, active and passive, which fill his conscious life. He must have (or be) a soul—a soul which is something more than an organised collection of capacities or a procession of physical status—a soul which is not only merely substance but has an individuality which is unique and indiscribable.

(Theism and Thought).

لیکن کچھ نہ معلوم ہونے کے باوجود، دنیائے مغرب اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہو چکی ہے کہ

> نفس یا انا (Self) چند خصائص و رجحانات ہی کا مجموعہ نہیں۔ بلکہ یہ شعوری زندگی کا ایک نیا مرکز اور شعوری سرگرمیوں کا نیا سرچشمہ ہے۔ (Moral values and the Idea of God, by Sorley).

پروفیسر (Eddington) جن کا ذکر پہلے آچکا ہے اس موضوع پر بڑے دل کش انداز میں گفتگو کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "ہم[1] نے اس سے پیشتر یہاں تک بحث کی ہے کہ "بجلی کے ذرات "کس طرح سمٹ سمٹا کر انسانی پیکر کی صورت اختیار کر گئے۔ لیکن ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ انسان ان عناصر سے جن کے متعلق پہلے بحث کی جا چکی ہے۔ بالکل مختلف اور جداگانہ شے ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ شعور (Consciousness) نے ارتقائی منازل طے نہیں کیں.... لیکن یہ حقیقت کا ایک ایسا پہلو ہے جو ہماری مادی تحقیق و تفتیش کے دائرے میں نہیں آسکتا۔ یہاں سے مادہ اور روح کی ثنویت[2] کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ ایک طرف شعور ہے کہ وہ مختلف خیالات و کیفیات کی آماجگاہ بنا رہتا ہے۔ دوسری طرف مادی دماغ ہے جس میں سالمات و برقیات بگولہ کی طرح رقص کرتے رہتے ہیں۔ ان دونوں میں باہمی تضاد و تباین بھی ہے اور عجیب و غریب قسم کا تطابق و توافق بھی۔ میکانکی تصورِ حیات یہی کہے گا کہ جب ہمارے دماغ میں برقی سالمات رقص کرتے ہیں تو ان سے خیالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ شعور انسانی، جذبات و خواہشات۔ آرزوؤں اور امنگوں اور حقوق و فرائض کی ایک نرالی دنیا اپنے اندر لئے ہے جن کے ادنیٰ سے اشارے پر دماغ کے تمام اجزائے لاتیجزی رقص کرنے لگ جاتے ہیں۔ یہ وہ دنیا ہے جہاں کے احوال و کوائف، طبیعیات کے پیمانوں سے نہیں ماپے جا سکتے۔ یہی پروفیسر ذرا آگے چل کر لکھتا ہے کہ (جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے) "محسوسات کی دنیا میں ہم اشیاء کی حقیقت کے متعلق کچھ بھی علم نہیں رکھتے۔ ہم صرف ان اشارات (Symbols) کو جانتے ہیں جو ہمارے حواس کے ذریعے ہمارے ذہن پر مرتسم ہوتے ہیں۔ لیکن اس تمام کائنات میں ایک چیز ایسی بھی ہے جس کا ہمیں براہ راست علم ہے اور وہ ہے انسان کا قلب (Mind)۔ ہم "اشارات" سے اشیاء کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے۔ لیکن اگر ہم ان اشارات کو اس حقیقت کی دنیا کے پس منظر کے سامنے رکھدیں جس سے ہمارا قلب متعلق ہے۔ تو ہم اشیاء کی حقیقت تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن خود قلب انسان کی حقیقت، طبیعیات کے قوانین سے معلوم نہیں ہو سکتی اس لئے کہ یہ قوانین صرف "اشارات" تک جا سکتے ہیں۔ ان سے آگے نہیں.... بڑھ سکتے لیکن جب زندگی شعور کے ساتھ متمسک ہو جاتی ہے تو ہم ایک بالکل جداگانہ دنیا میں جا پہنچتے ہیں۔ یہ وہ دنیا ہے جس میں طبیعیات اور کیمیا کے اصول اسی طرح ناکام رہ جاتے ہیں جس طرح یہ کوشش کہ انسانوں کی جماعت پر گرامر کے قواعد

---

[1] ترجمہ کے بجائے مفہوم پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ [2] اس ثنویت کا حل صرف قرآن پیش کر سکتا ہے۔ لیکن اس بحث کا مقام یہ نہیں۔

ضوابط کی مانند قوانین سے حکومت کی جائے"۔

غور فرمایا آپ نے کہ مغرب کے "مادہ پرست" نفس انسان کے متعلق کس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں؟ اور دیکھئے! پروفیسر (C. Lloyd Morgan) نے "ارتقائے نفس" کے عنوان سے ایک محققانہ مقالہ لکھا ہے جس کے اخیر میں وہ رقمطراز ہے:-

> میں اپنے اس عقیدہ کا اعتراف کرتا ہوں کہ نفس کے، اس ارتقاء کو ایک "نفس اعلیٰ" (Supreme Mind) کا مظہر یا عکس سمجھنا چاہیئے۔ وہ "نفس اعلیٰ" جو ان تمام اشیاء کا خالق ہے جسے ہم "جدید" سے تعبیر کرتے ہیں۔ میں اس ارتقائے نفس کے اندر یہی دیکھتا ہوں کہ اوپر سے نیچے اور اول سے آخر تک ایک عظیم الشان اسکیم (تدبیر) عمل پیرا ہے۔ میرا یہ بھی عقیدہ ہے کہ فطرت کی ہر شے میں یہ ارتقائی بالیدگی۔ خدائی عاملیت (Divine Agency) کا ہی مظاہرہ ہے۔ اور چونکہ اس سلسلۂ ارتقاء میں نفس انسانی بلند ترین مقام پر ہے۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ارتقائے نفس انسانی اس "نفس اعلیٰ" کی عاملیت کا آئینہ ہے۔ لیکن (جیسا کہ میرا عقیدہ ہے) یہ "نفس اعلیٰ" لامحدود اور زمان کی قیود سے بے نیاز ہے۔ اس کی ذات کے لئے "اول" اور "آخر" اور "حدت" و "اعادہ" کے الفاظ ان معانی میں استعمال نہیں کئے جا سکتے جن معانی میں یہ نفس انسانی سے بحث کرتے وقت استعمال ہوتے ہیں...... وہ "روح خالق" جو قدیم اور واجب الوجود ہے ارتقاء کی پیداوار نہیں۔ بلکہ وہ ایسی ذات ہے کہ خود ارتقاء کی بڑھتی ہوئی صورت اس کا پرتو ہے۔

دوسرے مقام پر لکھا ہے:-

> میرا یہ عقیدہ ہے کہ جانداروں میں یہ ارتقائے نفس۔ خدائے تعالےٰ کی قوت تخلیق و ہدایت (Creative-and Directive Power of God.) کا رہین منت ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ "ارتقائے نفس" کی ترکیب کا اطلاق خود خدائی ذات پر بھی ہوتا ہے۔ نہیں۔ نفس یا روح خداوندی (The Great Design) قدیم ہے اور زمان و مکان کی حدود سے بالا۔

اقتباس بالا میں "خدائے تعالیٰ کی قوت تخلیق و ہدایت (Creative and Directive Power-of God.) کے الفاظ کو سامنے رکھئے اور پھر قرآن کریم کی ان آیات جلیلہ پر غور کیجئے جن میں اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا ذکر ہے اور سوچئے کہ کیا یورپ کا مادہ پرست، سائنس کی تحقیقات کی رو سے ان ہی نتائج تک نہیں پہنچ رہا جن کی طرف قرآن کریم نے آج سے چودہ سو سال پیشتر اشارہ کیا تھا؟ سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ فرعون کے سوال کے جواب میں کہ (فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى) "اے موسیٰ۔ تم دونوں بھائیوں کا رب کون ہے؟" حضرت موسیٰ نے فرمایا:

قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ﴿۲۰/۵۰﴾

کہا کہ ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر شے کو اس کی پیدائش عطا کی اور پھر اسے راس کے کمال تک پہنچنے کی راہ بتائی۔

اسی طرح حضرت ابراہیم نے فرمایا:

اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ ۝ (۲۶)

اللہ وہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا اور پھر وہی میری راہنمائی کرتا ہے۔

سورہ اعلیٰ میں ہے:-

اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۝ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی (۸۷)

وہ خدا جس نے انسان کو پیدا کیا اور درست کیا۔ پھر اس نے انداز کے مطابق راس کی ہر شے میں تناسب و موزونیت پیدا کر دی) اور پھر اس کی راہ نمائی کی۔

ان آیات میں خلق اور ھدیٰ پر غور کیجئے۔ اور پھر دیکھئے کہ پروفیسر مارگن کے الفاظ (- Creative and Directive power -) کیا ان ہی قرآنی الفاظ کا ترجمہ نہیں! غور کیجئے کہ قرآن، علم انسانی کو کن بلندیوں تک لے جاتا ہے؟ اگر ان محققین مغرب کے سامنے کہیں قرآن ہوتا تو ان کی راہیں کس قدر آسان ہو جاتیں؟ ان کی حالت یہ ہے کہ مدتوں غلط رستوں پر چلتے رہتے ہیں اور پھر ہزاروں ٹھوکریں کھا کر صحیح راہ پر آتے ہیں۔ اگر تلاش حقیقت کے اس بحر بے کنار میں قرآنی روشنی کے مینار ان کے سامنے ہوں تو ان کا ہر قدم منزل کی طرف بڑھے اور انہیں اندھیرے میں ٹکریں نہ مارنی پڑیں (لیکن اس بحث کا یہ مقام نہیں)۔

نفس انسانی کے متعلق جو کچھ گذشتہ صفحات میں لکھا جا چکا ہے۔ اسے بالفاظ دیگر یوں[1] سمجھئے کہ حیات، ربانی توانائی (Divine Energy) کی مظہر ہے جو عالمگیر ہے اور ساری کائنات کی رگ رگ میں برق تپاں کی طرح جاری و ساری۔ جب حیات شعور (Consciousness) سے متعارف (identify) ہوتی ہے تو اس سے انسانی انا (Human Ego) متشخص ہوتا ہے۔ شعور انسان کی انفرادی (Individual) شے ہے۔ میرے دکھ اور درد کے احساس (Feeling) میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔ دوسرے میرے ساتھ ہمدردی کر سکتے ہیں۔ میرے درد کا مداوا سوچ سکتے ہیں۔ لیکن میرے درد کے احساس میں شرکت نہیں کر سکتے۔ چونکہ نفس انسانی (Ego) حیات اور شعور کے تمسک و تعارف سے متشخص ہوتا ہے اس لئے یہ بھی انفرادی ہوتا ہے۔ اسی انفرادیت کی رو سے یہ اپنا مستقل وجود رکھتا ہے۔ شعور انسانی میکانکی عمل ارتقار کا نتیجہ نہیں ہے۔ اس لئے نفس انسانی بھی طبیعی ارتقار کی تخلیق نہیں۔ پیکر انسانی اس الیغو کا ذریعہ اظہار (vehicle) ہے۔ اصل انسان یہی ایغو ہے۔

---

[1] دیکھئے اقبالؒ کا خطبہ چہارم۔

مستی زبادہ می رسد واز ایاغ نیست
ہرچند بادہ را نتواں خورد بے ایاغ

الیغو کی انفرادیت کبھی ضائع نہیں ہوتی۔ اس لئے پیکر بدل دینے سے اس پر کچھ اثر نہیں پڑ سکتا۔ شعور انسانی کے ظرف میں ایسی وسعتیں پیدا کی جا سکتی ہیں کہ حیات جس انداز میں مکمل طور پر اپنا نمود چاہتی ہے یہ اس کے قابل ہو جائے اسی کا نام استحکام خودی ہے۔

جب حیات اور شعور اپنی لامتناہیت (Infinity) میں متعارف ہوتے ہیں تو اسے (علامہ اقبال کے الفاظ میں) آخری الیغو (ULTIMATE EGO) کہا جاتا ہے۔ وہ اس آخری الیغو کی بحث کے بعد لکھتے ہیں:-

> ربانی توانائی کا ہر ذرہ خواہ اپنے وجود کے اعتبار سے کیسا ہی ناچیز کیوں نہ ہو۔ ایک الیغو (خودی) ہے لیکن خودی کی نمود (expression) کے مختلف مدارج ہیں تمام دائرہ ہستی میں، خودی کا تدریجی ارتقاء جاری و ساری ہے حتیٰ کہ پیکر انسانی میں پہنچ کر یہ اپنی تکمیل حاصل کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم آخری الیغو (Ultimate EGO -) کو انسان کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب بتاتا ہے۔ (خطبات صفحہ ۷۲)

انسانی الیغو اپنے وجود۔ انفرادیت اور اختیار (وارادہ کی بنا پر عجیب و غریب صفات و خصوصیات (Attributes — and characters -) کا حامل ہوتا ہے۔ جوں جوں اس میں استحکام اور وسعت پیدا ہوتی جائے۔ اس کی خصوصیات، آخری الیغو کی خصوصیات و صفات سے مشابہ ہوتی جاتی ہیں۔ لیکن اگر اس میں ضعف اور اضمحلال پیدا ہوتا جائے تو یہ درجہ انسانیت سے گر کر برباد ہو جاتا ہے۔ جن اعمال سے خودی میں استحکام پیدا ہوتا ہے انہیں اعمال صالحہ کہا جاتا ہے۔ جن سے اس میں ضعف آتا ہے وہ سیئات ہیں۔ بقول علامہ اقبالؒ:-

> دنیا میں دکھ پہنچانے والے یا آرام دینے والے اعمال نہیں ہوتے۔ صرف خودی کو مستحکم کرنے والے یا اسے تحلیل (Dissolve) کر دینے والے اعمال ہوتے ہیں۔ یہ اعمال ہی ہیں جن سے خودی تحلیل ہو جاتی ہے اور اعمال ہی ہیں جن سے اس میں مستقبل کی زندگی بسر کرنے کا سلیقہ آ جاتا ہے...... لہٰذا انفرادی بقا ہمیں بطور استحقاق نہیں مل سکتی۔ یہ ذاتی جدوجہد سے حاصل کرنی پڑتی ہے۔ انسان اس کے لئے امیدوار ہوتا ہے۔
>
> (خطبات صفحہ ۱۱۳)

ان تصریحات کو سامنے رکھئے اور گذشتہ صفحات میں نفس انسانی کے متعلق جو کچھ مغربی محققین کے خیالات سے مقتبس کیا گیا ہے اس پر پھر غائرانہ نگاہ ڈالئے بات واضح ہو جائے گی (نفس کے متعلق مزید تفصیلات میں جانے کا یہ مقام نہیں جس سلسلہ میں یہ بات چھڑی ہے اس کے لئے اتنے سے اشارات کافی سمجھے جاتے ہیں۔)

گزشتہ صفحات میں یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی ہے کہ انسان کے پاس عقل (یعنی علم استدلالی) کے علاوہ کچھ اور بھی ہے جس پر عقل کے قوانین حکمرانی نہیں کر سکتے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا انسانی زندگی کے اس دائرے میں (جو عقل کی فرمانروائی سے باہر ہے) اور اک حقیقت کا امکان ہے؟ اس دائرے کے بلند ترین مقام کا نام "نفسِ انسانی" ہے (Human Ego) لیکن ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ انسان ہی نہیں بلکہ حیوانات تک سے بعض افعال اس قسم کے سرزد ہوتے ہیں جو عقل کے تابع نہیں ہوتے۔ اس لئے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ انسان سے جو اعمال ایسے سرزد ہوتے ہیں جو اس کی عقل کے تابع نہیں ہوتے وہ بالضرور اس کے نفس ہی کے مظاہر ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس قسم کے افعال (جو عقل کی فرماں روائی سے باہر ہیں) کس کس شعبے سے سرزد ہوتے ہیں۔ اس باب میں ہمارے سامنے سب سے پہلے وہ چیز آتی ہے جسے جبلّت (Instinct) کہتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ

جبلّت

وہ دائرہ ہے جس میں استدلال کو کوئی دخل نہیں۔ بلکہ اس کی ابتدا اس وقت ہوتی ہے جب عقل و شعور ہنوز بیدار بھی نہیں ہوتے۔ انسان کے علاوہ باقی کائنات میں جبلّت وہی چیز ہے جسے عام طور پر قوانینِ فطرت کہا جاتا ہے جن کی رو سے یہ تمام سلسلہ ایک نظم و ضبط کے ماتحت چلا جا رہا ہے۔ پانی جب تک سیال ہے نشیب کی طرف بہتا ہے۔ جس قالب میں چاہیئے ڈھل جاتا ہے۔ ایک خاص درجۂ حرارت میں پہنچ کر بھاپ بن کر اُڑنے لگ جاتا ہے۔ تفریط کی طرف آئیے تو ایک خاص مقام پر سردی سے منجمد ہو جاتا ہے۔ یہ اس کی جبلّت ہے۔ یہی اس کی "فطرت" ہے۔ آگ ہمیشہ حرارت پہنچاتی ہے۔ پتھر کو اُوپر اُچھالئے ہمیشہ نیچے کی طرف آتا ہے۔ اس کے بعد زندگی کی دنیا کی طرف آئیے۔ بط کا بچہ انڈے سے نکلتے ہی پانی کی طرف دوڑتا ہے۔ لیکن مرغی کا بچہ پانی میں اپنی ہلاکت دیکھتا ہے۔ شیر بھوکوں مر جائیگا لیکن کبھی گھاس کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ بکری کا بچہ جاں بلب کیوں نہ ہو کبھی گوشت کے پاس تک نہ آئے گا۔ یہی ان کی جبلّت ہے جس کی خلاف ورزی کا انہیں اختیار نہیں۔ ہر ایک اس قانون کی اطاعت کر رہا ہے۔ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (۱۶/۴۹) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اللہ کے حضور سجدہ ریز ہے كُلٌّ لَّهٗ قَانِتُوْنَ سب اسی کے قانون کے تابع ہیں۔ جہاں تک انسان کی طبیعی زندگی کا تعلق ہے۔ اس کا بچہ بھی ان چیزوں کو جبلّی طور پر اختیار کر لیتا ہے۔ انسان کا بچہ بھی پیدا ہوتے ہی اپنی خوراک کے سرچشموں کی طرف لپک کر جاتا ہے۔ یہ اس لئے نہیں کہ اُس نے عقلاً یہ فیصلہ کیا ہے کہ اسے ایسا کرنا چاہیئے۔ بلکہ اس لئے کہ اس کے اندر خود بخود "بلا ارادہ"[1]

---

[1] ہمیں اس مقام پر مسئلہ تعیین اور غیر تعیین (Determinism and Indeterminism) کی اُس کشمکش میں نہیں اُلجھنا چاہیئے جو اس باب میں یورپ کے مفکرین و محققین کی بحث و تمحیص کا مرکز بن رہی ہے۔ ہم صرف اس عمومی حالت کا ذکر کر رہے ہیں جو ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے (نہ کہ برقیات کے قانون حرکت و گردش کا)

اس قسم کی ایک امنگ (Urge) پیدا ہوتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا جبلت اس مسئلہ کا حل پیش کر سکتی ہے جو ہمارے پیش نظر ہے؟

طبیعی زندگی کے قوانین جہانتک انسان کی طبیعی زندگی کا تعلق ہے۔ یہ بھی حیوانات کی طرح طبیعی قوانین کے تابع ہے۔ بھوک، پیاس، تکان، نیند، سلسلۂ تولید وغیرہ میں دونوں پر ایک ہی قسم کے قوانین جاری ہیں۔ لیکن انسان کو ساتھ ہی اختیار وارادہ بھی دیا گیا ہے۔ اگرچہ اپنی طبیعی زندگی میں یہ اپنے اختیار وارادہ کو زیادہ استعمال میں نہیں لاتا، کہ قوانین طبیعی کی خلاف ورزی کی سزا فوراً مل جاتی ہے۔ بایں ہمہ اس کے اختیار وارادہ کے مظاہرات ہر وقت ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ انسان کا بچہ بھی اپنی پیدائش کے ساتھ ہی اپنی خوراک کے سرچشموں کی طرف اسی طرح لپک کر جاتا ہے جس طرح بکری کا بچہ۔ لیکن انسان کے بچہ کی ساتھ ہی یہ حالت بھی ہے کہ جو چیز اس کے سامنے آئے۔ مفید ہو یا مضر۔ حیات آفریں ہو یا ہلاکت انگیز۔ بلا تکلف منہ میں ڈال لیتا ہے۔ اسی لئے جب بچہ ذرا گھٹنیوں چلنے لگتا ہے تو اس کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کبھی آگ میں ہاتھ ڈال دیا۔ کبھی پانی میں ڈبکیاں لینے لگا۔ کہیں اس چیز کو نگل گیا۔ حیوانات کے بچوں کی یہ کیفیت کبھی نہیں ہوتی۔ اور ایک بچپن پر ہی کیا موقوف ہے۔ بڑھاپے تک تمام سفر حیات میں قدم قدم پر یہی ہوتا ہے۔ ساری زندگی خلاف فطرت اور اس کا نتیجہ، ہزاروں قسم کی بیماریاں۔ ہماری اپنی تو یہ حالت تھی ہی۔ ہم نے جن جانوروں کو اپنے قریب لا کر گھریلو (Domestic) بنایا۔ اپنے اغراض ومقاصد کی خاطر آہستہ آہستہ ان کی طرز زندگی کو بھی ایسا بدلا کہ انہیں بھی اپنے جیسے عوارض وآلام کا شکار بنا دیا۔

جب انسان کا اپنی طبیعی زندگی میں یہ عالم ہے تو اس کی عائلی، معاشری، تمدنی، معاشی، سیاسی زندگی میں جو کیفیت ہوگی وہ محتاج تفصیل نہیں۔ کائنات کی دیگر اشیاء اور انسانی زندگی کا یہی فرق ہے جسے ان بصیرت افروز الفاظ قدسی میں بیان کیا گیا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؕ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۝ (۲۲/۱۸)

کیا تم نے دیکھا نہیں کہ آسمان اور زمین کی ہر چیز۔ سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، چوپائے اور بعض انسان بھی خدا کے حضور میں سجدہ ریز ہیں (اسی کے وضع کردہ قوانین فطرت پر عمل پیرا ہو کر اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا مظاہرہ کر رہے ہیں) بعض انسان ایسے بھی ہیں جو قوانین خداوندی سے سرکشی برتتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جن پر عذاب خداوندی مقدر ہو چکا ہے (ان کے لئے کامیابی وکامرانی کے بجائے ہر قسم کی ذلت

رسوائی منتظر ہے) اور (ظاہر ہے کہ) جسے خدا کا قانون رسوا کر دے تو اس کے لئے عزت دینے والا کون ہو سکتا ہے؟) کوئی بھی نہیں۔ (یہی خدا کا قانون ہے جو اٹل ہے۔ نہ یہ کسی کی سفارش سے تبدیل ہو سکتا ہے نہ کسی کے جبر سے۔ وہ مختار کل ہے) بلاشبہ خدا اپنے قانون مشیت کے مطابق) جو چاہتا ہے کرتا ہے (اور کوئی اسے روکنے والا نہیں)

ضمیر کی آواز لیکن جو سوال ہمارے سامنے ہے اس میں حیوانی زندگی چنداں اہمیت نہیں رکھتی۔ اس سوال کی تو ابتداہی منزلِ انسانیت سے ہوتی ہے۔ لہٰذا دیکھنا یہ ہے کہ کیا وادیِ انسانیت میں جبلت کی راہنمائی کافی ہو سکتی ہے؟ تمدنی زندگی میں انسانی معاملات، اخلاقیات (Ethics) کے دائرہ میں آتے ہیں۔ اور اخلاقیات کے دائرہ میں جبلت کا نام ضمیر (conscience) کی آواز ہے۔ لہٰذا بات یہاں تک پہنچی کہ کیا تنہا "ضمیر کی آواز" اس قابل ہے کہ انسان کی صحیح راہ نمائی کر سکے؟ کیا یہ خیر و شر کی تعیین و تفریق کا قابلِ اعتماد معیار قرار پا سکتی ہے؟ کیا ادراکِ حقیقت اس کے بس کی بات ہے؟

یہ امر بدیہی ہے کہ اخلاقی تقاضیات انسان سے شروع ہوتے ہیں۔ ایک بکری کی جبلت میں ہے کہ وہ گھاس کھائے۔ گوشت کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ لیکن یہ اس کی جبلت میں نہیں کہ وہ گھاس اپنے ہی مالک کے کھیت سے چرے۔ دوسرے کے کھیت میں نہ جا گھسے۔ یہ تقاضا انسان سے شروع ہوتا ہے۔ عام طور پر کہا یہ جاتا ہے کہ انسان کے اندر ایک قوتِ تمیز موجود ہے جو اسے بتا دیتی ہے کہ جائز کیا ہے اور ناجائز کیا؟ اس قوتِ تمیز کا نام "ضمیر" (con-science) رکھا گیا ہے۔ اس کو انسان کے اندر کی آواز یا دل کا فتویٰ کہا جاتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا فی الواقعہ انسان کے اندر کوئی ایسی قوتِ تمیز ہے جو اسے جائز اور ناجائز کا فرق بتا دے؟ یہ بات بادنیٰ تعمق سمجھ میں آ جائیگی کہ انسان کے اندر کوئی ایسی قوت نہیں جو حق اور باطل۔ خیر اور شر۔ جائز اور ناجائز میں تمیز کر سکے۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان کے اندر سے ایک آواز ضرور اٹھتی ہے جو اسے بعض کاموں سے ضرور روکتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ آواز حق اور باطل کی تمیز بھی کرتی ہے۔ مشاہدہ اس کا جواب نفی میں دیتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ حق اور باطل، مطلق اقدار (Absolute Values) کا نام ہے، اضافی اقدار (Relative Values) کا نام نہیں یعنی حق کے یہ معنی نہیں کہ وہ ایک انسان کے لئے حق ہو اور دوسرے کے لئے حق نہ ہو۔ اگر انسان کے اندر کوئی ایسی قوت ہے جو حق و باطل میں تمیز کر سکتی ہے تو ظاہر ہے کہ ہر انسان کے اندر سے یکساں اٹھنی چاہیئے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ گوشت کھانے والے خاندان کے بچے کے سامنے جب گوشت آتا ہے تو اس کی ضمیر اسے بالکل نہیں ٹوکتی۔ لیکن ایک سبزی خور گھرانے کے بچے کے سامنے گوشت کا نام آجانے سے اس کی طبیعت ابا کرنے لگتی ہے۔ جرائم پیشہ قبائل (مثلاً ٹھگوں) کے بچے بلا تکلف انسان کی جان لے لیتے ہیں اور اس میں لذت محسوس کرتے ہیں لیکن جینیوں کا بچہ کیڑوں مکوڑوں کو بھی ایذا نہیں پہنچاتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ نفسِ لوامہ برائی سے روکتا ہے۔

وَلَآ أُقۡسِمُ بِٱلنَّفۡسِ ٱللَّوَّامَةِ (۷۵:۲)

اور نہیں۔ میں ملامت کرنے والی ضمیر کو شہادت میں پیش کرتا ہوں۔

لیکن اسی برائی سے جسے وہ برائی سمجھتا ہے۔ اس نفس میں لوامیت کا جوہر تو ہے۔ لیکن وہ اسی چیز کے خلاف ملامت کرتا ہے جسے اس نے (مختلف اثرات کے ماتحت) قابل ملامت سمجھ رکھا ہے۔ لہٰذا جس چیز کو "ضمیر کی آواز" کہا جاتا ہے۔ وہ حق و باطل کی تمیز کا معیار نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ "آواز" خارجی اثرات سے متاثر ہوتی ہے (Samuel) اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

> اگر یہ صحیح ہوتا کہ انسان کے اندر ایک ایسی فطرتی طاقت ہے جو تمام اثرات سے آزاد ہے اور حق و باطل کے فیصلہ میں کبھی غلطی نہیں کرتی تو نیک عملی کے ہر معاملہ میں تمام انسان ہمیشہ متفق ہوا کرتے اور آج بھی متفق نظر آتے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کی ہم آہنگی نہ کبھی پہلے ہوتی تھی اور نہ آج ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کسی آدمی کا یہ کہنا کہ "میں نے فلاں بات کو نہایت دیانتداری سے حق سمجھ کر اختیار کیا ہے" اس بات کو فی الحقیقت حق نہیں بنا سکتا۔

لہٰذا جس چیز کا نام ضمیر رکھا جاتا ہے وہ ان اثرات سے مرتب ہوتی ہے جو انسان غیر شعوری طور پر وراثت، ماحول، تربیت اور تعلیم سے اخذ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کا اپنا وجود کچھ نہیں ہوتا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ضمیر (Internalised society) کا نام ہے۔ لہٰذا ضمیر میں یہ صلاحیت کہاں ہو سکتی ہے کہ وہ حق اور باطل، خیر اور شر، غلط اور صحیح کا امتیاز کر کے بتا دے۔

وجدان | جبلت کے بعد ہمارے سامنے علم غیر استدلالی کا ایک اور میدان آتا ہے۔ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا۔ ایک شخص کے دو بچے میں وراثت و ماحول کے اعتبار سے انہیں (قریب قریب) یکساں ہونا چاہیئے۔ لیکن ان میں سے ایک طبعاً (از خود) شاعری کا ذوق رکھتا ہے اور دوسرے کو اس سے قطعاً کوئی لگاؤ نہیں۔ ایک شخص کو آپ دیکھیں گے کہ کوئی عمدہ سی تصویر اس کے سامنے آجائے وہیں ٹھٹک کر رہ جائے گا اور دنیا جہان سے بے خبر، پہروں کھڑا رہے گا۔ لیکن باقی دنیا اس کے پاس سے یوں گذرتی جائے گی گویا وہاں کوئی چیز وجہ جاذبیت نہیں۔ وقس علی ہذا۔ یہ "ذوق کی دنیا" استدلال کی دنیا سے بالکل الگ ہے۔ علم الحیات کی اس وقت تک کی تحقیقات، یہ نہیں بتا سکیں کہ ذوق کا یہ اختلاف کس طرح پیدا ہوا ہے۔ کسی اچھے گانے والے کے ایک الاپ سے آپ کے رگ و پے میں کیف و سرور کی ایک دنیا رقصاں و جنباں نظر آتی ہے لیکن آپ کسی دوسرے کو کبھی نہیں سمجھا سکتے کہ ایسا کیوں اور کس طرح ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ آپ فن موسیقی کے بعض قواعد و اصطلاحات کو سمجھا سکیں گے۔ لیکن اس سے دوسرے پر وہ اثر کبھی مرتب نہیں ہو سکے گا جو آپ پر ہوا۔ اس کے علاوہ

آپ یہی کہیں گے کہ

ذوق این بادہ ندانی بخدا تا نچشی!

کیف و سرور کی اس دنیا کے جرعاتِ نشاط آور و بہجت آگیں، عقل کے پیمانوں سے نہیں ماپے جا سکتے۔ اس کا تعلق ذوق سے ہے جسے وجدآن کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے سماعت و بصارت یعنی قوتِ فکر (Intellect) کے علاوہ "فؤاد" کا بھی ذکر کیا ہے۔ دیکھئے (۳۲/۹) یہی فؤاد، وجدان کا سرچشمہ ہے۔ وجدآن کی ایک دوسری شاخ حدس ہے۔ (انگریزی زبان میں اس کے لئے کوئی الگ لفظ نہیں ہے)، مثلاً آپ کے سامنے کوئی معاملہ آتا ہے۔ آپ استدلالات کی کڑیوں کو عبور کئے بغیر (یونہی بلا غور و فکر کسی نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں اور وہ اکثر صحیح نکلتا ہے۔ یا بیٹھے بیٹھے آپ کے جی میں کوئی خیال آتا ہے جس کے لئے کوئی منطقی توجیہہ آپ کے ذہن میں نہیں آتی۔ کچھ عرصے کے بعد آپ دیکھتے ہیں کہ وہ خیال بالکل درست تھا۔ آپ دیکھیں گے کہ وجدآن اور حدس ایک ہی پھول کی دو پتیاں ہیں جن میں نہایت لطیف سا فرق ہے۔ وجدآن کا تعلق یکسر ذوق سے ہے (یا یوں کہیئے کہ شدتِ ذوق کا نام وجدآن ہے) اور حدس میں (بظاہر کچھ) فکر کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ برگسان نے جو کہا ہے کہ "حدس کو یوں سمجھئے کہ گویا فکر ہی کی ایک لطیف ترین شکل ہے۔" (خطبات صفحہ ۳) تو اس سے یہی مقصود ہے۔ یہ نہیں کہ عقل ممارست و مزاولت سے ترقی کرتے کرتے حدس کے مقام تک جا پہنچتی ہے۔ عقل کا دائرہ بالکل الگ ہے۔ وہ اپنے استدلالی دائرہ سے ترقی کر کے غیر استدلالی دائرہ میں آ ہی نہیں سکتی۔ وجدآن یکسر وہبی ملکہ ہے جس میں کسب و ہنر کو کچھ دخل نہیں۔ آپ کبھی اکتسابًا ذوقِ شعری اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتے۔ اگر آپ کے کان، ذوقِ موسیقی سے ناآشنا ہیں تو بڑے سے بڑے آتش نفس موسیقار کی ہزار برس کی محنت بھی آپ میں یہ احساس پیدا نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ جب تاروں میں نغمہ ہی پوشیدہ نہیں تو مضراب کیا کرے گا؟ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ یہ ذوق کس طرح پیدا ہوتا ہے اور کہاں سے آتا ہے؟ وجدان کا بلند ترین مقام نابغہ (Genius) کے پیکر میں ظہور پذیر ہوتا ہے (Genius) کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ یہ معمہ دنیائے عقل و سائنس میں ہنوز محتاجِ کلید ہے۔ علم الحیات کے محققین یہ کہتے ہیں کہ مختلف انسانوں میں عقلی تفاوت ان کی دماغی ساخت کے فرق کی بنا پر ہوتا ہے۔ وہ مختلف دماغوں (Brains) کا حیاتی تجزیہ (Biological analysis) کر کے یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ فلاں دماغ کی ساخت میں کیا نقص تھا، اور فلاں میں کیا کمی۔ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح مادہ کی مختلف شکلیں درحقیقت برقی سالمات (Molecules) کے امتزاجی اختلاف (Difference in combination) کی وجہ سے ہیں۔ اسی طرح مختلف انسانوں میں ذہنی تفاوت بھی ان کے دماغ کی ساخت کی بنا پر ہے۔ یعنی جس طرح سالمات کے ایک خاص امتزاج کا نتیجہ لوہا اور دوسری قسم کے امتزاج کا نتیجہ سونا ہے اور ان دونوں میں خواص کے

Genius کی پیدائش

اعتبار سے جو فرق ہے وہ بالکل بدیہی ہے۔ اسی طرح ایک انسان کی کھوپڑی میں برقی سالمات کا امتزاج ایک خاص انداز سے ہوتا ہے تو اس سے ایک خاص قسم کا دماغ وضع ہو جاتا ہے اور دوسرے میں دوسری قسم کا۔ اور یہی ان کے عقول کے تفاوت کا باعث ہے۔ پھر وہ یہ بھی بتلاتے ہیں کہ دماغ کی مختلف ساخت کن وجوہات کی بنا پر ہوتی ہے۔ یعنی انسانی جسم کی ساخت میں موروثی اثرات۔ بعض بیماریوں کے اثرات۔ خوراک کے نتائج۔ وقس علیٰ ہذا۔ ان علماء کے نزدیک یہ سب کچھ ایک میکانکی طریقہ سے عمل پذیر ہوتا ہے اور ریاضی کے سوال کی طرح اس کا حل بتایا جا سکتا ہے (حالانکہ۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ اب خود علمائے مغرب کی تحقیق یہ ہے کہ فکرِ انسانی، عملِ ارتقاء کا میکانکی نتیجہ نہیں۔ اس لئے مذکورہ صدر علمائے علم الحیات کی تحقیق زیادہ سے زیادہ یہ بتا سکتی ہے کہ مختلف دماغوں کی عنصری ترکیب کس قسم کی ہے اور اس ترکیب کا نتیجہ کیا؟ لیکن وہ یہ قطعاً نہیں بتا سکتے کہ اس ترکیب کا نتیجہ عقلِ انسانی کس طرح مرتب ہو گیا؟) بایں ہمہ ان علماء کی تحقیق کے راستہ میں بھی ایک مقام ایسا آتا ہے۔ جہاں ان کے یہ تمام کلیے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں اور وہ مقام ہے (genius) کی پیدائش! علمائے علم الحیات کے علاوہ علمائے نفسیات بھی جب ایک (genius) کے متعلق اپنے دائرۂ علم و تحقیق میں غور کرتے ہیں تو وہ بھی انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ علم النفس کی تحقیق کی رو سے، ایک انسان موروثی اثرات۔ ابتدائی ماحول و تربیت وغیرہ کا مجموعہ ہوتا ہے لیکن (genius) کے معاملہ میں یہ اصول و قواعد بھی سرگرداں دکھائی دیتے ہیں۔ دنیا میں مختلف علوم و فنون کے نادرہ کار مشاہیر کی زندگیوں کا مطالعہ کیجئے۔ وہ عام طور پر وراثت و ماحول کے ان "کلیات و مسلمات" کے علی الرغم حریف نظر آئیں گے۔ ایک کفش دوز کا بچہ، ایک عمر تک پھٹے پرانے جوتوں کی مرمت میں وقت گزارتا ہے۔ لیکن اچانک ایک موقعہ ایسا آتا ہے کہ وہ کود کر میدانِ کارزار میں جا پہنچتا ہے اور کوندے کی چمک کی طرح دیکھتے ہی دیکھتے، دنیا کے بلند ترین جرنیلوں کی صف میں کھڑا ملتا ہے۔ ایک کسان کا بیٹا مدت العمر تک ہل چلاتا اور مویشیوں کے ماحول میں نیم حیوانی سی زندگی بسر کرتا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس کے بعد جب اس کی فلمِ زندگی کا اگلا حصہ "پردۂ سیمیں" پر سامنے آتا ہے تو وہ بساطِ سیاست کا فقید المثال شاطر دکھائی دیتا ہے۔ ایک جاہل اور گنوار لڑکا، یونہی بیٹھے بیٹھے گنگنانے لگ جاتا ہے اور اس کے بعد کتابِ زندگی میں اس کا نام دنیا کے ممتاز ترین شعراء کے ورق میں ملتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے اندر ایک خاص قسم کا جوہر تھا جسے دایۂ فطرت نے ایک خاص وقت تک سلائے رکھا اور جوں ہی وہ مدت ختم ہوئی۔ خوابیدہ جوہر آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھا اور مطلعِ عالم پر نیرِ درخشاں بن کر چمکا۔ یہ ہیں وہ دل و دماغ (یعنی وجدان کے شاہکار) جن کے متعلق نہ علمائے حیاتیات کی سمجھ میں آسکا کہ ان کی تخلیق کے اسباب و حوادث کیا ہیں اور نہ ہی حکمائے نفسیات ہی بتا سکے کہ یہ خفتہ جوہر کہاں سے پیدا اور کس طرح بیدار ہوتے ہیں۔ حیرت کی ان وادیوں میں گم ہو کر کہہ سکے تو فقط اتنا کہ یہ ایک "ناگہانی ارتقا ....

(Emergent Evolution) ہے جو میکانکی سلسلۂ ارتقاء کے حدود سے باہر ہے

"تیس سال کے گہرے تجربے نے اس امر کے لئے بین ثبوت بہم پہنچا دیا ہے کہ کبھی کبھی اب بھی ہوتا ہے کہ غیر مخلوط نسل کے انسانوں کے اندر اس قسم کے افراد پیدا ہو جاتے ہیں جن کے متوارث خصائص (اپنے آباء و اجداد سے) بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ ان افراد کو (Mutants) یا (sports)[1] کہا جاتا ہے۔

(The Nature of Living Matter. By L. Hogben)

پروفیسر (Taylor) اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

ان تمام اسباب و علل کا جن سے کوئی شے وجود پذیر ہوتی ہے۔ ہر ممکن محاسبہ کر لینے کے بعد بھی یہ حقیقت باقی رہ جاتی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ شے اپنے نشو و نما کے بعد ایک ایسی خصوصیت کی مظہر بن جائے جو ان عناصر میں کہیں بھی نہ ہو جن سے اس شے نے ترکیب پائی تھی۔ یہ خصوصیت ایسی ہوتی ہے کہ ان تمام عناصر کی خصوصیات کا علم حاصل ہو جانے کے بعد بھی اس نرالی خصوصیت کے متعلق پہلے سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

(Evolution in the Light of Modern knowledge)

"نجائی ارتقا" (Emergent evolution) کے نظریہ کا ایک دوسرا مؤید (Lloyd Morgan) اس باب میں لکھتا ہے۔

اگر یہ پوچھا جائے کہ جس چیز کو تم نجائی (Emergent) کہتے ہو وہ بالآخر ہے کیا؟ تو اس کا مختصر جواب فقط اتنا ہے کہ یہ ایک نئی قسم کا رابطہ ہوتا ہے۔ اور اگر یہ پوچھا جائے کہ یہ روابط کس اعتبار سے نئے ہوتے ہیں۔ تو اس کا جواب اتنا ہی ہے کہ ان کی خصوصیات کے متعلق ان کے ظہور پذیر ہونے سے پیشتر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

(Emergent Evolution)

"نجائی ارتقاء" کے نظریہ اور اس کی تائید میں محسوس شواہد و نظائر نے کائنات کے متعلق میکانکی تصور کی بنیادیں تک ہلا دی ہیں۔ اس مقام تحیر پر پہنچ کر اس حقیقت کے اعتراف کئے بغیر بن نہیں پڑتی کہ

علت و معلول کی زنجیر میں بعض اوقات ایسے مستثنیات آتے ہیں جنہیں صرف دست قدرت ظہور میں لا سکتا ہے۔ (Samuel)

---

[1] یہ (sports) صرف نوع انسانی ہی میں پیدا نہیں ہوتے بلکہ نباتات اور حیوانات میں بھی ایسا ہوتا ہے۔ عام طور پر ایک پھول کے بیج سے ایک ہی قسم کے پھول پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسی بیج سے ایک الگ قسم کا پھول پیدا ہو جائے اسے (sport) کہتے ہیں اور ارباب ذوق اس کی تلاش میں رہتے ہیں۔

بہرحال، ہم نے دیکھنا یہ تھا کہ وجدان ایک وہبی شے ہے اور ایک (genius) کی پیدائش، دنیائے سائنس کے لئے معمہ ہے۔ اس حقیقت کو خاص طور پر ذہن نشین کر لینے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ آگے چل کر کئی ایک مقامات ایسے آئیں گے جہاں اس کے دہرانے کی ضرورت پڑے گی۔

کیا وجدان ادراکِ حقیقت کر سکتا ہے؟

لیکن اس کے بعد پھر وہی سوال ہمارے سامنے آتا ہے کہ کیا وجدان حقیقت تک پہنچانے کے لئے انسان کی راہنمائی کے لئے کافی ہے؟ اس کا جواب بھی ظاہر ہے۔ جس طرح ہم دیکھ چکے ہیں کہ مختلف انسانوں میں ضمیر کی آواز مختلف سمتوں کی طرف راہ نمائی کرتی ہے۔ اسی طرح وجدان کی کیفیت ہے۔ ہر انسان کا ذوق الگ الگ اور اس کی وجدانی کیفیت جداگانہ ہے لیکن انسانیت کا مسئلہ ایک ہے حقیقت ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ اس لئے حقیقت کا علم یا مسئلہ۔ انسانیت کا حل بھی ایک ہی ہونا چاہیئے۔ علاوہ بریں ایک اور چیز بھی قابلِ غور ہے۔ یعنی یہ کہ وجدان، خود صاحبِ وجدان کی سیرت پر کیا اثر ڈالتا ہے؟ ایک (Genius) اپنے خاص فن یا شعبہ میں امتیازی حیثیت لئے ہوتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ سیرت کے اعتبار سے بھی اسی نسبت سے بلند مقام پر ہو۔ بلکہ عام مشاہدہ تو یہ ہے کہ اس قسم کے لوگوں کی پرائیویٹ زندگی کچھ ایسی قابلِ تحسین نہیں ہوتی۔ بڑے بڑے فلاسفر بلند پایہ سیاستدان۔ مدبرینِ روزگار شہرۂ آفاق سپہ سالار۔ نادرہ کار آرٹسٹ۔ فقید المثال اربابِ قلم کی (جو تنہا عقل یا اپنے وجدان ہی کو انسانی راہ نمائی کے لئے کافی سمجھتے ہوں) پس پردہ زندگی عام طور پر بھیانک نظر آئے گی۔ اس لئے یہ ضروری نہیں کہ جو شخص کسی خاص فن میں نابغہ (Gnius.[1]) ہو وہ سیرت کے اعتبار سے بھی ویسا ہی بلند ہو بلکہ عام صورت تو یہ ہے کہ (مستثنیات کو چھوڑ کر) جو شخص جتنا زیادہ ذہین و فطین ہو اتنا ہی زیادہ عیار و فتان ہوتا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے مجرموں کو دیکھئے۔ دماغی اعتبار سے اوسط درجے کے لوگوں سے بہت آگے ہوں گے اس سے یہ مفہوم نہیں کہ ہم عقل و دانش کی فراوانی یا نبوغ (Genius-ness) کی مذمت کرتے ہیں۔ یہ سب قابلِ فخر و مزیت ملکات ہیں۔ کہنا صرف یہ ہے کہ تنہا نبوغِ انسانی راہ نمائی کے لئے کافی نہیں ہو سکتا۔

اس سے بھی آگے بڑھئے تو غیر استدلالی علم کا ایک اور میدان سامنے آتا ہے۔ یہ وہ میدان ہے جس میں

---

[1] پھر آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ ایک (Genius) اپنے فن میں نادرہ کار ضرور ہوگا لیکن زندگی کے دوسرے شعبوں میں کھویا کھویا پھرے گا۔ اس لئے اس کی زندگی تمام تر (As a Whole) ناکام رہے گی۔ لہٰذا اگر کوئی یہ بھی کہے کہ ایک (Genius) حقیقت کا شاہد کر لیتا ہے تو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جائے گا کہ اسے حقیقت کے کسی ایک گوشے کی جھلک دکھائی دی ہے۔ خود حقیقت کی نہیں۔

تصوّف

قوتِ خیال یا ارادہ (یا قوتِ نفس) کے مظاہر دکھائی دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں اسے دنیائے تصوّف کہا جاتا ہے لیکن چونکہ تصوّف سے ذہن ایک خاص منظم ادارہ (systematised institution) کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اس لئے بہتر ہے کہ اسے ہم اصطلاحی نام سے نہ پکاریں۔ انگریزی میں اسے باطنیت —— (Mysticism) کہا جاتا ہے۔ لیکن کسی اور مناسب لفظ کے فقدان کی وجہ سے ان کے ہاں باطنیت کا دامن نبوت کو بھی اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔ اس لئے اس لفظ (Mysticism) سے بھی ایک غلط فہمی کا اندیشہ ہے (اور یہ اندیشہ مزعومہ نہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جن حضرات نے ان امور کا مطالعہ صرف انگریزی زبان کی وساطت سے کیا ہے وہ تصوّف اور نبوت کے خصائص و کوائف اور احوال و ظروف میں فرق نہیں کرتے۔ اور اس طرح ایک عجیب چکر میں الجھے رہتے ہیں) تصوّف در اصل "گیان دھیان" کی دنیا ہے جس کا تعلق قوتِ نفس کے شواہد و مظاہر سے ہوتا ہے۔ سہولتِ بیان کی خاطر (بنا برمجبوری) ہم اسے "باطنیت" کے لفظ سے تعبیر کریں گے۔ تاریخِ انسانی کے کسی دور پر نگاہ ڈالیئے۔ اس علم کے مظاہر ہر ملک اور ہر زمانہ میں دکھائی دیں گے۔ علمی اعتبار سے دیکھئے تو قوتِ ارادی کے ابتدائی مراحل "خود ایمائیت" (Auto suggestion) سے لیکر اس کے آخری مراحل تک ایک ہی سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں۔ جبلت اور وجدان کے متعلق ہم نے دیکھا ہے کہ وہ یکسر وہبی ملکات ہیں۔ کسب و ہنر کو ان میں کچھ دخل نہیں۔ لیکن باطنیت ایک اکتسابی فن ہے۔ چیلہ اپنے گرو سے۔ مرید اپنے پیر سے۔ شاگرد اپنے استاد سے[۱] اس

یہ اکتسابی فن ہے

فن کی باقاعدہ تحصیل کرتا اور مختلف قواعد و ضوابط کے ماتحت ریاضتوں اور مشقتوں سے اس قوت میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے۔ اس لئے یہ فن اکتسابی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کا دائرہ، علم استدلالی سے جداگانہ ہے۔ لیکن اگر آپ بغور دیکھیں گے تو مترشح ہوگا کہ یہ در اصل ادراکِ حقیقت کا ایک فکری طریق (Intellectual Process) ہے۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ سائنس کی تحقیق اس وقت تک یہ نہیں بتا سکی کہ تفکرِ انسانی (Intellect) ہے کیا؟ نفس کے متعلق بھی پہلے بحث آچکی ہے کہ اس کی کنہ و حقیقت کے متعلق بھی ہر زبان خاموش اور ہر نگاہ متحیر ہے۔ یورپ کا علم النفس (Psychology) ہنوز اپنے عہدِ طفولیت میں ہے۔ اگرچہ عہدِ حاضر میں اس کے جلیل القدر ائمہ ہو گزرے (اور موجود) ہیں۔ بایں ہمہ، ان کے ہاں انسانی نفس کی کیفیات۔ اس کے تاثرات و ماجریات۔ اقسام و مدارج اور طبقات و اطوار کے متعلق تو بحثیں ہوتی ہیں لیکن خود نفسِ انسانی کے متعلق انہیں بھی کچھ معلوم

---

[۱] چونکہ اس وقت اس موضوع پر خالص علمی اور تاریخی اعتبار سے گفتگو ہو رہی ہے اس لئے اسے عقائد کے چشمہ سے نہیں دیکھنا چاہیئے۔ [۲] یورپ اور امریکہ میں اس کے لئے باقاعدہ درسگاہیں (institutions) کھلی ہوئی ہیں۔

نہیں کہ یہ ہے کیا؟ باقی رہے "ارباب حال" (خواہ مشرق میں ہوں یا مغرب میں) وہ خود حیرت کی وادیوں میں گم ہیں۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے تو زیادہ سے زیادہ یہ کہ

کاں راکہ خبر شد خبرش باز نیامد

اس لئے نفس کی کنہ و حقیقت کے خیال کو چھوڑ کر دیکھنا یہ چاہیئے کہ یہ علم ہمارے اس سوال کا حل بتا سکتا ہے جو اس بحث کا مرکز ہے؟

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، حقیقت کُلّی وحدت ہے اور ناقابلِ تقسیم۔ اس لئے جس آنکھ کے سامنے حقیقت بے نقاب ہو، زمان و مکان کے بعد و فصل کے باوجود، اس کا نتیجہ منتخرجہ ہر مقام پر ایک ہونا چاہیئے۔ لیکن آپ تاریخ کے اوراق کو اُلٹ کر دیکھئے، یا اپنے دور پر نگاہ ڈال کر، آپ دیکھیں گے کہ مدعیانِ کشف کے تجرباتی نتائج ایک دوسرے سے مختلف[1] ہوں گے۔ (William James) اپنی مشہور کتاب (The Varieties of Religious Experience —) میں اس موضوع پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے۔

> ان لوگوں کے خوابوں اور پیغاموں میں بعض بجید حماقت آمیز ہوتے ہیں۔ ان کے عالم وجد و مستی کے ماجریات میں سے بعض، انسانی اعمال و سیرت کے لئے کسی نفع کا موجب نہیں ہوتے۔ لہٰذا انہیں خدائی پیغامات وغیرہ کہنا تو ایک طرف وہ اس قابل بھی نہیں ہوتے کہ انہیں کوئی اہمیت دی جائے۔۔۔۔۔۔ علاوہ بریں، باطنیت کا فن ایک انفرادی چیز ہے اور اس کے نتائج ایسے متضاد و متباین کہ انہیں "عالمگیر سند" کی حیثیت حاصل ہی نہیں ہو سکتی۔

کشف حجت نہیں

اسی لئے خود اہلِ تصوف کے ہاں بھی کسی کا کشف، کسی دوسرے کے لئے سند و حجت قرار نہیں پا سکتا۔ حتیٰ کہ خود صاحبِ کشف کے لئے بھی نہیں۔ اس لئے کہ اس حقیقت کے پرکھنے کے لئے اس کے اپنے پاس بھی کوئی معیار نہیں ہوتا کہ وہ کشف کن میلانات و عواطف اور رجحانات و وساوس کا نتیجہ ہے "رحمانی الہام" کے ساتھ "شیطانی الہام" ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ علم النفس، بالخصوص علم تحلیل نفسی (Psycho - Analysis) نے اس باب میں مفید خدمات انجام دی ہیں۔ وہ نفسِ انسانی کے امیال و عواطف کا تجزیہ کر کے بتاتا ہے کہ فلاں قسم کے خواب یا مکاشفہ کی اساس کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن ایک تو یہ فن ہنوز اپنے

---

[1] اکثر اوقات یہ اختلافات جزئی نہیں بلکہ اصولی ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں وحدت وجود (ابن عربیؒ) اور وحدت شہود (امام سرہندیؒ) کے نظریات ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ نے ان میں باہمی توافق و تطابق کی کوشش کی ہے لیکن وہ اس میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں، ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں؟ پھر یہ چیز بھی عجیب ہے کہ اس دنیا کا تعلق یکسر واردات قلب سے ہے لیکن اس موضوع پر بحث فلسفیانہ کی جاتی ہے۔ اس لئے کہ جیسا کہ متن میں لکھا جا چکا ہے۔ یہ دراصل ادراک حقیقت کی ایک فکری کوشش ہے۔

عہد طفولیت میں ہے۔ دوسرے اس کی بنیاد میں بعض اینٹیں ایسی غلط رکھی گئی ہیں جن سے اس کی عمارت کے بعض گوشے کبھی قابلِ اعتماد نہیں قرار پا سکتے۔ بالخصوص ڈاکٹر فرائڈ کا یہ نظریہ کہ تمام نفسی رجحانات و محرکات کا سرچشمہ عام طور پر (کسی نہ کسی شکل میں) جنسی تحریک (Sex Impulse) ہے اس لئے یہ حقیقت ابھی تک اپنی جگہ پر ہے کہ اربابِ کشف کے دعاوی کے پرکھنے کا کوئی معیار اس فن میں موجود نہیں اس لئے متضاد و متباین نتائج کے حامل سب اپنی اپنی جگہ حقیقت کے مدعی ہیں اور کوئی ان کی تکذیب و تردید نہیں کر سکتا۔ اگر ایک ان کی تردید کرتا ہے تو دوسرا اس کی تائید کر دیتا ہے۔ اسی بنا پر انہوں نے باہمی صلح جوئی کی شکل یہ پیدا کی ہے کہ سب دعاوی اپنی اپنی جگہ برحق ہیں، فرق صرف اظہار بیان میں ہے۔ اس مقصد کے لیئے ("جمنا ایک گھاٹ بہتیرے" جیسی) سطحی شاعرانہ تشبیہات و استعارات سے عوام کے بہلاوے کا سامان مہیا کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ ان مختلف مسالک و مشارب کا بدقتِ نظر مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آجاتی ہے کہ ان میں باہمی اختلاف طرق و اسلوب کا نہیں بلکہ اصل و حقیقت کا ہے۔ پھر مشکل یہ ہے کہ اس باب میں ردّ و قبول (بلکہ حق و باطل) کا معیار "کرامات" قرار پا چکا ہے۔ اور یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ ان چیزوں کے لئے نہ تطہیرِ فکر کی شرط ہوتی ہے نہ تصحیحِ اعمال کی۔ (جیسا کہ جلد سوم میں سحر کے عنوان میں بتایا جائے گا) یہ قوتِ ارادی کے مظاہر ہوتے ہیں جسے فنی حیثیت سے حاصل کیا جا سکتا ہے مشکل اندر مشکل یہ کہ (ان لوگوں سے قطع نظر جو اس قسم کی "شعبدہ بازیاں" حصول منفعت کی خاطر دیدہ و دانستہ دکھاتے ہیں) بعض لوگ نفس کے دھوکے میں رہتے ہیں اور اس قوتِ خیال کو روحانی ترقی (اور قرب الٰہی) سمجھ کر حقیقت شناسی کے مدعی بن بیٹھتے ہیں اور انہیں اس بات کا احساس تک بھی نہیں ہوتا کہ جسے وہ گلستان سمجھے ہیں فریبِ رنگ و بو کے سوا کچھ نہیں۔ انہیں اس مغالطہ سے نکالنا یا دوسروں کو اس فریب میں مبتلا ہونے سے باز رکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ ان ہی لوگوں کے متعلق (William James) لکھتا ہے:-

> یہ مسئلہ کہ ایسے تجربات و پیغامات جو درحقیقت منجانب اللہ تھے اور وہ جنہیں شیطان نے وضع کر دکھایا تھا اور جن سے بجائے مذہب پرست لوگ پہلے سے بھی زیادہ جہنم کے عذاب کے مستحق بن گئے۔ ان دونوں میں کس طرح تمیز کی جا سکے۔ عیسائی تصوف کی تاریخ میں لاینحل رہا ہے۔

(The varieties of Religious Experience.)

ایک عیسائیت ہی پر کیا موقوف ہے؟ یہ مسئلہ ہر مذہب کی باطنیت (تصوف) میں ہزار مشکلات کا موجب بنا رہا اور بنا ہوا ہے جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ "القائے رحمانی" اور "القائے شیطانی" میں تمیز و تفریق بڑی مشکل ہے جس کی وجہ سے شیطنت، بڑے بڑے مقدس نقابوں میں رہزنِ ایمان و ہوش بنے رہتی ہے۔ اور اس رہزنی میں

؎ انبیاء کے معجزات کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

فریب کاروں کے علاوہ فریب خوردگان کا بھی کچھ کم حصّہ نہیں ہوتا۔

لیکن اگر، قطع نظران لوگوں کے جو دیدہ و دانستہ مکاری اور فریب کاری کرتے ہیں۔ یا نادانستہ مبتلائے خدع و فریب رہتے ہیں، ان لوگوں کو بھی لیا جائے جو سچ مچ واردات قلب سے لذت آشنا ہوتے ہیں تو بھی یہ حقیقت اپنی جگہ پر رہتی ہے کہ ان لوگوں کی یہ لذت آشنائی اپنی ذات کے لئے ہوتی ہے۔ یعنی یہ تجربہ، بکسر انفرادی (Individual) ہوتا ہے ان لوگوں کے پاس نوعِ انسانی کے لئے کوئی پیغام نہیں ہوتا۔ وہ ان کے فکر و عمل کی دنیا میں کوئی انقلاب نہیں برپا کر سکتے ان کے نزدیک "تزکیۂ نفس" مقصود بالذات ہے۔ حالانکہ تزکیۂ نفس نہ بجائے خویش منزل ہو سکتا ہے نہ مقصود۔ ادراکِ حقیقت سے مفہوم یہ ہے کہ اس سوال کا حل بتایا جائے جو دنیائے انسانیت کے لئے موجب ہزار خلش و اضطراب بنے چلا آرہا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص خاص نظم و ضبط اور ریاضتوں اور مشقتوں سے اپنے دل کی دنیا میں کچھ کیفیتیں اور لذتیں محسوس کرنے لگ جاتا ہے تو اس سے انسانیت کو کیا فائدہ ہے؟ ایسا شخص اگر اپنے تجرد کی خلوت گاہوں سے باہر بھی آئے گا تو زیادہ سے زیادہ یہی کر سکے گا کہ کسی دوسرے کو ان طرق و مقامات کا پتہ بتا دے جن سے وہ بھی اس کی طرح اسی قسم کی کیف و مستی سے لذت آشنا ہو جائے۔ لیکن اس صورت میں بھی یہ تجربہ انفرادی ہی رہا۔ اس انفرادیت کو رہبانیت کہتے ہیں جس نے دنیا میں کبھی کوئی انقلاب نہیں برپا کیا۔ انفرادیت کبھی نوعِ انسانی کے مسائل کا حل نہیں بتا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جن مذاہب نے اسے ادراکِ حقیقت کا ذریعہ سمجھ رکھا ہے انہیں مسائلِ حیات کے حل کے لئے دوسری راہیں اختیار کرنی پڑی ہیں۔ یہی غلطی آگے چل کر دین اور دنیا (روح اور مادہ) کی ثنویت Dualism کا موجب بن گئی جس سے نظامِ انسانی میں فساد ہی فساد برپا ہو گیا۔ استحکامِ خودی، ترکِ خواہشات و قطعِ علائق سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ متصادم و متحارب قوتوں سے کشمکش اور ان پر غلبہ و استیلاء سے حاصل ہوتا ہے۔ شمشیر کی تاب و برندگی کا راز نیام کی خلوتگاہوں میں نہیں بلکہ فسان کی شعلہ باریوں میں ہے۔ اپنے پر ضبط و قابو اس لئے ضروری ہے کہ اس مؤمنانہ استغنائے دنیا کی بڑی سے بڑی طاغوتی قوتوں کو مغلوب و مفلوج کر دیا جائے۔ نہ اس لئے کہ خود ایک گوشۂ انزوا میں بیٹھ کر انہیں ہر قسم کی سرکشی و بیباکی کے لئے کھلا چھوڑ دیا جائے۔ بقائے نفس کے لئے اگر صفاتِ خداوندی کا پر تو ضروری ہے تو ضربِ کلیمی کا جلال بھی تو خدائے قہار و جبار کی صفت کا عکس ہے (اور یہ ظاہر ہے کہ خدا کی قہاریت و جباریت (معاذ اللہ) کسی مستبد قوت کی قہرمانیت نہیں ہوتی بلکہ یہ بھی در پردہ اس کی ربوبیت ہی کا تقاضا ہوتا ہے۔) لہٰذا جہاں فقط طبیعیات کی خارجی دنیا کو مرکزِ نگاہ بنا لینا غلط ہے۔ وہاں صرف نفس کی داخلی دنیا کو خارج سے غیر متعلق سمجھ لینا بھی صحیح نہیں۔ نفس کا ارتقاء ان دونوں کے صحیح امتزاج سے ہوتا ہے۔ روح اور مادہ (داخلی اور خارجی دنیا) کی ثنویت قرآنی مسلک نہیں۔ جو اسلوبِ فکر ان میں سے صرف ایک کو سامنے رکھتا ہے عجمی ہے اسی کیلئے

علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ

به چشمے خلوت خود را به بیند | به چشمے جلوت خود را به بیند
اگر یک چشم بر بندد گناہے است | اگر با ہر دو بیند شرط راہے است

ان تصریحات سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ باطنیت (Mysticism) کا طریق بھی حقیقت کلی کے ادراک کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ جن شاہراہوں میں اس قدر غلط فہمیوں اور ابلہ فریبیوں، وساوسِ نفس کی رنگ آمیزیوں اور دسیسہ کاریوں کے کھلے کھلے امکانات موجود ہوں۔ جہاں خضر اور راہزن میں تمیز ہی نہ ہو سکتی ہو۔ انہیں حقیقت عظمیٰ کی منزل تک پہنچانے کا قابلِ اعتماد طریق کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ عالمِ محسوسات (دنیائے سائنس) میں اگر آج کوئی قدم غلط اٹھتا ہے تو کل کی مزید تحقیقات اس غلطی کی تردید کر دیتی ہیں۔ لیکن باطنیت کی دنیا میں ایسے ایسے نگاہ فریب مناظر آتے ہیں کہ ان میں جذب ہو کر انسان کو احساس تک بھی نہیں ہونے پاتا کہ وہ جس رستہ پر گامزن ہے وہ ہلاکت اور بربادی کے کن عمیق گڑھوں کی طرف لئے جا رہا ہے۔

نگۂ بازگشت

اب آگے بڑھئے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ رستہ کی دشوار گزاری سے آپ کا رہروِ فکر شاید تکان محسوس کر رہا ہو۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ اگلی منزل تک پہنچنے سے پہلے ذرا سستا لیا جائے۔ فرصت کے ان لمحات میں قطع کردہ منزل پر نگاہ بازگشت ڈالئے اور عالمِ تصور میں دیکھئے کہ ہم کہاں سے چل کر کہاں پہنچ گئے ہیں۔

ہمارا آغازِ سفر اس مقام سے ہوا تھا کہ انسان کے سامنے ایک سوال ہے جس کے حل کی تلاش میں یہ ہمیشہ حیران و سرگرداں رہا ہے۔ اس سوال کا حل حقیقتِ کلی کے ادراک کے بغیر ممکن نہیں۔ اس ادراک کا ذریعہ علم ہے۔ علم کی دنیا میں ہمارے سامنے سب سے پہلے عالمِ محسوسات آتا ہے جہاں عقل استدلال کے راستے جزئیات سے کلیات تک پہنچتی ہے۔ عقل کا کبھی جی چاہتا ہے کہ وہ حقیقت کا ادراک کرے۔ لیکن حقیقت، لامتناہی ہے اور استدلال کا دائرہ متناہیت سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس لئے کلی حقیقت کا ادراک، عقل کے بس کی بات نہیں۔ عقل کے مختلف دوائر میں وحدتِ حقیقت، ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ملتی ہے۔ اس کے ذریعے وحدت پر تماماً احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔

دوسری منزل علم غیر استدلالی کی ہے جس میں سب سے پہلے جبلت (instinct) یا ضمیر (conscience) کا مقام سامنے آتا ہے۔ ضمیر، وراثت اور ماحول وغیرہ کے خارجی اثرات سے اس درجہ متاثر ہوتی ہے کہ یہ حق و باطل کی تمیز کا ذریعہ قرار ہی نہیں پا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ضمیر کی آواز" کبھی ایک نتیجہ پر نہیں پہنچتی۔

ضمیر کے بعد وجدان (intuition) کی وادی سامنے آتی ہے۔ جس میں سب سے وسیع اور وقیع میدان نابغہ کی تخلیق کا ہے۔ وجدان، شدتِ ذوق کا نام ہے اور ذوق کا اختلاف ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ! اس لئے

ذوقِ (وجدان) کو بھی حق و باطل کی تمیز کا معیار نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک نابغہ (genius) اپنے فن کے انتہائے کمال پر ہوتا ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ یہ کمال، اس کی سیرت پر بھی اسی طرح اثر انداز ہو۔ اس لئے نابغہ، انسانوں کی دنیا میں کوئی انقلاب نہیں پیدا کر سکتا۔ لہذا وجدان بھی ادراکِ حقیقت کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔

اس کے بعد باطنیت (Mysticism) کا میدان سامنے آتا ہے۔ اگرچہ اس کے نتائج غیر استدلالی دنیا سے متعلق ہیں لیکن یہ فن اکتسابی ہے اور ادراکِ حقیقت کا ایک فکری طریقِ کار۔ اس میں اربابِ کشف کے نتائج ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد ہوتے ہیں۔ اس لئے ضمیر اور وجدان کی طرح یہ علم بھی حقیقتِ کلی کے ادراک سے قاصر ہے۔ یہی نہیں۔ بلکہ اس راستے میں حق و باطل کی تمیز بڑی مشکل ہے۔ اس لئے اس میں ضلالت وغوایت کے امکانات اور راہوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ پھر یہ بھی کہ اس میں صاحبِ تجربہ کا نتیجہ یکسر انفرادی ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ عالم دنیائے انسانیت کے لئے کوئی پیغام اپنے اندر نہیں رکھتا اور اسی لئے ہماری فکر و تہذیب کی دنیا میں کسی انقلاب کا موجب نہیں بن سکتا۔

یہاں تک پہنچنے کے بعد ہم سستانے بیٹھ گئے۔

آخری مقام

اب آگے بڑھئے اور تاریخ کے اوراق کو ایک مرتبہ پھر الٹئے۔ اب ہمارے سامنے متلاشیانِ حقیقت کا ایک ایسا گروہ آتا ہے جن میں وہ تمام خصوصیاتِ حسنہ بھی موجود ہیں جو متذکرۂ سابقہ گروہوں کے انسانوں میں جھلک رہی تھیں لیکن ان کے علاوہ ایک خصوصیتِ کبریٰ ایسی بھی ہے جو اور کہیں وجہ شادابیٔ قلب و نگاہ نہیں ہو سکی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ایک ایسے دور میں جبکہ لطافتِ فکر و نظر اور نظافتِ کردار و عمل کا کوئی نشان تک نہ ملتا ہو۔ انسانی تصورات و معتقدات کی دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہ رہے جس پر ابالیسِ دہر کے عساکرِ ضلالت اور شیاطینِ عصر کے جنودِ بطالت مسلط نہ ہو چکے ہوں۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہ ہو جس میں ایمان و یقین کی جگہ شکوک و ظنون اور اور نصوصِ صریحہ و حجج بالغہ کی جگہ تلبیس و تحریف نے نہ لے لی ہو۔ ہر جگہ اور ہر مقام پر فساد ہی فساد دکھائی دیتا ہو۔ شرفِ انسانیت اپنے تمام مدارج و معارج کھو کر تنزل و تسفل کے عمیق جہنم میں گر چکا ہو۔ ایسے وقت میں جبکہ کشف و ابرازِ حقیقت کے لئے انفس و آفاق کے کسی گوشے میں شارعِ ہدایت و سعادت دکھائی نہ دیتی ہو۔ ظلمت و غوایت کے اس مرکز میں ایک بچہ پیدا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ماحول اور وراثت کے ان اصول و ضوابط کے ماتحت جن کا ذکر پہلے آ چکا ہے اس بچہ کو وہی کچھ ہونا چاہیئے جو اس کا گرد و پیش ہے۔ لیکن دیکھنے والی نگاہیں دیکھتی ہیں کہ وہ اپنے خاندان اور ماحول سے بالکل الگ تھلگ نظر آتا ہے۔ وہ ان تمام غلط نظریاتِ حیات سے، جو مہلک جراثیم کی طرح، فضا کی پہنائیوں میں غیر محسوس طور پر پھیلے ہوئے ہیں، محترز و متنفر دکھائی دیتا ہے۔ وہ بچپن ہی میں اس غلط روشِ ذہن

ہے جس پر اس کے آباد اجداد ایک زمانہ سے چلے آرہے ہیں۔ اور جنہیں قدامت پرستی کی سند نے تحقیق و تفتیش اور تنقید و تنقیب کی حد سے بالاتر قرار دے رکھا ہے۔ تبرّی اور بیزاری کا اعلان کرتا ہے۔ وہ ہر شے پر غائرانہ نگاہ ڈالتا اور ہر چیز کو متجسسانہ نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کی نگہ بصیرت، انعکاسی شعاعوں (X - Rays) کی طرح، تمام نظر فریب پردوں سے گزر کر حق و باطل میں تمیز کر لیتی ہے۔ وہ عقل و دانش میں بھی ایسا ممتاز ہوتا ہے کہ قبیلہ اور خاندان کے سن رسیدہ بزرگ بڑے بڑے اہم معاملات کے تصفیہ کے لئے اس سے استصواب رائے کرتے اور اسے حکم قرار دیتے ہیں۔ بایں ہمہ نہ اسے عقل حیلہ جو کسی مغالطہ میں رکھتی ہے نہ ضمیر کی آواز اسے دھوکا دیتی ہے اس کی پیدائش ایک نابغہ (Genies) کی طرح ہوتی ہے (جس کے متعلق ہم گذشتہ صفحات میں تفصیلاً بحث کر چکے ہیں) لیکن ایک عام نابغہ کے خلاف وہ بلندیٔ سیرت کے اس معراج کبریٰ پر تبسم فشاں ہوتا ہے جو مکارم اخلاق کا معیار قرار پاتی ہے۔ وہ اس ماحول میں

بلند سیرت نابغہ

جس میں سلب و نہب ایک اصول زندگی اور لوٹ کھسوٹ عام انداز حیات ہوتا ہے۔ سارے علاقہ میں "الامین" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اور بڑی سے بڑی امانت اس اعتماد اور بھروسے سے اس کے سپرد کر دی جاتی ہے۔ جس طرح انسان اپنا راز اپنے دل سے کہہ دیتا ہے۔ اور اس کی دیانت کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب وہی لوگ جو اسے اس قدر امین جانتے ہیں۔ اس جرم کی پاداش میں اسے قتل کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ انہیں حق کی طرف کیوں دعوت دیتا ہے اور ایک اندھیری رات میں اس کے مکان پر گھیرا ڈال دیتے ہیں، تو اس "امین محصور"، کو رات بھر یہ فکر غلطاں و پیچاں رکھتی ہے کہ اگر میں یہاں سے چپکے سے نکل گیا تو ان کی جو امانتیں میرے پاس ہیں۔ انہیں کس کے سپرد کر کے جاؤں گا۔ اس کی صداقت کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ جب اپنی قوم کو حق و انصاف کی طرف سب سے پہلی دعوت دیتا ہے تو ایک پہاڑی پر کھڑے ہو کر ان سے کہتا ہے کہ کہو! اگر میں کہوں کہ اس پہاڑی کے اس پار دشمن کا ایک عظیم لشکر ہے جو تمہاری بستیوں پر حملہ کرنے کے لئے بڑھے چلا آرہا ہے، تو میری بات کو صحیح مانو گے یا غلط۔ تو سب بیک زبان پکار اٹھتے ہیں کہ ہم غلط کیوں مانیں گے۔ تم نے آج تک کبھی جھوٹ ہی نہیں بولا! اس کے کیریکٹر کی پختگی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ مخالفت کے طوفان میں جب دشمن کی طرف سے یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو اپنی صداقت کا کوئی ثبوت پیش کرو۔ تو وہ نہایت بلند آہنگی سے بیباکانہ کہہ دیتا ہے کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۱۰/۱۶) " میں نے اس سے بیشتر تمہارے اندر اپنی عمر بسر کی ہے۔ کیا تم اس سے نہیں جان سکتے کہ میں سچا ہوں یا جھوٹا"! کیسا عظیم الشان ہے یہ دعوے! اور پھر دعویٰ بھی کس جگہ؟ دشمنوں کے ہجوم میں۔ لیکن بلندیٔ سیرت کا جلال ایسا صاعقہ فگن ہے کہ تمام مخالفتوں کے باوجود، اس دعوے کے خلاف، کسی گوشے سے کوئی دھیمی سی آواز بھی تو نہیں اٹھتی؟ یہی نہیں کہ اس کے سامنے مروت اور حجاب کی بنا پر کوئی کچھ نہیں کہتا بلکہ اس کی غیبت میں بھی ایک حرف اس کی سیرت کے خلاف

کسی کی زبان تک نہیں آتا[1]۔ وہ نہایت سادگی اور اطمینان کی زندگی بسر کرتا ہے۔ اور بظاہر کوئی بات اس کے لئے وجہ تشویش نہیں ہوتی۔ لیکن دیکھنے والے دیکھتے ہیں کہ وہ کسی اہم مسئلہ کے حل کی تلاش میں حیران و سرگرداں رہتا ہے۔ (وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝ ۹۳/۷) اس کے لئے وہ کبھی فطرت کی کھلی جلوہ گاہوں میں مصروف غور و تدبر دکھائی دیتا ہے اور کبھی رموز و لطون کے خلوت کدوں میں محو تفکر و تفحص۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی عظیم المرتبت فکر و خیال ہے جو اس کے قلب کی گہرائیوں میں پہلو بدل رہا ہے۔ لیکن خود آپ و تاب سے موزوں نہیں ہو سکتا[2]۔ لیکن حیرت یہ کہ اسے خود بھی علم نہیں ہوتا کہ یہ فکر و خیال کیا ہے اور اس کا قلب، کن انکشافات و تجلیات کا مہبط بننے والا ہے؟ (مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ ۴۲/۵۲) حتیٰ کہ وہ وقت آجاتا ہے جب حقیقت تماماً و کمالاً، اپنے آپ کو اس منتخب اور برگزیدہ شخصیت پر جسے اس غرض و مقصد کے لئے تیار کیا جا رہا تھا؛ منکشف — (Reveal) کر دیتی ہے۔ حیات (Life) کے تمام سربستہ راز اس پر کھل جاتے ہیں اور وہ قلب کائنات کی انتہائی گہرائیوں میں اتر کر اس سوال کا حل دریافت کر لیتا ہے جس تلاش میں انسان یوں مضطرب و بیتاب چلا آرہا تھا۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں

> حیاتِ کائنات وجدانی طور پر اپنے تقاضوں کو محسوس کرتی ہے اور نازک اوقات پر اپنا رخ آپ متعین کر لیتی ہے
> اسی کو ہم مذہب کی زبان میں وحیِ نبوت کہتے ہیں۔ (خطبات۔ صفحہ ۱۴۰)

مقامِ نبوت یہ ہے مقامِ نبوت۔ مغربی دنیا چونکہ مقامِ نبوت سے پورے طور پر آشنا نہیں اس لئے ان کے ہاں اس کے لئے (Prophet) کا لفظ آتا ہے جو یقیناً اس مقام کی تماماً تعبیر نہیں کر سکتا۔ اس سے ذہن پیش گوئیوں (Prophecies) کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس میں کہانت کا تصور لازمی طور پر سامنے آجاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک نبیؑ، وحی کے عطا فرمودہ علم کی حد تک غیب کی

[1] ابوسفیان، ہرقل کے دربار میں جاتا ہے کہ اسے اس نئے: امیِ انقلابؐ کے خلاف بھڑکائے اور اس سے مدد لے کر اس اٹھنے والے "شعلے" کو دبائے ہرقل پوچھتا ہے کہ اس شخص نے تمہارے اندر زندگی بسر کی ہے اور تمہیں میں سے ایک ہے۔ کہو کہ اس کی زندگی کس نہج سے گزری ہے؟ غور کیجئے! حضورؐ سامنے نہیں۔ آپ کا کوئی طرفدار بھی وہاں موجود نہیں جس سے جھجک پیدا ہو جائے۔ مقصد پیش نظر ہرقل کو مشتعل کرنا ہے۔ اس کی حمایت حاصل کرنے کا بڑا عمدہ موقع ہے۔ لیکن حضور کی بلندیِ سیرت کا یہ رعب ہے کہ وہ ایک لفظ بھی حضورؐ کے خلاف زبان تک نہیں لا سکا اور کہا تو اتنا ہی کہا کہ بس اس ایک دعوت کے علاوہ اس کی زندگی میں کوئی چیز قابلِ اعتراض نہیں۔

[2] یکے در معنیٔ آدم نگر، از من چہ می پرسی ‏— ہنوز اندر طبیعت می خلد، موزوں شود روزے
چناں موزوں شود، ایں پیش پا افتادہ مضمونے ‏— کہ یزداں را دل از تاثیر او پرخوں شود روزے

باتوں سے بھی واقفیت رکھتا ہے۔ لیکن یہ مقام نبوت کا صرف ایک پہلو ہے۔ اس مقام کی صحیح تعبیر وحی کے تصور ہی سے ہو سکتی ہے۔ چونکہ وحی کا تعلق (غیر استدلالی دنیا) سے ہے۔ اس لئے اس اعتبار سے یہ اور وجدان (Intuition) کے دوسرے تجربے (مثلاً باطنیت (Mysticism) وغیرہ) ایک شق میں آسکتے ہیں۔ لیکن اتنی سی مشارکت و مشابہت کے علاوہ ان میں اور کوئی چیز مشترک نہیں ہوتی۔ وحی اپنی دنیا کا الگ اور منفرد تجربہ ہے جس کی مثال و نظیر کسی اور تجربے میں نہیں مل سکتی۔ باطنیت کے متعلق ہم دیکھ چکے ہیں کہ

(i) وہ اکتسابی فن ہے۔

(ii) اس میں دھوکہ اور فریب انسان کو مغالطے میں رکھ سکتا ہے۔

(iii) اور وہ ایک یکسر انفرادی تجربہ ہے جسے انسانی ہیئت اجتماعیہ کے مسائل سے کچھ تعلق نہیں۔

اس کے برعکس نبوت یکسر وہبی ہوتی ہے۔ جس میں کسب و ہنر کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اَللّٰهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ پھر نبوت ایک حتمی اور یقینی ذریعہ علم ہے جس میں فریب و مغالطہ تو ایک طرف، ظن و قیاس تک کو بھی دخل نہیں (مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ۔ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ۔ (النجم)) جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ وہ حقیقت کو تماماً و کمالاً پاکر انسانیت کے معراجِ کبریٰ پر پہنچ جاتا ہے جہاں انسان کائنات اور خدا کا صحیح اور اصلی تعلق اس کے دل کی گہرائیوں پر بے نقاب ہو جاتا ہے۔ پھر سب سے بڑی چیز یہ کہ اس کا یہ تجربہ انفرادی نہیں ہوتا بلکہ وہ اس عدیم النظیر تجربہ کے بعد دنیائے انسانیت کی طرف لوٹتا ہے۔ يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ

انقلاب آفریں پیغام اور ایک عظیم الشان، قیامت در آغوش انقلاب کا داعی بن کر ان کے فکر و عمل کی سوئی ہوئی بستیوں میں صورِ اسرافیل پھونکتا ہے اور اس طرح اپنے غیر متزلزل ایمان (جو آنکھوں دیکھی حقیقت پر مبنی ہوتا ہے) اور بے پناہ عمل سے (جو اس ایمان کا محسوس مظاہرہ ہوتا ہے) ذہنوں کے تصورات نگاہوں کے زاویے۔ اشیاء کی اقدار۔ فکر و نظر کے اسلوب۔ غرضیکہ انفس و آفاق کی دنیا کے نقشے بدل دیتا ہے۔ علامہ اقبال اس حقیقت کی تبئین کے لئے اپنے پانچویں خطبہ کو ان الفاظ سے شروع کرتے ہیں۔

> محمد عربی فلک الافلاک کی بلندیوں پر پہنچ کر واپس تشریف لے آئے۔ خدا شاہد ہے کہ میں اگر اس مقام تک پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ لوٹتا" یہ الفاظ ایک بہت بڑے مسلمان صوفی بزرگ (حضرت عبد القدوس گنگوہی) کے ہیں۔ تصوف

---

[1] تفصیل ذرا آگے چل کر آئے گی۔

[2] اسی سے "روح اور مادہ" کی ثنویت ختم کر ان میں باہمی توافق و امتزاج پیدا ہو جاتا ہے۔ "پیدا" کیا ہو جاتا ہے؟ بلکہ ان کی اصل و بنیاد کی یگانگت سامنے آجاتی ہے اور یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ روح جب محسوس و مرئی پیکر میں اپنا نمود چاہتی ہے تو اسے مادہ کہتے ہیں۔

> کے لٹریچر میں ان جیسے اور الفاظ کا ملنا خاصا مشکل ہے۔ جو ایک نفرقہ گے اللہ شعور نبوت اور تصوف کے نطیف نفسیاتی فرق کو اس طرح واضح کردیں۔ ایک صوفی اپنے انفرادی تجربہ کی تجردگاہ سے واپس آنا نہیں چاہتا اور جب واپس آتا بھی ہے (اس لئے کہ اسے آنا پڑتا ہے) تو اس کی یہ مراجعت نوع انسانی کے لئے کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس ایک نبی کی مراجعت، تخلیقی ہوتی ہے۔ وہ آتا ہے کہ زمانہ کے طوفان پر تسلط پاکر تاریخ کی قوتوں کو اپنے قابو میں لے آئے اور اس طرح مقاصد و مطامح کی ایک نئی دنیا تعمیر کردے۔ ایک صوفی کے لئے، اس کے انفرادی تجربہ کی تجردگاہ، آخری مقام ہوتی ہے۔ لیکن ایک رسول کے دل میں اس سے زلزلہ انگیز نفسی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ تمام دنیائے انسانیت میں ایک انقلاب پیدا کردیں۔ یہ آرزو کہ جو کچھ اس کی آنکھ نے دیکھا ہے وہ ایک جیتی جاگتی دنیا کے پیکر میں متشکل ہو جائے۔ نبی کے دل میں پیش پیش ہوتی ہے۔ اسی لئے، ایک صاحب وحی کے "تجربہ" کی قدر و قیمت جانچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دیکھا جائے کہ اس نے انسانیت کو جس قالب میں ڈھالا ہے وہ کیسا ہے اور اس کے پیغام کی روح سے جس قسم کی دنیائے ثقافت ابھر کر سامنے آگئی ہے وہ کس انداز کی ہے
>
> (خطبات صفحہ ۱۲۴)

دعوائے نبوت پرکھنے کا یہ استنتاجی طریق (Pragmatic test) ہے جس سے وحی کی صداقت کے ساتھ ساتھ یہ حیثیت بھی سامنے آجاتی ہے کہ ایک نبی کی بعثت، نابغہ (Genius) کی طرح محض اتفاقی نہیں ہوتی بلکہ وہ نظام کائنات کے عظیم الشان مقصد اور تدبیر کے سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہوتی ہے جو ٹھیک اپنے وقت پر ایک خاص مقصد کو پورا کرنے کے لئے ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اس کے لئے علامہ اقبال[7] کے ان الفاظ کو ایک مرتبہ پھر سامنے لے آئیے جنہیں ابھی چند صفحات پیشتر لکھا جاچکا ہے۔ کہ

مقصد عظیم کیلئے

"حیات کائنات وجدانی طور پر اپنے تقاضوں کو محسوس کرتی ہے اور نازک اوقات پر اپنا رُخ آپ متعین کرلیتی ہے۔ اسی کو مذہب کی زبان میں وحیِ نبوت کہا جاتا ہے"۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ (Eddington) کی پیش کردہ تصریحات کے مطابق، دنیائے سائنس میں ہم اشیاء کی حقیقت سے باخبر نہیں ہوسکتے۔ فقط ان اشارات (Symbols) سے آشنا ہوسکتے ہیں جو ہمارے حواس ہمارے ذہن پر مرتسم کرتے ہیں۔ لیکن جب حقیقت اپنے آپ کو اس طرح منکشف کرتی ہے تو اس (وحی) کی روشنی میں اشیاء کی حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے۔ ایڈنگٹن لکھتا ہے۔

> "قوت۔ توانائی۔ ابعاد۔ یہ سب اشارات (Symbols) کی دنیا سے متعلق ہیں۔ یہی وہ تصورات ہیں جن سے ہم نے طبیعیات کی خارجی دنیا تخلیق کی ہے۔ ان کے علاوہ ہمارے پاس اور تصورات ہیں کونسے؟ (لیکن) طبیعیات کی دنیا کے اسباب و ذرائع ختم کرچکنے کے بعد جب ہم اپنے شعور کی دنیا کی انتہائی گہرائیوں میں پہنچتے ہیں[5]۔

---

[7] قرآن کی رو سے یہ مقام صرف نبی کو حاصل ہوتا ہے۔ غیر نبی کو حاصل نہیں ہوسکتا۔

وہ دنیا جہاں سے ہماری ذات کا اعلان ہوتا ہے۔ وہاں ہم ایک نئے منظر میں داخل ہوتے ہیں اور خود اپنی ذات سے اشارات (Symbols) لیکر ایک نئی دنیا کی تخلیق کرتے ہیں جس کی بنیاد (ماورا المادہ) روحانیت پر ہوتی ہے۔" (Science and the Un-Seen world)

نبی اس نئی دنیا کی تخلیق کرتا ہے اور پھر اس کی وحی کی روشنی سے مکتسب دستنیر ہونے والے افرادِ اشیاء کی حقیقت و ماہیت سے بہرہ یاب ہو جاتے ہیں۔ اس طرح اس "مادی دنیا" کی بنیاد خالص "روحانیت" پر قرار پا جاتی ہے جس سے نگاہوں کے زاویے بدل جاتے ہیں۔

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود

جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

ایک پیغام ہم ضمیر، وجدان اور باطنیت کی دنیا میں دیکھ چکے ہیں کہ ان تجارب کے نتائج مختلف ہوتے ہیں۔ ضمیر کی آواز مختلف مقامات میں مختلف ہے۔ وجدان (ذوق) کا باہمی تباین و تخالف ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ باطنیت کے "کشفی" نتائج میں واضح تضاد ہوتا ہے۔ لیکن نبوت کی دنیا میں ہر صاحبِ تجربہ کے نتائج اساسًا اور اصولاً ایک ہوتے ہیں۔ ان میں کہیں کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ زمان و مکان کا بعد بھی اس پر کچھ اثر نہیں کر سکتا اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک پر حقیقت تمامًا و کمالاً اپنا انکشاف کرتی ہے۔ اس لئے ان میں سے ہر ایک کا تجربہ ایک ہی ہوتا ہے (اِنَّآ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ كَمَآ اَوْحَیْنَآ اِلٰی نُوْحٍ وَّالنَّبِیّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِیْسٰی وَاَیُّوْبَ وَیُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَیْمٰنَ ۚ وَاٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۝ (۴/۱۶۳)) اس لئے ان میں سے ہر ایک، دوسرے کی تائید و تصدیق کرتا ہے اور اپنے دعوے کی صداقت تسلیم کرانے کے ساتھ ہی اس حقیقت کا بھی اعتراف کراتا ہے کہ اس سے پہلے جس قدر نبی گزرے ہیں وہ بھی اسی حقیقت کے بیان کرنے والے تھے۔

***

وحی کی حقیقت ہمارے سامنے آگئی۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم عام طور پر وحی کی ماہیت کو (جو یکسر غیر استدلالی دنیا سے متعلق ہے) عقل یعنی استدلالی علم کی رو سے سمجھنا چاہتے ہیں اور جب عقل اپنی متناہیت سے آگے نہیں بڑھ سکتی تو بجائے اس کے کہ اس کی محدودیت کا اعتراف کیا جائے" وحی کے متعلق ظنون و شکوک پیدا کر لئے جاتے ہیں۔ وحی تو خیر بہت بلند چیز ہے۔ ہماری حالت تو یہ ہے کہ وجدان کی معمولی کیفیات کو بھی استدلال کی رو سے نہ سمجھ سکتے ہیں نہ سمجھا سکتے ہیں۔ لوہے کے چند تاروں کو مضراب سے جنبش دی جاتی ہے جس سے فضا میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ ارتعاش موسیقی

مقام وحی اور عقل ہمارے دل کی دنیا میں جذب و مستی کی ایک ایسی والہانہ کیفیت پیدا کر دیتا ہے جسے نہ عقل کی رو سے ہم خود سمجھ سکتے ہیں نہ کسی کو بتا سکتے ہیں کہ ایسا کیوں اور کیسے ہوتا ہے؟ لہٰذا

یہ اصول ہی غلط ہے کہ جس چیز کو ہم عقلاً نہ سمجھ سکیں اس کے وجود سے انکار کر دیا جائے۔ جن لوگوں میں موسیقی کا ذوق (Ear for Music) نہیں ہوتا انہیں قیامت تک سمجھ میں نہیں آسکتا کہ تاروں کے اس ارتعاش یا گلے کی چند سروں سے ہوتا کیا ہے کہ جو لوگ اس طرح سر دھننے لگ جاتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ علمائے نفسیات، نفس انسانی کی کیفیات و ماجریات اور امیال و عواطف سے بحث کرتے ہیں اور ان ہی مباحث پر ان کے پورے علم کی عمارت قائم ہو رہی ہے لیکن آج تک کسی کو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ بالآخر نفس انسانی ہے کیا؟ طبیعیات کی دنیا میں دیکھئے ایتھر کے وجود کے سب قائل ہیں۔ اس کے خواص و کوائف اور مشاہد و مظاہر ہر ایک کی زبان پر ہیں۔ لیکن ایتھر کی ماہیت کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ بجز اس کے کہ ایک مجہول الکیف توانائی ہے جو ہر جگہ موجود ہے۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ وحی از قبیل ایتھر وغیرہ ہے مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ یہ اصول کہ جس چیز کی ماہیت ہم عقلاً دریافت نہیں کر سکتے اس کے وجود سے انکار کر دیا جائے درست نہیں ایسے لوگوں کے متعلق[1] (pascal) کہتا ہے۔

"ناقابل ادراک؛

لیکن اگر تم کسی چیز کو نہیں سمجھ سکتے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کا وجود ہی نہیں"

Quoted by Huxley in Religion Without Revelation.

اور تو اور اب تو سائنس بھی وحی کے امکانات کی تردید نہیں کرتی (samuel) لکھتا ہے۔

سائنس، بیرونی دنیا سے آنے والے مستند پیغامات کے امکان کو خارج نہیں کرتی۔ لیکن چونکہ وہ خود اپنے دائرہ کے اندر نظریات کے رد و قبول کے معاملہ میں بھی بہت محتاط واقع ہوئی ہے اس لئے وہ ان دوائر سے متعلق نظریات کو جو اس کی حدود سے باہر ہیں مسترد یا قبول کرنے میں اس سے بھی زیادہ احتیاط برتے گی۔

وحی اور سائنس

لہٰذا وحی کے متعلق اب سائنس کی روش، احتیاط کی روش ہے کھلے ہوئے انکار کی نہیں۔ زمانہ کو اور آگے بڑھتے دیکھئے۔ رفتہ رفتہ یہ احتیاط، ہم دوش اقرار ہو جائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ وحی اور عقل (یعنی مذہب و سائنس) کے تصادم کی داستانیں علم انسانی کے عہد طفولیت کی یادگار ہیں۔ وحی کبھی علم و عقل کی نقیض نہیں ہو سکتی۔ سائنس (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) ادراک **حقیقت** کا ناقص یا جزئی طریقہ ہے۔ اور وحی کامل و مکمل۔ علامہ اقبالؒ اس فرق کے متعلق لکھتے ہیں۔

---

[1] وجدانی دنیا سے متعلق سب سے لطیف علم، علم نفسیات ہے۔ لیکن وحی کی ماہیت علم النفس کی رو سے بھی دریافت نہیں ہو سکتی چنانچہ علم تحلیل نفسی کا مشہور عالم (Jung) اس چیز کا کھلے کھلے الفاظ میں اعتراف کرتا ہے۔ (دیکھئے خطبات صفحہ ۱۸)

جسے ہم سائنس کہتے ہیں وہ حقیقت کا کلی اور مکمل مشاہدہ نہیں ہوتا۔ وہ حقیقت کے مختلف گوشوں کے مشاہدات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ایک مکمل تجربہ کے ٹکڑے جو اکٹھے کرنے سے فٹ نہیں بیٹھتے علم فطرت (Natural Science) مادہ، زندگی اور شعور سے بحث کرتا ہے۔ لیکن آپ جونہی یہ سوال کریں کہ مادہ، زندگی اور شعور کا باہمی تعلق کیا ہے؟ تو آپ کے سامنے وہ علوم آتے جائیں گے جو ان مختلف حصص سے متعلق ہیں۔ لیکن ان علوم کو یکجا کر دینے سے بھی آپ کے سوال کا مکمل جواب نہیں مل سکے گا۔ (خطبات صفحہ ۴۲)

دوسرے مقام پر ہے:۔

سائنس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے مطالعہ کے لئے حقیقت کے بعض مخصوص پہلوؤں کو منتخب کرے اور باقیوں کو خارج کر دے۔ سائنس کا یہ دعویٰ بے دلیل عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے کہ حقیقت کے جن گوشوں کو اس نے منتخب کر لیا ہے، وہی گوشے مطالعہ کے قابل ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان ایک مکانی پہلو (Spatial - aspect) بھی ہے لیکن انسان کا صرف یہی پہلو تو نہیں۔ اس کے دوسرے پہلو بھی ہیں..... جنہیں سائنس کو لازماً اپنے دائرۂ تحقیق سے خارج کرنا ہوگا۔ اس لئے کہ ان کے سمجھنے کے لئے ان سے الگ ذرائع کی ضرورت ہے جو سائنس کے ہاں مستعمل ہیں۔ (خطبات صفحہ ۱۰۱)

اس حقیقت کو پروفیسر ایڈنگٹن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:۔

ہم اس امر کا اعتراف کر چکے ہیں کہ طبیعیات کی دنیا حقیقت کا صرف ایک جزوی سا گوشہ ہے (اب سوال یہ ہے کہ) ہم حقیقت کے دوسرے گوشے کے متعلق کس طرح بحث کریں؟ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس دوسرے حصہ کا ہم سے ایسا واسطہ نہیں جیسا طبیعیات سے متعلق حصہ کا ہے۔ ہمارا شعور، احساس۔ مقصد اور اقدار سے بھی اسی طرح مرتب ہوتا ہے جس طرح حسی نقوش سے۔ ہم حسی نقوش (sense-impressions) کا تتبع کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ ہمیں اس خارجی دنیا میں لے جاتے ہیں جس کا تعلق سائنس سے ہے۔ اسی طرح ہم جب اپنی ذات کے دوسرے عناصر کا اتباع کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ہمیں زمان و مکان کی دنیا سے کہیں الگ لیجاتے ہیں[۱]۔

اس سے ظاہر ہے کہ سائنس حقیقت کے صرف ایک گوشے سے بحث کرتی ہے۔ اس لئے اس کا دائرہ محدود ہے لیکن

---

[۱] وحی کے امکان بلکہ اس کی ناگزیر ضرورت کے متعلق دور حاضرہ کے سائنسدانوں اور مفکرین کی مزید شہادات کے لئے سلسلۂ معارف القرآن کی آئندہ کڑی "انسان نے کیا سوچا" کا انتظار کیجئے۔ اس میں انسانی فکر کے مختلف گوشوں کی تاریخ آ گئی ہے اور اس کا آخری باب وحی ہی سے متعلق ہے۔

اس کے برعکس مذہب (وحی) حقیقت کو تمام و کمال دیکھتا ہے۔ اس لئے اس کل کے اندر دنیائے سائنس کا جزو خود بخود شامل ہوتا ہے۔

"لہٰذا مذہب کے لئے، حقیقت کے جزئی علم (یعنی سائنس) سے گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں۔" (خطبات ص۲)

علاوہ بریں، ایک اور جہت سے بھی مذہب، سائنس کی دنیا سے آگے نکل جاتا ہے۔ سائنس کا مقصد فقط اتنا ہوتا ہے کہ وہ اشیاء کے متعلق تصور (conception) قائم کر سکے (اس کی تفصیل شروع میں گزر چکی ہے) اس کے برعکس

مذہب محض تصور سے مطمئن نہیں ہو جاتا۔ وہ جس شے کی تلاش میں نکلتا ہے چاہتا ہے کہ اس کے متعلق گہرا علم حاصل کرے اور اس سے ربط و ضبط بھی پیدا کرے (خطبات ص۹)

سائنس صرف معلومات بہم پہنچاتی ہے۔ لیکن وحی کا مقصود یہ ہے کہ حقیقت کے متعلق نہ صرف معلومات بہم پہنچائے بلکہ یہ بھی کہ انسان خود بھی وہی کچھ کیسے بن سکتا ہے۔ سائنس، معلومات کے ذریعے تسخیر فطرت کے امکانات میں وسعت پیدا کرتی ہے۔ لیکن وحی کی وساطت سے انسانی خودی، خود روحِ کائنات بن جاتی ہے۔

مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

وحی اور رہبانیت

جب طبیعیات کی دنیا، خود وحی (مذہب) کے دائرہ کے اندر شامل ہے تو رہبانیت[۵۱] کا مسلک مبنی علی الحقیقت نہیں قرار پا سکتا۔ رہبانیت کی تعلیم درحقیقت روح اور مادہ کی ثنویت (Dualism) کے غلط نظریہ پر مبنی ہے۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ انسانی خودی کا ارتقاء اس کی "داخلی دنیا" کی تہذیب و تنظیم سے وابستہ ہے۔ خارجی دنیا کی قوتوں سے اس کا کچھ تعلق نہیں۔ لیکن وحی کا ارشاد ہے کہ اس نظریہ کا اتنا حصہ درست ہے۔ مگر اس کے ساتھ اس اضافہ کی بھی ضرورت ہے کہ انسان کے اندر جس "داخلی دنیا" کا انکشاف ہوتا ہے وہ مادہ کی خارجی دنیا کی حریف نہیں ہوتی بلکہ وہ تو مادی دنیا کے رگ و پے میں جذب ہوتی ہے۔ اس لئے خودی کا استحکام، مادی دنیا کی قوتوں کے ترک سے نہیں بلکہ داخلی دنیا اور خارجی دنیا کی باہمی تطبیق و توفیق سے ہوگا (خطبات ص۹)۔ وحی "انسان کے اس بلند شعور کو بیدار کرتی ہے جس سے اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا خدا اور کائنات سے کیا تعلق ہے۔" (خطبات صفحہ ۱۵۷)

جب انسان اس تعلق کو صحیح معنوں میں سمجھ لیتا ہے تو اس کی رو سے ایک ایسا نظام قائم کرتا ہے جس میں یہ تمام قوتیں اس مقصد کے بروئے کار لانے میں صرف ہوتی ہیں جو حیات کے سرچشمہ کا تقاضا ہے۔ اس طرح "اس کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ" ہو جاتا ہے۔

علامہ اقبالؒ کہتے ہیں۔

---

۵۱ رہبانیت درحقیقت کشمکش حیات سے گریز و فرار کی راہ ہے (تفصیل "خلاصہ مباحث" میں دیکھئے)

۵۲ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ ([illegible])

"خدا کی تمام مخلوق میں انسان ہی اس قابل ہے کہ وہ شعوری طور پر اپنے خالق کی حیاتِ تخلیق میں شرکت کر سکے
اس میں یہ جوہر ودیعت کیا گیا ہے کہ یہ ایک بہتر دنیا کا تصور کر سکے اور جو کچھ موجود ہے اسے وہ کچھ بنا دے جو اسے
ہونا چاہیئے۔" (خطبات صفحہ ۱۲)

مقصود و مطلوب

جو کچھ موجود ہے (What is) اسے کیا ہونا چاہیئے؟ (What ought to be) اس کا تعین اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ انسان کائنات کی مختلف اشیاء کی حقیقت معلوم کر سکے۔ اور ایسا ہونا وحی کی روشنی کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لئے کہ اس کے علاوہ کوئی اور ذریعہ ایسا نہیں جس سے حقیقت کا ادراکِ کلی ہو سکے۔ یہی وہ روشنی ہے جس سے انسان، قلبِ کائنات کی گہرائیوں میں اتر کر اس کی تمام وسعتوں پر چھا جاتا ہے۔ اس مقام پر سب سے پہلے اسے اپنی ذات کے اثبات کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اس طرح اس پر حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ "دنیا میں فی الحقیقت وہی ثابت (real) ہے جسے اپنے اثبات کا براہ راست شعور ہے (خطبات صفحہ ۶۸) اس سے انسان اپنے آپ کو بہ حیثیت انسان پہچانتا ہے۔ اس طرح اس کی زندگی کے تمام گوشے جگمگا اٹھتے ہیں۔ اس طرح وحی اس کی زندگی کے تمام شعبوں میں اس کی راہ نمائی کرتی ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ

"مذہب کسی ایک شعبۂ زندگی کا نام نہیں۔ یہ نہ تو محض خیال ہے۔ نہ محض احساس۔ نہ محض عمل۔ بلکہ یہ انسان کا
تمام تر جمان ہے۔[1]" (خطبات صفحہ ۲)

بقائے نفس کا راز

ایک مرتبہ عنوانِ زیرِ نظر کا پہلا صفحہ پھر الٹیئے۔ آپ دیکھیں گے کہ انسانی خودی (Ego) حیاتِ جاوید کی آرزو مند تھی۔ وہ اپنا استہلاک نہیں چاہتی تھی۔ وہ فنا کے تصور سے خوف کھاتی تھی۔ ابلیس نے اسے شجرۃ الخلد کی طرف اشارہ کیا اور یوں اسے یہ سمجھایا کہ بقا کا مسئلہ حسی (استدلالی) علوم کے ذریعے حل ہو سکتا ہے اور انسان اپنی اولاد کی وساطت سے ہمیشہ زندہ رہ سکتا ہے اس کے برعکس ندائے آسمانی نے کہا کہ یہ گمراہی کی طرف دعوت ہے۔ فنا کی طرف بلاوا ہے۔ بقا کا راز کچھ اور ہے۔ فَمَنۡ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَلَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ (۲/۳۸) اگر تباہی و بربادی کے خوف سے مامون ہونا چاہتے ہو تو اس کا ایک ہی طریق ہے کہ "میری طرف سے بھیجی ہوئی ہدایت" کے مطابق زندگی بسر کرو۔ یہ تمہیں سلامتی کے گھر کی طرف لیجائے گی یَهۡدِیۡ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ (۵/۱۶) تاریخِ انسانیت پر نگاہ ڈالیئے وہ ایک داستان نظر آئے گی اسی کشمکش پیہم کی کہ نشیدِ کامرانی، استدلالی علوم (تنہا عقلِ انسان) سے فردوس گوش ہو سکتی ہے یا اس کے لئے وحیِ خداوندی کی ندائے

---

[1] حقیقت سے عدم آگہی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان خود اپنی ذات کے اثبات سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ وَلَا تَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنۡسٰهُمۡ اَنۡفُسَهُمۡ ؕ اُولٰٓئِکَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ (۵۹/۱۹) [2] (It is an expression of the Whole Man)

جمال بھی ضروری ہے۔ مدعیانِ علمِ استدلالی نے کیا کیا؟ سب سے پہلے تنہا عقل کی رو سے یہ فیصلہ کیا کہ نوعِ انسانی کے سامنے مسئلہ (Problem) ہے کیا؟ اور پھر اس مسئلہ کا حل بھی عقلِ انسانی سے تلاش کرنا چاہا۔ آپ دیکھیں گے کہ علمِ استدلالی نے انسان کے مسئلہ کو اس کی طبیعیاتی زندگی سے آگے دیکھا ہی نہیں۔ اس لئے کہ علمِ استدلالی خود متناہی ہے اور اس کی نگاہ متناہیت کی حدود سے آگے جا ہی نہیں سکتی۔ اس نے انسان کو انسان کی حیثیت سے پہچانا ہی نہیں۔ اس لئے اس نے جو نظام بھی قائم کیا وہ انسانی ذات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے بجائے خلش و اضطراب کا جہنم بن کر مسلط ہوگیا۔ اس کے برعکس وحی کی روشنی نے اس کی راہ نمائی اس راستے کی طرف کر دی جو حسن و توازن کو ساتھ لئے ہوئے، ایسے اس جنت کی طرف لیجائے جس کی بہاریں خزاں نا آشنا اور جس کی شادابیاں، افسردگی نادیدہ ہیں (جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ۔ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا)

بابِ دوم

گذشتہ صفحات میں ہم نے علمِ انسانی کے مختلف ذرائع اس کے حدود و قیود اور لزومات و تضمنات کے متعلق فکری طریق سے بحث کی ہے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس پس منظر میں قرآنی تصریحات کا بھی مطالعہ کیا جائے اور استنتاجی طریق (pragmatic test) کی رو سے اس کی پیش کردہ تعلیم کو جانچا جائے۔ باب اول میں سب سے پہلے، عقل ریا علمِ استدلالی سے بحث کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کے لئے عقل کس قدر شرف و عزت کا باعث ہے اور قرآن کریم اس کی اہمیت پر کس قدر زور دیتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ عقل کا اپنا دائرہ اثر و نفوذ اور حیطۂ تحقیق و تفتیش ہے

باندازِ دگر

جس سے آگے یہ بڑھ نہیں سکتی اس کے بعد ضروری ہے کہ یہ وحی کا دامن پکڑے[1] اسی کی روشنی میں زندگی کی مسافت طے کرے۔ یعنی وحی اور عقل کا وہی تعلق ہو جو سورج کی روشنی اور انسانی آنکھ کا تعلق ہے جس طرح سورج کی روشنی کے بغیر انسانی آنکھ کا عدم اور وجود برابر ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی کے پاس دیدۂ بینا نہ ہو تو اس کے لئے سورج کی روشنی کا ہونا اور نہ ہونا بھی کچھ فرق نہیں پیدا کرتا۔ لہذا شاہراہ زندگی پر گامزن ہونے کے لئے انسانی

---

[1] اسی طرح ضمیر، وجدان اور باطنیت کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو وحی کے سایۂ عاطفت میں لے آئیں۔ جب ضمیر و وجدان، وحی کی پیدا کردہ فضا میں پرورش پائیں گے تو ان کے فیصلے وحی کی روشنی میں ہوں گے۔ اسی طرح جب نفس کی قوتیں اس نظام کے عملی قیام میں صرف ہوں گی جو وحی کا منشا ہے تو پھر کشمکشِ حیات سے فرار کی راہیں مسدود ہو جائیں گی۔ صحیح راہِ عمل یہ ہے کہ انسان کی تمام داخلی اور خارجی قوتیں وحی کے تابع ہوں اور اس کے عطا فرمودہ ضابطۂ حیات کو ایک جیتے جاگتے نظامِ زندگی کی صورت میں متشکل کرنے میں صرف کی جائیں۔

عقل اور وحی کی روشنی، دونوں کی ضرورت لاینفک ہے۔ قرآن کریم کو شروع سے اخیر تک دیکھئے۔ ہر صفحہ پر عقل و بصیرت کی طرف دعوت نظر آئے گی۔ قرآن کریم کا تخاطب ہی عقل و دانش سے ہے۔ وہ حق و صداقت سے انکار کرنے والوں کے خلاف سب سے بڑا الزام یہی عائد کرتا ہے کہ وہ عقل و فہم سے کام نہیں لیتے۔

قرآن اور عقل

صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ (۲/۱۷۱) وہ کہتا ہے کہ یہ لوگ یکسر اندھیرے میں ہیں۔

وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا صُمٌّ وَبُكْمٌ فِي الظُّلُمَاتِ ۗ مَن يَشَإِ اللَّهُ يُضْلِلْهُ وَمَن يَشَأْ يَجْعَلْهُ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝ (۶/۳۹)

اور (دیکھو) جن لوگوں نے ہماری آیتیں جھٹلائیں، تو ان کا حال ایسا ہو گیا ہے، گویا بہرے گونگے تاریکیوں میں گم ہوں! (سو) جس کسی پر خدا چاہے (اپنے قانون ہدایت کے مطابق) راہ (کامیابی) گم کر دے، اور جسے چاہے (اس قانون کے مطابق کامیابی و فلاح کی) سیدھی راہ پر لگا دے (اس نے اس بارہ میں جو قانون ٹھہرا دیا ہے، تم بدل نہیں سکتے)۔

وہ عقل و فکر سے کام نہ لینے والوں کو بدترین خلائق قرار دیتا ہے۔

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ۝ (۸/۲۲)

یقیناً اللہ کے نزدیک سب سے بدتر حیوان وہ (انسان) ہیں جو بہرے گونگے ہو گئے، جو کچھ سمجھتے ہی نہیں!

وہ کہتا ہے کہ ایسے لوگ انسان نہیں ڈھور ڈنگر ہیں۔ بلکہ اُن سے بھی گئے گذرے کہ حیوانات (مجبوراً ہی سہی) اپنی جبلت پر تو قائم رہتے ہیں۔

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ۖ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ۝ (۷/۱۷۹)

اور کتنے ہی جن اور انسان ہیں جنہیں ہم نے جہنم کے لئے پیدا کیا (یعنی قانون مکافات کی رو سے اُن کا ٹھکانا جہنم ہونے والا ہے اس لئے کہ) اُن کے پاس عقل ہے مگر اُس سے سمجھ بوجھ کا کام نہیں لیتے۔ آنکھیں ہیں، مگر اُن سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ وہ (عقل و بصیرت کا استعمال کھو کر) چارپایوں کی طرح ہو گئے۔ بلکہ اُن سے بھی زیادہ کھوئے گئے ایسے ہی لوگ ہیں جو یک قلم غفلت میں ڈوب گئے ہیں!

قرآن اپنی دعوت کو علیٰ وجہ البصیرت پیش کرتا ہے۔ اندھی عقیدت کی بنا پر نہیں منواتا۔

قُلْ هَٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ ۚ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي ۖ وَسُبْحَانَ اللَّهِ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ (۱۲/۱۰۸)

(اے پیغمبر!) تم کہدو میری راہ تو یہ ہے میں اس روشنی کی بنا پر جو میرے سامنے ہے، اللہ کی طرف بلاتا ہوں اور (اس راہ میں) جن لوگوں نے میرے پیچھے قدم اٹھایا ہے، وہ بھی (اسی طرح بلاتے ہیں) اللہ اس سے بہت بلند ہے (کہ اسے جہالت اور بے علمی کے زور سے منوایا جائے) نہ ہی وہ ایسا ہے کہ اس کے ساتھ کسی اور قوت کو شریک کیا جائے۔

اس لئے وہ ضد اور انکار کرنے والوں سے کہتا ہے کہ اپنے دعوے کے ثبوت میں دلیل و برہان لاؤ۔

سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا ...... إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ ٥ (۶/۱۴۹)

جن لوگوں نے کفر کا شیوہ اختیار کیا ہے وہ کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا شرک نہ کرتے، اور نہ کسی چیز کو (اپنے خیال کے مطابق) حرام ٹھہراتے، سو (دیکھو) اسی طرح ان لوگوں نے بھی (سچائی کو) جھٹلایا تھا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ یہاں تک کہ (بالآخر) ہمارے عذاب کا مزہ چکھنا پڑا۔ (اے پیغمبر!) تم کہو کیا تمہارے پاس (اس بارہ میں) کوئی علم و یقین ہے۔ جسے ہمارے سامنے پیش کر سکتے ہو؟ (اگر ہے تو پیش کرو!) اصل یہ ہے کہ تم پیروی نہیں کر رہے ہو مگر محض وہم و گمان کی۔ اور تمہارا یہ دعویٰ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ بے سمجھے بوجھے باتیں بناتے ہو!

لیکن دلیل ایسی جو حق و یقین پر مبنی ہو۔ ظن و قیاس پر اس کا مدار نہ ہو۔ کیونکہ حقیقت کے مقابلہ میں ظن و تخمین کچھ کام نہیں۔

وَمَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ٥ (۵۳/۲۸)

اور دیکھو، انہیں حقیقت کے متعلق کچھ بھی علم نہیں ہے۔ وہ محض ظن و قیاس کی پیروی کر رہے ہیں اور بلا شبہ حق کے متعلق ظن و تخمین کے گھوڑے دوڑانا، کچھ بھی فائدہ نہیں دے سکتا۔

اسی لئے اس نے حکم دیدیا ہے کہ بلا علم و یقین کسی چیز کی پیروی مت کرو۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ٥ (۱۷/۳۶)

اور دیکھو، جس بات کا تمہیں علم و یقین نہیں، اس کے پیچھے نہ پڑو۔ یاد رکھو۔ کان، آنکھ، خیالات ان سب کے بارے میں باز پرس ہونے والی ہے۔

اس لئے کہ میزانِ خداوندی میں اندھا اور آنکھوں والا۔ بہرہ اور سننے والا کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔

مَثَلُ الْفَرِيقَيْنِ كَالْأَعْمَىٰ وَالْأَصَمِّ وَالْبَصِيرِ وَالسَّمِيعِ هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلًا أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ٥ (۱۱/۲۴)

ان دو فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے اندھا بہرا اور ایک دیکھنے سننے والا۔ پھر بتلاؤ کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا تم

عزو شکر نہیں کرتے!

قرآن کریم نے علم و عقل پر کس قدر زور دیا ہے۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے جس کا تفصیلی تذکرہ کسی آئندہ جلد میں آئے گا لیکن متذکرہ صدر اجمالی اشارات سے اس حقیقت کی ایک جھلک سی ضرور سامنے آگئی ہوگی۔ ان حقائق کی روشنی میں کون دیدہ ور کہہ سکتا ہے کہ اسلام علم و عقل کا مخالف ہے! اس نے تو اس زمانہ میں عقل و بصیرت کی عظمت کو دنیا کے سامنے پیش کیا جب دنیا جہالت اور توہم پرستی کو انسانیت کے لئے مایۂ ناز سمجھا کرتی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن کریم ہمیں یہ بھی بتلاتا ہے

عقل کا دائرہ محدود ہے

کہ عقل کا اپنا دائرہ ہے گا اور اس کی فضیلت و افادیت اسی دائرہ کے اندر ہے۔ اس دائرہ سے آگے اس کے لئے وحی کی قندیل آسمانی کی راہ نمائی کی ضرورت ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ آنکھ کی قوت کو بڑھانے کے لئے خارجی امداد کی ضرورت ہے۔ اندھیرے میں آنکھ بالکل نہیں دیکھ سکتی۔ تھوڑی سی روشنی (جو خارج سے آتی ہے) قوت بینائی کو بڑھا دیتی ہے۔ جوں جوں روشنی تیز ہوتی جائے نگاہ کی حد وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ پھر اگر اس روشنی کے ساتھ دوربین بھی ہو تو ان حدود کی وسعت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے جو چیزیں تنہا آنکھ کو کبھی نظر نہیں آسکتیں وہ خوردبین اور دوربین کی مدد سے کھلی کھلی اور نکھری نکھری سامنے آجاتی ہیں۔ اسی طرح قوتِ سماعت کے حدود آلات مکبر الصوت (loudspeakers) سے وسیع سے وسیع تر ہو جاتے ہیں۔ جس طرح خارجی امداد سے ان ذرائع احساس کی حدود وسیع ہو جاتی ہیں اسی طرح قوتِ فکر کی حدود بھی وحی کی روشنی سے کشادہ و وسیع ہو جاتی ہیں۔ تنہا عقل ہمیشہ ظن و تخمین کی وادیوں میں محو حیرت و سرگرداں رہتی ہے لیکن وحی کی روشنی میں یقین کے درجہ پر پہنچ جاتی ہے۔ اس لئے کہ وحی علم و یقین ہے اور دلیلِ محکم!

عقل اور وحی

ہم نے کہا یہ ہے کہ وحی کی روشنی میں (i) عقل کی حدود بہت زیادہ وسیع ہو جاتی ہیں۔ اور (ii) وہ ظن و تخمین کی وادیوں میں بھٹکنے کے بجائے علم و یقین کے محکم نقطہ پر پہنچ جاتی ہے۔ وحی انسانی حیات اجتماعیہ کے لئے اصول متعین کرتی ہے اور پھر عقل سے کہتی ہے کہ وہ ان اصولوں کی جزئیات متعین کرے اور ان کی تنفیذ و ترویج کے لئے اسباب و ذرائع تلاش کرے۔ مثلاً وحی کا ارشاد ہے کہ سود حرام ہے۔ اب عقل کا کام یہ ہے کہ وہ ایسا نظام معاشی وضع کرے جس میں سود کے بغیر کاروبار چل سکے۔ ظاہر ہے کہ جب دنیا میں ایسے بین الاقوامی نظام ہائے معاشی رائج ہوں جن کی بنیادیں سود پر ہوں تو ان کے علی الرغم ایک ایسا نظام وضع کرنا جو اپنی اساس و بنیاد میں ان تمام نظام ہائے معاشی سے مختلف ہو، لیکن اس کے باوجود دنیا میں نہایت آسانی سے رائج بھی ہو سکے، کارے باشد۔ سوچئے کہ ایسا نظام وضع کرنے کے لئے عقل کی حدود میں کس قدر کشادگی اور اس کی پہنائیوں میں کس درجہ وسعت پیدا ہو جائے گی۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ اگر عقل کے سامنے کوئی خاص اصول متعین نہ ہو تو اس کا جہاں جی چاہے گا رک کر بیٹھ

جائے گی۔ اور اسی نقطہ کو منزل قرار دیدے گی۔ آپ کے پاس کوئی معیار نہ ہوگا جس کی رو سے آپ یہ کہہ سکیں کہ عقل، مقامِ مقصود تک نہیں پہنچی۔ راستہ میں ہی تھک کر بیٹھ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اقوام جنہوں نے تنہا عقل کی رو سے حیاتِ اجتماعیہ کے قوانین وضع کئے اُن کی حالت یہ رہی (اور آج بھی یہی حالت ہے) کہ عقل نے جس مقام کو منزل کہدیا، وہ اسے منزل سمجھ کر بیٹھ گئے۔ لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد مزید تجربات و مشاہدات، یا یوں کہئے کہ داعیاتِ حیات نے یہ حقیقت واضح کردی کہ جس مقام کو منزل سمجھ لیا گیا تھا وہ منزل نہ تھا۔ یہ صرف فریبِ عقل تھا کہ اس نے اپنی خستگی و درماندگی کو منزل کی غلط تعبیر میں چھپا دیا۔ لیکن اگر انسانی حیاتِ اجتماعیہ کے لئے اس کے اصول متعین ہوں (یعنی منزل کا تعین پہلے کر دیا گیا ہو) تو عقلِ حیلہ جو آپ کو کبھی فریب نہ دے سکے گی۔ اس لئے کہ آپ جب تک منزل تک نہ پہنچ جائیں گے اسے چین نہ لینے دیں گے۔ اس لئے اسے ظن و قیاس کے بجائے۔ علم یقین تک پہنچنا لازمی ہوگا۔ مثلاً آپ کسی بچے کو حساب کا سوال حل کرنے کے لئے دیتے ہیں اگر آپ نے اس کا صحیح جواب متعین کر کے اس کے سامنے نہیں رکھ دیا تو وہ جو جواب نکالیگا اسے صحیح تصور کر کے مطمئن ہو کر بیٹھ جائے گا۔ لیکن اگر آپ نے اس کا جواب متعین کر کے دے دیا ہے تو وہ اپنی عقل کو کبھی اطمینان سے نہیں بیٹھنے دے گا جب تک وہ اس جواب تک نہ پہنچ جائے جو آپ نے متعین کر کے دیدیا ہے۔ یہی صورت عقل کی ہے آپ اس کے سامنے اصولی قوانین نہ رکھئے۔ وہ ہر مقام پر کہدے گی کہ صحیح جواب یہی ہے اور اس پر قناعت کر کے بیٹھ جائے گی۔ لیکن اگر اس کے سامنے اصولی قوانین موجود ہیں تو اسے طوعاً و کرہاً وہاں تک پہنچنا پڑے گا۔ اس طرح عقل، ظن و تخمین کے فریبِ راہ کے بجائے علم و یقین کے صحیح مقامِ محمود تک پہنچ جائے گی۔ عقل کی راہ نمائی اور عشق کی راہ نمائی میں یہی فرق ہے

ہر دو بہ منزلے رواں۔ ہر دو امیرِ کارواں عقل بہ حیلہ می برد۔ عشق برد کشاں کشاں

عشق ز پا در آورد خیمۂ شش جہات را دست دراز می کند تا بہ طنابِ کہکشاں

یہ ہے وحی اور عقل کا تعلق۔ یعنی وحی، عقل کی حدود کو وسیع تر کرنے اور اس کے ظن و تخمین کو حتم و یقین میں تبدیل کرنے کے لئے ہے۔ جیسے روشنی، آنکھ کی وسعتوں کو وسیع کرنے اور اس کے نتائج کو ظن و تخمین سے مبدل بہ یقین کرنے کے لئے ہے۔ لیکن ہمارے ہاں جس طرح اور معاملات میں افراط و تفریط کی راہیں اختیار کی جاتی ہیں اور مسلکِ اعتدال و اقتصاد پر کبھی قائم نہیں رہا جاتا، عقل کے معاملہ میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ ایک طرف اگر محسوسات کی خوگر مغرب زدہ

عقل کی تحقیر غلطی ہے

ذہنیتیں عقل سے آگے کسی اور سرچشمۂ علم کو تسلیم ہی نہیں کرتیں تو دوسری طرف وہ ذہنیتیں بھی موجود ہیں جو عقل کی اس درجہ تنقیص و تذلیل کرتی ہیں۔ گویا یہ نوعِ انسانی پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اس سے بچنا انتہائی تقدس و تورع کی نشانی اور تماشا یہ کہ یہ لوگ اپنے دعوے کے ثبوت میں دلیل یہ لاتے ہیں کہ دیکھئے خود مغرب کے عقل پرست بھی سائنس کی محدودیت اور عقل کی ناقصیت کے قائل ہیں۔ حالانکہ عقل و سائنس کی محدودیت اور شے ہے اور اس کا قابلِ مذمت قرار دیا جانا اور شے۔ سائنس ماورائے مادہ

اپنی تحقیقات کو نہیں بڑھا سکتی یہ اس کی محدودیت ہے۔ لیکن اپنے دائرہ کے اندر اس کی علمی کاوشیں یقیناً سزاوارِ تحسین و تبریک ہیں۔ عقل کا دائرہ استدلال کی دنیا ہے۔ وہ اس سے آگے وحی کی دنیا میں قدم نہیں رکھ سکتی۔ یہ اس کی ناقصیت ہے۔ لیکن اس سے ہرگز یہ مفہوم نہیں کہ اسے اس کے اپنے دائرہ کے اندر بھی قابلِ نفرت قرار دیدیا جائے۔ وحی ان دوائر کی حدود متعین کر کے ہر شے کو اس کی اصلی پوزیشن عطا کر دیتی ہے۔ یہی اربابِ حق و اعتدال کا مسلک ہے جن کے متعلق قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ .... رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۳/۱۹۰-۱۹۹)

یقیناً تخلیق ارض و سما اور اختلافِ لیل و نہار میں اربابِ دانش و بینش کے لئے (بڑی بڑی) نشانیاں ہیں۔ وہ اربابِ بینش، جو کھڑے۔ بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر لیٹے (توانین خداوندی کو ہر وقت اپنے سامنے رکھتے ہیں اور تخلیق ارض و سماوات میں غور و تفکر کرتے رہتے ہیں اور دکامل تحقیق و تدقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ) اے ہمارے پروردگار! تو نے نظامِ کائنات تخریبی نتائج کے لئے نہیں پیدا کر دیا۔ تیری ذات (اس سے بلند اور) پاک ہے (کہ کائنات کا انجام تخریب ہو جو ایسا سمجھتا ہے اس کی اس سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس کر رہ جاتی ہیں) اے ہمارے نشو و نما دینے والے تو ہمیں اس قسم کے انجام سے محفوظ رکھنا۔

یہ ہیں وہ منازل جہاں استدلال اور وحی یعنی عقل و عشق آپس میں بغلگیر ہوتے ہیں۔ یا یوں کہئے کہ عشق (ایمان یا وحی) کا وسیع دائرہ، عقل کے چھوٹے دائرہ کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ اور عقل اپنے فیصلوں کو عشق کی بارگاہ میں پیش کر کے سندِ حقیقت حاصل کرتی جاتی ہے جس کے بغیر اس کی قیمت کچھ بھی نہیں۔ اس لئے کہ

ہزار بار نکوتر متاعِ بے بصری
ز دانشے کہ دل او بانمی کند تصدیق

حقیقت منکشف ہوتی ہے

اس کے بعد ایک اور چیز ہمارے سامنے آتی ہے۔ باب اول میں بتایا جا چکا ہے کہ اس قلب یعنی مطہر سینے اس عظیم الشان رازِ کائنات کی امانت گاہ بنانا مقصود ہوتا ہے۔ حقیقت اپنے آپ کو منکشف کر دیتی ہے۔ اگر بغور دیکھا جائے تو محسوسات کی دنیا میں بھی کائنات اپنے آپ کو ہم پر منکشف کرتی ہے ہم اس کا انکشاف نہیں کرتے۔ کہنے کو تو ہم یہی کہتے ہیں کہ ہم فلاں چیز کو دیکھتے ہیں لیکن درحقیقت وہ شے خود اپنے آپ کو ہم پر ظاہر کر رہی ہوتی ہے۔ مثلاً ہمارے سامنے یہ کتاب رکھی ہے ہوتا یہ ہے کہ روشنی کے ذریعے اس کا عکس ہماری آنکھ کے پردہ پر مرتسم ہوتا ہے۔ اور یہ عکس ہمارے ذہن پر ایک اثر

مرتب کرتا ہے۔ ہماری آنکھ میں اثر پذیری یا اخاذی کی قوت ہے۔ خود کسی چیز کو دیکھنے کی رفعالی، قوت نہیں ہے۔ لہذا جب تک محسوس دمرئی اشیاء (خاص اصول اور قاعدے کے ماتحت) خود اپنے آپ کو ہم پر ہویدا نہ کریں۔ ہم انہیں دیکھ نہیں سکتے۔ اسی طرح جس "دیدۂ بینا" پر حقیقت اپنے آپ کو منکشف کرنا چاہتی ہے اس میں اس کی اخاذی کی قوت پیدا کر دیجاتی ہے۔ محسوس دنیا کی چیزیں دیکھنے کے لئے قوت بصارت، ایک نوعی موہبت ہے۔ یعنی جس نوع (species) "کو دیکھنے والا" بنایا گیا ہے اس میں یہ قوت ہر فرد کو عطا کر دی گئی ہے۔ پھر اس قوت میں کسب وہنر سے اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن وحی کو حاصل کرنے کی قوت، نوعی نہیں ہے۔ بلکہ انسانوں میں سے صرف انہی کو عطا ہوتی ہے جنہیں اس مقصد کے لئے مختص کیا جاتا ہے۔ نیز اس قوت میں کسب وہنر سے کمی بیشی بھی نہیں ہو سکتی۔ ان اشارات سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ حقیقت، صاحبِ وحی پر اپنے آپ کو منکشف کرتی ہے اور اس میں اس کے اختیار وارادہ کو دخل نہیں ہوتا۔ اسی کو قرآن کریم نے "تنزیل" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جس سے وحی کی خارجیت (Objectivity) واضح ہوجاتی ہے۔

وحی کی خارجیت قرآن کریم کو شروع سے آخیر تک دیکھ جایئے۔ ہر مقام پر وحی کی خارجیت پر زور دیا گیا اور اسے غیر مبہم الفاظ میں واضح کیا گیا ہے۔ یعنی وحی کا خدا کی طرف سے نزول ہوتا ہے۔

تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ (۳۶/۵)

خدائے رحیم کی طرف سے منزل۔

اور

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ (۳۹/۱-۲)

(اور دیکھو) یہ کتاب اس خدا کی طرف سے نازل کی ہوئی ہے جو بڑے غلبہ اور حکمت والا ہے (اے پیغمبر اسلام!) ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب (قرآن) سچائی کے ساتھ اتاری ہے۔ تم اپنے نظام زندگی کو خدا کے لئے خالص رکھتے ہوئے صرف اس کے قوانین کی اطاعت وفرماں پذیری اختیار کرو (اور بس!)

جبریل امین اسے لیکر نازل ہوئے۔[1]

---

[1] جیسا کہ ملائکہ کے عنوان میں بتایا جاچکا ہے، جس طرح عالم محسوس میں، محسوس دمرئی قوتیں نظام کائنات میں ظہور نتائج کے ذرائع وسباب بنتی ہیں اسی طرح عالم امر میں تدبیر امور ملائکہ کے ذریعہ ہوتی ہے۔ ہم نے ابھی ابھی دیکھا ہے کہ ہر وہ شے جو اپنا انکشاف ہم پر کرتی ہے۔ روشنی کے ذریعہ اپنا عکس آنکھ کے پردے پر منتقل کرتی ہے۔ لہذا روشنی عالم محسوس میں ذریعہ انکشاف ہے۔ یوں سمجھئے کہ روشنی مرئی شے کو لیکر ہماری آنکھ کے پردے پر نازل ہوتی ہے۔ اسی طرح (لیکن یہ مثال محض سمجھانے کے لئے ہے) انکشاف حقیقت کی "روشنی" (ذریعہ یا واسطہ) کو جبریل سے تعبیر کیا گیا ہے۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (۲/۹۷)

(اے پیغمبر اسلام!) جو جبریل کے دشمن ہوں ان سے کہدو کہ یہ اللہ کا کلام ہے جو جبریل نے اس کے حکم سے تمہارے قلب میں اتارا ہے اور یہ ان تمام صداقتوں کو سچ کر کے دکھادے گا جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں اس میں نوع انسانی کے لئے ہدایت ہے اور ان لوگوں کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں (فلاح وکامیابی کی) بشارت

اللہ تعالیٰ کی ذات جہت اور سمت کی تمام نسبتوں سے پاک ہے۔ اس لئے نزولِ وحی سے مراد یہ نہیں کہ کوئی شے سچ مچ اوپر کی سمت سے نیچے کی سمت کو آتی ہے۔ خدا تو رگِ جان سے بھی قریب[1] ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۝ (۵۰/۱۶)

اور بلاشبہ ہم نے ہی تو انسان کو پیدا کیا ہے اور جو کچھ اس کا نفس (اس کے دل میں) وسوسے ڈالتا ہے ہم انہیں بھی خوب خوب جانتے ہیں (ہم اس سے کچھ دور تھوڑا ہی ہیں) ہم تو اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں (اسی لئے اس کا ظاہر و باطن سر و علانیہ کچھ بھی ہم سے چھپا نہیں رہ سکتا۔)

اس لئے وحی کی خارجیت سے اصل مقصد یہ بتانا ہے کہ یہ ذہنِ انسانی کی پیداوار نہیں۔ اور نہ ہی اس میں اس کے کسب و ہنر کو کوئی دخل ہے۔

وحی اکتسابی ملکہ نہیں

جیسا کہ باب اوّل میں لکھا جا چکا ہے۔ وحی اگر کسب و ہنر سے حاصل کی جا سکے تو جس ماحول میں رسول پیدا ہوتا۔ پرورش پاتا۔ بڑھتا۔ پھولتا۔ پھلتا ہے۔ اس ماحول میں اور لوگ بھی تو ہوتے ہیں۔ اگر ایک انسان میں اکتساباً حصولِ وحی کا امکان ہو تو دوسرے انسانوں میں بھی اس کا امکان ہو سکتا ہے۔ لیکن وحی اکتسابی چیز نہیں ہے۔ ایسی وہبی ہے کہ اس منصبِ جلیلہ کے لئے اس ماحول میں سے مشیت خداوندی ایک خاص برگزیدہ ذات کا انتخاب کرتی ہے اور اس کے قلبِ مطہر کو وحی کی روشنی کا مہبط بناتی ہے۔

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝ (۲۲/۷۵)

---

[1] خدا کے متعلق "اوپر کی سمت" کا تصور کچھ اس طرح انسان کے قلب کی گہرائیوں میں راسخ ہو چکا ہے کہ خدا کے نام کے ساتھ ہی انگلی اوپر کو اٹھ جاتی ہے حتیٰ کہ اگر منہ زبان سے کچھ نہ کہا جائے اور محض انگلی یا آنکھ سے اوپر کی طرف اشارہ کر دیا جائے تو بھی مخاطب سمجھ لیتا ہے کہ مراد اللہ تعالیٰ ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ کی علوِ مرتبت کا تقاضا تھا کہ اس کے لئے بلندیوں کا تصور ذہن میں قائم ہوتا لیکن اس سے مقصود یہ نہیں کہ وہ سچ مچ کہیں اوپر کی سمت میں جاگزیں ہے۔ سُبْحَانَ اللّٰهِ تَعَالٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ۔

اللہ نے فرشتوں میں سے بعض کو پیام رسانی کے لئے منتخب کر لیا۔ اسی طرح بعض انسانوں کو بھی۔ بلا شبہ اللہ ہی سننے والا دیکھنے والا ہے!

حضرت یونسؑ کے متعلق ارشاد ہے۔

فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ (۶۸/۵۰)

چنانچہ یونس کو اس کے پروردگار نے منتخب کر لیا اور اسے نیک کردار لوگوں میں سے بنا دیا (جو نبوت و رسالت کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

حضرت موسیٰ کے متعلق فرمایا۔

وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ۝ (۲۰/۴۱)

اور (دیکھ، اے موسیٰ!) تجھے میں نے اپنی ذات کے لئے (آسمانی ہدایات اور بنی اسرائیل کی راہ نمائی کے لئے جو ایک مقصد الٰہی ہے) برگزیدہ کر لیا ہے۔

رسول جب پیغام وحی کی تبلیغ کرتا ہے تو اس کے گرد و پیش کے لوگوں کو حیرت ہوتی ہے، اس لئے کہ وہ ایسی باتیں کہتا ہے جن کی انہیں قطعاً اس سے توقع نہیں ہوتی وہ اسے اپنے میں سے ہی ایک سمجھتے اور اسی قسم کی اس سے امیدیں وابستہ رکھتے ہیں۔ لیکن وہ نزول وحی کے ساتھ ہی کسی اور دنیا کی باتیں کرنے لگتا ہے۔ جب حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کو اس شرک سے روکا جو ان کے آبا و اجداد سے ان میں متوارث چلا آتا تھا۔ تو وہ فرطِ حیرت سے پکار اٹھے کہ

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ۝ (۱۱/۶۲)

لوگوں نے کہا "اے صالح! پہلے تو تو، ایک ایسا آدمی تھا کہ ہم سب کی امیدیں تجھ سے وابستہ تھیں۔ پھر کیا تو ہمیں روکتا ہے کہ ان معبودوں کی اطاعت کریں جنہیں ہمارے باپ دادا پوجتے چلے آئے ہیں (یہ کیسی بات ہے؟) ہمیں تو اس بات میں بڑا ہی شک ہے جس کی طرف تم دعوت دیتے ہو کہ ہمارے دل میں اترتی نہیں"

یہ موہبت کبریٰ نسبی اور قومی بھی نہیں ہوتی۔ حضرت ابراہیمؑ کے تذکرہ جلیلہ کے ضمن میں فرمایا۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ۭ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ۝ (۲/۱۲۴)

اور (پھر غور کرو، وہ واقعہ) جب ابراہیم کو اس کے پروردگار نے مختلف قوانین کے ذریعے اسے زندگی کے مختلف مراحل میں گردش دی تھی اور اس نے ہر قانون کی پوری پوری اطاعت کی تھی۔ جب ایسا ہوا تو خدا نے فرمایا "اے ابراہیم! میں تجھے نوع انسانی کا امام بنانے والا ہوں" ابراہیم نے عرض کیا جو لوگ میری نسل سے ہوں گے (ان کی نسبت

کیا حکم ہے؟) ارشاد ہوا، جو ظلم و معصیت کی راہ اختیار کریں، تو اُن کا ایسے عہد میں کوئی حصہ نہیں۔"

وحی صرف مشیت پر مبنی ہے

وحی، اللہ کی رحمت ہے جو صرف مشیت پر مبنی ہوتی ہے۔

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝ (۲/۱۰۵ نیز ۳/۷۳)

اہل کتاب میں جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے، وہ اور مشرکین مکہ، دونوں نہیں چاہتے کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر خیر و برکت (یعنی وحی الٰہی) نازل ہو۔ (اور اس لئے وہ طرح طرح کے شکوک پیدا کر کے تمہیں اتباع حق سے باز رکھنا چاہتے ہیں) لیکن اللہ کا قانون اس بارے میں انسانی خواہشوں کا پابند نہیں ہو سکتا۔ وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے لئے چن لیتا ہے، اور وہ بڑا فضل رکھنے والا ہے!

اس کا علم صرف اللہ کی ذات ہی کو ہوتا ہے کہ اس منصب گرامی کے لئے کس ذات اقدس و اعظم کو منتخب کیا جائے گا۔

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ۝ (۶/۱۲۴)

اللہ ہی اس بات کو بہتر جاننے والا ہے کہ کہاں اور کس طرح اپنی رسالت ٹھہرائے۔

سورۂ نحل میں ہے

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ۝ (۱۶/۲)

وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے، اس غرض کے لئے چن لیتا ہے کہ اپنے حکم سے فرشتے الروح کے ساتھ (یعنی وحی کے ساتھ) اس پر بھیجے، اور اسے حکم دے کہ لوگوں کو اس حقیقت سے خبردار کر دو "میرے سوا کوئی معبود (قابل اطاعت و فرمانبرداری) نہیں ہے۔ لہذا میرے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرو۔

سورۂ مومن میں ہے۔

رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ ۚ يُلْقِى الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ۝ (۴۰/۱۵)

(اور دیکھو، وہ ہی) بلند مرتبوں والا اور صاحب عرش (حکومت) ہے (اس کے سوا کسی کی بادشاہت نہیں) وہ اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے الروح (یعنی وحی) بھیجتا ہے۔ تاکہ وہ (خدا کے) سامنے ہونے کے دن سے (لوگوں کو) ڈرائے۔

چونکہ یہ موہبت مشیت پر مبنی ہے اس لئے اگر مشیت اسے سلب کر لینا چاہے تو اسے کوئی واپس نہیں لا سکتا ہے؟

وَلَئِنۡ شِئۡنَا لَنَذۡهَبَنَّ بِالَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَیۡنَا وَكِیۡلًا ۝ (۱۷/۸۶)

اور (اے پیغمبر!) جو کچھ ہم نے تجھ پر وحی کی ہے، اگر ہم چاہیں تو اسے سلب کر لیں۔ پھر تجھے کوئی نہ ملے جو اس کے لئے ہم پر زور چلائے۔

خالص موہبت اس اختصاص و اجتبار کی تو یہ حالت ہے کہ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، خود رسول کو بھی رسالت سے پہلے اس کا علم نہیں ہوتا کہ وہ اس منصب جلیل کے لئے تیار کیا جا رہا ہے۔ حضرت موسیٰ جب اپنے اہل خانہ کے لئے آگ کی تلاش میں نکلے ہیں تو انہیں دور سے ایک شعلۂ نور دکھائی دیا۔ انہوں نے اسے آگ ہی کا شعلہ سمجھا اور نہایت سادگی سے اس کی طرف لپکے۔ قریب پہنچے تو حظیرۂ قدس سے آواز آئی۔

وَاَنَا اخۡتَرۡتُكَ فَاسۡتَمِعۡ لِمَا یُوۡحٰی ۝ (۲۰/۱۳)

اور دیکھ! میں نے تجھے (رسالت کے لئے) چن لیا ہے۔ پس جو کچھ وحی کی جاتی ہے اسے کان لگا کر سن!

خود وہ ذات اعلم الناس، معلم الحکمار (فداہ ابی و امی) جو شرف و رشد انسانیت کے معراج کبریٰ پر فائز اور علم و عقل کے فن اعلیٰ پر جلوہ ریز تھی اسے بھی وحی سے پہلے اس کا علم نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کسے کہتے ہیں۔

وَكَذٰلِكَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡكَ رُوۡحًا مِّنۡ اَمۡرِنَا ؕ مَا كُنۡتَ تَدۡرِیۡ مَا الۡكِتٰبُ وَلَا الۡاِیۡمَانُ وَلٰكِنۡ جَعَلۡنٰهُ نُوۡرًا نَّهۡدِیۡ بِهٖ مَنۡ نَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّكَ لَتَهۡدِیۡۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ۝ (۴۲/۵۲)

اور (دیکھ، اے پیغمبر اسلام!) اسی طرح ہم نے تیری طرف بھی اپنے حکم سے الروح (وحی الٰہی) بھیجی (ورنہ اس سے پہلے) تو (قطعاً) ناآشنا تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے۔ اور ایمان کسے کہتے ہیں؟ مگر ہم نے اس (الروح۔ یعنی قرآن) کو ایک نور بنا دیا جس کے ذریعہ سے ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں۔ اپنے قانون ہدایت کے مطابق رہنمائی کر دیتے ہیں۔ اور اسی کے ذریعہ سے تو بھی (اے پیغمبر! لوگوں کو) سیدھے راستے کی طرف رہبری کر رہا ہے۔

نہ جانتے تھے۔ اور نہ ہی اس کی کوئی توقع تھی کہ آپ کو نبوت مل جائے گی۔

وَمَا كُنۡتَ تَرۡجُوۡۤا اَنۡ یُّلۡقٰۤی اِلَیۡكَ الۡكِتٰبُ اِلَّا رَحۡمَةً مِّنۡ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوۡنَنَّ ظَهِیۡرًا لِّلۡكٰفِرِیۡنَ ۝ (۲۸/۸۶)

اور (دیکھ اے پیغمبر!) تجھے کوئی امید نہیں تھی کہ تیری طرف الکتٰب (یعنی قرآن) بھیجی جائے گی۔ مگر یہ تو صرف تیرے پروردگار کی (تجھ پر) رحمت تھی (کہ اس منصب جلیل کے لئے اس نے تجھے چن لیا) تو یاد رکھ! ایسا کبھی نہ ہو کہ تو نافرمان لوگوں کا مددگار بن جائے۔

وحی سے پہلے نہ لکھنا جانتے ہیں نہ پڑھنا۔ لیکن ہبط اس نور کے بنائے جا رہے ہیں جس سے اکتساب ضیا کرنے والے ساری دنیا میں علم و حکمت کے امام تسلیم کئے جائیں۔

وَمَا كُنتَ تَتْلُوا مِن قَبْلِهِ مِن كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ إِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُونَ ۝ (۲۹/۴۸)

(اور دیکھ لے پیغمبر!) تُو نہ تو اس (قرآن) سے پہلے کوئی کتاب پڑھتا تھا۔ نہ ہی اپنے ہاتھ سے کچھ لکھتا تھا جس کی بنا پر یہ بیہودہ لوگ شک کر سکتے ہوں (پھر ان کا یہ بلاوجہ شک و شبہ کس لئے ہے؟)

اسی لئے گرد و پیش کے لوگوں کو تعجب ہوتا تھا کہ یہ تو ہم میں سے ایک آدمی تھا۔ اس پر وحیؔ کس طرح آنے لگ گئی!

أَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا أَنْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ رَجُلٍ مِّنْهُمْ أَنْ أَنذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا أَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِندَ رَبِّهِمْ ۗ قَالَ الْكَافِرُونَ إِنَّ هَٰذَا لَسَاحِرٌ مُّبِينٌ ۝ (۱۰/۲)

کیا لوگوں کو اس بات پر اچنبھا ہوا کہ ان ہی میں سے ایک آدمی پر ہم نے وحی بھیجی؟ اس بات کی وحی، کہ لوگوں کو (انکا بدعملی کے نتائج سے) خبردار کر دے۔ اور ایمان والوں کو خوشخبری دیدے کہ پروردگار کے حضور ان کے لئے اچھا مقام ہے؟ کافروں نے کہا۔ بلاشبہ یہ شخص کھلا ہوا جادوگر ہے!

اسی لئے یہ لوگ جو حقیقتِ وحی سے ناواقف تھے کہتے تھے کہ خدا ہم سے ہمکلام کیوں نہیں ہوتا؟

وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللَّهُ أَوْ تَأْتِينَا آيَةٌ ۗ كَذَٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِم مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ۘ تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ ۗ قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ۝ (۲/۱۱۸)

اور جو لوگ وحی کی حقیقت سے بے خبر ہیں وہ کہتے ہیں (اگر یہ تعلیم خدا کی طرف سے ہے تو) کیوں ایسا نہیں ہوتا کہ خدا ہم سے براہِ راست بات چیت کرے، یا اپنی کوئی (عجیب و غریب) نشانی ہی بھیجدے، تو (دیکھو، گمراہی و جہالت کی جیسی بات یہ کہہ رہے ہیں، ٹھیک ٹھیک ایسی ہی بات اُن لوگوں نے بھی کہی تھی۔ جو اُن سے پہلے گزر چکے ہیں۔ اس بارے میں پہلوں اور پچھلوں، سب کے دل ایک ہی طرح کے ہوئے (بہر حال، اگر یہ لوگ نشانیوں ہی کے طلبگار ہیں، اور نشانیوں کی پہچان رکھتے ہیں، تو دیکھ لیں) ہم نے ان لوگوں کے لئے جو ماننے والے ہیں، کتنی ہی نشانیاں نمایاں کر دی ہیں۔

یہ انتخاب کیسے ہوتا ہے؟

لیکن اجتباء، رسالت و اصطفاء، وحی کے یہ معنی نہیں کہ (معاذاللہ) یونہی جس راہ چلتے پر نظر ٹک گئی اسی کو اس منصب کے لئے چن لیا۔ آپ خیال کر سکتے ہیں کہ جب قوتِ عقل و فکر کے لئے مشیتِ خداوندی نے انسان کا انتخاب کیا ہے تو اس آب و گل کے ہیولیٰ کو کس قدر ارتقائی منازل طے کرانے کے بعد اس جوہر کے قابل بنایا گیا تو جس برگزیدہ ہستی کو وحیؔ جیسی موہبتِ عظمیٰ کے لئے منتخب کرنا اور اس کے قلبِ منور کو کائنات کے اسرار و رموز کا امین بنانا ہو وہ شرفِ انسانیت کے کس مقامِ بلند پر جلوہ فرما ہو گا سورۂ صٓ میں حضرات انبیاء کرامؑ کے تذکرہ کے بعد فرمایا:

وَكُلٌّ مِّنَ الْأَخْيَارِ ۝ (۳۸/۴۸)

اور وہ سب بہترین (افرادِ نسلِ انسانی) میں سے تھے۔

وہ تمام کے تمام برگزیدہ کائنات اور بہترین مخلوق ہیں۔ اور جو ہر خُلقِ عظیم کے مظہر (وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ ﴿٦٨:٤﴾) لہٰذا اس حقیقت کے سمجھنے کے لئے کہ جس ذات کو آخر الامر منصب نبوت پر فائز کرنا مقصود ہوتا ہے اس کی تربیت کس طرح شروع ہی سے "خدا کی زیر نگرانی" ہوتی ہے اور کن کن مراحل سے گزار کر اسے مقام نبوت تک لایا جاتا ہے؛ اس کے لئے سورۂ طٰہٰ میں سرگزشت حضرت موسیٰ کا مطالعہ کیجئے۔ بات (٢٠:٣٨) سے شروع ہوتی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی پیدائش کن حالات میں ہوئی کن حالات میں وہ فرعون کے محلات میں پہنچے۔ وہاں ان کی تربیت کس طرح ہوئی۔ پھر کس طرح انہیں محلات کی زندگی سے نکال کر مدین کی شبانی کی طرف بھیجا گیا۔ وہاں کن کن صبر آزما مراحل سے گذارا گیا۔ ان تمام منازل و مراحل کی تفصیل کے بعد ارشاد ہے کہ ثُمَّ جِئْتَ عَلَىٰ قَدَرٍ يَا مُوسَىٰ (٢٠:٤٠) "اے موسیٰ ان تمام مراحل کے طے کرنے کے بعد کہیں جا کر تو ہمارے پیمانے پر پورا اُترا" اس پیمانے پر لانے کے لئے ہم نے تجھے اپنی صنعت کاریوں سے ہر طرح بنایا اور سنوارا وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي (٢٠:٤١) اس طرح نبی کو مقامِ نبوت کے لئے تیار کیا جاتا ہے لیکن اسے خود کچھ علم نہیں ہوتا کہ اس کی اس طرح تربیت کس مقصد کے لئے ہو رہی ہے۔

اس سے واضح ہے کہ نبوت کسب و ہنر سے نہیں ملتی یعنی یہ نہیں کہ ایک شخص کسی خاص طریقے پر چل کر اور خاص انداز کی ریاضتیں کر کے نبوت حاصل کر سکتا ہے۔ اس انداز سے دنیا کے اور علوم تو حاصل کئے جا سکتے ہیں لیکن نبوت کا علم حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ علم نبوت، کشف و وجدان وغیرہ سے بھی یکسر الگ ہے۔ یعنی ان دونوں میں صرف درجہ (Degree) کا فرق نہیں بلکہ دونوں کی نوعیتیں بالکل مختلف ہیں۔ یہ فرق کمیت (Quanti-tative) نہیں بلکہ کیفیت کا (Qualitative) ہے۔ نبوت کی مثال دنیا کے کسی اور علم میں نہیں مل سکتی۔ نبوت اپنی مثال آپ ہے۔ یہ علم، انسان کے اپنے اندر کے کسی ملکہ کی بڑھی ہوئی شکل کا نام نہیں یہ کوئی چیز ہی الگ ہے جسے غیر از نبی کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا۔

استنتاجی طریق

ہم نے یہ بھی کہا تھا کہ وحی کے پرکھنے کا ایک بڑا معیار استنتاجی طریق (Pragmatic Test) ہے۔ اب اس گوشہ کی طرف آئیے۔ چونکہ (جیسا کہ آئندہ جلد میں تاریخی شواہد و نظائر سے بتایا جائے گا) دنیا میں وحی کا مستند اور غیر محرف صحیفہ صرف قرآن کریم ہے۔ اس لئے اس باب میں قرآن کریم ہی کی تعلیم پیش کی جائے گی (اور حقیقت تو یہ ہے کہ جہاں جہاں بھی وحی کی روشنی آئی تھی۔ اس کی تعلیم اساساً و بنیاداً وہی تھی جو قرآن کریم کے اندر ہے۔ وحی کی تعلیم میں اصولی طور پر کوئی فرق ہو ہی نہیں سکتا۔ فرق اس وقت پڑتا ہے جب وحی کی تعلیم میں تحریف انسانی رد و بدل کر دے) پھر اس تعلیم میں سے بھی صرف چند اصولی باتیں پیش کی جا سکیں گی۔ اس لئے کہ اس کی تفصیل کے لئے معارف القرآن کی تمام کی تمام جلدیں وقف ہیں اور اس کے بعد بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکے گا کہ اس کی تعلیم مکمل ہو گئی ہے۔

آپ تاریخ کے اوراق کو چھٹی صدی عیسوی تک پیچھے لوٹیے اور یہ دیکھئے کہ اس زمانہ میں تمام دنیا میں، انسانی ہیئت اجتماعیہ کی حالت کیا تھی[1]؟ اس عہد میں ایران۔ یونان۔ مصر اور روم تہذیب و تمدن کے بڑے بڑے مراکز تھے۔ سب سے پہلے عقائد کی طرف آئیے تو آپ دیکھیں گے کہ اس وقت فکر و نظر کے تمام گوشوں پر کسی نہ کسی شکل میں، شرک مستولی تھا۔ اور یہ عقیدہ جہلاء کی توہم پرستی تک محدود نہ تھا بلکہ بڑے بڑے ارباب حکمت و بصیرت اس "ظلم عظیم" کی تاریکیوں میں مبتلا دکھائی دیتے

شرک

تھے۔ حکمت یونان، علم و آگہی کی سب سے درخشندہ مثال نظر آتی ہے۔ لیکن سقراط نے اپنے مقدمہ عدالت میں اس امر کا اعتراف کیا کہ وہ چاند اور سورج کو دیوتا مانتا ہے۔ (plato's Apology) آج چونکہ ہمارے سامنے بالعموم توحید کی صحیح عظمت نہیں ہے اس لئے ہم شرک کو محض ایک عقیدہ کی بحث تصور کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں لیکن اگر آپ بغور دیکھیں تو شرک و توحید محض علم کلام کے مسائل نہیں۔ بلکہ ان کا تعلق براہ راست زندگی کے اصولی اور بنیادی مباحث سے ہے۔ غور کیجئے کہ جب انسان اپنے ہاتھ کی تراشیدہ مصنوعات یا مظاہر فطرت کے سامنے جھک جائے تو اس میں شرف انسانیت کا شائبہ تک بھی باقی رہ سکتا ہے؟ دنیا میں جن قوموں کے حصہ میں سرفرازی ہوتی ہے انہیں سب سے پہلے قامت انسانیت (human stature) عطا ہوتی ہے جس کا تقاضا ہے کہ انسان اپنے سے کمتر یا اپنے برابر کسی کے سامنے نہ جھکے۔ اس جھکنے کے معنی صرف یہ نہیں کہ پتھر یا مٹی کی کسی مورتی کے سامنے نہ جھکے۔ بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون بھی صرف ایک خدا کا تسلیم کرے جس طرح کائنات میں صرف ایک قانون نافذ العمل ہے اور وہ خدا کا قانون ہے (جسے قانونِ فطرت کہا جاتا ہے) اسی طرح انسانی معاشرہ میں بھی صرف خدا کا قانون نافذ العمل ہونا چاہیئے جو وحی کے ذریعے ملتا ہے اگر کسی انسان نے کسی اور انسان کا، یا اپنا خود ساختہ قانون اپنے لئے واجب الاطاعت سمجھ لیا تو یہ شرک عظیم ہے۔

ہیئت اجتماعیہ

عقائد کے بعد ہیئت اجتماعیہ کی طرف آئیے تو نظام حکومت میں ملوکیت ایک مسلم آئین تھا اور اس کے خلاف کہیں کوئی آواز بلند نہیں ہوتی تھی۔ اس کی مخالفت میں آواز اٹھتا تو ایک طرف، اس نے کچھ ایسے تقدس کی صورت اختیار کر رکھی تھی کہ اسے "آسمانی حق" (Divine Right) تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس سے آگے بڑھئے تو پیشوائیت[2] (priesthood) کی زنجیریں، قلب و دماغ کے ہر گوشے کو

---

[1] اس کے متعلق چند ضمنی اشارات آدم کے عنوان میں بھی گزر چکے ہیں۔ اس لئے ان کے اعادہ کی ضرورت نہ تھی لیکن اس مقام پر چونکہ ذہن کو ایک اور نتیجہ کی طرف منتقل کرنا مقصود ہے اس لئے اس تکرار کو روا رکھا گیا ہے۔

مرا معنیٔ تازہ مدعا ست　　　اگر گفتہ را باز گویم رواست

[2] اس کے ترجمہ کے لئے ہمیں کوئی موزوں لفظ نہیں مل سکا۔ اس لئے اسے کہیں پیشوائیت اور کہیں برہمنیت کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جہاں کہیں یہ الفاظ آئیں۔ آپ ان کے مفہوم پر نگاہ رکھیں۔

چاروں طرف سے جکڑے ہوئے تھیں۔ عمرانی زندگی میں انسانوں کی طبقاتی تقسیم پیدائش کی رو سے کی جاتی تھی۔ ذاتوں اور گوتروں کی ان آہنی دیواروں کی شکست و ریخت کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ رنگ و نسل اور ملک و وطن کی حدود نے نوعِ انسانی کو ٹکڑے ٹکڑے کر رکھا تھا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ احترام آدمیت کا معیار آدمیت کے بجائے مختلف اضافات و انتسابات قرار پا چکے تھے۔ انسان بہ حیثیت انسان کہیں پہچانا نہیں جاتا تھا بلکہ ملک و نسب اور شعوب و قبائل کی رو سے ان کے حقوق و واجبات کا تعین ہوتا تھا۔ انسان کے عہدِ جہالت میں "اپنے قبیلہ میں چوری کو جرم۔ اور دوسرے قبیلہ میں قابلِ ستائش عمل قرار دیا جاتا تھا" لیکن یہ تخصیص عہدِ جہالت سے آگے بڑھ کر دورِ تہذیب میں بھی اصولِ حیات بن چکی تھی۔ چنانچہ "روما کے قانون کی رو سے اپنے ملک کی حدود سے باہر کے انسانوں کو انسان نہیں سمجھا جاتا تھا۔ حدودِ سلطنت کے اندر آزاد انسان کو حقوقِ شہریت اور ان سے متعلقہ مفاد حاصل ہوتے تھے۔ لیکن ان حدود سے باہر تمام انسان، وحشی اور دشمن سمجھے جاتے تھے" (Samuel p. 210) معاشی نظام کی طرف آئیے تو سرمایہ داری ایسا ہی مسلّم آئین تھا جیسے ملوکیت۔ ان ہی غیر فطری نظامہائے زندگی کی ایک شاخ غلامی کی لعنت تھی۔ جو انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا ایک لاینفک جزو قرار پا چکی تھی۔ اُس زمانہ کی مہذب دنیا کی تاریخ کے کسی گوشے پر نگاہ ڈالیے۔ ہر طرف آئینِ زندگی ایسا ہی تھا۔ اس آئینِ حیات کے خلاف زبان تک حرفِ شکایت آنا تو کجا، دل کی گہرائیوں میں بھی کہیں تنگی اور گرانی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ گویا اس نہجِ زندگی کو عین "فطرتِ انسانی" کے مطابق سمجھ لیا گیا تھا۔ غور کیجئے کہ اس فضا میں، عرب کی جاہل اور وحشی سرزمین سے ایک شخص اٹھتا ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اسے وہی کچھ ہونا چاہیے تھا جو اس کے گرد و پیش کے انسان تھے اور اگر اس کی ذہنی سطح کو اس کے گرد و پیش کے انسانوں سے بلند بھی تصور کر لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ اسے اُس زمانہ کی مہذب دنیا کا ایک مردِ دانا قرار دیا جا سکے گا۔ اور اُس زمانہ کی مہذب دنیا کی جو حالت تھی اس کا ذکر اوپر آ چکا ہے لیکن وہ شخص اٹھتا ہے اور اُس آئینِ حیات کے ایک ایک گوشے کے خلاف جسے اُس زمانہ کی

وحی کا لایا ہوا انقلاب

تہذیب و تمدن اور علم و دانش نے عین مطابقِ فطرت قرار دے رکھا تھا علمِ بغاوت بلند کرتا ہے۔ وہ ایک ایسے انقلاب کا داعی بن کر زمانہ سے متعارف ہوتا ہے جس میں اس آئینِ کہن کی بنیادیں تک اکھیڑ کر رکھ دی جائیں۔ وہ ملوکیت کو خدا کی بدترین لعنت قرار دیتا ہے توہم پرستی کو خلافِ شرفِ انسانیت ٹھہراتا اور (priesthood) کو فریبِ نفس کا "مقدس" نقاب بتاتا ہے۔ ذات پات کی تقسیم کو طاغوتی قوتوں کا استبداد گردانتا ہے۔ سرمایہ داری کا نظام اس کے نزدیک ایک ایسا جذام ہے جس نے جسدِ انسانیت کو مہلک جراثیم سے بھر رکھا ہے۔ غلامی کے تصور سے اس کی روح کانپ اٹھتی ہے۔ قومیت پرستی (Nationalism) کے متعلق اس کا اعلان ہے کہ اس سے انسان خونخوار درندوں کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ وہ اٹھتا ہے اور ساری دنیا کو پکار کر کہتا ہے کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا اور بندے کا تعلق براہِ راست ہے۔ اس کے لئے برہمنیت[1]
(priesthood)

---

[1] فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے۔

کے کسی درمیانی واسطہ کی ضرورت نہیں وہ اعلان کرتا ہے کہ انسانی شرف وسعادت اور تعظیم وتکریم کا معیار۔ اس کا کیرکٹر اور اعمال ہیں۔ جن کی بنیاد ایمان پر ہے۔ پیدائش سے کسی انسان کو دوسرے پر کوئی فوقیت و افضلیت حاصل نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ سرمایہ داری بجز این نیست کہ بعض انسانوں نے قوت فراہم کرکے کمزور وناتوان انسانوں کے حقوق کو غصب کر رکھا ہے۔ اس لئے تقاضائے عدل وانصاف یہی ہے کہ ان غصب شدہ حقوق کو ان غاصبوں کے ہاتھوں سے چھین کر اُن کے اصل حقداروں تک پہنچا دیا جائے۔ وہ معاشی نظام (economic system) میں احتکار واکتناز کو سنگین جرم قرار دیتا ہے۔ اور اعلان کرتا ہے کہ دولت کی گردش (circulation of money) اس انداز سے نہیں ہونی چاہیئے کہ وہ صرف ایک خاص طبقہ کے اندر ہی پھرتی رہے۔ وہ کہتا ہے کہ آدمی کا آدمی ہونا اس کے لئے وجہ احترام ہے۔ اس لئے انسانوں کے اندر غلامی کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ تمام قبائلی اور قومی عصبیتوں کو توڑ کر اس انقلاب عظیم کا اعلان کرتا ہے کہ تمام نوعِ انسانی اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہے اس لئے تمام روئے زمین کے انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد اور ایک شجر بلند وبالا کی شاخیں ہیں۔ نسل، رنگ، زبان، وطن کی غیر فطری دیواروں سے ان میں تفریق وتمیز پیدا کرنا جسدِ انسانیت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ غرضیکہ وہ انسانی (انفرادی واجتماعی) زندگی کے تمام غیر فطری آئین ودساتیر کے خلاف اعلان کرتا ہے اور صرف اعلان ہی نہیں کرتا بلکہ عملی طور پر انقلاب پیدا کرکے دکھا دیتا ہے کہ صحیح مقامِ زندگی کیا ہے؟ انسانوں کی داخلی اور خارجی دنیا میں اس کی طرف سے پیدا کردہ یہ انقلاب عظیم مبنی ہوتا ہے اس انکشاف حقیقت پر جس کی رو سے وہ روح کائنات کی انتہائی گہرائیوں میں ڈوب کر وحدتِ حیات کے اصل الاصول کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے (خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ) حقیقت

وحدتِ حیات کا تصوّر

یہ ہے کہ وحدتِ حیات کی اصل عظیم کا انکشاف ہی وہ محیر العقول انقلاب ہے جس نے انسانی فکر ونظر کے تمام غلط زاویوں کو بدل دیا اور جس کی رو سے انسانی ہیئت اجتماعیہ کی تشکیلِ جدید صحیح خطوط پر وجود کوش ہوئی۔ قرآن کی طرف سے پیش کردہ یہ تصور، فی الحقیقت دنیائے قدیم وجدید میں ایک حدِ فاصل ہے۔ یہاں سے نظامِ انسانیت کے دھارے کا رُخ دوسری طرف منتقل ہو گیا جس نے نسل اور وطن کی غیر فطری حدود کو توڑ کر شعورِ انسانی میں عالمگیریت کا تصور بیدار کر دیا۔ قرآن کریم نے اپنے پہلے نقرہ میں اس عظیم المرتبت حقیقت کو واضح کر دیا کہ جس خدا کی یہ تعلیم ہے وہ (رب العالمین) تمام اقوام وملل کا نشو ونما دینے والا ہے اس لئے اس نظام میں قومی عصبیت اور جماعتی رجحانات کو کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔ اس کا مخاطب "انسان" ہے۔ انسانوں کا کوئی خاص گروہ نہیں ہے۔

(فٹ نوٹ صفحہ ۲۹۱) [1] آنکھوں پر تعصب کی پٹی باندھ رکھنے والے اعتراض کیا کرتے ہیں کہ نبی اکرمؐ نے شام کے عیسائی راہبوں سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اگر راہبوں سے تعلیم حاصل کی ہوتی تو رہبانیت وبرہمنیت کے خلاف اعلان بغاوت کس طرح کیا جاتا؟ لیکن تعصب کا کیا علاج جس سے دل کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔

قرآن کریم ذکریٰ للعٰلمین (۶۸) تمام اقوامِ عالم کے لئے ضابطۂ حیات ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ یہ کتاب ہدایت نوعِ انسانی کے لئے نصاب زندگی ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿۵۷﴾

اے نوعِ انسانی! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے ایک ایسی چیز آگئی ہے، جو موعظت ہے، دل کی تمام بیماریوں کے لئے شفا ہے۔ اور ہدایت اور رحمت ہے ان تمام لوگوں کے لئے جو اس پر یقین رکھتے ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ جو نظامِ تمدن و سیاست عقلِ انسانی کی رو سے مرتب ہوگا اس میں شعوری اور غیر شعوری طور پر کسی نہ کسی طرف جھکاؤ ضرور ہوگا۔ انسان کے سینے میں جب تک دھڑکنے والا دل ہے وہ کبھی جذبات کے میلان سے خالی نہیں ہو سکتا۔ اور جذبات کا تقاضا ہے کہ وہ امیال و عواطف کی رنگینی قبول کر لیں۔ لیکن وحی کا سرچشمہ ان تمام میلانات و رجحانات سے پاک و بلند ہے اس لئے اس کے نزدیک تمام انسان یکساں ہیں۔ بقول اقبالؒ

عقل خود بیں غافل از بہبودِ غیر سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر
وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

"بینندۂ سودِ ہمہ" کے معنی ہیں رب العالمینی۔ یعنی ربوبیتِ عامہ۔ ربوبیت سے مراد یہ ہے کہ ہر فرد کے اندر جس قدر مضمر صلاحیتیں ہیں ان سب کی نشوونما (تربیت) اس طرح ہوتی چلی جائے کہ وہ اپنی تکمیل تک پہنچ جائیں۔ یہی وہ معاشرہ ہے جسے قرآن قائم کرنا چاہتا ہے۔ یعنی ایسا معاشرہ جس میں ہر فردِ انسانیہ کی صلاحیتیں مکمل نشوونما پا لیں۔ اس کے معنی تکمیلِ ذات یا انفرادیت ہے۔ اس کو (Development of self) کہا جاتا ہے۔ یہی قرآن کی بنیادی تعلیم ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس نظام میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج نہیں ہوتا (جس طرح ایک قمقمہ اپنی روشنی اور حرارت کے لئے

انفرادی زندگی

کسی دوسرے قمقمہ کا محتاج نہیں ہوتا۔) بقول علامہ اقبالؒ اس نظام کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

لیکن یہ نظام اس سے ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ انفرادی نشوونما کے یہ معنی نہیں کہ ہر فرد دوسروں سے الگ تھلگ ہو کر بیٹھ جائے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ جس طرح افراد کی یہ صلاحیتیں ایک اجتماعی معاشرہ کے اندر تکمیل پذیر ہوتی ہیں اسی طرح اس اجتماعی معاشرہ کی تشکیل بھی ان ہی افراد کے اجتماع و ائتلاف سے ہوتی ہے۔ اس نظام میں افراد اپنی تمام صلاحیتوں کو ہیئتِ اجتماعیہ کے استحکام کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ اور اس طرح نموِ حیات اجتماعی شکل میں قوی سے قوی تر ہوتی جاتی

اس کے ساتھ ہی افراد کی خودی (انا) میں بھی پختگی اور استواری آتی جاتی ہے۔ اور یوں ایک ایسا دائرہ قائم ہو جاتا ہے جس میں یہ بتانا مشکل ہوتا ہے کہ کون کس کے زور پر آگے بڑھ رہا ہے۔ انفرادیت اور اجتماعیت کچھ اس طرح باہمدگر پیوست ہوتی ہے جس طرح جسم انسانی اور اس کے اندر خلیاتِ حیات (life cells) پورے جسم کا قیام، خلیات کی زندگی پر ہے اور خلیات کی زندگی منحصر ہے جسم کی زندگی پر۔ جسم خلیات کو قوت عطا کرتا ہے اور خلیات جسم کو۔ دونوں کے وجود الگ الگ بھی ہیں اور دونوں مل کر ایک بھی۔ یا ایک اور مثال میں یوں سمجھئے جیسے ایک (fly wheel) مشین کے پرزوں کو حرکت دیتا ہے اور مشین کے پرزے پھر اس (Fly wheel) کو گھماتے ہیں اور یوں باہمی تعاون (عناصر ملکہ نظم و ضبط) کا ایک ایسا سلسلہ قائم ہو جاتا ہے جسے ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

زندگی انجمن آرا و نگہدار خود است

اے کہ در قافلہ بے ہمہ شو با ہمہ رو

افراد کے ایغو جب اس نظام کے ماتحت اجتماعیت کی شکل اختیار کرتے ہیں تو چونکہ ان کی منفرد خصوصیات میں مماثلت ہوتی ہے اس لئے اس مماثلت و مشابہت سے ان میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور اس ہم آہنگی سے ایسی فضا پیدا ہو جاتی ہے جس میں ان (Egos) کی پرورش کا سامان ہوتا ہے۔ اس فضا میں ہر شخص کو اس کی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما کا پورا پورا موقع ملتا ہے (تفصیل ان امور کی میری تصنیف نظام ربوبیت میں ملے گی)

میزانِ عدل اس نظام میں ہر معاملہ اصول پر مبنی ہوتا ہے اور اس کا فیصلہ ایک خاص قاعدے اور قانون کے ماتحت عمل میں آتا ہے جس میں نہ کسی کی رعایت پیش نظر ہوتی ہے نہ کسی پر زیادتی۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَیْبِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝ (۵۷/۲۵)

(دیکھو) ہم نے یقیناً اپنے پیغمبروں کو واضح دلائل دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ (آسمانی) کتابیں اور میزان (عدل) بھی اتاری (تاکہ وہ احکام الٰہی کے مطابق کامل انصاف اور عدل کے ساتھ لوگوں کے جھگڑوں کا فیصلہ کر سکیں اور) تاکہ لوگ (خود بھی) انصاف کو قائم کر سکیں اور (ساتھ ہی) ہم نے لوہے کو (پیدا کیا) اتارا جس میں بڑی طاقت اور لوگوں کے لئے بہت سی منفعتیں ہیں (یہ تمام چیزیں خدا نے اس لئے بھیجیں تاکہ دنیا میں امن و سلامتی کا دور دورہ ہو جائے) اور تاکہ یہ دیکھا جا سکے کہ کون لوگ اس (کے نظام) کی، اس کے نتائج دیکھے بغیر امداد کرتے ہیں۔ (اور کون لوگ نہیں کرتے؟) بلاشبہ (خدا کا نظام ان لوگوں کی امداد کا محتاج نہیں ہے) وہ بڑی قوت اور غلبہ والا ہے۔

آیات بالا میں غور کیجئے کہ سلسلۂ رشد و ہدایت "قانون اور میزان" وغیرہ سے مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ نوعِ انسانی میں

عدل قائم رکھا جاسکے (لیقوم الناس بالقسط) اس لئے قرآن کریم کا نصب العین تمام نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود ہے (وَ اَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ (۱۳/۱۷) زمین میں وہی باقی رہتا ہے جو نوعِ انسانی کے لئے نفع رساں ہو) اور یہی وہ بلند و بالا نصب العین ہے جسے انسانیت کا نصب العین قرار پانا زیب دیتا ہے اور جس پر در حقیقت تمام اعمال کی بنیاد رکھی جانی چاہیئے (samuel) اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

> نصب العین، فلاحِ نوعِ انسانی ہے۔ اور فلاح کا انحصار کسی ایک ہی چیز پر نہیں...... اس فلاح میں روحانی دماغی، اخلاقی، مادی، اجتماعی، انفرادی سب ہی قسم کے اجزاء آجاتے ہیں۔ یہ ہے حقیقی بھلائی جس کی تلاش انسان کا فریضہ ہے۔

یعنی ایسا نصاب زندگی جس کا مطمحِ نگاہ تمام نوعِ انسانی کا مفاد ہو اور مفاد بھی کسی ایک شعبۂ زندگی کا نہیں بلکہ پوری کی پوری زندگی کا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم، عدل و انصاف کے معاملہ میں اپنے اور پرائے۔ یگانے اور بیگانے کی کوئی تمیز و تفریق روا نہیں رکھتا۔ حتیٰ کہ اس کا ارشاد ہے کہ وَ لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (۵/۸) "کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے انصاف نہ کرو۔ ہمیشہ انصاف کرو کہ یہ تقویٰ سے قریب ہے" اس سے اندازہ فرما لیجیئے کہ وحی کی روشنی میں متعین کردہ نظامِ زندگی میں انسانی مساوات کس بلند مقام تک پہنچ جاتی ہے۔ اس لئے کہ اس عمارت کی بنیاد، وحدتِ خالق اور وحدتِ حیات کا عدیم النظیر اصول ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن، انسانوں کی تقسیم کفر و ایمان کی رو سے کرتا ہے۔ لیکن اس تفریق میں ظلم و استبداد کا شائبہ تک نہیں۔ اس تقسیم سے مراد یہ ہے کہ جو انسان نظامِ زندگی کو مذکورہ صدر اصول کی بنا پر متشکل کرنا چاہتے ہیں، وہ ایک جماعت کے فرد ہیں۔ اور جو اس کے خلاف انسانوں کے خود ساختہ اصولوں کے ماتحت نظامِ حیات مرتب کرنا چاہتے ہیں۔ وہ دوسری جماعت کے افراد۔ اور یہ ظاہر ہے کہ فکر و عمل کے ایسے بنیادی اور اساسی اختلاف کی بنا پر تفریق و تمیز ضروری ہے۔ لیکن (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) اس تفریق و تمیز میں بھی بے انصافی کسی صورت میں روا نہیں رکھی جاسکتی (تفصیل اپنے مقام پر آئے گی) اسلام نے وحدتِ فکر و عمل کی اساس و بنیاد پر اس حقیقی اُخوت و مساوات کی فلک بوس عمارت قائم کی جسے دیکھ کر غیروں تک نے اعتراف کر لیا کہ فی الحقیقت مساوات اسی کا نام ہے۔ عیسائیت خود مساوات و مواخات کی مدعی ہے۔ لیکن اسلامی مساوات اور عیسائیت کی مساوات کے فرق کے متعلق ایک عیسائی مشنری کی زبان سے سنیئے (Dr: Maude Royden) اپنی کتاب (The problem of palestine) میں لکھتی ہیں۔

> محمدؐ کے مذہب نے سب سے پہلے اس حقیقی جمہوریت کا اعلان کیا جس کا تصور ذہنِ انسانی میں آسکتا تھا۔ اس کا خدا ایسی بلند عظمتوں کا مالک ہے جس کے سامنے دنیا کی ہر قسم کی تفریق و تقسیم بالکل مٹ جاتی ہے حتیٰ کہ تفریقِ رنگ و نسل کی گہری خلیج بھی ناپید ہو جاتی ہے۔ دوسرے لوگوں کی طرح مسلمانوں میں بھی معاشرتی طبقات موجود ہیں۔ لیکن اساسی (یعنی

روحانی) طور پر سب مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ اور یہ بنیادی روحانی مساوات اس قسم کی افسانوی مساوات نہیں۔ جیسی عام طور پر عیسائیوں کے ہاں پائی جاتی ہے۔ یہ مساوات مسلم ہے اور حقیقی۔ مختلف اقوام میں اسلام کی عالمگیر اشاعت کی یہی وجہ ہے۔ یہی چیز افریقہ میں آج اس کی قوت کا راز ہے۔ جہاں عیسائی مشنری اس مساوات کی (ناکام) تبلیغ کرتے رہتے ہیں جن کا امتیازی نشان سفید اور سیاہ رنگ کی نمایاں تفریق کی صورت میں ہر جگہ سامنے رہتا ہے۔ یہ صرف مسلمان ہی ہے جو دیکھتا ہے کہ سفید، بھورے اور کالے رنگ کے باوجود وہ ہر جگہ بھائی تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کی اخوت کا مدار رنگ پر نہیں مذہب پر ہے۔

اور یہ آج گئے گذرے زمانہ میں حالت ہے جبکہ اسلام کی تعلیم قصۂ پارینہ بن کر رہ چکی ہے۔ کہئے کہ یہ تصورات کسی صورت میں بھی ذہن انسانی کی تخلیق ہو سکتے تھے؟ اور یہ تصوراتِ حیات پیش کس زمانہ میں کئے گئے؟ اس زمانہ میں جب ساری دنیا میں ایسے تصورات قائم تھے جو اساسی طور پر ان سے یکسر مختلف تھے۔

دنیا وہیں آرہی ہے!

اب اس سے ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ دنیا نے ان انقلابی تصوراتِ زندگی کی مخالفت کی اور جی بھر کر مخالفت کی۔ لیکن اس کے بعد اس تیرہ سو برس میں ہوا کیا؟ یہ ہم سے نہیں، خود ان مخالفین سے پوچھئے! انسان ٹھوکریں کھا کھا کر، آہستہ آہستہ۔ بتدریج بغیر نام لئے، انہی تصوراتِ حیات کی طرف بڑھ رہا ہے، جن کی اس نے اس قدر مخالفت کی تھی۔ اس کی حالت یہ ہے کہ وہ تنہا عقل کے زور پر ایک نظام قائم کرتا ہے۔ لیکن اس کے ہاتھوں تنگ آکر اسے خود ہی توڑ پھوڑ دیتا ہے۔ اس شکست و ریخت میں اسے بڑی بڑی قربانیاں کرنی پڑتی ہیں لیکن جب انسانیت آگ اور خون کی اس ہولی سے نکلتی ہے تو اس کا قدم اسی نظام کی طرف اٹھتا ہے جس کی آواز چھٹی صدی عیسوی کی تاریکیوں میں سرزمین عرب سے بلند ہوئی تھی! انقلاب فرانس پر غور کیجئے۔ اس نے کس طرح ملوکیت کے تصور کو پامال قرار دیدیا۔ چنانچہ آج سلاطین کے "آسمانی حقوق" کا تصور عہدِ جہالت کی یادگار قرار دیا جاتا ہے (Samuel) تحتیا پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے۔

> اس نے سلاطین کے آسمانی حقوق کے عقیدہ کی تائید کی۔ اس لئے یورپ کی تاریخ میں اس عقیدہ نے جس قدر برائیاں پھیلائیں ان کی ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی ہے۔

ملوکیت کے ساتھ ہی برہمنیت (priesthood) کے "آسمانی حقوق" کا تصور بھی رفتہ رفتہ مٹتا چلا جا رہا ہے۔ سموئیل لکھتا ہے کہ "جیسا کہ تاریخ بتاتی ہے۔ برہمنیت کا عقیدہ معاشرتی ترقی کے رستہ میں ایک سنگ گراں بن کر حائل رہا ہے" غلامی (Slavery) کا وجود (قریب قریب) مٹ چکا ہے۔ گذشتہ جنگ عظیم کے بعد دنیا کے معاشی نظام میں جو انقلاب واقع ہوا ہے وہ کسی تشریح کا محتاج نہیں۔ قومیت پرستی (Nationalism) کو تہذیب حاضرہ کا معرکہ آرا کارنامہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن موجودہ جنگ (دوسری عالمگیر جنگ) میں اس کے خلاف جو کچھ

دلوں کی دنیا میں اٹھ رہا ہے اس کے مظاہرے آئے دن سامنے آتے رہتے ہیں۔ اقبالؒ نے کہا تھا۔

فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے۔ (دیباچہ پیام مشرق)

اس نئے آدم اور نئی دنیا کی تعمیر کے دھندلکے سے خاکے آئے دن خاکِ مغرب کے ذرات سے اُبھر کر سامنے آتے رہتے ہیں۔ امریکہ کا مشہور سیاستدان۔ مسٹر وینڈل ولکی (wendell wilkiy) ساری دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد جس نتیجہ پر پہنچا ہے وہ دلوں کی اس تبدیلی کا آئینہ دار ہے جو اس باب میں دنیا سے انسانیت میں کروٹیں لے رہی ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

اس سے مقصد یہ ہے کہ اگرچہ ہماری نشو ونما جنگ عظیم سے شروع ہو گئی تھی۔ لیکن ہم اپنی قومیت پرستی کے عہد طفولیت سے نکل کر جس میں تمام معاملات گھریلو قسم کے متصور ہوتے تھے۔ اب ایک بالغ قوم کی حیثیت اختیار کر رہے ہیں جس کے پیش نظر بین الاقوامی مسائل اور تمام دنیا کا تصور ہے۔ (One world, p. 133)

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے یگانگت اور بیگانگت کا معیار رنگ و نسل نہیں بلکہ وحدتِ فکر و عمل ہے مسٹر ولکی اس باب میں لکھتا ہے۔

میں بار دگر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس کشمکش میں یہ دیکھنے کے لئے کہ کون کون سے لوگ حریف اور کون کون سے حلیف ہیں معیار رنگ اور نسل نہیں (ایضاً صفحہ ۱۳۵)

اور ذرا آگے چل کر۔

اس جنگ کے بعد امریکہ کو تین راستوں میں سے کوئی ایک اختیار کرنا ہوگا۔ (۱) تنگ قومیت پرستی جس سے لامحالہ یہ مراد ہے کہ ہم آخر الامر اپنی آزادی بھی کھو بیٹھیں۔ یا (۲) بین الاقوامی استعماریت۔ جس سے مطلب کسی دوسری قوم کی آزادی کی قربانی ہے اور یا (۳) ایک ایسی دنیا کی تخلیق جس میں ہر نسل اور ہر قوم کے لئے (نشو و ارتقاء کے) یکساں مواقع موجود ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اہل امریکہ، بہت بڑی اکثریت سے اس آخری راستہ کو منتخب کریں گے۔ (ایضاً صفحہ ۱۴۴)

دیکھا آپ نے کہ دنیا کس طرح قومیت پرستی کی تاریک وادیوں سے نکل کر انسانیت کی ہمہ گیر وسعتوں کی طرف چلی آرہی ہے؟

در تنگنائے شاخ بسے پیچ و تاب خورد
تا جوہرم بجلوہ گہ رنگ و بو رسید

ان حقائق کو سامنے رکھئے اور سوچئے کہ دنیا علمی و عقلی ارتقاء کے ساتھ اس نظام کی طرف بڑھ رہی ہے جو آج سے تیرہ سو برس پہلے دیا گیا تھا۔ یا اس کی مخالفت کر رہی ہے؟ آپ بلا شائبہ ظن و تخمین دیکھیں گے کہ دنیا غیر خدائی نظام زندگی کے ایک ایک شعبے کو آزمانے کے بعد ترک کئے جا رہی ہے اور یوں بطریق استخراج (By-Process of elimination) صحیح نظام زندگی کی طرف کشاں کشاں چلی آرہی ہے۔ اور اس طرح اس کی تمام دانش و بینش فی الحقیقت اس داعیٔ انقلاب

(علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے آستانِ عالیہ پر جھک رہی ہے جس نے انسانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ کے لیے ایسا نظامِ خداوندی پیش کیا جو عین انسانی ارتقاء کے مطابق ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اس نے یہ اعلان بھی کر دیا کہ یہ نظام میرے ذہن کی تخلیق نہیں بلکہ اس کا سرچشمہ علمِ الٰہی ہے۔ کیا اس کے بعد بھی وحی کے متعلق کسی اور دلیل کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ اور پھر یہ کہ جب اسی ذاتِ اقدس و اعظم کے دیئے ہوئے نظام کی کڑیوں کے متعلق آپ نے عقل و بصیرت کی رو سے دیکھ لیا تجربہ اور مشاہدہ سے پرکھ لیا کہ وہ فی الواقعہ حقیقت پر مبنی ہے تو کیا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس تعلیم کا وہ حصہ جس پر دنیا ابھی عمل نہیں کر سکی وہ بھی حق ہے غلط نہیں ہو سکتا۔ اس داعیٔ انقلاب نے تیرہ سو برس پیشتر کہا تھا کہ اس تعلیم کو اس لیے نہ جھٹلاؤ کہ یہ ابھی تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ تو سرتاپا بصیرت و حکمت پر مبنی ہے۔ تمہاری علمی اور عقلی سطح ابھی اتنی بلند نہیں ہوئی کہ تم اس کا احاطہ کر سکو۔ چنانچہ جوں جوں انسان کی علمی و عقلی سطح بلند ہوتی گئی اس نے دیکھ لیا کہ یہ دعویٰ کس قدر سچا تھا۔ تو کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ جتنا حصہ باقی رہ گیا ہے اس کے متعلق بھی تسلیم کر لیا جائے کہ وہ عین مطابق علم و بصیرت ہے۔ لیکن ہمارے زمانہ کی علمی سطح ہنوز اتنی بلند نہیں ہوئی کہ اس کی صداقت کا ادراک کر سکے[1]؟

اس مقام پر ایک نکتہ کی وضاحت ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اگرچہ یورپ نے علمی و عقلی بنیاد پر قرآنی نظامِ حیات کے بعض اجزاء کو پرکھ کر دیکھ لیا ہے۔ لیکن عملی طور پر اس نظام کو بالکلیہ قائم نہیں کیا۔ کہیں کہیں تھوڑا بہت مستعار لیا ہے لیکن

یورپ کا نظام اسلامی نظام نہیں

قرآنی نظام جزؤں اور حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک مکمل نظام ہے جسے پورے کا پورا اختیار کرنا ضروری ہے۔ یہ ایک مشین ہے جس کا ہر پرزہ اپنی اپنی جگہ کام دے رہا ہے۔ اس کے پرزوں کو نکال کر مختلف مشینوں میں لگا لینے سے اصل مشین کے نتائج کبھی مرتب نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے فرمایا فَادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً یہ نظام پورے کا پورا اختیار کرنا ہوگا۔ کہ حق و باطل میں تلبیس شرک ہے۔ قرآنی اور غیر قرآنی نظام کے اجزاء اکٹھے نہیں کئے جا سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل معاملہ مختلف معاشرتی یا سیاسی قوانین و دساتیر کا نہیں بلکہ اس بنیاد کا ہے جس پر یہ تمام عمارت قائم ہوتی ہے۔ اور یہ بنیاد ہے اس حقیقتِ عظمیٰ کا اعتراف کہ صحیح نظامِ انسانیت کا قیام صرف اس تعلیم کی روشنی میں ممکن ہے جو حقیقتِ کلی کے ادراک پر مبنی ہو۔ اس تعلیم کا سرچشمہ وحی ہے اور اسی کا دوسرا نام ایمان باللہ۔ اگرچہ دورِ جدید کے مغربی محققین، کائنات کے متعلق میکانکی تصور کے ظلمتکدہ سے باہر آ رہے ہیں۔ لیکن ان کے سامنے ابھی تک اس خدائے حکیم و بصیر کا پورا پورا تصور نہیں آیا جسے وحی پیش کرتی ہے۔ گو اس کے

---

[1] عام طور پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ اگر یہ نظام ایسا ہی مبنی بر حقیقت تھا تو پھر یہ بجنسہٖ آگے کیوں نہ چلا۔ رک کیوں گیا؟ اس کے متعلق اسی عنوان کے اخیر میں "خلاصہ بحث" ملاحظہ کیجیے۔

دھندلے سے نقوش کہیں کہیں محسوس ہو رہے ہیں، اور ظاہر ہے کہ جب ابھی تک بنیاد ہی صحیح خطوط پر متشکل نہیں ہوئی تو اس پر قائم شدہ عمارت کو کس طرح صحیح تصور کر لیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ بساط سیاست میں مغرب کا نظام جمہوریت ہو یا معاشی دنیا میں آئین اشتراکیت (یا اسی قسم کے دیگر قوانین و دساتیر) انہیں کبھی اسلامی نظام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ان کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ان قوانین کے خلاف صدائے احتجاج ہیں جن میں اس وقت تک انسانیت جکڑی چلی آ رہی تھی۔ اور یہ آواز بلند ہوئی ہے اس اثر سے جو قرآنی تعلیم نے غیر محسوس طور پر فضا میں پیدا کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ میں جو نظام زندگی آج قائم ہے وہ اس کے ہاتھوں بے حد نالاں ہے اور اسے تلاش ہے کسی ایسے نظام کی جو اس کے عالم سوز اضطراب کو مبدل بہ سکون کر دے۔ اور اس تلاش میں انہیں اس امر کا احساس ضرور ہو رہا ہے کہ اس نظام کی بنیاد صحیح مذہب ہی پر رکھی جا سکتی ہے۔ تنہا عقل پر نہیں۔ سموئیل لکھتا ہے۔

یورپ اور مذہب کی تلاش

دنیا یقیناً فوری طور پر مذہب کی محتاج ہے۔ انسان ہمیشہ درندوں کی طرح نہیں رہیں گے کہ ان کی زندگی کا مقصد محض مادی ضروریات اور طبیعی حوائج کی تسکین ہی ہو۔ روحانی جہد اس کی فطرت کی گہرائیوں میں ہے۔ یہ ذہنی تیقن کہ دنیائے محسوس ہی (کائنات کی) آخری حد نہیں، ہمارے اندر (ہماری موجودہ تگ و تاز کے) بے معنی ہونے کا احساس پیدا کر دیتا ہے۔ ہمیں بہت سی ناقابل یقین باتوں پر ایمان لانے کے لئے کہا جاتا ہے لیکن یہ کہنا کہ کوئی چیز سرے سے ایسی ہے ہی نہیں جس پر ایمان لایا جائے۔ سب سے زیادہ ناقابل یقین بات ہوگی"

اسی ایمان کا فقدان ہے جس کی وجہ سے دنیا آج اس طرح عدم طمانیت کی جہنم بن رہی ہے اور جس کی تلاش میں ہر نگہ دورِ رس مجنونانہ بے قرار پھر رہی ہے۔ بقول پروفیسر کوبن:-

جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ انسان، ایمان کے بغیر بھی رہ سکتا ہے اسے آج کے نوجوانوں کی حالت کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ جو مضطربانہ تلاش میں پھر رہے ہیں کہ کوئی ایسی چیز مل جائے جس پر ایمان لایا جائے"

(The Crisis Of Civilisation.)

یہ ایمان ہی کی شمع فروزاں ہے جو اس حقیقت کو انسان پر بے نقاب کر دیتی ہے کہ زندگی امروز و فردا کے پیمانوں سے ماپنے کی چیز نہیں۔ یہ ایک جوئے رواں ہے جس کے تسلسل و لا متناہیت کے سامنے کہکشاں بھی گرد راہ ہے۔ پروفیسر جوڈ اس باب میں لکھتا ہے:-

زندگی کے جاوداں۔ پیہم رواں عقیدہ ہی سے انسان میں امنگیں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی سے اس میں عدم کو وجود میں لانے اور مستور کو بے حجاب کرنے کا حوصلہ آتا ہے اور یہ جد و جہد کرتا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔۔۔۔ لیکن جب زندگی کی وسعتیں سکڑ کر محدود ہو گئیں اور اس آب و گل کی تپتی تلی دنیا کو اصلی حیات سمجھ لیا گیا تو پھر اعلیٰ قدروں پر ایمان کہاں۔

(ماخوذ از ماہنامہ "کتاب" لاہور)

ایمان اور سیرت

یہ ایمان ہی ہے جو کسی نظام میں صحیح نتائج مرتب کرتا ہے اچھے سے اچھا نظام کبھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ اس کے ارباب بست و کشاد اسے قلب و نگاہ کی پاکیزگی سے نہ چلائیں۔ ایک نظام کو آپ حسابی قاعدے (Mathematical calculations) سے جانچیں تو وہ نہایت عمدہ نتائج کا حامل دکھائی دے گا۔ لیکن عملی دنیا میں اس کے نتائج ویسے مرتب نہ ہوں گے۔ اس لئے کہ اگر اس نظام کو مشینوں کے ذریعے نافذ کیا جائے تو اس پر خارجی مؤثرات اثر انداز نہیں ہوں گے۔ لیکن وہ مشینوں کی جگہ انسانی قلوب و اذہان کی رو سے نافذ ہوتا ہے۔ اس لئے جب تک اس نظام میں تطہیر فکر و نظر کی صلاحیت نہ ہو گی وہ عمدہ نتائج پیدا نہیں کر سکے گا۔ وحی کے ذریعے سے جو نظام مرتب ہوتا ہے اس کی بنیاد اس حقیقتِ عظمیٰ پر ہے کہ اس نظام کو چلانے والی جماعت کے لئے سیرت کی بلندی لاینفک ہے سیرت کی بلندی کے لئے بھی وہ کوئی خارجی ذرائع اختیار نہیں کرتا بلکہ خود اس نظام کے اندر یہ خوبی موجود ہوتی ہے کہ اس کے اتباع سے قلب و نظر میں از خود پاکیزگی پیدا ہو جاتی ہے بلکہ یوں کہیئے کہ سب سے پہلے یہی چیز پیدا ہوتی ہے۔ باقی سب کچھ اس کا نتیجہ ہوتا ہے وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (۲۴/۵۵) یعنی استخلاف فی الارض فطری نتیجہ ہوتا ہے ایمان اور اعمالِ صالحہ کا اور یہی وہ بنیادیں ہیں جن پر سیرت اور کیرکٹر کا قصرِ مشید استوار ہوتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ اس نظام کے قیام سے انسان میں سیرت کی بلندی پیدا ہوتی ہے اور سیرت کی بلندی سے اس نظام میں استحکام پیدا ہوتا ہے اور اس طرح یہ ایک ایسا دائرہ بن جاتا ہے کہ زمین و آسمان کی تمام برکتیں اس کے اندر آ جاتی ہیں وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (۳/۱۳۳) یہی وہ نظام ہے جس کی بنیاد ایمان پر ہوتی ہے۔ اور ایمان کے بغیر سیرت میں پختگی آ نہیں سکتی۔ بقول (Huxley) "مذہبی احساس سیرت کے لئے لازمی بنیاد ہے"۔

(Essays in popular Science)

اس نظام میں حسنِ عمل اپنے زندہ نتائج کی بنا پر حوصلوں کی افزائش اور ہمتوں کی بلندی کا موجب بنتا چلا جائے گا۔ اس سوسائٹی میں معیارِ عزت و فضیلت صرف تقویٰ ہو گا۔ یعنی یہ حقیقت کہ کون اپنی زندگی کو سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگ رکھتا ہے۔ اس معاشرہ میں ہر فرد، دوسرے افراد کو ٹھوس تعمیری نتائج مرتب کرنے والے پروگرام پر عمل کرنے اور اس پر استقامت سے جمے رہنے کی تلقین کرے گا۔ (وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ) برائی کو ہر جگہ اور ہر مقام پر برا اور اچھائی کو اچھا سمجھا جائے گا۔ اور اسی میں انسانیت کی فلاح و سعادت کا راز ہے (STUART Mill) لکھتا ہے۔

> اگر عدل، صداقت اور احسان کے اصولوں کی تعلیم کو جلوت و خلوت میں عام نہ کیا جائے۔ اگر ان محاسن کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے اور ان کے برعکس معائب کو روکا نہ جائے۔ تو یقیناً نوعِ انسانی کی حالت ابتر ہو جائے۔

(Nature; The Utility of Religion and Theism)

اور یہ اصول عدل و صداقت کسی خاص قوم اور ملک تک محدود نہیں رہیں گے۔ بلکہ ان کی وسعتیں تمام نوعِ انسانی کو اپنے آغوش میں لے لیں گی۔ وحی کی یہی تعلیم ہے اور آج زمانہ نے اپنے تقاضوں سے ہر صاحبِ فکر کو اسی نتیجہ پر پہنچا یا ہے۔

> پہلے پہل مذہب نے انفرادی نجات پر زور دیا۔ پھر جب اجتماعی اخلاق کی اہمیت سامنے آئی تو اس نے سوسائٹی کے لئے جدوجہد اور ایثار کی تاکید کی۔ لیکن اب جبکہ ایک بین الاقوامی ضابطۂ اخلاق کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے تو مذہب کے لئے بھی ضروری ہے کہ اپنی توجہات کو اسی نقطہ پر مرکوز کرے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ تمام کلیسا۔ مذہب کے ذریعے ایک عالمگیر اخوت کی تحریک چلائیں[1]۔ (Samuel p. 238)

سیرت کا مدار ایمان پر ہے

ہم نے یہ بتایا ہے کہ ایمان سے انسانی سیرت میں بلندی اور پختگی پیدا ہوتی ہے۔ معاملات کی دنیا میں یہ ہو سکتا ہے کہ آپ بنا بر مصلحت، دیانتداری کو بہترین پالیسی (حکمتِ عملی) قرار دیں۔ یا سوسائٹی میں عزت حاصل کرنے اور دنیا میں مقبولیت کی زندگی بسر کرنے کے لئے آپ راست بازی اور حسن معاملگی کی روش اختیار کریں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ اس روش کو عقل و دانش کی رو سے بہتر خیال کریں۔ یا یہ کہ آپ طبعاً منکسر المزاج۔ متواضع۔ خلیق۔ رحمدل واقع ہوئے ہوں۔ یا صدقہ اور خیرات (دان اوپن) کے بعض کاموں کو نیکی کے کام تصور کر کے انہیں رسماً ادا کریں۔ ان میں سے کوئی چیز بھی سیرت کی پختگی نہیں کہلا سکتی۔ حسنِ سیرت کا تعلق نہ عقلی فیصلوں سے ہے نہ رسمی اعمال و کردار سے۔ سیرت کی پختگی اور بلندی، دل کی تبدیلی سے متعلق ہے اس کی تمام عمارت قلب کی بنیادوں پر پختہ اور استوار ہوتی ہے۔ جب تک دل کی دنیا میں انقلاب نہیں پیدا ہوتا جب تک نگاہ کے زاویے نہیں بدل جاتے۔ اس وقت تک تطہیرِ فکر اور صحیح اعمال ممکن نہیں۔ اور تحسین و تزئین سیرت، فکر و نظر کی تطہیر و تہذیب ہی کا نام ہے نہ کہ عقلی فیصلوں کا۔

> خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
> دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

یہی وجہ ہے کہ فلسفہ، حسنِ سیرت کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ یعنی حسن سیرت کا تعلق استدلالی دنیا سے نہیں عمل کی دنیا سے ہے جس کی بنا ایمان پر ہے (Schlumberger) کے الفاظ میں:-

---

[1] چونکہ سموئیل کے سامنے مذہب عیسائیت ہے اس لئے اس نے ان تدریجی مراحل کا ذکر کیا ہے جن کی رو سے وہ انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف آیا۔ اور اب اسے دعوت دے رہا ہے کہ وہ بین الاقوامیت کی طرف توجہ کرے۔ لیکن وحی کی غیر محرف تعلیم (قرآن) نے تو پہلے دن سے ہی انسانوں کی عالمگیر برادری کا تصور پیش کیا ہے۔

فلسفہ کی اصطلاحات انسانی جذبات کی ترجمانی نہیں کرسکتیں۔ ان سے ہماری روح کی دنیا میں کوئی صدائے بازگشت نہیں اٹھتی۔ کسی قسم کی گونج نہیں پیدا ہوتی۔ وہ ہمیں ایک خالص عقلی تصور سے "زندہ خیال" کی طرف نہیں لے جاتیں۔

ہم نفس سے متعلقہ بحث میں (گذشتہ اوراق میں) بتا چکے ہیں کہ جوں جوں انسانی انا میں وسعت اور بلندی پیدا ہوتی جاتی ہے اس میں انائے مطلق (خدا) کی صفات مرتسم ہوتی جاتی ہیں۔ اسی کا نام حسن سیرت ہے۔ جب تک قلب کی دنیا میں اس انداز سے تبدیلی واقع نہیں ہوتی، سیرت کا مدار عقلی فیصلوں پر رہتا ہے جن پر کبھی اعتماد کلی نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ ہم شروع میں دیکھ چکے ہیں عقل تنقیدی قوت کا نام ہے اور دنیائے محسوسات سے متعلق ہونے کی بنا پر اس کا منصب آپ کی طبیعی زندگی کے حفظ و بقا کے اسباب و ذرائع کی فراہمی ہے (تفصیل آدم کے عنوان میں بھی گذر چکی ہے)۔ اس لئے اس کی تنقید کا مفہوم ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ یہ طبیعی زندگی کے مفاد کو پیش پیش رکھے نفس انسانی (EGO) کی دنیا اس کے حیطۂ اثر و نفوذ سے باہر ہے۔ اس لئے اس کے مفاد کے تحفظ سے اسے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔ اور سیرت کا معاملہ چونکہ نفس کی دنیا سے ہے اس لئے سیرت کا مدار تنہا عقل پر رکھا ہی نہیں جا سکتا۔ اس کا انحصار ایمان پر ہے۔

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں
عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

حسن سیرت کیا ہے؟

اس ایمان سے مفہوم یہ ہوتا ہے کہ نفس انسانی، حقیقت کلی کا عکس اپنے اندر جذب کرتا جاتا ہے (صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ) اور اس طرح اس کی تمام آرزوئیں اور تمنائیں اس کے میلانات و رجحانات، اس کے محبوبات و مطلوبات، اس کی خواہشات و مقتضیات سب اس چشمہ حسن و خیر سے ہم آہنگ ہوتے جاتے ہیں۔ جس سے تمام سیرتیں اپنی تزئین و آرائش کے سامان مستعار لیتی ہیں۔ اس کا نام ہے سیرت کی بلندی اور پختگی۔ علامہ اقبالؒ لکھتے ہیں۔

> مذہب کی آرزوئیں فلسفہ سے کہیں زیادہ بلند پرواز ہوتی ہیں۔ فلسفہ، چیزوں کو عقلی طور پر دیکھتا ہے..... ..... وہ حقیقت کو فاصلہ سے دیکھتا ہے۔ لیکن مذہب حقیقت سے قریبی تعلق پیدا کرتا ہے۔ ایک (یعنی فلسفہ) صرف نظریہ ہے۔ اور دوسرا (یعنی مذہب) جیتا جاگتا تجربہ۔ اور قریبی اور گہرا تعلق۔ اس گہرے تعلق کے حصول کے لئے خیال کو اپنی سطح سے بلند ہونا چاہیئے اور یوں اپنے مقصود کو قلب کی اس کیفیت کی رو سے حاصل کرنا چاہیئے۔ جسے مذہب کی زبان میں دعا کہتے ہیں۔ دعا۔ یعنی ان (گراں بہا) الفاظ میں سے ایک لفظ جو آخری وقت حضور نبی اکرمؐ کی زبان اقدس پر تھے۔ (خطبات صفحہ ۹۰)

ہم نے (prayer) کا ترجمہ دعا کیا ہے۔

دُعا کا مفہوم

دعا کیا ہے؟ سازِ فطرت کے نغمۂ ازل سے ہم آہنگ ہونے کی حسین تمنا۔ عروسِ حقیقت کے حسنِ جہاں آرا و جاں نواز کی دل فریب رعنائیوں سے یکرنگی کی مچلتی ہوئی آرزو۔ چکور کے سینے میں چاند کو اپنے اندر سمو لینے کی کہکشاں گیر و فلک پیما والہانہ امنگ۔ تلب پروانہ میں شمع فروزاں کے انداز و اسلوب جذب کر لینے کا وجد انگیز و رقص آفریں جوش و خروش۔ یعنی انسانی خودی کا اپنی متناہیت کو لامتناہیت میں بدل لینے کا بیتابانہ ولولہ اور اس ولولہ کی تسکین کے لئے قطرۂ شبنم کی، سورج کی شعاعوں سے، بازوئے شاہین کی حسن طلب۔ بغور دیکھئے تو ایمان دعا۔ اور عمل تینوں ایک ہی شمع کی کرنیں اور ایک ہی پھول کی پنکھڑیاں ہیں۔ ایمان اس حقیقت کے اعتراف کا نام ہے کہ انسانی سیرت کی بلندی کا راز، نظامِ عالم کے مرکزِ خیر و خوبی سے ہم آہنگی میں پوشیدہ ہے۔ دعا، اس ہم آہنگی و یکرنگی کی شدید تڑپ ہے۔ اور عمل اس تڑپ کا زندہ مظاہرہ اور اس کے حصول کے لئے پیہم کوشش۔ مشہور عالم نفسیات، (ولیم جیمز) لکھتا ہے کہ:-

سائنس جو جی میں آئے کرے۔ انسان جب تک دنیا تک، برابر دعا میں مشغول رہیگا۔ (خطبات ص۸۶)

غرضیکہ وحی ایک ایسا نظام قائم کرتی ہے جس میں اس نظام کے متبعین کی سیرت ایک خاص قالب میں ڈھل جاتی ہے جو جلالی و جمالی یعنی قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت کا ایک عجیب و غریب پیکر ہوتا ہے۔ جس میں تسلیم و رضا اور غلبہ و تسلط کے متضاد عناصر کا حسین امتزاج نظامِ انسانیت کو نقطۂ اعتدال پر

نیٹشے کا فوق البشر

رکھنے کا موجب بنتا ہے۔ آج یورپ جس عذاب میں گرفتار ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے سامنے "فوق البشر" (Super Man) کا وہ تصور ہے جو نیٹشے کی تعلیم کا پیدا کردہ ہے اور جس میں "اندھی قوت" خالصتاً مادی پیکروں میں ڈھلی ہوئی سامنے آتی ہے۔ نیٹشے کے "فوق البشر" کی خصوصیات کے متعلق (A.H.J Knight) اپنی کتاب (Some Aspects of the Life and Works of Nietzsche) میں لکھتا ہے۔

(فوق البشر) اہم مقاصد کی خاطر اخلاقی پابندیوں سے آزاد۔ فعال۔ خلاق۔ ہر قسم کی زنجیروں کو توڑنے والا اور کسی کے حکم کو نہ ماننے والا۔ اس کے نزدیک زندگی صرف اسی دنیا کی زندگی ہوگی۔ ہر وہ شے جو تفوق اور قوت کی راہ میں حائل ہوگی فنا کردی جائے گی۔ گناہ۔ جہنم۔ موت۔ ضمیر (کی آواز) کا خوف (دل سے) نکال دیا جائے گا۔ (اس کے نزدیک کسی پر رحم کھانا، بیماری یا خود غرضی کے مرادف ہوگا۔ اس لئے کہ یہ چیز عمل کے راستے میں روڑا اٹکاتی ہے۔ (اس کا نصب العین یہ ہوگا کہ) صلابت یعنی سختی (Hardness) دنیا میں بے بہا نیکی ہے۔

اندازہ فرمائیے! جو تمدن مادہ پرستی کی اندھی قوتوں کے اس تصور پر اُٹھے، اس کے نتائج کس قدر عالم سوز ہوں گے؟ جب تک قوت، وحی کے تابع نہ ہو۔ دنیا میں امن قائم نہیں رہ سکتا۔

ہم نے بات یہاں سے شروع کی تھی کہ وحی کی تعلیم کو پرکھنے کا طریق استنتاجی (Pragmatic) ہے۔ یعنی آپ اس کے نتائج سے یہ دیکھ سکتے ہیں کہ اس کی تعلیم کیسی ہے۔ اس باب میں اگر یہ دیکھنا ہو کہ قرآن وہ کونسا نظام زندگی پیش کرتا ہے جس کی مثل اور نظیر دنیا میں اور کہیں نہیں مل سکتی اور اس نظام کے نتائج و ثمرات کیا ہوں گے، تو اس کے لئے میری تصنیف "نظام ربوبیت" دیکھئے جس میں قرآن کی بنیادی تعلیم اور اس کے خوشگوار نتائج کو واضح انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ وہیں سے آپ کو اس سوال کا جواب بھی مل جائے گا کہ اگر اسلام کا نظام ایسا ہی کامیاب اور خوشگوار نتائج کا حامل تھا تو وہ چند دن تک چل کر ختم کیوں ہو گیا۔ آگے کیوں نہ بڑھا۔

باب سوم

وحی کے معنی وحی کے لغوی معنے ہیں۔ اشارہ کرنا۔ پیغام دینا۔ دل میں ڈال دینا۔ چھپا کر بولنا۔ اور امام راغب کے الفاظ میں، ایسا اشارہ جس میں تیزی بھی شامل ہو (الاشارۃ السریعۃ) حضرت زکریا علیہ السلام کے تذکرہ کے ضمن میں ہے کہ ان سے کہا گیا کہ وہ تین شب تک لوگوں سے ہمکلام نہ ہوں چنانچہ

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ۝ (۱۹/۱۱)

پھر وہ قربان گاہ سے نکلا اور اپنے لوگوں میں آیا (جو حسب معمول اس کا انتظار کر رہے تھے) اس نے (زبان نہ کھولی، اشارہ سے کہا ہمیشہ احکام خداوندی کی اتباع میں سرگرداں رہو۔

یہاں "وحی" کے معنی اشارہ کرنے کے ہیں۔ سورۂ انعام میں ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ (۶/۱۱۲)

اور (اے پیغمبر!) اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے (جب اس کی دعوت کا ظہور ہوا تو) انہوں اور بیگانوں میں سے بڑے بڑے لوگوں کو دشمن ٹھہرا دیا جو ایک دوسرے سے خوشنما باتوں کی سرگوشیاں کرتے تاکہ لوگوں کو فریب دیں۔

یہاں "وحی" کے معنی باہمی سرگوشیاں کرنا ہے۔ اس سے ذرا آگے ہے۔

وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰۤى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ (۶/۱۲۱)

اور دیکھو) شیاطین اپنے مددگاروں کے دلوں میں وسوسے ڈالتے رہتے ہیں تاکہ تم سے کج بحثی کریں۔ *

---

* یہ وہ "شیطانی" وحی ہے جس کا ذکر باطنیت کے ضمن میں گذشتہ اوراق میں آچکا ہے۔

یہاں وحی کے معنی وسوسہ اندازی کے ہیں۔

یہ تو ہیں لفظ وحی کے لغوی معنی۔ لیکن جیسا کہ ہم باب اول میں بصراحت بیان کر چکے ہیں۔ ایک علم تو وہ ہے جسے انسان اپنی عقل و فکر سے حاصل کرتا ہے۔ اس علم کے دروازے ہر انسان کے لئے بقدر ظرف کھلے ہیں۔ لیکن دوسرا علم وہ ہے جسے عقل و فکر کی بناء پر خود حاصل نہیں کیا جا سکتا بلکہ وہ وہیں سے راز خود ملتا ہے۔ جہاں سے اشیائے کائنات کو ان کی تخلیق ملتی ہے۔ یعنی اس کا سرچشمہ خدا کی مشیت ہے۔ یہ خدا کی طرف سے براہ راست ملتا ہے۔ کائنات کی ہر شے اسی علم کی بناء پر جو اس کے اندر داخل ہے، اپنے اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں سرگرم عمل ہے۔ سورۂ حٰم میں ہے۔

وحی کی قسمیں

فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا (۴۱/۱۲)

چنانچہ (تمہارے پروردگار نے) فضائی کروں کو سات بلندیوں (کی شکل) میں دو مقررہ دوروں میں مکمل کر دیا۔ اور ہر کرے کو اس کا علم دیدیا (وحی کر دیا) کہ اس کے ذمے کیا کام ہے۔

یہ وہ وحی ہے جس کی رو سے ان فضائی بلندیوں میں خدا کا امر تدبیری نافذ العمل ہے اور اس طرح ہر فضائی کرہ اپنے فریضۂ مفوضہ کی سرانجام دہی میں سرگرداں ہے۔ اسی طرح زمین کے متعلق ہے کہ وہ "قیامت" میں اپنے سربستہ رازوں کو اگل کر رکھ دے گی اور یہ بھی خدا کی وحی کے مطابق ہوگا۔

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۝ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۝ (۹۹/۴)

(اور دیکھو) اس دن زمین تمام خبریں بیان کر دے گی۔ اسلئے کہ تیرے پروردگار نے اسکی وحی کی ہوگی۔

جنگ بدر کے سلسلہ میں ملائکہ کے متعلق فرمایا۔

اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (۸/۱۲)

(اے پیغمبر!) یہ وہ وقت تھا کہ تیرے پروردگار نے فرشتوں پر وحی کی تھی کہ میں تمہارے ساتھ ہوں (یعنی میری مدد تمہارے ساتھ ہے) پس مومنوں کو ثابت قدم رکھو۔

اسی طرح حیوانات اپنی جبلی قوتوں سے جن امور کو سرانجام دیتے ہیں اس کے لئے بھی وحی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ جہانِ فطرت کے بہترین ماہر فن تعمیر (orchitect) یعنی شہد کی مکھی کے متعلق ارشاد ہے۔

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ۝ (۱۶/۶۸)

اور دیکھو، تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کر رکھی ہے کہ پہاڑوں میں۔ درختوں میں اور ان ٹٹیوں میں جو اس غرض سے بلندی میں بنادی جاتی ہیں چھتہ بنائے۔

ہدایت

اس وحی کو خدا کی طرف سے راہ نمائی (ہدایت) کہہ کر بھی پکارا گیا ہے۔ یعنی خدا نے ہر شے کو اس کی تخلیق عطا کی اور پھر اس کے اندر یہ ملکہ بھی رکھ دیا کہ وہ کس نہج سے زندگی بسر کرے۔

قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (۲۰ : ۵۰)

موسیٰ نے کہا "ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت بخشی۔ پھر اس کی (زندگی تک پہنچنے کی) راہ نمائی کی۔

یہی وہ راہ نمائی ہے جس کی بنا پر آم کی گٹھلی اپنی ارتقائی منازل طے کرتی کرتی خوش رنگ، خوش ذائقہ، خوشبودار آم میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہی وہ "ہدایت" ہے جس سے بکری کا بچہ پیدا ہوتے ہی ماں کے تھنوں کی طرف لپکتا ہے اور چڑیا کا بچہ دانے کے لئے منہ کھول دیتا ہے۔

انسانوں کی دنیا

یہاں تک تو کائنات کے ان گوشوں کا ذکر تھا جن میں انسان شامل نہیں تھے۔ یا اگر انسان شامل ہے تو صرف اس کے بچے کی ابتدائی زندگی تک جس میں وہ بھی دوسرے حیوانوں کی طرح فطری جبلت سے کام لیتا ہے۔ مثلاً پیدائش کے ساتھ ہی وہ بھی اپنی خوراک کے لئے ماں کی چھاتیوں کی طرف ہمک کر جاتا ہے۔ لیکن اس کے بعد انسانی دنیا کا وہ گوشہ آتا ہے جس میں یہ اپنی عقل و خرد سے کام لیا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسے اس گوشے میں اس کے اندر سے کوئی راہ نمائی نہیں ملتی۔ یہاں وحی کا وہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے، جو باقی حیوانات میں عمر بھر تک ان کے ساتھ رہتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان کو اس امر میں آزاد چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ محض اپنی عقل کی بنا پر جس طرح جی چاہے اپنے فیصلے آپ کر لیا کریں؟ ہم سابقہ اوراق میں دیکھ چکے ہیں کہ انسان کو اس طرح نہیں چھوڑا گیا بلکہ اسے بھی خدا کی طرف سے راہ نمائی دی گئی ہے۔ لیکن اس راہ نمائی کا طریقہ بدل دیا گیا ہے۔ یہ راہ نمائی ہر فرزند آدم کے دل میں از خود نہیں ڈالی گئی۔ اگر ایسا کر دیا جاتا تو انسان بھی حیوانات کی طرح مجبور ہوتا کہ وہ اپنی اس داخلی آواز پر آنکھیں بند کر کے چلتا رہتا۔ لیکن انسان کو اختیار و ارادہ دیا گیا ہے اس لئے اس کی راہ نمائی کے لئے ایسا طریقہ اختیار کیا گیا جس سے اس کے اختیار و ارادے پر کوئی اثر نہ پڑے۔ یعنی اس کا جی چاہے تو یہ اس راہ نمائی کو اختیار کرے اور جی چاہے تو اس سے سرکشی برتے۔

اس راہ نمائی کے لئے طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ انسانوں میں سے بعض کو اس مقصد عظیم کے لئے چن لیا گیا اور انہیں وہ راہ نمائی دے دی گئی جس کے مطابق چلنے سے انسان اپنی زندگی کے منتہیٰ تک پہنچ جائے۔ یہ راہ نمائی، اس برگزیدہ انسان کو وحی کے ذریعے ملتی ہے اور اسے کہہ دیا جاتا ہے کہ اسے دوسرے انسانوں تک پہنچا دے۔ یعنی یہ وحی اُسے بھی اسی طرح بلا کسب و ہنر ملتی ہے جس طرح کائنات کی دوسری چیزوں کو ملتی ہے۔ لیکن اس کے ذمے یہ فریضہ بھی عائد کر دیا جاتا ہے کہ وہ اس وحی پر خود بھی عمل کرے اور اسے دوسروں تک بھی پہنچائے۔ جس شخص کو یہ وحی دی جاتی ہے اُسے نبی یا رسول کہا جاتا ہے (ان الفاظ کا فرق ذرا آگے چل کر بتایا جائے گا) اس میں کوئی غیر نبی شامل نہیں ہوتا۔ جو شخص کہتا ہے مجھے خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے سمجھ لیجئے کہ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے نبی اور رسول ہے۔

ہمکلامی کی صورتیں

قرآن کریم نے ان دونوں صورتوں کو ایک ہی جگہ بیان کیا ہے۔ جہاں فرمایا۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيمٌ ۝ (۴۲/۵۱)

اور دیکھو! کسی انسان کے لئے ممکن نہیں کہ خدا اس سے ہمکلام ہو بجز ان صورتوں کے کہ (وہ رسولوں سے) وحی کے ذریعے بات کرے یا پردہ کے پیچھے سے۔ اور (غیر انبیاء سے) اس طرح کہ ان تک اس کا رسول اس کے قانونِ مشیت کے مطابق وحی پہنچائے۔

پہلی قسم کی وحی کی شکل یہ ہے کہ ملائکہ کے ذریعے قلبِ نبوی پر خدا کے کلام کا القاء ہو۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ (۲/۹۷ نیز ۲۶/۱۹۲—۱۹۴)

(اے پیغمبر!) جبریل کا کون دشمن ہو سکتا ہے؟ یہ تو اللہ کا کلام ہے جو جبریل نے اللہ کے قانون کے مطابق تمہارے قلب میں اتارا ہے اور اس تمام تعلیم کو سچ کر کے دکھانے کے لئے آیا ہے، جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہے۔ اس میں انسان کے لئے ہدایت ہے، اور ان لوگوں کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں (فلاح وکامیابی کی) بشارت۔

دوسری قسم، پردہ کے پیچھے سے بذریعہ آواز کے۔ جیسے حضرت موسیٰؑ کے ضمن میں فرمایا۔

وَنَادَيْنَاهُ مِنْ جَانِبِ الطُّورِ الْأَيْمَنِ وَقَرَّبْنَاهُ نَجِيًّا ۝ (۱۹/۵۲)

ہم نے اسے کوہ طور کی دہنی جانب سے پکارا، اور (وحی کی) سرگوشیوں کے لئے اپنے قریب کیا۔

حضرات انبیاء کرامؑ کو اس طرح خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے اور وہ اس وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچاتے ہیں۔ اس کو رسالت کہتے ہیں۔

ہدایتِ آسمانی کا سلسلۂ وحی

یہ ہے وہ وحی جس کا سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا جب انسان کو دنیا میں ہدایت کی ضرورت پیش آئی اور یہ سلسلہ منزل بہ منزل کارواں در کارواں آگے بڑھتا ہوا اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہو گیا[۱]۔

إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَىٰ نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَوْحَيْنَا

---

[۱] چونکہ وحیٔ رسالت ایک خالصۃً انفرادی تجربہ ہے جس سے نبی کے علاوہ اور کوئی لذت آشنا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ہم [illegible] جان سکتے کہ انکشافِ حقیقت کی ان مختلف صورتوں کی نوعیت و ماہیت کیا ہوتی ہے۔ [۲] پہلے بتایا جا چکا ہے کہ حقیقتِ کلی کے انکشافی تجربہ (یعنی حضرات انبیاء کرامؑ کی وحی) میں کبھی اختلاف نہیں ہو سکتا۔

إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ .... وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝ (۴ ـ ۱۶۳ ـ ۱۶۵)

(اے پیغمبر!) ہم نے تمہاری طرف اسی طرح وحی بھیجی جس طرح نوح پر اور ان نبیوں پر جو نوح کے بعد پیدا ہوئے بھیجی تھی۔ اور جس طرح ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب، اولاد یعقوب، عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان پر بھیجی اور داؤد کو زبور عطا فرمائی۔ نیز خدا کے وہ رسول جن کا حال ہم (قرآن میں) پہلے سنا چکے ہیں، اور وہ جن کا حال ہم نے تمہیں نہیں سنایا، اور (اسی طرح) اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا جیسا کہ وحی کے طور پر کلام کرنا ہوتا ہے۔ یہ تمام رسول (نیکی و روش زندگی کے خوشگوار نتائج کی) خوشخبری دینے والے اور (انکارِ حق کے نتائج سے) ڈرانے والے تھے (اور اس لئے بھیجے گئے تھے) کہ ان کے آنے اور نیک و بد بتلانے کے بعد لوگوں کے پاس کوئی حجت باقی نہ رہے جو وہ خدا کے سامنے پیش کر سکیں (یعنی یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمیں راہِ حق کی طرف کسی نے دعوت نہیں دی تھی) اور خدا (اپنے کاموں میں) سب پر غالب ہے اور (اپنے تمام کاموں میں) حکمت رکھنے والا ہے۔

سورۂ شوریٰ میں ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ ..... اَللَّهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ يُنِيبُ ۝ (۴۲ ـ ۱۳ نیز ۴۲)

اور (دیکھو) خدا نے تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا اور جس کی ہم نے تمہاری طرف وحی کی ہے اور جس کا ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو (مع ان کے متبعین کے) حکم دیا تھا کہ دین کے نظام کو قائم رکھنا، اور تفرقہ اندازی (کی لعنت سے) بچنا۔ (تمام انبیاء کو یہی حکم دیا گیا تھا۔ کیونکہ اصول کے اعتبار سے مختلف انبیاء کی تعلیم میں کوئی فرق نہیں۔ مگر) مشرکین کو وہ بات جس کی طرف (اے پیغمبرِ اسلام!) تم انہیں بلا رہے ہو بڑی گراں گزر رہی ہے (شاید انہیں یہ ناگوار ہو رہا ہے کہ منصبِ نبوت سے ان میں سے کوئی سرفراز کیوں نہ کیا گیا) خدا اپنی طرف (منصبِ رسالت کے لئے) جسے چاہتا ہے چن لیتا ہے۔ اور پھر جو شخص انبیاء کی طرف آئی ہوئی ہدایت کے ذریعے خدا کی طرف رجوع کرتا ہے تو خدا اسے زندگی کے منتہیٰ تک پہنچا دیتا ہے۔

حضرت نوحؑ کے متعلق فرمایا۔

فَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ أَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا ۝ (۲۳ ـ ۲۷)

پس ہم نے نوح کی طرف وحی بھیجی کہ "ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق ایک کشتی بنا"

سورۂ انبیاء میں حضرت ابراہیمؑ کے تذکرہ کے بعد فرمایا۔

وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ ۖ وَيَعْقُوبَ نَافِلَةً ۖ وَكُلًّا جَعَلْنَا صَالِحِينَ ۝ وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَإِقَامَ الصَّلَاةِ

وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ۝ (۲۱/۷۳)

اور پھر ہم نے اُسے (ایک فرزند) اسحاق عطا فرمایا اور مزید برآں (پوتا) یعقوب۔ ان سب کو ہم نے صالح بنایا تھا۔ ہم نے انہیں (انسانوں کی) پیشوائی دی تھی۔ ہمارے حکم کے مطابق وہ راہ دکھاتے تھے۔ ہم نے ان پر وحی بھیجی کہ ہر طرح کے بھلائی کے کام انجام دیں۔ نیز نظامِ صلوٰۃ قائم کریں اور نوعِ انسانی کی نشوونما کا انتظام کریں۔ چنانچہ وہ سب ہمارے قوانین کی اطاعت میں سرگرمِ عمل رہتے تھے۔

حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا کہ اپنے بھائی (حضرت ہارونؑ) کو ساتھ لے کر فرعون کے دربار میں جاؤ۔ اور وہاں دعوتِ حق کا اعلان کرو کہ

اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى (۲۰/۴۸)

جو کوئی جھٹلائے اور سرتابی کرے، تو ہم پر وحی اتر چکی ہے کہ اس کیلئے عذاب کا پیام ہے۔

کوئی رسول ایسا نہیں تھا جس پر وحی نہ آئی ہو کہ رسول (پیغامبر) کہتے ہی اسے ہیں جو پیغام لیکر آئے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝ (۲۱/۲۵ نیز ۱۶/۳۶ : ۳۹/۶۵)

(اور اے پیغمبر!) ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر ایسا نہیں بھیجا جس پر اس بات کی وحی ہم نے نہ بھیجی ہو کہ کائنات میں کسی کا اقتدار وقانون نہیں بجز ہمارے۔ پس چاہیے کہ میری ہی محکومیت (اطاعت وفرماں پذیری) اختیار کرو!

نبی اکرمؐ پر قرآن کریم بطورِ وحی نازل کیا گیا۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝ (۱۲/۲-۳ نیز ۴۲/۷)

ہم نے اسے اس شکل میں اتارا کہ یہ واضح اور مفصل زبان کی کتاب ہے تاکہ تم سمجھو بوجھو (اے پیغمبر!) اس قرآن کی وحی کر کے ہم تجھے بہتر سے بہتر طریقہ پر اگلی سرگزشتیں سناتے ہیں، اور یقیناً قرآن کے نازل ہونے سے پہلے تو ان ہی لوگوں میں سے تھا جو (ان سرگزشتوں سے) بے خبر تھے۔

دوسرے مقام پر اسی کو کتاب کہا گیا ہے[1]۔

وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ۝ (۱۸/۲۷ نیز ۱۶/۳۹ : ۲۹/۴۵ : ۳۵/۳۱)

اور (اے پیغمبر!) تیرے پروردگار کی کتاب جو تجھ پر وحی کی گئی ہے اس کی اتباع کرتا رہ۔ اللہ کا قانون کوئی بدل نہیں سکتا۔ اور تجھے اس کے سوا کوئی پناہ کا سہارا ملنے والا نہیں!

---

[1] کتاب اور حکمت کسے کہتے ہیں؟ اس کی تشریح اپنے مقام میں آئے گی۔ یہاں صرف اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ یہ دونوں قرآن کریم ہی کے اندر ہیں۔ اس سے باہر نہیں۔

انبیائے سابقہ کی وحی کا اولین اور بنیادی اعلان بھی خدا کی توحید تھا۔

قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰۤى اِلَىَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ (۲۱/۱۰۸)

تو کہدے "مجھ پر جو کچھ وحی کیا گیا ہے، وہ تو صرف یہ ہے کہ تمہارے لئے اقتدار و اختیار صرف خدا کا ہے (اس کے سوا کسی کا نہیں)

پس بتلاؤ تم اس کے آگے سر جھکاتے ہو یا نہیں؟"

حضورؐ اسی وحی سے انسانوں کے وضع کردہ قوانین زندگی کے انجام و عواقب سے آگاہ فرماتے تھے۔

قُلْ اِنَّمَاۤ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْىِ ۖ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ ۝ (۲۱/۴۵ نیز ۳۶/۷۰)

(اے پیغمبرؐ) تو کہدے "میری پکار اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کی وحی سے علم پاکر تمہیں متنبہ کر رہا ہوں اور (یاد رکھو) جو اپنے کان سے

کام نہیں لیتے ہیں، انہیں کتنا ہی خبردار کیا جائے کبھی سننے والے نہیں!

اسی وحی سے ملت ابراہیمیؑ کے اتباع کا حکم دیا گیا

ثُمَّ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (۱۶/۱۲۳)

اور پھر (اے پیغمبرؐ) ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی کہ (اسی) ابراہیمؑ کے طریقہ کی پیروی کرو۔ ہر طرف سے ہٹا ہوا (صرف

دین حق ہی پر کاربند رہنے والا) اور جو مشرکین میں سے نہ تھا۔

(اس کی تفصیل اپنے مقام پر ملے گی) یہ وحی خدائے علیم و حکیم کی طرف سے ہوتی تھی۔

وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ۝ (۲۷/۶)

اور بلاشبہ (اے پیغمبرؐ) تم پر یہ قرآن خدائے حکیم و علیم کی جانب سے القا کیا جاتا ہے۔

اس قرآن کا رسول اللہ کو پڑھا دینا اور پھر اس کا جمع کر دینا بھی خدا کے ذمہ تھا۔

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ۚ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝ۚ (۷۵/۱۷-۱۸)

قرآن کو جمع کرنا اور اس کا پڑھانا ہمارے ذمہ ہے۔ پھر جب ہم اسے پڑھ چکیں (ہمارا فرشتہ پیام کو پہنچا چکے) تو پھر اس کی قرأت

کی پیروی کرو (اسے اسی طرح دہراؤ اور اسی طرح جم کر اس پر عمل کرو)

وحی صرف خیالات کا القا نہیں

اس آیۂ جلیلہ کو ذرا غور سے دیکھئے کہ "فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ" "جب ہم پڑھیں تو ان کے پیچھے پڑھا کرو" یہ ہے وحی کی حقیقت۔ محض خیالات کا دل میں ڈال دینا نہیں بلکہ اس طرح سے الفاظ کو پڑھانا جیسے معلم متعلم کو پڑھاتا ہے۔ (یہاں یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ قرآن کریم کے محض مطالب ہی وحی نہیں بلکہ اس کے الفاظ[1] بھی وحی ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی عنوان "قرآن" میں ملے گی۔

---

[1] سورۂ ابراہیم میں ہے

وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ...... (۱۴/۴)

(باقی اگلے صفحے پر)

یہاں صرف اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ کوئی خیال، الفاظ کے بغیر ممکن نہیں۔ "خیال اور الفاظ، احساس کے سرچشمہ سے بیک وقت باہر آتے ہیں" (خطبات صفحہ ۲۱) اس کے ساتھ ہی اللہ نے اس کی بھی وضاحت کردی کہ وحی کا سرچشمہ یکسر خارجی (Objective) ہوتا ہے۔ صاحب وحی کے اپنے خیالات، جذبات، رجحانات و میلانات کا اس میں قطعاً کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یعنی وحی کا علم داخلی (Subjective) نہیں ہوتا چنانچہ سورۂ والنجم میں ہے

وَ مَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی ۝ (۵۳/۳)

اور (دیکھو ہمارا پیغمبر) اپنے جذبات کے تابع کچھ نہیں کہتا۔

تلاوتِ وحی پھر جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ وحی رسالت سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ نوعِ انسانی کے لئے ضابطۂ حیات ہے۔ اس لئے حضورؐ کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اس وحی کو دوسروں تک بھی پہنچا دیں۔

تبلیغ رسالت یٰاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ ۝ (۵/۶۷)

اے پیغمبر! تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر جو کچھ نازل ہوا ہے، اسے (خدا کے بندوں تک) پہنچا دو (اور دشمنوں کی مخالفت کی کچھ پروا نہ کرو) اگر تم نے ایسا نہ کیا، تو (پھر) خدا کا پیغام نہیں پہنچایا (یعنی ادائے فرض رسالت میں کوتاہی کی) اور اللہ تمہیں انسانوں (کے شر) سے بچائے گا وہ اس گروہ پر (کامیابی) کی راہ نہیں کھولتا جس نے کفر کی راہ اختیار کی ہے!

اتباعِ وحی صرف پہنچانا ہی نہیں بلکہ خود وحی کی اتباع بھی کرنا۔

وَاتَّبِعْ مَا یُوْحٰٓی اِلَیْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰی یَحْكُمَ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ خَیْرُ الْحٰكِمِیْنَ ۝

(۱۰/۱۰۹)

اے پیغمبر! جو کچھ تم پر وحی کی جاتی ہے، اس پر چلتے رہو اور اپنی راہ میں جمے رہو۔ یہاں تک کہ اللہ (تمہاری جماعت اور فریق مخالف کی کشمکش میں) فیصلہ کر دے۔ اور وہ فیصلہ کرنے والوں میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے!

" اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی قوم کی زبان میں تاکہ وہ انہیں کھول کر بتا دے "

یہاں سے ظاہر ہے کہ رسول کا پیغام اس کی قوم کی زبان میں ہوتا ہے۔ چونکہ رسول اللہ کے اولین مخاطب عرب تھے اس لئے قرآن عربی زبان میں نازل ہوا۔ لیکن قرآن تمام نوعِ انسانی کے لئے ہمیشہ تک کے لئے ضابطۂ حیات ہے، اس لئے اس کے عربی زبان میں ہونے سے یہ مراد نہیں کہ وہ صرف عربوں کے لئے ہے۔

اسی سے تمسک کا حکم ہے۔

فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِیْٓ اُوْحِیَ اِلَیْكَ ۚ اِنَّكَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ؁ (۴۳/۴۳)

اور (اے پیغمبرِ اسلام!) ان ہی ہدایات کے ساتھ تمسک کرو جن کی تمہاری طرف وحی کی گئی ہے۔ بلاشبہ تم سیدھے راستے پر ہو (اسی پہ گامزن رہو)

یعنی رسول کو حکم دیا جاتا تھا کہ اُس وحی کو دوسروں تک پہنچائے اور پھر اس کے مطابق ایک معاشرہ قائم کرے جس میں تمام افرادِ معاشرہ وحی کی اتباع کریں۔ اور یہ کوئی نئی چیز نہ تھی۔ سلسلۂ وحی و رسالت، اور اس کی اتباع کا مسلک شروع سے چلا آ رہا تھا۔

یہ کوئی نئی بات نہ تھی

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِكُمْ ؕ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ؁ (۴۶/۹)

(اے پیغمبر!) تم کہدو کہ میں کوئی انوکھا رسول نہیں ہوں، (بلکہ جماعتِ انبیاء کا ایک فرد ہوں۔ مجھ میں کوئی ایسی انوکھی بات نہیں ہے جو اوروں میں نہ ہو) مجھے قطعاً معلوم نہیں کہ (کل) میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا؟ میں تو صرف ان ہدایاتِ خداوندی کا اتباع کرتا ہوں جن کی میری طرف وحی کی گئی ہے۔ میں تو صرف (نوعِ انسانی کو اس کے بُرے اعمال کے نتائج سے کھلے طور پر واضح طریقہ سے) آگاہ کرنے والا ہوں (اور بس!)

اتباعِ وحی سے انسان ہمیشہ راہِ راست پر رہتا ہے۔ اور اس کے سوا، راہنمائی کی کوئی دوسری شکل ہے ہی نہیں۔ (خواہ کسے باشد)

قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰی نَفْسِیْ ۚ وَاِنِ اهْتَدَیْتُ فَبِمَا یُوْحِیْٓ اِلَیَّ رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌ ؁ (۳۴/۵۰)

اے پیغمبر! ان سے کہدو کہ اگر میں معاشرہ کے تدبیر امور میں کہیں کوئی غلطی کرتا ہوں تو وہ غلطی میرے اپنے اجتہاد کی غلطی ہوتی ہے اور جہاں بالکل سیدھی راہ پر چلتا ہوں تو وہ اس وحی کی رو سے ہوتی ہے، جو میرا پروردگار میری طرف نازل کرتا ہے۔ وہ بے شک ہر ایک بات سننے والا اور ہر ایک کے قریب ہے۔

یقینی علم

اس لئے کہ حتمی اور یقینی علم صرف وحی ہے جس میں ظن و تخمین کا کوئی شائبہ نہیں۔ حضورؐ سے ارشاد ہے

وَلَنْ تَرْضٰی عَنْكَ الْیَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَی اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰی ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ؁ (۲/۱۲۰)

اور (حقیقت یہ ہے کہ تم اپنی سچائی کی کتنی ہی نشانیاں پیش کرو، لیکن) یہود اور نصاریٰ تم سے خوش ہونے والے نہیں۔ وہ تو صرف اُسی حالت میں خوش ہو سکتے ہیں کہ تم (اُن کی راہنمائی ہوئی) ملتوں کے پیرو ہو جاؤ (کیونکہ جس بات کو انہوں نے

دین سمجھ رکھا ہے وہ گروہ پرستی کے تعصب کے سوا کچھ نہیں ہے) پس تم اُن سے (صاف صاف) کہدو کہ خدا کی ہدایت کی راہ تو وہی ہے جو ہدایت کی حقیقی راہ ہے (نہ کہ تمہاری خود ساختہ ٹولیاں اور گروہ بندیاں، اور میری راہ وہی ہے) اور یاد رکھو، اگر تم نے ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی کی، باوجودیکہ تمہارے پاس علم و یقین کی روشنی آچکی ہے، تو یہ ہدایت الٰہی سے صریح انحراف ہوگا، اور پھر) اللہ کی دوستی اور مددگاری سے تم یکسر محروم ہو جاؤ گے۔

کیونکہ وحی کو خدا اپنے علم سے نازل کرتا ہے۔

لٰکِنِ اللّٰہُ یَشْھَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَیْکَ اَنْزَلَہٗ بِعِلْمِہٖ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ (۴/۱۶۶)

اے پیغمبر! اگر یہ لوگ تمہاری سچائی سے انکار کرتے ہیں، تو انکار کریں) لیکن اللہ نے جو کچھ تم پر نازل کیا ہے وہ اسے نازل کرکے (تمہاری سچائی کی) گواہی دیتا ہے، اور اس نے اسے اپنے علم کے ساتھ نازل کیا ہے۔

اور باطل اس کے پاس نہیں پھٹک سکتا۔

لَا یَاْتِیْہِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْہِ وَلَا مِنْ خَلْفِہٖ ؕ تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَکِیْمٍ حَمِیْدٍ ۝ (۴۱/۴۲)

(اور دیکھو،) باطل تو نہ اس کے آگے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے۔ یہ (قرآن) خدائے حکیم اور محمود کی طرف سے نازل کیا ہوا ہے۔

غیب کی وحی

چونکہ وحی علم خداوندی پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس لئے اس میں وہ امورِ غیب منکشف کئے جاتے ہیں جو حیطۂ علم انسانی میں نہیں آسکتے۔ قصۂ حضرت مریم کے ضمن میں فرمایا۔

ذٰلِکَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْہِ اِلَیْکَ ؕ وَمَا کُنْتَ لَدَیْھِمْ اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَھُمْ اَیُّھُمْ یَکْفُلُ مَرْیَمَ ۪ وَمَا کُنْتَ لَدَیْھِمْ اِذْ یَخْتَصِمُوْنَ ۔۔ ۔۔ (۳/۴۴)

(اے پیغمبر!) یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جس کی ہم تم پر وحی کر رہے ہیں۔ ورنہ یہ بات تو ظاہر ہے کہ تم اس وقت ان لوگوں کے پاس موجود نہ تھے جب (مریم کی ماں مریم کو لیکر ہیکل میں آئی تھی، اور ہیکل کے مجاور) اپنے اپنے تیر پھینک رہے تھے کہ (قرعہ ڈال کر فیصلہ کرلیں) کون مریم کا کفیل ہو۔ اور (یقیناً) تم اس وقت بھی موجود نہ تھے، جب وہ (مریم کی کفالت کے لئے) آپس میں جھگڑ رہے تھے۔

حضرت نوحؑ کے تذکرہ کے بعد فرمایا۔

تِلْکَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْھَآ اِلَیْکَ ۚ مَا کُنْتَ تَعْلَمُھَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُکَ مِنْ قَبْلِ ھٰذَا ؕ (۱۱/۴۹)

(اے پیغمبر!) یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جسے وحی کے ذریعے ہم تجھے بتلا رہے ہیں۔ اس سے پہلے نہ تو یہ باتیں تو جانتا تھا، نہ تیری قوم۔

قصۂ حضرت یوسفؑ کے سلسلہ میں فرمایا۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ۝ (۱۲/۱۰۲)

(اے پیغمبر!) یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جس کی ہم تجھ پر وحی کر رہے ہیں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ جس وقت یوسف کے بھائی سازش میں مصمم ہو گئے تھے اور پوشیدہ تدبیریں کر رہے تھے، تو تم اس وقت کچھ ان کے پاس کھڑے نہ تھے (کہ سب کچھ دیکھ سن لیا ہو۔)

قصۂ حضرت موسیٰؑ اور اہلِ مدین کے متعلق حضورؐ سے ارشاد ہوا۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ (۲۸/۴۴-۴۶)

اور (اے پیغمبر اسلام!) تم (کوہ طور کی) مغربی جانب میں موجود نہیں تھے۔ جب ہم نے موسیٰ کو امر (رسالت) حوالہ کیا اور نہ ہی تم وہاں حاضر تھے۔ بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) ہم نے (موسیٰ کے بعد) بہت سی نسلیں پیدا کر دیں اور پھر ان پر زمانہ دراز گذر گیا۔ (جب کہیں تمہاری پیدائش ہوئی۔ اس لئے وہاں تمہاری موجودگی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا) اور نہ ہی تم اہلِ مدین میں قیام پذیر تھے (کہ تم ان کے حالات دیکھ کر ان کے واقعات کے متعلق) ان لوگوں کو ہماری آیتیں سناتے ہو۔ بلکہ حقیقت ہے کہ یہ تمام باتیں ہم نے تمہیں وحی کے ذریعہ سے بتلائی ہیں اور) ہم ہی (تمہیں) رسول بنا کر بھیجنے والے ہیں۔ اور (دیکھو اے پیغمبر!) تم اُس وقت (بھی) طور کی جانب (غربی) میں موجود نہیں تھے۔ جب ہم نے (موسیٰ) کو پکارا تھا۔ مگر تمہارے پروردگار کی طرف سے مہربانی کا ظہور ہوا۔ (اور تم رسول بنا دیئے گئے اور ان تمام گذشتہ واقعات کا وحی کے ذریعہ سے تم کو علم دیا گیا) تاکہ تم ایک ایسی قوم کو جن کے پاس تم سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا (انکار و بدعملی کے بُرے نتائج سے) آگاہ کر دو، ممکن ہے کہ وہ لوگ نصیحت قبول کر لیں۔

یعنی یہ تمام امورِ غیب حضورؐ پر بتوسط وحی منکشف ہوئے تھے۔ وحی کے بغیر حضور اُن سے واقف نہ تھے۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝ (۱۲/۳)

(اے پیغمبر!) اس قرآن کی وحی کر کے ہم تجھے بہتر سے بہتر طریقہ پر (پچھلی) سرگذشتیں سناتے ہیں، اور یقیناً قرآن کے نازل ہونے سے پہلے تو اُن ہی لوگوں میں سے تھا جو (ان سرگذشتوں سے) بے خبر تھے۔

نہ صرف امورِ غیب، بلکہ تمام علوم جن سے صاحبِ وحی بذاتِ خویش نا آشنا ہوتا ہے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ۭ......

......وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ۝ (۴/۱۱۳)

اور (اے پیغمبر!) اگر تم پر اللہ کا فضل نہ ہوتا اور اس کی رحمت (کارفرما) نہ ہوتی، تو واقعہ یہ ہے کہ ان لوگوں میں سے

ایک جماعت نے پورا ارادہ کر لیا تھا کہ (اصل مجرم کی حمایت میں جتھابندی کر کے) تمہیں غلط رستہ پر ڈال دیں (اور تم بے گناہ آدمی کو مجرم تصور کر لو) اور یہ لوگ غلط رستہ پر نہیں ڈال رہے ہیں مگر خود اپنی ہی جانوں کو (کہ حق کی حمایت کرنے کی جگہ جھوٹے کی حمایت کر رہے ہیں، اور یہ اپنی چالاکیوں سے) تمہیں کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ کیونکہ اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل کر دی ہے، اور جو باتیں معلوم نہ تھیں، وہ تمہیں سکھلا دی ہیں اور تم پر اس کا بہت ہی بڑا فضل ہے:

علمِ خصوصی یہی وجہ ہے کہ رسول اپنے ماحول کی پیداوار نہیں ہوتا۔ ورنہ اس کا علم اپنے گردوپیش سے آگے نہ بڑھ سکتا۔ یہ وحی ہے کہ جس کی بناء پر وہ اپنے ہم عصروں سے ایک جداگانہ علم رکھتا ہے۔ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے فرمایا۔

أُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَ اَنْصَحُ لَكُمْ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (۷/۶۲)

میں اپنے پروردگار کا پیغام تمہیں پہنچاتا ہوں اور پندونصیحت کرتا ہوں، اور اللہ کی طرف سے اس بات کا علم رکھتا ہوں جو تمہیں معلوم نہیں۔

عام ماحول تو ایک طرف، صاحبِ وحی کا علم (جو بذریعۂ وحی ملتا ہے) اس کے اپنے افرادِ خاندان، حتیٰ کہ اب وجد سے جداگانہ ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ سے فرمایا۔

يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝ (۱۹/۴۳)

اے میرے باپ! میں سچ کہتا ہوں، علم کی ایک روشنی مجھے مل گئی ہے، جو تجھے نہیں ملی۔ پس میرے پیچھے چل، میں تجھے سیدھی راہ دکھاؤں گا۔

رسول اللہؐ کو خدا کی طرف سے جو وحی ملی تھی وہ قرآن کے اندر محفوظ ہو گئی۔ قرآن سے باہر اور کہیں بھی وحی نہیں۔ ہمارے ہاں جو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وحی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وحیٔ متلو (یعنی جس وحی کی تلاوت کی جاتی ہے) اور دوسری وحیٔ غیر متلو (یعنی جس وحی کی تلاوت نہیں کی جاتی)۔ تو قرآن سے اس عقیدہ کی کوئی سند نہیں ملتی۔ قرآن سے صرف ایک ہی قسم کی وحی کی سند ملتی ہے اور وہ وحی قرآن کے اندر ہے وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ (۶/۱۹) "اُن سے کہدے کہ میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعے تمہیں غلط روشِ زندگی کے نتائج سے آگاہ کر دوں۔ اور انہیں بھی جن تک یہ قرآن پہنچے"۔ (ان امور کی تفصیل میرے دیگر مضامین میں شرح و بسط سے آ چکی ہے اس لئے اس کے اعادے کی یہاں ضرورت نہیں[1])

---

[1] دیکھو "مقامِ حدیث" شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام۔

غیر نبی اور وحی

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، وحی صرف انبیاء کے لئے مخصوص ہوتی ہے اور غیر از نبی کو نہیں ملتی۔ قرآن کریم میں دو تین مقامات پر وحی کا لفظ غیر از نبی کے لئے بھی آیا ہے مثلاً حضرت موسیٰ کی والدہ کے متعلق ہے۔ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى (۲۸/۷) اور ہم نے موسیٰ کی ماں کی طرف وحی کی" (کہ بچے کو دریا میں بہا دے)۔ یا حضرت عیسیٰ کے حواریوں کے متعلق ہے کہ "ہم نے حواریوں پر وحی کی کہ وہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لائیں" (۵/۱۱۱)۔ اسی طرح حضرت یوسف کے متعلق ہے کہ جب ان کے بھائیوں نے انہیں کنوئیں میں ڈال دیا تو خدا نے ان کی طرف وحی کی کہ وہ گھبرائیں نہیں (۱۲/۱۵)۔ ظاہر ہے کہ ان مقامات میں وحی کا لفظ اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے جس مفہوم کے لئے وحی کا لفظ، شہد کی مکھی۔ یا آسمان یا زمین کے لئے استعمال ہوا ہے۔ یعنی یہ باتیں بغیر استدلالی علم کے، خدا نے ان کے دل میں ڈال دیں۔ لیکن ان امور کا دین سے کوئی تعلق نہیں نہ ہی انہیں جن کے دل میں یہ باتیں ڈالی گئی تھیں، اس کا حکم دیا گیا تھا کہ ان باتوں کو، خدا کی طرف سے دوسروں تک پہنچائیں۔ لہذا کسی غیر نبی کے دل میں اگر کوئی بات از خود پیدا ہو جاتی ہے (جسے عام طور پر الہام یا کشف کہا جاتا ہے) تو اسے دین سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی شخص اسے ماننے پر مکلف ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں الہام یا کشف کا کوئی ذکر نہیں نہ ہی اس میں کہیں یہ لکھا ہے کہ نزول قرآن کے بعد، اللہ تعالیٰ بعض برگزیدہ بندوں کو بذریعہ الہام کچھ بتا دیا کرے گا۔ اس نے قرآن نازل کر دیا اور پھر قرآن پر غور و فکر کرنے اور علم و بصیرت سے اسے بار بار سمجھنے کی تاکید کر دی۔ اس لئے ہمارے لئے دین کی سند قرآن ہے اور علم و بصیرت اس کے سمجھنے کا ذریعہ۔ کشف و الہام کا دین سے کوئی تعلق نہیں (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہ ایک اکتسابی فن ہے اور ہر شخص کسب و مہارت سے اسے حاصل کر سکتا ہے)

خلاصہ مبحث

حیات جاوداں کی خواہش انسان کی دلی آرزو ہے۔ یہ ہمیشہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ انسانی ماجریات کے تمثیلی بیان، یعنی قصہ آدم میں دیکھئے۔ ابلیس نے انسان کے اسی کمزور پہلو سے فائدہ اٹھایا اور اسے یہ کہہ کر ورغلایا کہ آؤ میں تمہیں حیات جاوید کا راز بتاؤں۔ اس نے کہا کہ بقائے ذات کا ذریعہ افزائش نسل ہے اور نسل و خاندان کا تحفظ عقلی اسباب و ذرائع سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یعنی اس نے بالفاظ دیگر یہ کہا کہ انسان عمل ارتقاء کی ایک میکانکی تخلیق ہے اور اس کے سامنے مسئلہ صرف طبیعی حوائج و ضروریات کے حل کا ہے۔ اور یہ حل علم محسوسات، یعنی عقل کے ذریعے تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ابلیس کے پیش کردہ نظریہ کی رو سے مادی زندگی کے علاوہ انسان کی کوئی زندگی نہیں اور اسی مادی پیکر کی بقا حیات جاوید ہے۔ اس کے برعکس خالق فطرت نے کہا کہ یہ غلط ہے کہ انسان محض حیوانات ہی کی

ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ اور اس کے سامنے مسئلہ صرف اس کی طبیعی ضروریات کا ہے جو علم محسوسات کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہیں۔ نفسِ انسانی مادہ سے ماوراء ہے اور بقا کا راز نفس کے استحکام میں پوشیدہ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کے مادی پیکر کا تحفظ و استحکام بھی ضروری ہے (کیونکہ یہی وہ قلعہ ہے جس کے اندر اس کی خودی کی فوج متمکن ہے) لیکن منتہائے نگاہ نقطۂ مادی پیکر کا تحفظ ہی نہیں بلکہ نفسِ انسانی کا تحفظ و استحکام ہے اور یہ تحفظ علم محسوسات (عقل یا علم استدلالی) سے نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ علم محسوسات عالم طبیعیات سے متعلق ہے اور نفس انسانی دنیائے طبیعیات کا ماوراء ہے۔ ایسی راہ نمائی کی ضرورت ہے جس کا سرچشمہ مادی کائنات سے ماوراء ہو۔ اس کا نام وحی ہے۔

پہلے دن سے آج تک، یہی ایک سوال ہے جو نوعِ انسانی کے لئے کشمکش پیہم کا موجب بن رہا ہے۔ اسی کا نام ابلیس و آدم کی آویزش ہے۔ یعنی ایک گروہ اس کا مدعی ہے کہ انسانی زندگی بس اسی مادی پیکر کی زندگی ہے۔ اس لئے انسانی مسائل کا حل، علم محسوسات (عقل) کے ذریعے حل ہو سکتا ہے۔ ماورائے عقل کچھ نہیں ہے۔ اس کے برعکس دوسرا گروہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ انسانی زندگی اسی مجبسِ آب و گِل کی زندگی نہیں بلکہ یہ پیکر، نفسِ انسانی کا قالب ہے۔ اصل زندگی، نفسِ انسانی کی زندگی ہے اور اسی کی بقا، درحقیقت بقا ہے۔ چونکہ نفسِ انسانی محسوسات کی دنیا سے ماوراء ہے اس لئے اس کے حفظ و بقا سے متعلق مسائل کا حل محسوسات کی دنیا میں نہیں مل سکتا۔ بلکہ اس کی راہ نمائی کے لئے ایسی روشنی کی ضرورت ہے جو اس دنیا سے آرہی ہو جس سے نفسِ انسانی متعلق ہے۔ اس روشنی (وحی) کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ عقل (علم استدلال) اس کے اندر آجاتی ہے۔ لیکن یہ، عقل کے محدود و متناہی دائرہ کے اندر نہیں آسکتا۔ یہ وہ دونوں دعاوی ہیں گویا دو الگ الگ بنیادیں ہیں جن پر دو مختلف تہاذیب کی عمارت استوار ہوتی ہے۔

یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ انسان کے اندر کچھ ایسی چیزیں بھی ہیں جو فی الواقعہ استدلالی علم کے دائرہ سے باہر ہیں۔ جبلی عادات۔ ضمیر کی آواز۔ ذوقِ جمالیات۔ اختیار و ارادہ۔ ان کا تعلق انسان کے مادی جسم سے نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ یورپ کے ان علمائے طبیعیات نے (جن کے نزدیک مادہ سے ماوراء اور کوئی دنیا نہیں) بہت کوشش کی ہے کہ ان چیزوں کی بھی مادی توجیہات پیش کی جائیں۔ لیکن رفتہ رفتہ خود وہیں کے حکماء و محققین نے ان کا رد کر دیا اور اب تحقیقاتِ جدیدہ کا رُخ اسی طرف ہے کہ یہ تمام معاملات، نفسِ انسانی سے متعلق ہیں جو اس مادی پیکر کی تخلیق نہیں۔ انہوں نے یہ بھی کوشش کی ہے کہ نفس کی کنہ و حقیقت سے متعلق بھی تحقیقات کی جائیں۔ لیکن چونکہ نفس، محسوسات کی دنیا کی چیز نہیں اور ان کے ذرائع تحقیق محسوسات و استدلال کی دنیا سے متعلق ہیں۔ اس لئے ان ذرائع سے نفس کی حقیقت کا علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ وہ زیادہ سے زیادہ نفس کے لزوم و ماجریات یا اس کے دوائرِ اثر و نفوذ سے بحث کر سکتے ہیں۔ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتے (ان اشارات کی تفصیل، سلسلۂ معارف القرآن کی ایک آئندہ

کڑی میں جاکر ملے گی، جس کا نام ہے "انسان نے کیا سوچا")

ہماری کائنات محسوسات کی دنیا ہے جس میں ہر آن تغیرات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن اس کائنات کے پیچھے ایک حقیقت (Reality) ہے جو تغیرات سے ماوراء ہے۔ رازِ کائنات معلوم نہیں کیا جا سکتا جب تک ادراکِ حقیقت نہ ہو۔ جب حیات، شعور سے متمسک ہوتی ہے تو نفس متشخص ہو جاتا ہے۔ لہذا نفس کی کنہ و حقیقت سے آگہی کے لئے رازِ حیات، یا ادراکِ حقیقت ضروری ہے۔ علمِ محسوسات (سائنس یا طبیعیات) کے ذریعے حقیقت کا ادراک صرف ان پہلوؤں کی جھلک سی سامنے آسکتی ہے جن میں وہ محسوس طور پر اپنا نمود کرتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت کا ادراک نہیں ہوتا۔ پھر یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ ان مختلف پہلوؤں کو یکجا جمع کر لیا جائے تو ان کی حاصل جمع حقیقتِ کلی ہو۔ اسی کو دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ سائنس، حقیقت کو جزءً اجزءً ا دیکھ سکتی ہے تماماً نہیں۔ اور جب تک حقیقت تماماً سامنے نہ آجائے، اس کے مختلف گوشوں کا باہمی ربط و ضبط سمجھ میں نہیں آسکتا۔ لہذا تنہا عقل کی رو سے، انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کے لئے جو نظام بھی متعین کیا جائے گا وہ انسانی زندگی کے کسی ایک گوشے کے لئے مفید نتائج کا کفیل ہو تو ہو۔ کلی ارتقائے انسانیت کے لئے کبھی مفید نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے وہی نظام مفید ہو سکے گا جو انسان کو تماماً و کمالاً سامنے رکھ کر متعین کیا گیا ہو (اسی کا نام قرآن کی اصطلاح میں دین ہے) اور جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہ عقل کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے ماورائے عقل کسی سرچشمہ کی ضرورت ہے۔ ماورائے عقل وجدانیات کی دنیا ہے۔ لہذا اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا دنیائے وجدانیات میں حقیقت کا ادراکِ کلی ممکن ہے؟ اور اگر ہے تو کس مقام پر؟

علمِ غیر استدلالی میں سب سے پہلے ہمارے سامنے جبلت یا ضمیر کا میدان آتا ہے۔ حقیقت ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ اس لئے ادراکِ حقیقت کا نتیجہ ہمیشہ، اور ہر جگہ ایک ہی ہونا چاہیئے۔ لیکن جبلت کا اختلاف اور ضمیر کی آواز کی بوقلمونی ایک بدیہی چیز ہے۔ یہی صورت وجدان (شدتِ ذوق) میں ہے۔ لہذا جبلت اور وجدان (یا حدس) حقیقتِ کلی کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اس سے آگے باطنیت (یا تصوف) کی دنیا آتی ہے۔ لیکن بغور دیکھا جائے تو اسے محض اس اعتبار سے دنیائے وجدان میں شامل کیا جا سکتا ہے کہ قوتِ نفس (قوتِ ارادی یا قوتِ خیال) کے نتائج، دلائلِ عقلی کی رو سے سمجھے یا سمجھائے نہیں جا سکتے۔ اس لئے یہ علمِ استدلالی کی حدود سے خارج ہے لیکن اس اعتبار سے کہ یہ فن یکسر اکتسابی ہے اور مشق و ریاضت سے اس میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اسے وجدان کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں رہتا بلکہ یہ ایک ذہنی طریقِ فکر کی شکل رہ جاتی ہے۔

پھر جبلت اور وجدان کی طرح، باطنیت (تصوف) کے نتائج بھی باہمدگر مختلف ہوتے ہیں اور یہ اختلاف فرعی یا جزئی نہیں۔ بلکہ اصولی اور اساسی ہوتا ہے۔ نیز یہ بھی کہ یہ تجربہ بالکل انفرادی ہوتا ہے اور نوعِ انسانی کی ہیئت

اجتماعیہ کے لئے کوئی پیغام اپنے اندر نہیں رکھتا۔ اس کے طریقِ فکر کی طرف آیئے تو یہ خارجی دنیا سے آنکھیں بند کر لیتا ہے اور سمجھتا یہ ہے کہ داخلی اور خارجی دنیا دو الگ شعبے ہیں جو نہ صرف ایک دوسرے سے غیر متعلق ہیں بلکہ ایک دوسرے کی ضد ہیں حالانکہ ایک حقیقت کے دو گوشے کبھی باہمد گر متضاد نہیں ہو سکتے۔ لہذا باطنیت (تصوف) کی دنیا بھی حقیقت کا ادراک کلی نہیں کر سکتی۔

اس کے بعد ہمارے سامنے علم غیر استدلالی کا آخری مقام آتا ہے۔ جسے مقامِ نبوت کہا جاتا ہے۔ یہ وہ علم حقیقی ہے جس میں کسب و ہنر کو کوئی دخل نہیں۔ اس لئے یہ یکسر وہبی ہے۔ اسی علم کو وحی کہا جاتا ہے۔ وحی کی رو سے حاصل شدہ تعلیم میں کبھی کہیں۔ کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ وحی انسان کی تمام تر ترجمان ہوتی ہے اس لئے اس کی رو سے متعین کردہ نظام انسان کی جملہ مضمر صلاحیتوں کی نشوونما اور تکمیل کا ضامن ہوتا ہے۔ قرآن نے یہی نظام نبی اکرمؐ کی وساطت سے عملی طور پر متشکل کیا تھا۔

وحی منزل من اللہ ہوتی ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ صاحب وحیؑ، کسب و ہنر سے اس ملکہ کو اپنے اندر سے پیدا نہیں کرتا۔ بالفاظِ دیگر یوں سمجھئے کہ حقیقت کا انکشاف نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ حقیقت خود اپنے آپ کو منکشف کرتی ہے لیکن یہ انکشاف یونہی نہیں کر دیا جاتا بلکہ جس قلب مطہر کو کائنات کے اس عظیم الشان راز کا امین بنانا مقصود ہوتا ہے اسے شرفِ انسانیت کے معراجِ کبریٰ پر فائز کیا جاتا ہے۔ اسی لئے صاحبِ وحیؑ، وراثت اور ماحول کے اثرات سے منزہ اور دنیا کی ہر غلط روش کے خلاف کھلی ہوئی بغاوت لئے ہوتا ہے۔ وہ حقیقت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے۔ اس لئے اس کی آنکھ کہیں دھوکا نہیں کھاتی نہ اس کا دل کسی فریب میں آتا ہے۔

قرآنِ کریم میں وحی کا لفظ، غیر استدلالی دنیا کے مختلف گوشوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔ کہیں حیوانات کی نوعی جبلت کے لئے (جیسے شہد کی مکھی کی طرف وحی) کہیں، یونہی دل میں کسی بات کے القاء کر دینے کے لئے (جیسے ام موسیٰ کی طرف وحی) حتیٰ کہ شیطانی وساوس کے لئے بھی۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ (شیطانی وساوس کو چھوڑ کر باقی بھی) تمام آئی وحی کے اقسام ہیں جسے نبوت کہا جاتا ہے۔ نبوت، وحی کی ایک منفرد اور خصوصی شکل ہے جس میں کوئی اور شامل نہیں ہو سکتا۔ یہ ادراک حقیقت کا مکمل اور واحد ذریعہ ہے اور نوعِ انسانی کے لئے ایک انقلاب در آغوش پیغام۔ جو لوگ اپنے خوابوں کے اوہام اور ذہنی وساوس کے ڈانڈے اس وحی سے جا ملاتے ہیں۔ وہ وحی کی حقیقت سے باخبر نہیں ہوتے۔ حقیقت کا مکمل انکشاف صاحبِ قرآن کے قلب منور پر ہو چکا۔ اب شرفِ انسانیت کا راز اس تعلیم کے اتباع میں ہے۔ اور اس اتباع کی صحیح صورت یہ ہے کہ انسانی ہیئت اجتماعیہ کو وحی کی تعلیم کے

خط و خال پر تشکل کیا جائے۔

اگر باپ نرسیدی تمام بولہبی است

[کتاب کے اخیر پہ "نگہ بازگشت" کے عنوان کے تحت، وحی کے متعلق ان ہی حقائق و تفاصیل کو ایک دوسرے انداز میں سمٹا کر لکھدیا گیا ہے۔ بہتر ہو کہ ساتھ کے ساتھ ایک نگاہ اس پر بھی ڈال لی جائے تاکہ اس کے تمام گوشے مختلف، زاویوں سے سامنے آجائیں۔]

الَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰہِ وَیَخْشَوْنَہٗ

[فلک کی بات بتادی زمیں کے محرم کو]

سفالم را مئے او جام جم کرد
درون قطرہ ام پوشیدہ یم کرد
خرد اندر سرم بت خانہ ریخت
خلیلِ عشق دیرم را حرم کرد

رسالت

ہبوطِ آدم کے وقت نوعِ انسانی سے کہا گیا تھا کہ

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲/۳۸)

ہمارا حکم ہوا، اب تم سب یہاں سے نکل چلو (اور جس نئی زندگی کا دروازہ تم پر کھولا جارہا ہے، اسے اختیار کرلو) لیکن (یاد رکھو) جب کبھی ایسا ہو کہ ہماری جانب سے تمہیں ہدایت ملے تو جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا اس کے لئے نہ کسی طرح کا کھٹکا ہوگا نہ کسی طرح کی غمگینی۔

دوسری جگہ اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے۔

يٰبَنِىْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِىْ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (۷/۳۵)

(اور فرمانِ الٰہی ہوا تھا) اے اولادِ آدم! جب کبھی ایسا ہو کہ میرے پیغمبر تم میں پیدا ہوں، اور میری آیتیں تمہیں پڑھ کر سنائیں تو جو کوئی ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے گا اور اس طرح اپنی صلاحیتوں کو نشو ونما دے گا تو اس کے لئے نہ کسی طرح کا اندیشہ ہوگا نہ کسی طرح کی غمگینی۔

پیام رسانی

اس سے ظاہر ہے کہ وہ ہدایتِ خداوندی جس کا وعدہ نوعِ انسانی سے کیا گیا تھا۔ خدا کے رسولوں کی وساطت سے ملنی تھی۔ لہٰذا ہدایت آسمانی وہی ہے جسے اللہ کے رسول پیش کریں۔ رسول (پیغامبر) کو رسول کہا ہی اس لئے جاتا ہے کہ وہ رسالات (پیامات) خداوندی کو پہنچاتا ہے۔ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے فرمایا۔

اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّىْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (۷/۶۲)

میں اپنے پروردگار کا پیغام تمہیں پہنچاتا ہوں اور پند و نصیحت کرتا ہوں، اور اللہ کی طرف سے اس بات کا علم رکھتا ہوں جو تمہیں معلوم نہیں۔

یہی کچھ حضرت ہود۔ صالح۔ شعیب (علیہم السلام) نے فرمایا (دیکھئے ۷/۶۸، ۷/۷۹، ۷/۹۳) خود نبی اکرم سے ارشاد ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۭ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (۵/۶۷)

اے پیغمبر! تمہارے پروردگار کی طرف سے جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے اسے (خدا کے بندوں تک) پہنچا دو (اور دشمنوں کی مخالفت کی کچھ پروا نہ کرو) اگر تم نے ایسا نہ کیا، تو (پھر) خدا کا پیغام نہیں پہنچایا۔ (یعنی ادائے فرضِ رسالت میں کوتاہی کی) اور اللہ تمہیں انسانوں (کے شر) سے محفوظ رکھے گا۔ وہ اس گروہ پر (کامیابی کی) راہ نہیں کھولتا جس نے کفر کی راہ اختیار کی ہے

سورۂ اعراف کی مندرجہ صدر آیت (۷/۳۵) پر ایک بار پھر غور کیجئے۔ نوعِ انسانی سے ارشاد ہے کہ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ۔ اس میں مِنْكُمْ (تم میں سے) کا لفظ توجہ طلب ہے۔ یعنی اگرچہ ہدایت کا سرچشمہ انسانوں کی دنیا سے ماوراء ہے

رسول انسان ہی ہوتے تھے

لیکن یہ ہدایت جن رسولوں کے توسط سے ملے گی وہ انسان ہی ہوں گے انسانی جہالت کا تقاضا چونکہ توہم پرستی ہے اس لئے لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ جو شخص اللہ کی طرف سے رسول ہے، وہ ان جیسا ایک آدمی کیسے ہو سکتا ہے؛ اسے عالم بشریت سے الگ کچھ اور ہونا چاہیئے (وہ تو خیر عہد جاہلیت تھا۔ آج بھی توہم پرستی کا یہ عالم ہے کہ جن لوگوں میں "روحانیت" بھی باقی ہے انہیں انسانی دنیا سے کچھ الگ تھلگ تصور کیا جاتا ہے، اسی لئے قرآن کریم نے کئی ایک مقامات پر حضرات انبیاء کرامؑ کی بشریت کو کھلے اور واضح الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ کہیں اس انداز میں کہ لوگ، رسولوں کی بشریت پر تعجب کرتے تھے اور معترض ہوتے تھے۔ کہیں اس اسلوب سے کہ خود حضرات انبیاء کرامؑ اپنی بشریت کا اعلان فرماتے اور لوگوں کے دل پہ اس حقیقت کو نقش کرتے تھے۔ قصۂ حضرت نوحؑ کے ضمن میں فرمایا

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا (۱۱/۲۷ نیز ۲۳/۲۴)

اس پر قوم کے ان سرداروں نے جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی کہا کہ ہم تم میں اس کے سوا کوئی بات نہیں دیکھتے کہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی ہو۔

حضرت صالحؑ کی قوم نے بھی یہی کہا۔

مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ښ فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۲۶/۱۵۴)

تم تو ہمارے ہی جیسے ایک آدمی ہو (ہمیں تو تم میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی جس کی وجہ سے خدا نے تمہیں رسالت کے لئے منتخب کیا ہو) اگر تم (در حقیقت) سچے ہو تو کوئی نشانی لاؤ۔

یہی قوم حضرت شعیبؑ سے کہا۔

وَمَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَإِن نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكَاذِبِينَ (۲۶/۱۸۶)

اور تم تو ہمارے ہی جیسے ایک آدمی ہو اور ہم تمہیں جھوٹا ہی سمجھتے ہیں۔

جب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علیہما السلام) نے فرعون اور اس کی قوم کے سامنے دعوت کلیمی کو پیش کیا تو انہوں نے بھی یہی اعتراض کیا تھا۔

فَقَالُوا أَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُونَ (۲۳/۴۷)

تو وہ بولے کیا خوب! ہم اپنے ہی جیسے دو انسانوں پر ایمان لے آئیں۔ حالانکہ ان کی قوم ہماری اطاعت گذار اور تابع فرمان ہے۔

ہر رسول کے متعلق یہی اعتراض ہوتا تھا۔

ذٰلِكَ بِأَنَّهُ كَانَت تَّأْتِيهِمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَقَالُوا أَبَشَرٌ يَهْدُونَنَا فَكَفَرُوا
وَتَوَلَّوا وَّاسْتَغْنَى اللَّهُ وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَمِيدٌ (۶۴/۶)

بات یہ تھی کہ ان کے پاس کھلی کھلی نشانیوں کے ساتھ اُن کے رسول آتے تھے اور وہ کہدیا کرتے کہ کیا انسان ہماری رہنمائی کریں گے؟ چنانچہ وہ نافرمانی کرتے تھے اور دعوت حق سے اعراض برتتے تھے (بالآخر خدا کی دعوت ان سے مستغنی ہوگئی) اور اللہ تو ہمیشہ سے بے نیاز اور ستودہ صفات ہے۔

سورہ ابراہیم میں اس بیان کو ذرا تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔ قوم نوح اور عاد و ثمود کے تذکرہ کے بعد فرمایا۔

قَالَتْ رُسُلُهُمْ أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ....
وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ (۱۴/۱۰-۱۱)

ان کے رسولوں نے کہا "کیا تمہیں اللہ کے بارے میں شک ہے؟ وہ اللہ کہ آسمان و زمین کا بنانے والا ہے وہ تمہیں بلا رہا ہے کہ وہ تمہارے ... تم ... نتائج سے محفوظ رہنے کا سامان پیدا کر دے۔ اور ایک وقت مقررہ تک زندگی و کامرانی کی مہلتیں دے۔"

اس پر قوموں نے کہا کہ تم اس کے سوا کیا ہو کہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی ہو اور چاہتے ہو کہ جن معبودوں کی پکار باپ دادا الطاعت کرتے آئے ہیں۔ ان کی اطاعت سے ہمیں روک دو۔ اچھا اگر ایسا ہی ہے تو کوئی واضح دلیل پیش کرو۔

ان کے رسولوں نے جواب میں کہا، ہاں ہم اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ تمہاری ہی طرح کے آدمی ہیں لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے اپنے فضل و احسان کے لئے چن لیتا ہے۔ اور یہ بات ہمارے اختیار میں نہیں کہ تمہیں کوئی سند

لا دکھائیں۔ مگر یاں یہ کہ اللہ کے حکم سے ہو۔ اور اللہ ہی ہے جس پر ایمان رکھنے والوں کا بھروسہ ہے۔

خود نبی اکرم ؐ کے متعلق بھی یہی اعتراض تھا۔

وَقَالُوا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۝ (۲۵/۷)

اور (دیکھو!) لوگوں نے کہا۔ اس رسول کو کیا ہو گیا ہے؟ یہ تو (بالکل انسانوں کی طرح) کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ اس پر کوئی فرشتہ کیوں نہ اتار دیا گیا جو اس کے ساتھ ڈرانے والا ہوتا۔

اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ (۲۵/۲۰)

اور (اے پیغمبر اسلام!) ہم نے تجھ سے پہلے تمام رسول ایسے ہی بھیجے تھے جو کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں بھی چلتے پھرتے تھے۔

دوسری جگہ ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ۭ...... (۱۳/۳۸)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے تجھ سے پہلے بھی (بے شمار پیغمبر قوموں میں پیدا کئے اور (وہ تیری ہی طرح انسان تھے) ہم نے انہیں بیویاں بھی دی تھیں اور اولاد بھی۔

لوگوں کو تعجب تھا کہ ان ہی میں سے ایک آدمی پر کس طرح وحی نازل ہو سکتی ہے۔

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ..... (۱۰/۲)

کیا لوگوں کو اس بات پر اچنبا ہوا کہ ان ہی میں سے ایک آدمی پر ہم نے وحی بھیجی؟ (اس بات کی وحی کہ لوگوں کو (انکار و بدعملی کے نتائج سے) خبردار کر دے۔ اور ایمان والوں کو خوش خبری دیدے کہ پروردگار کے حضور ان کے لئے اچھا مقام ہے۔

جتنا زیادہ انہیں تعجب تھا۔ اتنی ہی زیادہ شدت و تکرار سے نبی اکرم ؐ اپنی بشریت کا اعلان فرماتے تھے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ (۱۸/۱۱۰ نیز ۴۱/۶)

(اے پیغمبر اسلام! صاف صاف) کہدے کہ میں تو اس کے سوا کچھ نہیں ہوں کہ تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہوں۔ البتہ اللہ نے مجھ پر وحی کی ہے کہ تمہارا الٰہ وہی ایک ہے اس کے سوا کوئی نہیں۔

تمام رسول مرد تھے پھر اس امر کی بھی تصریح فرما دی کہ تمام رسول مرد تھے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِي إِلَيْهِمْ فَسْئَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝ (۱۶/۴۳ نیز ۱۲/۱۰۹، ۲۱/۷)

اور (اے پیغمبر اسلام!) تجھ سے پہلے ہم نے جتنے رسولوں کو بھیجا، تو اسی طرح بھیجا کہ وہ مرد تھے۔ ان پر ہم وحی بھیجتے تھے۔ (ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آسمان کے فرشتے یا دیویاں اتر آئی ہوں) پس (اے منکرین حق!) اگر خود تمہیں (یہ بات) معلوم نہیں تو ان لوگوں سے دریافت کر لو جو (آسمانی کتابوں کی) سمجھ بوجھ رکھتے ہیں (یعنی یہودیوں اور عیسائیوں سے کہ رسول مرد ہوتے تھے عورتیں نہ تھیں)

ایسا کیوں ہوا؟ اللہ تعالیٰ اس پر قادر تھا کہ لوگوں کی آنکھوں کے سامنے آسمان سے نورانی فرشتے اتر آتے اور وحی کے الفاظ کو بستیوں، اور قریوں، امتوں اور جماعتوں میں نشر کر دیا کرتے لیکن پیغام رسانی کے اس مافوق الفطرت طریق سے انسانی رشد و ہدایت کا مقصد فوت ہو جاتا۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ انسانی اختیار و ارادہ، انسان کا سب سے بڑا جوہر اور اس کی قوتِ عقل و شعور اس کا بہت بڑا امتیاز ہے۔ اس قسم کے اسلوب پیغام رسانی سے انسان خوف و ہراس سے طوعاً و کرہاً ہدایت قبول کرتا۔ جس میں نہ تو اس کے اختیار و ارادہ کو دخل ہوتا نہ عقل و بصیرت کو درک۔ اور یوں انسان اور دیگر اشیائے کائنات میں، جو بلا شعور و اختیار لگے بندھے قوانین کے تابع چلی جا رہی ہیں کچھ فرق نہ رہتا۔ انسانی اختیار و ارادہ کی آزمائش ہی وہ فسان ہے جس پر اس کی شمشیرِ خودی کے جوہر کا دار و مدار ہے۔ رسولوں کا فوق البشر ہونا تو ایک طرف[1] اس مقصد کے پیشِ نظر مشیت کو تو یہ بھی منظور نہ تھا کہ جو فرشتہ پیغام لاتا ہے اسے بھی مرئی (visible) صورت میں لوگوں کے سامنے لایا جائے۔

وَقَالُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ..... (۶/۸)

اور انہوں نے کہا کہ اگر یہ شخص اپنے دعوے میں سچا ہے، تو کیوں اس پر فرشتہ نہیں اتر تا کہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔

اس سے اگلی آیت میں ہے کہ اگر بفرض محال ایسا کرنا ضروری ہوتا کہ وہ فرشتہ مرئی صورت میں سامنے آئے۔ تو بھی اللہ تعالیٰ عام انسانوں کی شکل میں بھیجتا تاکہ رشد و ہدایت مافوق الفطرت انداز سے ذہنِ انسانی پر مسلط نہ ہو جاتی۔

وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِم مَّا يَلْبِسُونَ ۝ (۶/۹)

اور اگر ہم کسی فرشتہ کو پیغمبر کرتے، تو اسے بھی انسان ہی بناتے (کیونکہ یہ قانون الٰہی کے خلاف ہے کہ فرشتے اپنی ملکوتی حقیقت میں انسانوں کے سامنے آئیں) اور جیسے کچھ شبہات یہ اب کر رہے ہیں، ویسے ہی شبہوں میں اس وقت بھی انہیں ڈال دیتے (یعنی یہ کہتے، یہ تو دیکھنے میں ہماری ہی طرح کا آدمی ہے فرشتہ نہیں ہے)

---

[1] معجزات سے کیا مقصود ہے اس کے لئے سلسلہ معارف القرآن کی ایک کڑی "معراج انسانیت" ص دیکھئے۔

دوسری وجہ منصبِ رسالت کے لیے انسانوں ہی کو کیوں منتخب کیا گیا۔ اس کی دوسری وجہ قرآن کریم نے یہ بیان فرمائی ہے کہ

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْۤا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰۤى اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ قُلْ لَّوْ كَانَ فِی الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ یَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّیْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَیْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۝ (۹۴-۹۵)

اور حقیقت یہ ہے کہ جب کبھی اللہ کی ہدایت (دنیا میں) ظاہر ہوئی تو صرف اسی بات نے لوگوں کو ایمان لانے سے روکا کہ متعجب ہو کر کہنے لگے کہ کیا اللہ نے (ہماری طرح کا) ایک آدمی پیغمبر بنا کر بھیجا ہے؟ (اے پیغمبر!) کہہ دے کہ اگر ایسا ہوا ہوتا کہ زمین میں (انسانوں کی جگہ) فرشتے بسے ہوتے، اور اطمینان سے چلتے پھرتے، تو ہم ضرور آسمان سے ایک فرشتہ پیغمبر بنا کر اتار دیتے۔

رسول کی حیثیت یعنی چونکہ دنیا میں انسان بستے ہیں اس لیے ان کے لیے رسول بھی ان ہی میں سے ہونے چاہئیں۔ اس سے فریضہ رسالت کے ایک اہم گوشے پر روشنی پڑتی ہے۔ یعنی رسول کے ذمے صرف پیغام پہنچا دینا ہی نہیں (جیسے چٹھی رساں کے ذمے چٹھی پہنچا دینا ہوتا ہے)، بلکہ وہ اس تعلیم خداوندی کو ایک عملی نظام معاشرہ کی صورت میں متشکل کر کے اس کے درخشندہ نتائج اور خوشگوار ثمرات کو وحی خداوندی کی صداقت کے لیے بطور دلیل پیش کرتا ہے، اور اس طرح لوگوں کو مشہود طریقے پر بتا دیتا ہے کہ یہ تعلیم ناممکن العمل نہیں ہے۔ تم نے بھی اسے اسی طرح کے نظام کی شکل میں آگے چلانا ہے۔ منصبِ رسالت کے مختلف گوشوں اور رسول کی متنوع حیثیتوں کا تفصیلی ذکر اپنے مقام پر آئے گا[۱]۔ اس مقام پر صرف اتنا بیان کرنا مقصود ہے کہ رسول کی حیثیت محض آلہ ابلاغ کی نہیں ہوتی کہ وہ (معاذ اللہ) ریڈیو پوسٹ کی طرح محطۂ نشر الصوت (Broadcasting Station) سے نشر شدہ پیغام کو فضا کی لہروں سے اخذ کر کے سامعین تک پہنچا دیتا ہے اور اس کے بعد لکڑی کا ایک ڈبہ رہ جاتا ہے۔ ایسا تصور منصبِ رسالت اور مقامِ نبوت سے انتہائی بے بصری کا ثبوت ہے۔

رسول سب سے پہلے خود اس پیغام پر ایمان لاتا ہے جو اس پر وحی کیا جاتا ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ..... (۲/۲۸۵)

اللہ کا رسول اس (کلام) پر ایمان رکھتا ہے جو اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر نازل ہوا ہے، اور جو لوگ (دعوت حق پر) ایمان لائے ہیں، وہ بھی اس پر ایمان رکھتے ہیں۔

سب سے پہلا عبد مسلم اور اس طرح وہ سب سے پہلا عبد مسلم بنتا ہے۔ یعنی اس جماعت کا پہلا رکن جو اس کے بعد وجود میں آنے والی ہوتی ہے۔ اور جس نے قوانین خداوندی پر عمل کر کے دکھانا ہوتا ہے۔

[۱] دیکھئے "معراج انسانیت" باب منصب رسالت۔

قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَآءَنِیَ الْبَیِّنٰتُ مِنْ رَّبِّیْ ؗ وَ اُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (۴۰/۶۶)

(اے پیغمبرِ اسلام!) تو کہدے کہ مجھے تو (میرے پروردگار کی طرف سے) منع کر دیا گیا ہے کہ میں خدا کے سوا ان ہستیوں کے اقتدار کی اطاعت اختیار کروں جنہیں تم پکارتے ہو (خصوصاً) جبکہ میرے پروردگار کی طرف سے میرے پاس کھلی کھلی نشانیاں بھی آچکی ہیں اور مجھے حکم (بھی) دیا جا چکا ہے کہ میں تمام جہانوں کے پروردگار ہی کے سامنے گردنِ اطاعت خم کر دوں۔

رسول اور اتباعِ وحی

پھر وہ سب سے پہلے خود اس وحی کی اتباع کرتا ہے۔

وَ اتَّبِعْ مَا یُوْحٰۤی اِلَیْكَ وَ اصْبِرْ حَتّٰی یَحْكُمَ اللّٰهُ ۚۖ وَ هُوَ خَیْرُ الْحٰكِمِیْنَ ۝ (۱۰/۱۰۹)

(اے پیغمبر!) جو کچھ تم پر وحی کی جاتی ہے اس کی اتباع کرو، اور اس راہ میں جمے رہو۔ یہاں تک کہ اللہ تمہارے اور تمہارے مخالفین کے درمیان فیصلہ کر دے اور وہ فیصلہ کرنے والوں میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے!

اور اس کے بعد دوسرے لوگوں (یعنی اپنی جماعت) سے اپنی اطاعت کراتا ہے۔

وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ...... (۴/۶۴)

اور (اے پیغمبر! ان لوگوں کو جو تمہاری اطاعت کا حکم دیا گیا ہے) تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جو ان ہی کے ساتھ ہوئی ہو۔) ہم نے جس کسی کو بھی منصبِ رسالت دے کر دنیا میں کھڑا کیا، تو اسی لئے کیا، کہ ہمارے قانون کے مطابق اس کی اطاعت کی جائے۔

رسول کی اطاعت

اس انداز کی اطاعت کہ اس کے سامنے سرہی نہ جھکیں بلکہ اس کے فیصلوں کے آگے اس جماعت کے قلب و نگاہ کے تمام گوشے جھکے ہوئے ہوں۔

فَلَا وَ رَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَكِّمُوْكَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَ یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ۝ (۴/۶۵)

پس (دیکھو) تمہارا پروردگار اس بات پر شاہد ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے، جب تک ایسا نہ ہو کہ یہ اپنے تمام جھگڑوں، قضیوں میں تمہیں حاکم بنائیں۔ اور پھر (صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ) ان کے دلوں کی حالت بھی ایسی ہو جائے کہ جو کچھ تم فیصلہ کر دو اس کے خلاف کسی طرح کی دل گرفتگی محسوس نہ کریں، اور وہ جو کسی بات کو پوری طرح مان لینا ہوتا ہے اسی طرح ٹھیک ٹھیک مان لیں۔

اسی اطاعت میں خدا کی اطاعت پوشیدہ ہوتی ہے۔

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَ مَنْ تَوَلّٰی فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ حَفِیْظًا ۝ (۴/۸۰)

جس کسی نے اللہ کے رسول کی اطاعت کی، تو اس نے فی الحقیقت اللہ کی اطاعت کی، اور جس کسی نے روگردانی کی، تو (اے پیغمبر!) ہم نے تمہیں ان پر کچھ پاسبان بنا کر نہیں بھیجا ہے (کہ ان کے اعمال کے لئے تم جوابدہ ہو، اور جبراً ان سے اپنی اطاعت کراؤ)

منصبِ رسالت میں یہ پہلو اپنی اہمیت کے اعتبار سے ایک مستقل باب کا محتاج ہے (اور یہ باب اپنے مقام پر آئے گا)۔ اگر دین انفرادی شے ہوتا۔ یعنی اس سے مقصود یہ ہوتا کہ ہر شخص اپنی اپنی جگہ، کوئی اس گوشے میں کوئی اس ناویے میں، کوئی کسی پہاڑ کی چوٹی پر، کوئی کسی دریا کے کنارے۔ اپنی اپنی انفرادی "نجات" کی فکر میں اللہ کے دھیان اور پوجا پاٹ میں مستغرق رہے تو اس صورت میں رسول کی اطاعت کی ضرورت نہ تھی۔ جب رسول، اللہ کے احکام لوگوں تک پہنچا دیتا تو لوگ اپنے اپنے طور پر ان احکام کی تعمیل کرنے لگ جاتے۔ لیکن اس طرز "مذہبیت" کو قرآن کریم نے رہبانیت قرار دیا اور ذہن انسانی کی اختراع بتایا ہے۔ (دیکھئے ۲۷/۲۷۔ جس کی تفصیل اپنی جگہ آئے گی) جیسا کہ ہم وحی کے عنوان میں اجمالاً بتا چکے ہیں، وحی و رسالت

رسول کی اطاعت کیوں؟

کی ضرورت اس لئے ہے کہ انسانوں کو مدنیت کی زندگی بسر کرنا ہے۔ انہیں باہمی مل جل کر رہنا ہے۔ ایسی طرز زندگی کے لئے ایک نظامِ اطاعت کی ضرورت ہے جسے عام اصطلاح میں حکومت اور قرآن کی رو سے دین کہا جاتا ہے۔ دنیاوی نظامِ حکومت میں (خواہ اس کا اصطلاحی نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے) قانون سازی کا اختیار کسی ایک انسان یا انسانوں کی جماعت کو ہوتا ہے اور باقی انسان ان کے وضع کردہ قوانین کی اطاعت کرتے ہیں۔ اس کے برعکس جس نظامِ حکومت کے علمبردار حضرات انبیاء کرامؑ ہوتے ہیں اس میں اصولی قوانین کے وضع کرنے کا اختیار کسی انسان کو نہیں ہوتا۔ اس میں اصولی ضابطۂ قوانین خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ رسول، اپنی جماعت کے مشوروں کے ساتھ، ان اصولی قوانین کی روشنی میں، اپنے زمانے کے حالات کے مطابق، جزئی احکام مرتب کرتا ہے اور ان قوانین کو، بطور نظامِ حکومت، نافذ کرتا ہے۔ اس نظام کو، نظامِ حکومتِ خداوندی کہا جاتا ہے یعنی وہ نظام جس میں قانون کی اصل، خدائی وحی ہوتی ہے۔ رسول اس نظامِ حکومت کا مرکزِ اولین ہوتا ہے۔ اسی لئے اس کی اطاعت (جو درحقیقت قانون خداوندی کی اطاعت ہوتی ہے) ضروری ہوتی ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَیْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝ (۵۷/۲۵)

(دیکھو) ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلے کھلے دلائل دے کر بھیجا۔ اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب (ضابطۂ قوانین) اور نظامِ عدل کو نازل کیا۔ تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔ اور ہم نے (سرکشوں کی سرکوبی کے لئے) لوہے کو پیدا کیا ہے۔ جس میں بڑی طاقت اور لوگوں کے لئے بہت سی منفعتیں ہیں۔ اور اس لئے کہ خدا کو معلوم ہو جائے

کہ کون لوگ خدا (کے دین) کی اور اس کے رسولوں کی (خدا کو) دیکھے بغیر، مدد کرتے ہیں (اگرچہ اُسے انسانوں کی امداد کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ) بلاشبہ اللہ خود بڑی طاقت کا مالک اور غالب ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ دنیا کا کوئی نظام قائم نہیں رہ سکتا تا وقتیکہ اس کے مرکز (central authority) کی اطاعت نہ کی جائے اس لئے حکومت خداوندی کے نظام میں رسول کی اطاعت نہایت ضروری ہے۔ لیکن یہ اطاعت رسول کی ذات کی اطاعت نہیں ہوتی۔ ذاتی اطاعت کا تو رسول کو اختیار ہی نہیں ہوتا۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ (۳/۷۹)

کسی انسان کو یہ بات سزاوار نہیں کہ اللہ اسے (انسانوں کی ہدایت کے لئے) کتاب اور حکومت، اور نبوت عطا فرمائے، اور پھر اس کا شیوہ یہ ہو کہ لوگوں سے کہے، خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ (یعنی خدا کے احکام کی جگہ میرے حکموں کی اطاعت کرو) بلکہ چاہیئے کہ ربانی انسان بنو، اس لئے کہ تم کتاب اللہ کی تعلیم دیتے رہتے ہو، اور اس لئے کہ تم اس کے پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہتے ہو۔

رسول اس ضابطہ قوانین کی اطاعت کراتا ہے جو اسے منجانب اللہ عطا ہوتا ہے۔ اس لئے رسول کی اطاعت درحقیقت خدا کی اطاعت[1] ہوتی ہے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۝ (۴/۸۰)

جس کسی نے اللہ کے رسول کی اطاعت کی، تو اس نے فی الحقیقت اللہ کی اطاعت کی، اور جس کسی نے روگردانی کی، تو (اے پیغمبر!) ہم نے تمہیں ان پر کچھ پاسبان بنا کر نہیں بھیجا ہے (کہ ان کے اعمال کے لئے تم جوابدہ ہو اور جبراً ان سے اطاعت کراؤ)

اس مقصد کے لئے رسول ایک معاشرہ (social order) کی تشکیل کرتا ہے جس میں افراد معاشرہ کی مناسب تعلیم و تربیت سے ان کی مضمر صلاحیتیں نشوونما پا کر تکمیل حاصل کرتی ہیں اور جب ان صلاحیتوں میں صحیح توازن و اعتدال پیدا کر دیا جاتا ہے تو اس سے وہ کشمکش بھی ختم ہو جاتی ہے جو انسان کے اپنے اندر مختلف اور متضاد صلاحیتوں میں عدم توازن کی بنا پر پیدا ہوتی ہے اور وہ کشمکش بھی جو مختلف انسانوں میں باہمی مفاد کے تصادم سے رونما ہوتی ہے رسول کا فریضہ اس قسم کی تعلیم و تربیت سے بہترین افراد معاشرہ کا پیدا کرنا ہوتا ہے۔

---

[1] ان تمام امور کے متعلق ابواب اپنی اپنی جگہ الگ آئیں گے۔ اس مقام پر صرف اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ
وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝ (۲/۱۵۱)

جس طرح یہ بات ہوئی کہ ہم نے تم میں سے ایک شخص کو اپنی رسالت کے لئے چن لیا جو تمہارے سامنے ہمارے قوانین پیش کرتا ہے تمہاری مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کا انتظام کرتا ہے۔ تمہیں کتاب و حکمت[۵] کی تعلیم دیتا ہے اور وہ باتیں سکھلاتا ہے جن سے تم یکسر ناآشنا تھے۔

چونکہ تکمیلِ شرفِ انسانیت کا دارومدار اسی نظام پر ہے اس لئے اسے اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص نوازش کہا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان کی دل کی آنکھیں کھلی ہوں تو اسے نظر آجائے کہ نوعِ انسانی پر اس سے بڑی نوازش اور کیا ہوگی؟

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ
وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (۳/۱۶۴)

بلاشبہ، یہ اللہ کا مومنوں پر بڑا ہی احسان تھا کہ اس نے ایک رسول ان میں بھیج دیا جو ان ہی میں سے ہے وہ اللہ کے قانون انکے سامنے پیش کرتا ہے۔ ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کا انتظام کرتا ہے۔ اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے (اس نے اس طرح ہدایت کی راہ ان پر کھول دی) حالانکہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں مبتلا تھے!

یہی وہ نظام ہے جس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان کو کسی قسم کا خوف و حزن نہیں رہتا (نہ اس زندگی میں نہ اس کے بعد) اور (جیسا کہ سابقہ عنوان میں بتایا جا چکا ہے) یہی انسان کا منتہائے مقصود ہے۔

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (۶/۴۸)

اور (ہمارا قانون تو یہ ہے کہ) ہم رسولوں کو نہیں بھیجتے۔ مگر اس لئے کہ (ایمان و عمل کی برکتوں کی) خوش خبری سنائیں۔ اور (انکار و بدعملی کے نتائج سے) ڈرائیں۔ پھر جو کوئی ایمان لایا، اور اس نے اپنی صلاحیتوں کی نشوونما کر لی تو اس کے لئے نہ تو کسی طرح کا اندیشہ ہوگا نہ کسی طرح کی غمگینی۔

تبشیر و تنذیر رسولوں کی تبشیر و تنذیر سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگوں کو ضابطہ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے درخشندہ نتائج کا مژدہ حیات بخش سنائیں (بلکہ ایسے نتائج کو عملاً سامنے لے آئیں) اور اس مسلک زندگی سے روگردانی کرنے والوں کو ان کی غلط روش کے ہلاکت انگیز عواقب سے آگاہ کریں تاکہ وہ صحیح رستہ اختیار کر لیں۔

---

[۵] کتاب اور حکمت سے کیا مفہوم ہے؟ یہ اپنی جگہ آئے گا یہاں صرف اس قدر سمجھ لینا کافی ہوگا کہ کتاب سے مراد قانونِ خداوندی ہے اور حکمت سے مفہوم وہ مصالح جن پر اس قانون کی بنا رکھی گئی اور وہ نتائج جو اس قانون کا لازمی ثمر ہیں کتاب و حکمت دونوں منزل من اللہ ہیں۔

چونکہ حضرات انبیاء کرامؑ کی دور رس نگاہیں وحی کی روشنی میں ان نتائج و عواقب کو واضح طور پر اپنے سامنے دیکھتی ہیں۔ اس لئے راہ راست سے منہ موڑنے والوں کی بربادی اور تباہی کا تصور ان کے قلب حساس کو اندوہناک اور درد آگیں کر دیتا ہے اور وہ ایک طبیب مشفق کی طرح اس فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح مریض کی جان بچ جائے۔ نبی اکرمؐ کی اسی قلبی کیفیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝ (۱۸/۶)

(اے پیغمبرؐ!) تیری حالت تو ایسی ہو رہی ہے کہ جب لوگ ایسی (واضح) بات بھی نہ مانیں، تو عجب نہیں ان کی ہدایت کے پیچھے تو مارے افسوس کے اپنی جان ہلاکت میں ڈال دے۔

دوسری جگہ ہے۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ (۲۶/۳)

شاید (اے پیغمبرؐ!) تم تو اس غم میں کہ وہ لوگ مومن کیوں نہیں بن جاتے اپنی جان ہی کو ہلاکت میں ڈال دو گے۔

لیکن چونکہ ہدایت اس کو ملتی ہے جو اپنے دل کے ارادے سے اسے حاصل کرنا چاہے اس لئے حضورؐ سے کہا گیا کہ ان لوگوں کے دلوں کو بدل دینا آپ کے ذمے نہیں۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ...... (۲/۲۷۲)

(اے پیغمبرؐ!) تم پر کچھ اس بات کی ذمہ داری نہیں کہ لوگ ہدایت قبول ہی کر لیں (تمہارا کام صرف سمجھا دینا ہے ہدایت تو خدا کے قانون کے مطابق اسے ملتی ہے جو ہدایت لینا چاہے

آپ کے ذمے تو فقط ہدایت کا پہنچا دینا ہے۔

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ۭ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ۭ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ (۲۴/۵۴) نیز (۱۶/۳۵)

(اے پیغمبرؐ!) تم کہدو کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت[1] کرو! پھر اگر وہ لوگ اس سے روگردانی کریں تو (انہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ) رسول کے ذمے صرف اتنا ہی ہے جتنا اس پر بار ڈالا گیا ہے (یعنی انسانوں تک احکام الٰہی کو پہنچا دینا) اور تمہارے ذمے وہ سب کچھ ہے جس کا تم پر بار ڈالا گیا ہے۔ (یعنی ان احکام پر عمل پیرا ہونا۔ خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرنا) اگر تم رسول کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پا جاؤ گے۔ اور معلوم رہے کہ رسول کے ذمہ تو صرف احکام الٰہی کو

---

[1] اللہ کی اطاعت اور اس کے رسول کی اطاعت، دو مستقل اور الگ الگ اطاعتیں نہیں ہیں۔ بلکہ اس سے مراد قانون خداوندی کی اطاعت بذریعہ اس مرکز نظام حکومت کے ہے جو اس قانون کو نافذ کرتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی معراج انسانیت میں ملے گی۔

انسانوں تک، صاف صاف طور سے پہنچا دینا ہے راہ ربیں)

ایک عظیم المرتبت حقیقت

سلسلۂ رشد و ہدایت کے ضمن میں قرآن کریم نے ایک ایسی حقیقت کو پیش کیا ہے جسے اگر صحیح طور پر سمجھ لیا جائے تو دنیائے مذاہب سے بحث و جدل اور اختلاف و نزاع کا خاتمہ ہو جائے اور مذہب کے نام پر جس قدر خونریزیاں اور فسادانگیزیاں ہو رہی ہیں سب صلاح و فلاح میں بدل جائیں۔ موجودہ مذاہب کی دنیا پر غور کیجئے۔ ان میں سے ہر ایک ایک دوسرے کا رقیب اور ابدی دشمن دکھائی دیتا ہے اور چونکہ ہر مذہب اپنے آپ کو آسمانی تعلیم کا حامل قرار دیتا ہے۔ لہذا مذہب کی موجودہ عداوت و رقابت کے پیش نظر انسان لامحالہ اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ ان مذاہب کے بانی بھی ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ متشدد طبقہ کے لوگ اس خیال کا اظہار علانیہ کرتے رہتے ہیں لیکن متوسط الخیال لوگ چونکہ اس عقیدہ کو اختلاف و نزاع کا موجب سمجھتے ہیں اس لئے وہ ایک دوسری راہ اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مذاہب سب اپنی اپنی جگہ سچے ہیں۔ لیکن اہل مذاہب نے باہمی ضد اور تعصب سے اختلاف و نزاع کی صورتیں پیدا کر رکھی ہیں۔ لیکن جہاں پہلا عقیدہ غلط ہے یہ دوسرا عقیدہ بھی صحیح نہیں۔ حقیقت ان سے الگ ہے۔ پہلے عقیدہ کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ باقی رہا دوسرا عقیدہ۔ سو یہ ظاہر ہے کہ مذاہب چھپے ہوئے تو ہیں نہیں کہ کسی کو معلوم نہ ہو سکے کہ ان کی اصلی تعلیم کیا ہے اور ان کے پیرو اسے کس رنگ میں پیش کر رہے ہیں۔ ان کے پیرو کے اعمال غلط ہوں لیکن ان مذاہب کی تعلیم ان کتابوں کے اندر ہے اور یہ کتابیں ہر جگہ مل سکتی ہیں۔ انہیں پڑھ کر دیکھ لیجئے۔ ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہیں۔ لہذا باہمی رواداری اور حسن سلوک یا جذبۂ مرعوبیت کی بنا پر یہ کہہ دینا کہ تمام مذاہب یکساں طور پر سچے ہیں لیکن ان کے ماننے والے اپنی تعلیم کو غلط انداز میں پیش کر رہے ہیں۔ ایک کھلی ہوئی حقیقت سے چشم پوشی بلکہ دوسروں کو فریب دہی ہے۔ اگر سب مذاہب (جس شکل میں وہ آج موجود ہیں) خدا کی طرف سے ہیں اور سب یکساں اور سچے ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ہی خدا نے مختلف مذاہب کو دنیا میں بھیج کر اس قدر تشتت و انتشار۔ افتراق و اختلاف اور جنگ و جدل کی راہیں کیوں کھول دیں؟ انسانوں کے باہمی اختلافات کے لئے بے شمار اسباب و علل دنیا میں موجود رہتے ہیں اور مذہب کا اولین فریضہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ان اختلافات کو مٹا کر انسانوں میں یگانگت اور وحدت پیدا کرے۔ لیکن جب (تمام سچے اور یکساں) مذاہب باہمی اختلاف و نزاع کا سب سے بڑا ذریعہ بن جائیں تو اس کی علت سمجھ میں نہیں آسکتی۔

کیا سب مذاہب سچے ہیں

بعض لوگوں نے اس الجھن سے گھبرا کر اور اس حقیقت کو محسوس کر کے کہ مختلف مذاہب کی کتابوں میں اختلاف موجود ہے امن و سلامتی کی یہ راہ نکالی کہ ان مذاہب کی کتابوں سے "اچھی اچھی باتیں" ایک جگہ جمع کر کے اس "مجموعۂ حسنات" کو انسانوں کا مشترکہ مذہب قرار دیا جائے چنانچہ یہی وہ جذبہ ہے جو مختلف زمانوں میں مختلف انقلاب اور شکل کے سامنے آتا رہا ہے۔ کبھی اکبر کے دین الٰہی کی شکل میں، کبھی بہمو سماج

کی صورتیں یا شکلیں مختلف ہوں۔ لیکن روح ہر جگہ وہی کار فرما ہے۔ ظاہر ہے کہ اس جذبہ کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ دنیا میں جس قدر مذہبی کتابیں ہیں ان میں اچھی اچھی باتیں بھی ہیں اور بری بھی، اچھی اچھی باتوں کو ایک جگہ جمع کر کے بُری باتوں کو چھوڑ دیا جائے۔ اس عقیدہ کا مطلب یہ ہوا کہ گویا آج آسمان کے نیچے کوئی مذہبی کتاب ایسی نہیں جسے خالصتہً من جانب اللہ قرار دے کر اس کی تعلیم کو مذہبی نصاب بنایا جا سکے۔ یعنی ایک طرف تو ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ انسانوں کی رشد و ہدایت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لیا ہے؛ اس نے ذریتِ آدم سے کہہ دیا تھا کہ جو ہدایت اس کی طرف سے آئے اس کی پیروی کرنے سے نجات و سعادت حاصل ہوگی۔ اور دوسری طرف عملاً یہ صورت ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ نے اس کا کوئی انتظام ہی نہیں کیا کہ انسانوں کی ہدایت کے لئے ان کے اندر کوئی ایسی کتاب موجود ہو جسے بطور ضابطۂ زندگی اختیار کیا جا سکے۔ اور اب بیچارے انسان کو مجبوراً یہ راہ اختیار کرنی پڑی کہ جہاں جہاں اسے اچھی باتیں ملیں انہیں اکٹھا کر کے اپنے لئے ایک نصابِ زندگی تجویز کرے۔ پھر "اچھی باتوں" کا معیار کیا ہے؟ ذہنِ انسانی کی میزان۔ اور ذہنِ انسانی کی جو کیفیت ہے اسے ہم وحی کے عنوان میں دیکھ چکے ہیں۔

اور اگر آپ کہیں کہ نہیں نیکی اور بدی کا معیار ذہنِ انسانی نہیں بلکہ ان مذاہب کی مقدس کتابیں ہیں۔ تو اس سے یہ خلفشار اور بھی بڑھ جائے گا۔ موجودہ تورات کو صحیفۂ آسمانی ماننے والوں کے نزدیک دانت کے بدلے دانت اور آنکھ کے بدلے آنکھ عین نیکی ہے۔ اس کے برعکس انجیل کو تعلیمِ خداوندی سمجھنے والوں کے نزدیک ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال سامنے کر دینا نیکی

> تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت۔ لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے۔ اور اگر تجھ پر نالش کر کے تیرا کرتہ لینا چاہے تو چوغہ بھی اسے لے لینے دے۔ اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لے جائے اس کے ساتھ دو کوس چلا جا۔
>
> (متی ۵ : ۳۸ — ۴۱)

اس سے آگے بڑھئے لکھا ہے۔

> تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ اپنے پڑوسی سے محبت رکھ اور اپنے دشمن سے عداوت۔ لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اور اپنے ستانے والوں کے لئے دعا مانگو۔ تاکہ تم اپنے باپ کے جو آسمان پر ہے بیٹے ٹھہرو۔ کیونکہ وہ اپنے سورج کو بدوں اور نیکوں دونوں پر چمکاتا ہے اور راست بازوں اور ناراستوں دونوں پر مینہ برساتا ہے۔
>
> متی ۵ : ۴۴ — ۴۵

---

[1] اور ہندوستان میں تحریکِ آزادی کے ضمن میں سیاسی مقصد کے لئے۔

"تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا" تورات میں۔ اسی تورات میں جو خود بائبل کا حصہ ہے یہاں یوں ہی ایک مثال پیش کردی گئی ہے ورنہ اگر آپ مختلف مذاہب کی مزعومہ آسمانی کتابوں کا مطالعہ کریں تو آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ ان کی تعلیم میں کس قدر اصولی اختلافات ہیں۔ اور یہ اس لئے کہ (قرآن کریم کے سوا) ان میں کوئی کتاب ایسی نہیں جس کے متعلق حتمی اور یقینی طور پر کہا جا سکے کہ وہ من وعن وہی ہے جو اس کتاب لانے والے نے اپنے متبعین کو دی تھی۔ ان کتابوں کی تاریخی حیثیت کیا ہے اور ان میں کس قسم کی تعلیم پائی جاتی ہے۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے جس کے متعلق معراجِ انسانیت کے پہلے باب میں تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ اس وقت صرف اس چیز کو سامنے رکھئے کہ ان کتابوں میں ایک دوسرے سے ایسی متضاد و متباین تعلیم پائی جاتی ہے جس میں باہمی تطابق و توافق کی کوئی راہ نہیں نکل سکتی۔ لہذا یہ نظریہ بنیادی طور پر غلط ہے کہ ان مختلف مذاہب کی کتابوں کی تعلیم کو "نیکی اور بدی کا معیار قرار دیا جا" اس صورت میں تو ایک ہی عمل ایک کتاب کے مطابق نیک اور دوسری کے مطابق بد قرار پا جائے گا۔ حالانکہ ہم سابقہ عنوان میں دیکھ چکے ہیں کہ حقیقت ایک ہے اور جہاں جہاں یہ بے نقاب ہوئی ہے ایک ہی صورت میں ہوئی ہے۔

صحیح راہ عمل

آپ نے غور کیا ہوگا کہ اس مسئلہ کے حل کے لئے ذہن انسانی نے جس قدر راہیں تلاش کی ہیں ان میں سے کوئی راہ بھی تسلی بخش نہیں۔ اب دیکھئے کہ قرآن کریم اس کے متعلق کیا کہتا ہے۔ اس بحث کا صحیح مقام تو "اسلام" کا عنوان ہے۔ لیکن چونکہ وہ باب بہت دیر میں سامنے آئے گا۔ اس لئے اس مقام پر اطناب وتفصیل سے قطع نظر صرف اجمالی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ

(۱) جس وقت سے انسانوں کو آسمانی روشنی کی ضرورت لاحق ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے سلسلۂ رشد وہدایت کو برابر جاری رکھا۔ اور ہر قوم میں اپنے رسول بھیجے۔

إِنَّا أَرْسَلْنَٰكَ بِٱلْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۚ وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ ۝

(۳۵/۲۴ نیز ۱۶/۳۶ ؛ ۱۰/۴۷)

(اے پیغمبر!) ہم نے تمہیں سچائی کے ساتھ (ایمان وعمل کی برکتوں کی) خوش خبری سنانے والا اور (انکار وبدعملی کے نتائج سے) ڈرانے والا بنا کر بھیجا۔) تم کوئی انوکھے نبی بن کر نہیں آئے ہو) ہر ہر قوم میں کوئی نہ کوئی (انکار وبدعملی کے نتائج سے) ڈرانے والا گزر چکا ہے۔

یہ سلسلہ متواتر جاری رہا۔

ثُمَّ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ۖ كُلَّ مَا جَاءَ أُمَّةً رَّسُولُهَا كَذَّبُوهُ ۚ فَأَتْبَعْنَا بَعْضَهُم بَعْضًا وَجَعَلْنَٰهُمْ أَحَادِيثَ ۚ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُونَ ۝
(۲۳/۴۴)

پھر ہم نے لگاتار یکے بعد دیگرے اپنے رسول بھیجے۔ لیکن جب کبھی کسی قوم میں اس کا رسول ظاہر ہوا تو وہ جھٹلانے پر آمادہ
ہو گئی۔ پس ہم بھی ایک کے بعد ایک کر کے انہیں ہلاک کرتے گئے، اور ان کی ہستیاں افسانے بن گئیں سو ان کے لئے
محرومی و نامرادی ہے جو قانونِ خداوندی پر ایمان نہیں رکھتے۔

ان حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے ہر زمانہ اور ہر ملک میں۔ مختلف اقوام و ملل تک اللہ کے پیغامات پہنچتے رہے۔

(۲) ان پیغامات خداوندی کا سرچشمہ چونکہ ایک ہی تھا اس لئے ان کی اصل و بنیاد ہمیشہ ایک رہی۔ یعنی خدائے واحد کے قوانین کی اطاعت۔ اس کے سوا کسی اور کی محکومیت کو جائز نہ سمجھنا اور یوں ایک خدا کی حاکمیت تسلیم کر کے تمام مخلوق کا ملتِ واحدہ بن کر رہنا۔ تعلیم ربانی کا یہ نقطۂ ماسکہ شروع سے اخیر تک ایک ہی رہا۔

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ ۚ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ ۚ اللَّهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَن يُنِيبُ ۝ (۴۲/۱۳)

(اور دیکھو۔ اے لوگو!) خدا نے تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا۔ اور جس کو ہم نے (اے پیغمبر اسلام!) تمہارے پاس وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے۔ اور جس کا ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا۔ اور (ان سے اور اُن کی قوموں سے یہ کہہ دیا گیا تھا کہ) اسی دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ اندازی نہ کرنا۔ (حیرت ہے کہ اگرچہ یہ تعلیم کوئی انوکھی بات نہیں۔ مگر) مشرکین کو وہ بات بڑی گراں گزر رہی ہے جس کی طرف تم انہیں بلا رہے ہو (حیرت ہے کہ وہ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ فلاں کو نبوت کیوں دی گئی اور فلاں کو کیوں نہیں؟ خدا انسانوں کی مرضی کے تابع نہیں ہے) خدا جسے چاہتا ہے اپنی رسالت کے لئے منتخب کر لیتا ہے اور جو شخص خدا کی طرف رجوع کرتا ہے اسے اپنی طرف کا راستہ دکھا دیتا ہے۔

یہ تو تھی دین کی اصل و اساس۔ لیکن اس اصل کو بروئے کار لانے کے لئے عملی نظام کی تشکیل (یعنی مناہج و مناسک) میں مقتضیات زمانہ کے اعتبار سے جزئیات میں رد و بدل ہوتا رہا۔

(۳) یہ پیغامات آتے۔ کچھ عرصہ تک اپنی اصلی صورت پر قائم رہتے اس کے بعد یا تو آفات ارضی و سماوی کے ہاتھوں ضائع ہو جاتے۔ یا خود انسانوں کی دستبرد سے ان میں تحریف و الحاق ہو جاتا۔ یا انہیں فراموش کر دیا جاتا لہٰذا کچھ وقت کے بعد ان پیغامات کی پھر سے تجدید ہو جاتی۔ ان ہی جیسے پیغامات (آیات اللہ) کا پھر سے نزول ہو جاتا اس کے ساتھ ہی ایک اور حقیقت بھی تھی۔ انسانیت خود اپنے ارتقائی منازل طے کر رہی تھی۔ اس کے مقتضیات و داعیات میں بھی اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس لئے ہر زمانہ کی ضروریات کے مطابق نظام خداوندی کے تشکیلی عناصر میں بھی اضافہ

ہوتا رہا یعنی ہر رسول کی وساطت سے کچھ تو سابقہ رسول کے فراموش کردہ یا ضائع شدہ پیغام کی تجدید ہو جاتی اور جزئیات میں کچھ تغیر و تبدل بھی ہو جاتا۔ (لیکن اصل و اساس ہمیشہ ایک رہتی) لیکن یہ تغیر و تبدل ہمیشہ عروج کی طرف لیجاتا۔ ہبوط و تنزل کی طرف نہ جاتا۔ اس لئے ہر نئے رسول کے وقت جہاں سابقہ رسول کے منجانب اللہ ہونے پر ایمان کا حکم دیا جاتا وہیں اس نئے رسول کا اتباع اور اس کی اطاعت لازم قرار دی جاتی۔ سورۂ بقرہ کی اس آیت جلیلہ میں اسی اہم حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ۗ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۲ : ۱۰۶)

(ہمارا قانون یہ رہا ہے کہ) ہم اپنے احکام میں سے جو کچھ منسوخ کر دیتے ہیں یا فراموش ہو جانے دیتے ہیں تو اس کی جگہ اس سے بہتر یا اس جیسا حکم نازل کر دیتے ہیں۔ (اے پیغمبر!) کیا تمہیں معلوم نہیں (ضرور معلوم ہے) کہ اللہ ہر بات پر قادر ہے؟ (تو اس کے لئے ایک حکم کی جگہ اس جیسا یا اس سے بھی بہتر حکم دے دینا کیا مشکل ہے)

چنانچہ قرآن کریم میں کتب سابقہ کی تحریف و الحاق کا ذکر متعدد مقامات پر موجود ہے۔ آج دنیا میں (اسلام کے سوائے) کوئی مذہب ایسا نہیں جو بدلائل صحیحہ اس دعوے کو ثابت کر سکے کہ جس کتاب کو اس کے ہاں صحیفۂ آسمانی سمجھا جاتا ہے، وہ حرفاً حرفاً وہی ہے جو اس کے "بانی" نے انہیں دی تھی۔ یہ ایک تاریخی بحث ہے جس میں معتقدات کو کچھ دخل نہیں۔ اس لئے ہمارا یہ دعویٰ بھی تاریخی شواہد پر مبنی ہے اور اس کی سند میں خود اہل مذاہب کے اعترافات موجود ہیں (تفصیل ان امور کی باب ظہر الفساد۔ کتاب معراج انسانیت میں ملے گی)

(۸) یہ سلسلۂ رشد و ہدایت یونہی جاری رہا تا آنکہ دنیا اپنے عہد طفولیت سے نکل کر سن رشد و بلوغ تک پہنچ گئی۔ اب مشیت ایزدی کے اندازے کے مطابق وہ وقت آ گیا کہ ان تمام ازلی حقائق کو جو اس سے پیشتر حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے وقتاً فوقتاً نوع انسانی کی طرف بھیجے گئے تھے اور جو یا تو بالکل ضائع ہو چکے تھے۔ یا ان میں تحریف و الحاق ہو چکا تھا۔ ان کی اپنی اصل شکل میں ایک جگہ جمع کیا جائے۔ پھر ان تمام احکامات کو جو وقتی طور پر آئے تھے ایسے احکامات سے بدل دیا جائے جو اصولی طور پر قیامت تک کے لئے انسانی داعیات و مقتضیات کو پورا کر سکیں۔ ان تمام حقائق کو یکجا مدوّن کر کے اس مجموعہ کو قیامت تک کے لئے محفوظ کر دیا جائے کہ نہ تو یہ آفات ارضی و سماوی کے ہاتھوں ضائع ہونے پائے اور نہ اس میں انسانی دستبرد کچھ تصرف کر سکے۔ اس مجموعہ کا نام قرآن ہے۔ چنانچہ ضابطۂ خداوندی کے اس آخری اور مکمل ایڈیشن کے بعد حکم یہ دیا گیا کہ اب اطاعت اس کی اور صرف اس کی لازم ہے۔ اس کے باہر کوئی قانون نافذ العمل نہیں۔ اب دین ہے تو یہی اور اطاعت ہے تو اسی کی۔ یہ اس خدا کا اعلان ہے جس نے اپنی آخری کتاب کو نازل کیا اور ان احکامات کو جو اس سے پیشتر نافذ العمل تھے سمٹا کر اسی ایک کے اندر محفوظ کر دیا۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا

عَلَيۡهِ ...... إِلَى اللّٰهِ مَرۡجِعُكُمۡ جَمِيۡعًا فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمۡ فِيۡهِ تَخۡتَلِفُوۡنَ ۝ (۵/۴۸)

اور (اے پیغمبر!) اسی طرح) ہم نے تمہاری طرف سچائی کے ساتھ کتاب بھیجی۔ ان کتابوں کی اصلی صداقتوں کو سچ کر دکھانے والی جو پہلے سے موجود ہیں۔ اور ان سب کو اپنے اندر لئے ہوئے (اور یوں ان کی صداقتوں کی حفاظت کئے ہوئے ہے) خدا کی نازل کی ہوئی کتاب کے مطابق ان لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو اور جو سچائی تمہارے پاس آچکی ہے اسے چھوڑ کر لوگوں کی خواہشوں اور رایوں کی پیروی نہ کرو۔

تم میں سے ہر ایک گروہ کے لئے ہم نے ایک "شرع" اور "منہاج" ٹھیرا دی تھی (یعنی اپنے اپنے وقت کے لئے مذہبی زندگی کا دستور العمل اور طور طریقہ ٹھیرا دیا تھا) اگر خدا چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک جیسی استعداد دے کر پیدا کرتا اور اس طرح یہ سب پتھروں اور درختوں کی طرح ایک ہی اُمت بن جاتے۔ لیکن (تم دیکھ رہے ہو کہ اس نے ایسا نہیں کیا، اور اس لئے نہیں کیا) کہ اختلاف استعداد سے تمہارے مضمر جوہروں کی نمود کرے (اور تمہارے لئے ترقی کی راہیں پیدا ہوں) پس نیکی کی راہ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ نکلنے کی کوشش کرو۔ تمہارے تمام اعمال کے نتائج قانون خداوندی کے مطابق نتیجہ خیز ہوتے ہیں۔ سو اسی قانون کی رو سے ظاہر ہو جائے گا کہ جن باتوں میں تم اختلاف کرتے تھے ان میں سے کون کون سی بات سچی تھی۔

کہہ دیا جا سکتا ہے کہ یہ تو صاحب پھر وہی بات ہوئی کہ ہمارا دین سچا ہے اور دوسرے ادیان باطل۔ اور یہی (دعوے ہر ایک اہل مذہب کرتا ہے۔ پھر آپ میں اور ان میں فرق کیا ہوا؟ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ کسی اور اہل مذہب کے پاس ان کی کتاب اپنی اصلی شکل میں محفوظ نہیں۔ اور قرآن کریم کے متعلق داخلی اور خارجی شواہد موجود ہیں (جن کا اعتراف خود غیر مسلم مورخین اور محققین کو بھی ہے) کہ یہ حرفاً حرفاً وہی ہے جو نبی اکرمؐ نے دنیا کو دیا۔ اس تاریخی شہادت کے بعد دوسری حقیقت یہ ہے کہ اس کی تعلیم انسانی داعیات کے عین مطابق ہے اور دنیا آہستہ آہستہ اپنے تجربات کی ناکامیوں کے بعد اس کی طرف لوٹتی آرہی ہے (تفصیل سابقہ عنوان میں گزر چکی ہے۔

(۵) یہ ہے وہ حقیقت جو آسمانی تعلیم کے متعلق قرآن کریم نے بیان فرمائی ہے اور جس کی بین شہادت تاریخ کے اوراق سے ملتی ہے۔ اسی لئے اس نے کسی شخص کے مؤمن ہونے کے لئے جہاں نبی اکرمؐ پر ایمان لانے کی شرط پیش کی ہے اس کے ساتھ ہی یہ شرط بھی ہے کہ وہ اس حقیقت پر بھی ایمان لائے کہ حضورؐ سے پیشتر جس قدر انبیاء کرامؑ تشریف لائے وہ سب منجانب اللہ تھے اور ایک ہی مشعل کی مختلف کرنیں۔ ایک ہی لڑی کے تابناک گوہر۔ ایک ہی جوئے رواں کے قطرات آب۔ ایک ہی ملت کے مختلف افراد۔

وَإِنَّ هٰذِهِۤ أُمَّتُكُمۡ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَّأَنَا رَبُّكُمۡ فَاتَّقُوۡنِ ۝ (۲۳/۵۲)

اور (اے گروہ پیغمبران! دیکھو،) یہ تمہاری امت دراصل ایک ہی امت ہے۔ اور تم سب کا پروردگار میں ہی ہوں۔

پس تم تقویٰ کی راہ اختیار کرو،

ان تمام حضرات انبیاء کرام پر ایمان لانا، مسلمان کے لئے شرط اولیں ہے۔

قُولُوٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ .... وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ؀ (۲/۱۳۶-۱۳۷)

(اے پیروانِ دعوتِ قرآنی) تم کہو، ہمارا طریقہ تو یہ ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لاتے ہیں۔ قرآن پر ایمان لاتے ہیں جو ہم پر نازل ہوا ہے۔ ان تمام تعلیموں پر ایمان لاتے ہیں۔ جو ابراہیمؑ کو، اسماعیلؑ کو، اسحاق کو یعقوب کو اور اولاد یعقوب کو دی گئیں۔ نیز ان کتابوں پر، جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دی گئی تھیں۔ اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ، ان تمام تعلیموں پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو دنیا کے تمام نبیوں کو اُن کے پروردگار کی طرف سے ملی ہیں۔ ہم ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسروں سے جدا نہیں کرتے (کہ اسے نہ مانیں۔ باقی سب کو مانیں۔ یا اسے مانیں مگر دوسروں سے منکر ہو جائیں۔ خدا کی سچائی کہیں بھی، اور کسی پر بھی آئی ہو) ہم سب ہی کو مانتے ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ہر تعلیم خدا کی تعلیم تھی اور ہم تو خدا کے قانون کے فرمانبردار ہیں؛ تو اگر وہ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو انہوں نے (اسلام و اطاعتِ خداوندی کی) سیدھی راہ پالی۔ اور اگر وہ اس سے اعراض کریں تو یاد رکھو) وہ (ہمیشہ) مبتلائے نزاع رہیں گے (اور) خدا ان (کی ان) بدکرداریوں اور باہمی نزاع و اختلاف کو کافی ہو جائے گا۔ اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

ایسا ایمان کہ ان میں سے کسی ایک میں فرق نہ کیا جائے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ؀ (۲/۲۸۵)

اللہ کا رسول اس (کلام) پر ایمان رکھتا ہے جو اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر نازل ہوا ہے، اور جو لوگ (دعوتِ حق پر) ایمان لائے ہیں، وہ بھی اس پر ایمان رکھتے ہیں، یہ سب اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں (ان کے ایمان کا دستور العمل یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں) ہم اللہ کے رسولوں میں سے کسی کو دوسرے سے جدا نہیں کرتے (کہ اسے مانیں۔ دوسروں کو نہ مانیں۔ یا سب کو مانیں مگر کسی ایک سے انکار کر دیں۔ ہم خدا کے رسولوں کی یکساں طور پر تصدیق کرنے والے ہیں) اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں داعیٔ حق نے پکارا، تو) انہوں نے کہا، "خدایا! ہم نے تیرا حکم سنا اور ہم نے تیرے آگے اطاعت کا سر جھکا دیا، تیری حفاظت ہمیں نصیب ہو۔ اے پروردگار! ہم سب کو تیرے ہی قوانین کے سائے میں پناہ مل سکتی ہے۔

حتیٰ کہ قرآن کی رو سے اس قسم کی تفریق بین الرسل، کفر۔ اور کفر حقیقی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ ..... وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَلَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ أُولَٰئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيهِمْ أُجُورَهُمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا (۴/۱۵۰-۱۵۲)

(اور دیکھو، ان میں سے جو لوگ اللہ اور اسکے رسولوں کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور اللہ اور اسکے رسولوں میں تفریق کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، ان میں سے بعض کو مانتے ہیں بعض کو نہیں مانتے اور چاہتے ہیں، ایمان اور کفر کے درمیان کوئی تیسری راہ اختیار کریں) تو ایسے لوگ یقیناً کافر ہیں (ان کا بعض رسالتوں پر ایمان رکھنے کا دعویٰ انہیں مومن نہیں بنا سکتا) اور کافروں کے لئے ہم نے ذلت دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے، اور ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسروں سے جدا نہیں کیا (یعنی کسی ایک سے بھی انکار نہیں کیا) تو بلاشبہ ایسے ہی لوگ ہیں کہ (سچے مومن ہیں اور) عنقریب ہم انہیں ان کے اجر عطا فرمائیں گے، اور اللہ بخشنے والا اور رحمت رکھنے والا ہے!

(۶) لیکن تفریق بین الرسل کی ایسی سخت ممانعت کے ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ ان رسولوں میں سے بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ م .... وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلُوا ۖ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ ۝ (۲/۲۵۳ نیز ۱۷/۵۵)

یہ ہمارے پیغمبر ہیں، جن میں سے بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت دی ہے (یعنی اگرچہ پیغمبری کے لحاظ سے سب کا درجہ یکساں ہے لیکن اپنی اپنی خصوصیتوں کے لحاظ سے مختلف درجے رکھتے ہیں، ان میں سے کچھ تو ایسے تھے جن سے اللہ نے کلام کیا، بعض ایسے تھے جن کے درجے (ان کے وقتوں اور حالتوں کے مطابق، دوسری باتوں میں) بلند کئے گئے، اور (تم سے پہلے) مریم کے بیٹے عیسیٰ کو (ہدایت کی) روشن دلیلیں عطا فرمائیں، اور روح القدس (یعنی وحی) کی تائید سے سرفراز کیا۔ اگر اللہ چاہتا تو (اس کی قدرت سے یہ بات باہر نہ تھی کہ) جو لوگ ان پیغمبروں کے بعد پیدا ہوئے، وہ ہدایت کی روشن دلیلیں پالینے کے بعد پھر اختلاف و نزاع میں نہ پڑتے اور آپس میں نہ لڑتے۔ لیکن (تم دیکھ رہے ہو کہ اس کی حکمت کا فیصلہ یہی ہوا کہ انسان کو کسی ایک حالت پر مجبور نہ کر دے۔ ہر طرح کے ارادہ و فعل کی استعداد دیدے پس) پیغمبروں کے بعد لوگ باہم دگر مخالف ہو گئے (اور راہ ہدایت پر متحد نہ رہے) کچھ لوگوں نے ایمان کی راہ اختیار کی۔ کچھ لوگوں نے کفر کا شیوہ پسند کیا۔ اگر اللہ چاہتا تو یہ لوگ آپس میں نہ لڑتے، (یعنی ان سے لڑائی کی قوت سلب کر لیتا) لیکن اللہ جو چاہتا ہے اپنے قانون کے مطابق کرتا ہے۔

یعنی بہ حیثیت رسالت (منجانب اللہ پیغامبری) ان تمام حضرات انبیاء کرامؑ میں کسی قسم کی تفریق نہیں کی جا سکتی۔ سب خدا کے رسول تھے۔ لیکن ان کے دائرۂ تعلیم اور احاطۂ اثر و نفوذ کے اعتبار سے بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے۔ جیسا کہ ہم آیندہ اوراق میں دیکھیں گے۔ بعض رسول ایک قبیلہ کی طرف مبعوث ہوتے۔ ان ہی کی اصلاح ان کے پیش نظر ہوتی۔ لہٰذا ان کے پیغام کا دائرہ اسی قبیلہ تک محدود رہتا۔ بعض ایک بہت بڑی قوم کی طرف مبعوث ہوتے۔ اور بڑی بڑی سرکش قوتوں کے سامنے مقابلہ کر کے احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کرتے۔ اور اسطرح ان کے حلقۂ تبلیغ و تعلیم کے اعتبار سے ان میں فرقِ مدارج ہوتا۔ اس معیار کے مطابق یہ ظاہر ہے کہ جس رسول کی بعثت کسی خاص ملک یا خاص قوم۔ خاص جماعت یا خاص گروہ کے بجائے تمام نوعِ انسانی کے لئے ہو۔ اور جس کا پیغام، زمان و مکان کی قیود و حدود سے بلند و بالا ہو۔ اور اسے قیامت تک کے لئے ضابطۂ حیاتِ انسانی قرار دیا جائے۔ اس رسول کو دیگر حضرات انبیاء کرامؑ پر کس درجہ فضیلت ہو گی۔ یہ اللہ کے آخری رسول جناب محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ جن کے متعلق فرمایا۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (۷/۱۵۸)

(اے پیغمبر! تم لوگوں سے) کہو "اے افرادِ نسلِ انسانی! میں تم سب کی طرف، خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں۔ وہ خدا کہ آسمانوں کی اور زمین کی ساری بادشاہت اسی کے لئے ہے۔ کوئی صاحبِ اقتدار نہیں مگر اسی کی ایک ذات! موت اور حیات اس کے قانون کے مطابق ملتی ہے۔ پس اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول نبی اُمّی پر کہ اللہ اور اس کے کلمات (یعنی اس کی تمام کتابوں) پر ایمان رکھتا ہے۔ اس کی پیروی کرو تاکہ (کامیابی کی) راہ تم پر کھل جائے۔

تمام نوعِ انسانی کے لئے رسول۔

وَأَرْسَلْنَاكَ لِلنَّاسِ رَسُولًا ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا ۝ (۴/۷۹)

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تمہیں تمام لوگوں کے پاس اپنا پیامبر بنا کر بھیجا ہے۔ (اور تمہارے پیغامبر ہونے کے لئے) اللہ کی گواہی بس کرتی ہے!

ان کے لئے بھی جن کے پاس اس سے پیشتر رسول آ چکے تھے۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلَىٰ فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ أَن تَقُولُوا مَا جَاءَنَا مِن بَشِيرٍ وَلَا نَذِيرٍ ۖ فَقَدْ جَاءَكُم بَشِيرٌ وَنَذِيرٌ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ (۵/۱۹)

اے اہلِ کتاب ایسی حالت میں کہ رسولوں کا ظہور مدتوں سے بند تھا، ہمارا رسول (یعنی پیغمبر اسلام) تمہارے پاس آیا۔

تم پر احکامِ حق واضح کر رہا ہے تاکہ تم یہ نہ کہو کہ ہماری طرف کوئی نہیں بھیجا گیا۔ نہ تو (ہدایت کی) بشارت دینے والا۔ نہ (گمراہی سے) ڈرانے والا۔ تو اب (دیکھو) بشارت دینے والا اور ڈرانے والا تمہارے پاس آگیا ہے (یعنی تمہارے لئے کوئی عذر باقی نہیں رہا ہے) اور اللہ ہر بات پر قادر ہے۔

اور ان کے لئے بھی جن تک ابھی رسول نہیں پہنچے تھے۔

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۝ (۳۶ : ۶)

(اے پیغمبرِ اسلام! ہم نے تمہیں اس لئے کتاب دی ہے) تاکہ تم ان قوموں کو (بدعملی اور بدکرداری کے نتائج سے) ڈراؤ جن کے آبا (و اجداد اپنی بدکرداریوں کے نتائج سے) نہیں ڈرائے گئے تھے۔ چنانچہ وہ (اور ان کی اولادیں ابھی تک) غافل چلے آرہے ہیں۔

سارے جہان کے لئے رسول۔ اور سارے زمانوں کے لئے (قیامت تک کے لئے) رسول۔

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ وَّاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝ (۶۲ : ۲-۳)

(اور دیکھو! تمہارا پروردگار) وہی خدا ہے جس نے ان لوگوں میں جنہیں اس سے پہلے کتاب نہیں ملی تھی ان ہی میں سے ایک رسول بھیج دیا۔ جو ان پر قوانینِ خداوندی کو پیش کرتا ہے اور ان کی صلاحیتوں کی نشو و نما کی تکمیل کرتا ہے۔ اور انہیں احکامِ الٰہی سکھاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اُن کی حکمت بھی۔ اس نے اپنی تعلیم سے اس ان پڑھ قوم میں دنیا بھر کی صلاحیت پیدا کر دی ہے، اگرچہ وہ لوگ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں مبتلا تھے (اور اس کی رسالت صرف ان لوگوں تک ہی محدود نہیں ہے جو آج موجود ہیں بلکہ اُن) دوسرے لوگوں کو بھی احاطہ کئے ہوئے ہے جو ابھی تک پیدا بھی نہیں ہوئے۔ اور (تمہیں معلوم ہے کہ) خدا بڑے غلبہ والا اور حکمت والا ہے۔

جن کے بعد کوئی اور نبی نہیں آسکتا۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا ۝ (۳۳ : ۴۰)

(اور دیکھو!) محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کا باپ نہیں ہے بلکہ (وہ تو) اللہ کا رسول ہے اور (نہ صرف رسول بلکہ) انبیاء کے خاتمہ کی مہر (جس پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نبوت ختم کر دی گئی) اور اللہ ہر چیز کو جانتا ہے (اسے خوب معلوم ہے کہ محمد اس منصبِ جلیل کا اہل ہے اور صحیح اہل ہے)

کہ اس مقام پر پہنچ کر دین کی تکمیل اور خدا کی نعمتوں کا اتمام ہو گیا۔

اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ۭ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۭ (۵/۳)

(مسلمانو!) جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی، وہ آج تمہارے دین کی طرف سے مایوس ہو گئے ہیں کہ تم راہِ حق چھوڑ کر ان کا طریقہ اختیار کرنے والے نہیں۔ پس ان سے نہ ڈرو۔ مجھ سے ڈرو۔ اور میرے حکم کی تعمیل کرو۔ اگر تم مجھ سے ڈرتے رہے، تو پھر کوئی نہیں جو، تمہیں اپنی طاقت سے خوفزدہ کر سکے گا۔

آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا۔ اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی۔ اور دین کی حیثیت سے تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کر لیا! (اب اگر کوئی اسلام کے علاوہ کوئی دوسری راہ اختیار کرے گا تو وہ ہرگز اس سے قبول نہ کی جائے گی)

چونکہ یہ حضرات انبیاء کرامؑ ایک ہی شہنشاہ حقیقی کے مختلف پیغام رساں تھے۔ اس لئے ان میں (معاذ اللہ) نہ باہمی رقابت تھی۔ نہ عداوت، بلکہ وہ ایک دوسرے کے مؤید و مصدق تھے۔ اور نبی اکرمؐ چونکہ آخر میں تشریف لانے والے تھے۔ اس لئے ہر ایک جانے والا، اپنی امت کو اس آخری آنے والے کی بشارت دیکر اور یہ تاکید کر کے جاتا تھا کہ جب وہ آنے والا آئے تو تم اس کی اتباع اور اطاعت کرنا۔ (اس اجمال کی تفصیل اور اس حقیقت کبریٰ کی تائید میں تاریخی شواہد اپنے مقام پر ملیں گے)

یہ ہے آسمانی سلسلۂ رشد و ہدایت کے متعلق قرآن کریم کی تعلیم۔ اس تعلیم کو سامنے رکھئے اور پھر سوچئے کہ وہ تمام اشکال جن کا ذکر اس موضوع کے شروع میں کیا گیا ہے۔ کس طرح ایک ایک کر کے حل ہو جاتے ہیں۔ یعنی اس حقیقتِ کبریٰ پر بھی ایمان موجود ہے کہ تمام (آسمانی) مذاہبِ عالم کی اصلی اور سچی تعلیم کا سرچشمہ ایک ہی تھا۔ اس لئے کسی مذہب کی اصلی اور سچی تعلیم کی تکذیب نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی اس تعلیم کے لانے والوں میں سے کسی کی شان میں سوء ادبی کا تصور تک بھی لایا جا سکتا ہے۔ سوء ادبی تو ایک طرف، ان کی صداقت پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ آج مختلف مذاہب کی تعلیم میں اس قدر اختلافات کیوں ہیں۔ اور سب سے آخر یہ مسئلہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ان تمام مذاہب کی اصلی اور سچی تعلیم کہاں مل سکتی ہے! یہ ہے قرآن کریم کی تعلیم۔ اگر تعصب کی پٹی کسی کی آنکھیں نہ بند کر دے تو کہئیے کہ اس تعلیم کے ماننے میں کسی سلیم القلب انسان کو بھی تامل ہو سکتا ہے؟ لیکن اس کے لئے قرآن کی تعلیم کا خالی الذہن ہو کر مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ اور یہی چیز مشکل ہے۔ جس دن انسان میں اتنی وسعتِ قلب اور کشادگیٔ نگاہ پیدا ہو گئی اسی دن یہ مشکلات حل ہو جائیں گی۔ آخری عنوان "نگہ بازگشت" میں اس مسئلہ کو اور بھی زیادہ واضح کیا گیا ہے۔ ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجئے۔

ایک اور اہم حقیقت

آگے بڑھنے سے پیشتر ایک اور اہم حقیقت کی طرف اشارہ بھی ضروری ہے۔ یہ ہم ابھی ابھی دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم نے اس امر کی وضاحت فرما دی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے

ہر بستی، ہر قریہ، ہر ملک میں حضرات انبیاء کرامؑ مبعوث ہوتے رہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ ان میں سے بعض کا ذکر قرآن کریم میں ہے اور باقیوں کا ذکر نہیں ہے۔

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ؕ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۚ (۴/۱۶۴ نیز ۴۰/۷۸)

نیز خدا کے وہ رسول جن کا حال ہم (قرآن میں) پہلے سنا چکے ہیں، اور وہ جن کا حال ہم نے تمہیں نہیں سنایا۔ اور (اسی طرح) اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا جیسا کہ واقعی طور پر کلام کرنا ہوتا ہے۔

لیکن جن رسولوں کا تذکرہ جمیلہ قرآن کریم میں مذکور ہے، وہ تمام سامی اقوام سے متعلق ہیں، یا یوں کہیئے کہ وہ عرب اور اس کے گرد و پیش میں بسنے والی قوموں کے رسول ہیں۔ باقی اقوام و ملل عالم کے رسولوں کا قرآن میں کوئی ذکر نہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اس حقیقت تک پہنچنے کے لیے ایک مقدمہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ انسانی علوم کی جس قدر شاخیں ہیں انہیں تین اہم شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) علم فطرت (۲) تاریخ اور (۳) علم النفس۔ قرآن کریم نے ان علوم کی اہمیت پر جس قدر زور دیا ہے اس کے ذکر کا صحیح مقام "قرآن" کا عنوان ہے جو اپنی جگہ آئے گا۔ اس وقت صرف اس قدر سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن نے "تاریخ" کو محض وقائع نگاری کی حیثیت نہیں دی بلکہ استقرائی طریق سے اس کے مطالعہ کو ضروری قرار دیا ہے۔ (اور یہی وہ تفکر تاریخی ہے جسے اب انسان کی سیاسی اور عمرانی زندگی میں اس قدر اہمیت حاصل ہے) اس نے حضرات انبیاء کرامؑ اور ان کی

ایام اللہ کی اہمیت

اقوام کا جو تذکرہ کیا ہے تو محض ایام و وقائع کی تاریخ کی حیثیت سے نہیں کیا بلکہ اس سے عبرت و موعظت کے خاص نتائج اخذ کئے ہیں۔ اس نے بتایا ہے کہ حضرات انبیاء کرامؑ کی دعوت کے ساتھ کس کس قسم کا سلوک کیا گیا۔ ماننے والوں نے اسے کیسے مانا اور جھٹلانے والوں نے اسے کس طرح جھٹلایا۔ پھر یہ بتایا ہے کہ ماننے والوں کے اس ایمان و عمل نے کس قسم کے خوشگوار اور حیات بخش نتائج مرتب کئے اور تکذیب کرنے والوں کی سرکشی و عصیان نے انہیں کس طرح تباہی و بربادی کے جہنم کی طرف دھکیل دیا۔ ان واقعات کے بیان کرنے کے بعد اس نے بتایا ہے کہ یہ محض اتفاقی حوادث نہ تھے جو یونہی وجود پذیر ہو گئے بلکہ ان کا ظہور خاص قوانین خداوندی کے ماتحت ہوا۔ جسے سنت اللہ کہا جاتا ہے۔ اس مسئلہ کو ذہن نشین کرانے کے بعد اس نے فکر و نظر کے تمام گوشوں کو اس مرکز کی طرف منتقل کر دیا کہ جب یہ سب کچھ ایام گزشتہ میں سنت اللہ (اللہ کے غیر متبدل قوانین) کے تابع ہوتا رہا ہے تو اب بھی وہی سنت اللہ جاری و ساری ہے جس میں تم کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں پاؤ گے (لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا) لہذا جو کچھ اقوام گذشتہ اور ملل سابقہ کے ساتھ ہوا وہی کچھ تمہارے ساتھ ہوگا۔ انہوں نے رسولوں کی دعوت کی تائید و تصدیق کی تو کامیابی و شادکامی کی تمام راہیں ان پر کشادہ ہو گئیں۔ اگر تم بھی ایسا کرو گے تو اسی قسم کی سعادت و نجات کی راہیں تم پر کھل جائیں گی۔ برعکس ان کے اقوام سابقہ کے مکذبین نے اس دعوت کو جھٹلایا تو اس تکذیب کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان پر

نکبت وادبار کا ہلاکت انگیز عذاب مسلط ہوگیا۔ اور پھر وہ قومیں آہستہ آہستہ ایسی فنا ہوئیں کہ ان کی صرف داستانیں باقی رہ گئیں۔ اگر تم بھی اپنے اعمال قلوب وجوارح سے اس آسمانی دعوت کی تصدیق نہ کروگے جو قرآن کے اندر آئی ہے۔ تو تمہارا بھی انجام وہی ہوگا۔ یہی ہے وہ مقصد عظیم جس کے لئے قرآن کریم میں ملل قدیمہ اور حضرات انبیاء سابقہ کے احوال وقصص بیان ہوتے ہیں۔ (تفصیل اس کی معارف القرآن کی جلد متعلقہ "رسالت" کے اخیر میں ملے گی) اب ظاہر ہے کہ یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہوسکتا تھا کہ یہ اقوام وملل اور ان کے پیغمبر وہ ہوتے جن سے اس زمانہ کے مخاطبین[1] واقف وشناسا تھے۔ یہ تمام قومیں جن کا ذکر قرآن کریم میں ہے عرب اور اس کے قرب وجوار (فلسطین۔ شام۔ مصر وغیرہ) کے علاقوں میں بستی تھیں۔ ان میں سے اکثر وبیشتر بستیاں ایسی تھیں جن کے کھنڈرات عرب قافلوں کی گذرگاہوں میں پڑتے تھے۔ اور جن کی

صرف سامی اقوام کیوں؟

ٹھیکریاں ان اقوام گذشتہ کی زندہ داستانیں تھیں۔ وہ لوگ ان قوموں کے افسانے دن رات سنتے تھے۔ ان کے کان، ان حضرات انبیاء کرام کے اسمائے گرامی سے آشنا اور ان کے سوانح واحوال سے شناسا تھے۔ لہذا جب ان کے سامنے ان اقوام گذشتہ کے احوال وکوائف بیان کرکے ان کی توجہ اصل مقصود کی طرف منعطف کرائی جاتی تھی تو وہ ان داستانوں اور ان کے نتائج میں کوئی اجنبیت محسوس نہیں کرتے تھے یعنی اس تذکیر وموعظت کا ایک حصہ تو پہلے ہی سے ان کے سامنے تھا۔ فقط اتنا باقی تھا کہ انہیں یہ بتا دیا جائے کہ ان اقوام کی یہ حالت کیوں ہوئی تھی؟ اور اگر تم بھی ایسا ہی کروگے تو تمہاری بھی یہی حالت ہو جائے گی۔ سو ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے ان کے سامنے ان ہی اقوام وانبیاء کرام کے واقعات پیش کرنے چاہئیں تھے جن سے وہ پہلے ہی سے واقف تھے (یا اگر بعض تفاصیل سے واقف نہ تھے تو کم از کم ان کے نام سے ناآشنا نہ تھے۔ اگر قرآن ایسی اقوام یا ایسے مصلحین کرام کا ذکر کرتا جن کے نام تک سے عرب واقف نہ تھے تو وہ سننے والے کا منہ تکنے لگتے کہ یہ کن لوگوں کی باتیں کر رہا ہے۔ مثلاً اگر اس زمانہ کے حریوں سے یہ کہا جاتا کہ دیکھو تم نے اگر اس دعوت کی تکذیب کی تو تمہارا حال کنفیوشس کی قوم کا سا ہوگا۔ تو نہ صرف یہ کہ ان کا قلب اس سے کسی قسم کا اثر قبول نہ کرتا بلکہ وہ اس قسم کے سوال لیکر بیٹھ جاتے کہ یہ قوم کون تھی؟ کہاں بستی تھی؟ (جناب) کنفیوشس کی کیا تعلیم تھی؟ انہوں نے اس کی کیا خلاف ورزی کی۔ اور پھر اُن کا کیا انجام ہوا؟ اور اس سوال وجواب کے بعد یہ بحث چھڑ جاتی کہ ان سے جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ درست بھی ہے یا نہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا کہ اصل

---

[1] اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم تمام نوع انسانی کے لئے قیامت تک کے لئے ضابطۂ حیات ہے۔ اس لئے اس کی تعلیم صرف اس زمانہ کے مخاطبین تک ہی محدود نہ تھی۔ لیکن اس تعلیم کی عالمگیر بعثت کے لئے ضروری تھا کہ سب سے پہلے اس قوم کو نظم خیر کے تیار کیا جاتا جو اس کی اولین مخاطب تھی۔ پھر یہ قوم اس مشعل ہدایت کو لے کر ساری دنیا میں نکلتی۔ اور اس نور سے دنیا بھر کے اندھیروں کو منور کرتی جاتی۔ اس لئے ان حقائق کو ان کی اولین مخاطب قوم کے ذہن میں راسخ کرنے کے لئے یہ انداز واسلوب اختیار کیا گیا۔

مقصد نگاہوں سے گم ہو جاتا اور سارا وقت اس نئی بحث و جدل کی نذر ہو جاتا۔ قرآن کریم کوئی تاریخ کی کتاب تو تھا نہیں کہ اسے تمام اقوام و ملل عالم کا تذکرہ کرنا ضروری تھا۔ اس نے ان تمام بیکار مباحث سے بچ کر وہ سیدھی راہ اختیار کی جس کا نتیجہ بالکل بدیہی طور پر سامنے آگیا۔ آپ تاریخ کے اوراق کو اٹھا کر دیکھئے مخاطبین نے ان اقوام و ملل کے احوال و ظروف کو کہیں محل نظر قرار دے کر بحث و جدل نہیں شروع کی بلکہ انہیں مسلمہ حقائق کے طور پر تسلیم کر لیا۔ اب باقی صرف اتنا کام رہ گیا کہ ان کے ذہن نشین یہ کرا دیا جائے کہ اگر تم نے بھی ایسا ہی کیا تو تمہارا حشر بھی ویسا ہی ہوگا۔

یہ ہے وہ مصلحت جس کے پیش نظر قرآن کریم نے صرف ان انبیاء کرامؑ اور ان کی اقوام کا ذکر کیا ہے جو سامی مذہب سے متعلق اور عرب کے قرب و جوار میں رہنے والی تھیں۔ ورنہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ اس نے اس امر کی صراحت فرما دی ہے کہ اللہ کی طرف سے ہر قوم اور ہر ملک میں حضرات انبیاء کرام تشریف لاتے رہے۔ باقی رہا اُن پر ایمان تو اس کا مطلب آج اتنا ہی ہے کہ ہم اعتراف کریں کہ وہ اپنے اپنے وقت میں اللہ کی طرف سے سچا پیغام لے کر آئے تھے جو اپنی اصلی صورت میں محفوظ نہ رہا۔ اور اُن سب کی حقیقی تعلیم آج قرآن کریم کے دفتین کے اندر محفوظ ہے جو نوعِ انسانی کے لئے قیامت کے لئے ضابطۂ حیات ہے۔ اب اس کے سوا کسی اور کی اطاعت جائز نہیں۔

جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سامی اقوام کو مذہب کی دنیا میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ مشہور مورخ رینان اپنی کتاب (Life of Jesus) میں رقمطراز ہے:-

> یہ سامی نسل ہی ہے جسے یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے نوعِ انسانی کا مذہب مرتب کیا۔ تاریخی حدود سے کہیں آگے دنیاوی خباثتوں اور آلودگیوں سے پاک اور صاف اپنے خیمہ میں بیٹھے۔ ان بدوی مصلحین نے نسل انسانی کے لئے مذہب کی تدوین کی۔ (صفحہ ۳۷)

حقیقت یہ ہے کہ اقوام عالم کی امامت واقعی سامی اقوام کے حصہ میں آئی تھی۔ ابھی یہ تاریخی انکشافات عہد طفولیت ہی میں ہیں۔ انہیں آگے بڑھنے دیجیئے۔ پھر سامی اقوام کی پوزیشن اور بھی نکھر کر سامنے آجائے گی۔

رسُول کا صحیح مقام

پھر قرآن کریم نے اس باب میں ایک اور بڑی غلط فہمی کو بھی دور کیا ہے جو انسانی ضلالت و غوایت کی سب سے بڑی خطرناک گھاٹی ہے۔ دنیا کی کسی قوم کو لیجیئے ان کی فرطِ عقیدت نے ان کے بانیانِ مذاہب کو انسانی درجہ سے اٹھا کر مرتبۂ الوہیت تک پہنچا دیا۔ (تفصیل اس کی اس جلد میں ملے گی جس میں آئندہ کے متعلق گفتگو کی گئی ہے) قرآن کریم نے رسولوں کی بشریت کو اس لئے بھی زیادہ وضاحت اور تکرار سے بیان کیا ہے تاکہ ان کی الوہیت کا خیال دامنِ عقیدت سے وابستہ نہ ہونے پائے۔ اس کے علاوہ مختلف مقامات پر اس امر کی بھی تصریح فرما دی کہ رسولوں کو اپنی ذات کے لئے بھی نفع اور نقصان کا اختیار نہیں ہوتا چہ جائیکہ وہ دوسروں کے معبود بن سکیں۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْۗءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ (۷/۱۸۸ نیز ۶/۵۰)

(اے پیغمبر!) تم کہدو "میرا حال تو یہ ہے کہ خود اپنی جان کا نفع نقصان بھی اپنے قبضہ میں نہیں رکھتا وہی ہو کر رہتا ہے جو خدا کا قانون چاہتا ہے۔ اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو ضرور ایسا کرتا کہ بہت سی منفعت بٹور لیتا اور (زندگی میں) کوئی گزند مجھے نہ پہنچتا......الخ

حضرات انبیاء کرام کبھی قانونِ خداوندی سے سرکشی نہیں برتتے تھے۔ لیکن اگر ان سے کسی وقت کچھ ذرا سی بھول چوک ہو جاتی تو اس پر فوراً تادیب آجاتی تھی۔ مثلاً غزوۂ تبوک میں جب نبی اکرمؐ نے بعض لوگوں کو عدم شرکت کی اجازت دیدی تو اس پر وحی نازل ہوئی کہ

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ (۹/۴۳)

(اے پیغمبر!) اللہ تمہیں معاف کرے۔ تم نے ایسا کیوں کیا کہ (ان کی منافقانہ غداریوں پر) انہیں (پیچھے رہ جانے کی) رخصت دیدی؟ اس وقت تک رخصت نہ دی ہوتی کہ تجھ پر کھل جاتا کہ کون سچے ہیں، اور تو معلوم کر لیتا، کون جھوٹے ہیں؟

(اس قسم کی اور مثالیں معراجِ انسانیت میں ملیں گی) ان واقعات کے بیان کرنے سے مقصد اس حقیقت کو بے نقاب کرنا ہے کہ حضرات انبیاء کرام کو درجۂ الوہیت نہ دیدیا جائے۔ ان کا سب سے بلند مرتبہ مقامِ عبدیت ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جس میں شرف و اجتباء کی تمام سرفرازیاں اور سربلندیاں جھلمل جھلمل کرتی نظر آتی ہیں۔ یعنی قوانین خداوندی کی صحیح صحیح اطاعت کرنے والا۔ اور دوسروں سے ان کی اطاعت کرانے والا۔

رسول پر ایمان

یہ ہیں مقامِ رسالت کے مختلف پہلو جن پر ایمان لانا ایک مؤمن کے لئے ضروری ہے جب تک رسول پر ایمان نہ لایا جائے۔ وحی پر ایمان نہیں لایا جا سکتا۔ اور چونکہ وحی ہی وہ ذریعہ ہے جس سے خدا اور بندوں کے درمیان صحیح تعلق قائم ہوتا ہے۔ اس لئے وحی پر ایمان درحقیقت خدا پر ایمان ہے۔ یا یوں کہئے کہ خدا پر ایمان اس کی حاکمیت کا اعتراف ہے۔ یہ حاکمیت اس ضابطۂ قانون کی رو سے قائم ہوتی ہے جو وحیِ آسمانی کی وساطت سے بندوں کو ملتا ہے۔ اور اس ضابطہ کو نافذ العمل کرنے والی ہستی۔ رسول کی ذات ہوتی ہے۔ ایمان بالرسل کے پہلو پر ذرا پھر غور فرمائیے۔ ایک شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ فلاں بات جس کا وہ حکم دیتا ہے اس کی اپنی طرف سے نہیں خدا کی طرف سے ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے اس دعوے کا کوئی ایسا محسوس (مرئی) ثبوت

[1] معجزات کے متعلق تفصیلی بحث معراج انسانیت میں ملے گی۔

اس کے پاس نہیں ہوتا۔ جس سے ہر شخص اس کی تعلیم کو منزل من اللہ سمجھنے لگ جائے۔ اس کا ثبوت خود وہ تعلیم ہوتی ہے لیکن تعلیم کے اثرات ونتائج تو اسی صورت میں مرتب ہوں گے جب اس پر عمل کیا جائے گا۔ اور عمل اس وقت تک کیا نہیں جا سکتا جب تک اس کی صداقت کا یقین نہ ہو۔ لہذا رسول کے اس دعوے کو کس طرح سچا سمجھا جائے کہ جس تعلیم کو وہ پیش کر رہا ہے وہ اس کی اپنی وضع کردہ نہیں منزل من اللہ[1] ہے۔ اس یقین کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ یہ کہ اس شخص کے متعلق یہ یقین ہو کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ غلط بیانی سے کام نہیں لیتا۔ خیانت نہیں کرتا۔ اس ایمان کے بعد اس کے اس دعوے کی خود بخود تصدیق ہو جاتی ہے کہ اس کی تعلیم منزل من اللہ ہے۔ گویا رسول کی زندگی خود اس کے دعوے کی

رسولؐ کی زندگی اس کی صداقت کی دلیل ہوتی ہے

خود بخود تصدیق ہو جاتی ہے کہ اس کی تعلیم منزل من اللہ ہے۔ گویا رسول کی زندگی خود اس کے دعوے کی دلیل ہوتی ہے۔ جب نبی اکرم سے پوچھا گیا کہ اس بات کا ثبوت کیا ہے کہ آپ خدا کے رسول ہیں۔ تو اس کے جواب میں حضور نے کیا فرمایا۔ یہی کہ میں کہیں باہر سے نہیں آیا۔ میں نے اپنی عمر تمہارے اندر بسر کی ہے۔ کیا تم اس سے اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میں سچا ہوں یا (معاذ اللہ) جھوٹا (تفصیل سابقہ عنوان میں گذر چکی ہے۔)

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ (۱۰-۱۵-۱۶)

یہ واقعہ ہے کہ میں اس معاملہ سے پہلے تم لوگوں کے اندر ایک پوری عمر بسر کر چکا ہوں۔ کیا تم سمجھتے بوجھتے نہیں۔

رسولؐ اجر رسالت نہیں مانگتا

اور پھر بڑی چیز یہ کہ نبی اپنی تبلیغ رسالت کا کوئی معاوضہ یا اجر نہیں مانگتا[2]۔ اس کا اجر اُن کے اللہ کے ہاں ہوتا ہے۔ اس لئے کہ رسول ایک عظیم الشان انقلابی پروگرام اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اور اس کا اجر اس پروگرام کی کامیابی ہوتی ہے۔ وہ انسانوں کو باطل کی ہر قوت کے استبداد سے نجات دلانے کے لئے آتا ہے۔ اس لئے اس کا اجر باطل کی قوتوں کی شکست میں مضمر ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسے نظام کے قیام کے لئے آتا ہے جس کی رو سے تمام نوع انسانی کی ربوبیت (پرورش) ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی محنتوں کا اجر، اس کی سعی وکاوش کا صلہ، اس نظام کا قیام ہوتا ہے۔ اگر انقلاب کا علمبردار اجر کا خواہاں ہو جائے تو وہ تن پروری ہے۔ انقلاب نہیں۔ اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

---

[1] اس میں شبہ نہیں کہ تعلیم نبوی کو ذہنی طور پر پرکھ کر بھی اس کی صداقت پر ایمان لایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس قسم کے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ قرآنی تعلیم ذہنی اور فکری طور پر پرکھنے والوں کے لئے بھی کس قدر اعجاز نما ہے اس کی تشریح اپنے مقام پر آئے گی۔

[2] إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ کا مفہوم اپنے مقام پر آئے گا۔

وَمَا أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ (۲۶/۱۰۹)

اور (دیکھو! نوحؑ نے بھی یہی کہا کہ) میں اس (تبلیغ احکام الہیہ) پر تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو صرف جہانوں کے پروردگار کے ذمہ ہے (وہی دے گا۔ اور بس!)

اس لئے جو لوگ ان کی رسالت پر ایمان لاتے ہیں وہ کچھ احسان نہیں کرتے۔ جس طرح ایک مریض کسی ایسے طبیب کی حذاقت پر اعتقاد رکھ کر جو علاج کے لئے کسی معاوضہ کا خواہاں نہ ہو۔ اس کے مجوزہ نسخہ کا استعمال کرتا ہے تو یہ طبیب پر احسان نہیں بلکہ خود طبیب کا اس مریض پر احسان ہوتا ہے۔

يَمُنُّونَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوا ۖ قُل لَّا تَمُنُّوا عَلَيَّ إِسْلَامَكُم ۖ بَلِ اللَّهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ لِلْإِيمَانِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ (۴۹/۱۷)

(اے پیغمبر اسلام! دیکھو) یہ لوگ تم پر احسان جتلاتے ہیں کہ وہ اسلام لے آئے ہیں۔ تم کہہ دو کہ مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ رکھو، بلکہ خدا خود تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت دیدی۔ بشرطیکہ تم (اپنے دعوئے اسلام میں) سچے ہو۔

اس لئے حضرات انبیاء کرامؑ نوع انسان کے لئے آیۂ رحمت ہوتے ہیں۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ۝ (۲۱/۱۰۷)

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تجھے نہیں بھیجا ہے۔ مگر اس لئے کہ تمام دنیا کیلئے باعث رحمت ہو۔

لیکن اس رحمت سے مستفیض وہی ہو سکتے ہیں جو رسول کی رسالت پر ایمان لائیں

وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ ۝ (۹/۶۱)

اور وہ ان لوگوں کے لئے سرتاسر رحمت ہے جو تم میں سے ایمان لائے ہیں۔

جس طرح ابر گہربار کی درفشانی سے وہی زمین متمتع ہو سکتی ہے جو اپنے سینے کو اس رحمت کے لئے کشادہ کر لے اور اپنے اندر اس کے جذب و قبول کی صلاحیت پیدا کر لے۔ اسی طرح رسول کی رسالت (قوانین خداوندی) بھی انہی کے لئے خوشگواریوں اور کامرانیوں کا موجب بنتی ہے جو ان قوانین کی اتباع کریں۔ دیکھئے قرآن کریم نے اس حقیقت کبریٰ کو بارش کی مثال سے کس قدر دل آویز اور دلکش انداز میں بیان فرمایا ہے۔ ارشاد ہے

وَمِنْ آيَاتِهِ أَن يُرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرَاتٍ وَلِيُذِيقَكُم مِّن رَّحْمَتِهِ وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِأَمْرِهِ وَلِتَبْتَغُوا مِن فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ (۳۰/۴۶)

اور اس کی آیات (قدرت) میں سے (یہ بھی ایک نشانی) ہے کہ وہ ہواؤں کو باعث بشارت بنا کر بھیجتا ہے۔ اور اس لئے (بھیجتا ہے) تاکہ تمہیں اپنی رحمت کے اثرات سے متمتع ہونے کا موقعہ دے اور اس لئے کہ خدا کے حکم سے کشتی

ربانی ہیں) چلیے اور تاکہ تم اس کے فضل کو طلب کر سکو۔ اور اس لئے بھی کہ تم اس کا شکر کرو۔

اس سے آگے ہے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ رُسُلًا إِلَىٰ قَوْمِهِمْ فَجَاءُوهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَانتَقَمْنَا مِنَ الَّذِينَ أَجْرَمُوا ۖ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ ‎(۳۰/۴۷)

اور (دیکھو، اے پیغمبر اسلام!) ہم نے تم سے پہلے بھی بہت سے رسول ان کی اپنی قوموں کی طرف بھیجے ہیں۔ وہ اُن کے پاس واضح دلائل لے کر آئے (مگر منکرین حق نے ان کا بھی انکار ہی کیا) تو ہم نے (بھی) مجرمین کو ان کی غلط روش کی سزا دی (اُن کی بدعملی اور انکار کے بدنتائج مرتب کر دیئے) اور ہم نے ایمان والوں کی امداد کرنا اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔

پھر اس کے بعد بارش اور اس مژدہ جانفزا کی پیغامبر ہواؤں کا ذکر ہے۔

اللَّهُ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ فَتُثِيرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهُ فِي السَّمَاءِ ..... وَلَئِنْ أَرْسَلْنَا رِيحًا فَرَأَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوا مِن بَعْدِهِ يَكْفُرُونَ ‎(۳۰/۴۸—۵۱)

اور (دیکھو) اللہ، وہ ہے جو ہوائیں بھیجتا ہے۔ وہ ہوائیں ان بادلوں کو (فضا میں) پھیلاتی ہیں۔ پھر خدا انہیں آسمان پر جس طرح (اور جہاں) چاہتا ہے اپنے قانونِ کائنات کے مطابق پھیلا دیتا ہے اور انہیں اس طرح تو بر تو کر دیتا ہے کہ تم ان کے درمیان میں سے بارش کے قطرات نکلتے دیکھتے ہو۔ تو جب وہ اپنے بندوں میں سے جنہیں چاہتا ہے وہ بارش پہنچا دیتا ہے تو وہ خوش ہونے لگتے ہیں۔ اگرچہ بارش نازل ہونے سے پہلے وہ بالکل مایوس تھے۔ تو (ذرا) اللہ کی رحمت کے آثار کو دیکھو، کہ وہ کس طرح (ان قطرات بارش سے) مردہ زمین کو (دوبارہ) زندگی بخش دیتا ہے (کہ یکبارگی زمینیں سبزہ زاروں سے لہلہا اٹھتی ہیں) بلاشبہ یہی (خدا تو ہے جو) مردوں کو بھی زندگی بخشنے والا ہے۔ اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اور (دیکھو) اگر ہم اِن ہواؤں کو بھیجیں (جو کھیتوں کو پکانے والی ہوں) اور یہ لوگ کھیتوں کو زرد (پکا ہوا) دیکھ لیتے ہیں تو اس کے بعد یہ لوگ پھر خدا کی نافرمانیوں میں پڑ جاتے ہیں (جیسے انہیں خدا سے کبھی کوئی واسطہ نہیں تھا)

آئندہ جلد میں رحمتِ خداوندی کی ان ہی عطر بیز ہواؤں اور عنبر فشاں گھٹاؤں کا تذکرہ جمیل وجہ شادابیٔ قلب و نگاہ ہوگا۔ جس سے سعید روحوں کی کشتِ انسانیت لہلہا اُٹھی۔ لیکن زمین شور ویسی کی ویسی رہ گئی۔ وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا خَسَارًا

رسول اور نبی قرآن کریم میں پیغامبرانِ خداوندی کے لئے رسول کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے اور نبی کا بھی۔ رسول کے معنی پیغام رساں اور نبی کے معنی ہیں وہ شخص جو بلند مقام پر کھڑا ہو۔ عام طور پر کہا یہ جاتا ہے کہ

رسول وہ ہے جسے اللہ کی طرف سے کتاب ملے۔ اور نبی وہ جو بغیر کتاب کے آئے۔ لیکن یہ تقسیم انسانوں کی خود ساختہ ہے۔ قرآن کریم سے اس کی سند نہیں ملتی۔ برعکس اس کے قرآن کریم سے ظاہر ہے کہ رسالت اور نبوت ایک ہی مقام کے دو نام اور ایک ہی سکہ کے دو رُخ ہیں۔ نبوت کے معنی ہیں خدا کی طرف سے وحی کا ملنا۔ اور رسالت کے معنی ہیں اس وحی کو دوسروں تک پہنچانا۔ ظاہر ہے کہ وحی ملتی ہی اس لئے ہے کہ اسے دوسرے انسانوں تک پہنچایا جائے اور اس کے مطابق انسانی معاشرہ کی تشکیل کی جائے۔ لہذا نبوت، بغیر رسالت کے بے مقصد ہوتی ہے۔ اور نبوت کے بغیر رسالت کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ جسے خدا کی طرف سے وحی نہیں ملے گی وہ انسانوں تک پہنچائے گا کیا؟ نبوت کے ساتھ رسالت کی تصریح کر دینے سے قرآن نے ایک بہت بڑی حقیقت سے پردہ کشائی کی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ نبوت کوئی ایسا انفرادی تجربہ نہیں جس کا تعلق محض اس خاص شخص کی ذات سے ہو۔ اس شخص کو حصولِ وحی کے لئے منتخب کیا جاتا ہے تاکہ وہ خدا کی وحی کو دوسروں تک پہنچائے۔ اس لئے اس اعتبار سے دیکھئے تو نبوت کے بعد رسول کا اصل فریضہ رسالت ہی ہوتا ہے۔ رسالت بہت بڑی ذمہ داری کا منصب ہے۔ یہیں سے وہ تمام جاں گداز اور صبر آزما مراحل شروع ہوتے ہیں۔ جو قرآن کے الفاظ میں رسول کی کمر توڑ دیتے ہیں۔ رسول اپنے اس پیغام کو لے کر اپنے اس معاشرے میں جاتا ہے جہاں کا ذرہ ذرہ اس پیغام کی مخالفت کرتا ہے۔ اُسے اس معاشرہ میں وہ انقلاب پیدا کرنا ہوتا ہے جو اس کی وحی کی غایت ہوتا ہے۔ لہذا نبوت کے معنی ہیں خدا کی طرف سے ضابطۂ حیات کا ملنا اور رسالت کے معنی ہیں اس ضابطۂ حیات کے مطابق انقلاب پیدا کرنا۔ اس لئے قرآن نے ان حضرات کو کہیں انبیاء کہا ہے اور کہیں رسول کہہ کر پکارا ہے۔ مثلاً سورۃ انعام کے دسویں رکوع میں حضرت ابراہیم۔ اسحاق۔ یعقوب۔ داؤد۔ سلیمان۔ یوسف۔ موسیٰ۔ ہارون۔ زکریا۔ یحییٰ۔ عیسیٰ۔ الیاس۔ اسماعیل۔ یسع۔ یونس۔ لوط (علیہم السلام) کے تذکرہ کے بعد فرمایا۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَإِن يَكْفُرْ بِهَا هَٰؤُلَاءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوا بِهَا بِكَافِرِينَ ○ (۶/۹۰ نیز ۴۵/۱۶ ; ۲۹/۲۷ ; ۵۷/۲۶)

یہ وہ انبیاء ہیں جنہیں ہم نے کتاب، حکومت اور نبوت عطا فرمائی ہے۔ اگر یہ لوگ ان باتوں کے ساتھ کفر اور نافرمانی کا برتاؤ کرتے ہیں (تو کرنے دو) ہم نے ایک ایسی قوم کو ان باتوں کو سونپ دیا ہے جو ان کے ساتھ کفر اور نافرمانی کرنے والے نہیں ہیں۔

ان حضرات میں سے کئی ایسے ہیں جن کی کتاب کا ذکر قرآن کریم میں جداگانہ طور پر نہیں کیا گیا۔ لیکن قرآن کریم کا واضح ارشاد موجود ہے کہ انہیں کتاب بھی دی گئی اور نبوت بھی۔ پھر یہ بھی دیکھئے کہ حضرات انبیاء کرام میں کسی جگہ انہیں رسول کہا گیا ہے کسی جگہ نبی۔

حضرت ابراہیم کے متعلق خود قرآن کریم میں ہے کہ انہیں اور حضرت موسیٰ کو صحف عطا کئے گئے۔

صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ۝ (۸۷/۱۹)

(یہ تمام باتیں) ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں بھی موجود ہیں۔

بایں ہمہ حضرت ابراہیمؑ کو نبی کہا گیا۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۥ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝ (۱۹/۴۱)

اور (اے پیغمبر اسلام!) کتاب (یعنی قرآن) میں ابراہیم کا ذکر کرو، بلاشبہ وہ بہت سچے انسان اور نبی تھے۔

حضرت عیسیٰ کو انجیل عطا ہوئی۔ لیکن آپ نے خود فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے نبی بنایا ہے۔

قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۣ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ۝ (۱۹/۳۰)

اور (دیکھو) عیسیٰ نے کہا کہ میں تو اللہ کا بندہ ہوں (کہ یہ مقام عبدیت ہی سب سے بڑا مقام ہے۔ میرے خدا نے) مجھے کتاب (انجیل) دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے کہ حضرت عیسیٰ رسول تھے۔

وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ..... (۴/۱۵۷)

اور ان (یہودیوں) کے یہ کہنے کی وجہ سے کہ ہم نے عیسیٰ ابن مریم اللہ کے رسول کو قتل کر دیا.....

ان کے برعکس حضرت اسمٰعیلؑ جن کی کتاب کا جداگانہ ذکر نہیں ہے کے متعلق فرمایا کہ رسول و نبی تھے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝ (۱۹/۵۴)

اور (اے پیغمبر اسلام!) کتاب (یعنی قرآن) میں اسماعیل کا ذکر کرو۔ بلاشبہ وہ وعدہ کے سچے، اور رسول و نبی تھے ایسے ہی جیسے حضرت موسیٰؑ۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰٓى ۡ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝ (۱۹/۵۱)

اور (اے پیغمبر اسلام!) کتاب (یعنی قرآن) میں موسیٰ کا ذکر کرو، بلاشبہ وہ ایک پیکر خلوص اور رسول و نبی تھے۔

سورہ انعام کی آیت ۹۰ میں ہم ابھی ابھی دیکھ چکے ہیں کہ حضرات مرسلین علیہم السلام کے تذکرہ کے ضمن میں فرمایا کہ انہیں کتاب و نبوت عطا کی گئی تھی۔ سورہ نساء کے تیئیسویں رکوع میں ارشاد ہے۔

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰي نُوْحٍ وَّالنَّـبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ..... لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَي اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ (۴/۱۶۳-۱۶۵)

(اور اے پیغمبر اسلام! دیکھو) بلاشبہ ہم نے تمہاری طرف بالکل اسی طرح وحی کی ہے جیسے ہم نے نوح کی طرف اور نوح کے بعد دوسرے انبیاء کی طرف وحی کی تھی۔ اور (جس طرح) ہم نے ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب و اولادِ یعقوب۔ عیسیٰ۔ ایوب۔ یونس ہارون اور سلیمان کی طرف وحی کی تھی، اور (اے پیغمبر!) ہم نے تمہیں بالکل

اُسی طرح کتاب قرآن، عطا کی ہے، جس طرح) ہم نے داؤد کو زبور عطا کی تھی۔

اور (کچھ ان ہی حضرات انبیاء کرام پر منحصر نہیں ہے) اور بھی بہت سے رسول ہیں جن کے (کچھ) واقعات ہم نے اس سے پہلے تم سے بیان کر دیئے ہیں اور بہت سے رسول ہیں جن کے واقعات ہم نے تم سے بیان نہیں کئے (جس طرح ہم نے ان پر وحی کی تھی اور کتاب دی تھی۔ بالکل اسی طرح ہم نے تم پر بھی وحی کی ہے، اور کتاب) قرآن۔ عطا کی ہے (نوعیت وحی اور عطاء کتاب میں کوئی فرق اور امتیاز روا نہیں رکھا گیا۔) اور خدا نے موسیٰ سے اچھی طرح کلام فرمایا تھا۔ یہ (سب کے سب) خدا کے رسول تھے جو (نتائج اعمال کی) بشارت دینے والے اور (انکار و بدعملی کے برے نتائج سے ڈرانے والے تھے، تاکہ رسولوں کے (آجانے کے) بعد لوگوں کی خدا پر کوئی (صحیح اور قابل پذیرائی) حجت باقی نہ رہے۔ اور (تم جانتے ہو کہ) خدا بڑے غلبہ اور حکمت والا ہے۔

یہاں ان حضرات کو رسول کہا گیا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے حضرات انبیاء کرام پر ایمان ضروری ہے (ایمان کے پانچ اجزاء میں سے یہ ایک جزو ہے) سورۂ بقرہ کے بائیسویں رکوع میں ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ

(۲/۱۷۷)

یہ کوئی بھلائی کی بات نہیں ہے کہ تم (نمازوں میں) اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف پھیر لو، البتہ بھلائی اور نیکی اس شخص کی بھلائی اور نیکی ہے جو اللہ پر، قیامت (اور حشر و نشر) کے دن پر، فرشتوں پر، کتابوں پر اور انبیاء پر ایمان لائے۔

اور اسی سورت کے چالیسویں رکوع میں ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝

(۲/۲۸۵)

اللہ کا رسول اس (کلام) پر ایمان رکھتا ہے جو اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر نازل ہوا ہے، اور جو لوگ (دعوت حق پر) ایمان لائے ہیں، وہ بھی اس پر ایمان رکھتے ہیں، یہ سب اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، ایمان لائے ہیں (ان کے ایمان کا دستور العمل یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں) ہم اللہ کے رسولوں میں سے کسی کو دوسرے سے جدا نہیں کرتے (کہ اُسے مانیں۔ دوسروں کو نہ مانیں، یا سب کو مانیں مگر کسی ایک سے انکار کریں، ہم خدا کے تمام رسولوں کی یکساں طور پر تصدیق کرتے ہیں) اور (یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں داعی حق نے پکارا، تو) انہوں نے کہا، خدایا! ہم نے تیرا حکم سنا اور ہم نے تیرے آگے اطاعت کا سر جھکا دیا۔ تیری حفاظت ہمیں نصیب ہو۔ اے پروردگار! ہمیں تیرے ہی قانون کی طرف ہی لوٹنا ہے۔

یعنی ایک جگہ نبیین فرمایا اور دوسری جگہ رسل سورۂ آل عمران کی ذیل کی آیہ مقدسہ بھی اسی حقیقت کو واضح کرتی ہے۔

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۠ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ○ (۳/۸۴)

(اے پیغمبر اسلام!) تم کہدو، ہمارا طریقہ تو یہ ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں۔ قرآن پر ایمان لائے ہیں۔ جو ہم پر نازل ہوا ہے۔ ان تمام تعلیموں پر ایمان لائے ہیں جو ابراہیم کو، اسماعیل کو، اسحاق کو، یعقوب کو، اور اولاد یعقوب کو دی گئیں۔ نیز ان کتابوں پر جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دی گئی تھیں۔ اور صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ ان تمام تعلیموں پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو دنیا کے تمام نبیوں کو ان کے پروردگار سے ملی تھیں۔ ہم ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسروں سے جدا نہیں کرتے (کہ اسے نہ مانیں۔ باقی سب کو مانیں۔ یا اسے مانیں، مگر دوسروں سے منکر ہو جائیں، خدا کی سچائی کہیں بھی، اور کسی پر بھی آئی تھی) ہم سب ہی کو مانتے ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ہر تعلیم خدا کی تعلیم تھی اور (ہم تو) خدا کے فرمانبردار ہیں۔

اسی طرح جہاں یہ فرمایا ہے کہ بعض رسولوں کو بعض پر فضیلت دی گئی ہے۔ وہاں ایک مقام پر انہیں رسل کہا گیا ہے اور دوسرے مقام پر انبیاء۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ....الخ (۲/۲۵۳)

یہ ہمارے رسول ہیں، جن میں سے بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت دی ہے۔ (یعنی اگرچہ پیغمبری کے لحاظ سے سب کا درجہ یکساں ہے۔ لیکن اپنی خصوصیتوں کے لحاظ سے مختلف درجے رکھتے ہیں) ان میں سے کچھ تو ایسے تھے جن سے اللہ نے کلام کیا، بعض ایسے تھے جن کے درجے (ان کے وقتوں اور حالتوں کے مطابق، دوسری باتوں میں بلند کئے گئے ....الخ

اور سورۂ بنی اسرائیل میں ہے۔

وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ○ (۱۷/۵۵)

اور (اے پیغمبر اسلام! دیکھو) تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ آسمانوں اور زمینوں میں کون کون لوگ ہیں۔ اور بلاشبہ ہم نے بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ (یعنی اگرچہ پیغمبری کے لحاظ سے سب کا درجہ

یکساں ہے، مگر اپنی اپنی خصوصیتوں کے لحاظ سے مختلف درجے رکھتے ہیں۔ اور داؤد کو ہم نے (اپنی کتاب) زبور عطا فرمائی۔

خود نبی اکرمؐ کو کہیں رسول کے لقب سے مخاطب کیا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۔۔۔ (۵/۶۷)

اے رسول ان احکام کو جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل کئے گئے ہیں (لوگوں تک) پہنچا دو!

اور کہیں نبی کے لقب سے۔ مثلاً

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللَّهَ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا (۳۳/۱)

اے نبی! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ اور کفار و منافقین کی اطاعت نہ کرو، بلاشبہ خدا (سب کچھ) جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

اور کہیں رسول و نبی دونوں جامع القاب سے۔

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ ۔۔۔۔۔۔ (۷/۱۵۷)

(اور دیکھو!) جو لوگ پیغمبر (اسلام) یعنی نبیِ اُمّی کا اتباع کرتے ہیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے رسول اور نبی ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ ان میں کچھ فرق نہیں۔ صاحب کتاب اور غیر صاحب کتاب کا فرق ذہن انسانی کا پیدا کردہ ہے۔ نبی یا رسول بغیر کتاب کے آ ہی نہیں سکتا۔ (پیغام رساں بغیر پیغام کے بھلا کیا کرنے آئے گا؟) اس لئے قرآن کریم نے بالکل واضح اور غیر مبہم الفاظ میں اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ ہر ایک رسول کے ساتھ کتاب نازل کی گئی۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا ۔۔۔ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ ۔۔۔۔۔ (۵۷/۲۵)

اور بلاشبہ ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا ہے اور ان سب کے ساتھ کتاب (ضابطۂ قوانین) نازل کی۔

اور اسی طرح ہر ایک نبی کے ساتھ کتاب نازل کی گئی۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ۔۔۔۔۔ (۲/۲۱۳)

چونکہ نوع انسانی کو ایک امت کی حیثیت سے (مدنی) زندگی بسر کرنا تھا اس لئے خدا نے انبیاء کو بھیجا جو (اعمال کے نتائج کی) بشارت دینے والے اور (انکار و بدعملی کے بدنتائج سے) ڈرانے والے تھے۔ اور ان سب کے

پاس سچائی کے ساتھ کتاب (ضابطۂ قوانین) نازل کی تاکہ وہ لوگوں کے درمیان ان مسائل میں جن میں وہ اختلاف

کر رہے تھے (خدا کے قانون اور اس کی مرضی کے مطابق) فیصلہ کر سکیں۔

مَعَهُمُ (ان سب کے ساتھ) قابلِ غور ہے۔ کوئی رسول اور کوئی نبی بغیر کتاب کے نہیں آیا۔ لہٰذا نبی یا رسول بلا کتاب کا تصور یکسر غیر قرآنی ہے۔ اور تشریعی غیر تشریعی کی تفریق اس حقیقت سے بیگانگی کی دلیل۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، ہر رسول (یا نبی) پر اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوتی تھی۔ وہ وحی اس کی کتاب[1] تھی۔ اور وہی کتاب اس کی شریعت کا ضابطہ۔ اس میں جدید اور قدیم (نئی یا پرانی) کا کوئی سوال نہیں۔ وہ کسی سابقہ شریعت کی تجدید[2] ہو۔ یا اس میں ترمیم و تنسیخ اور حک و اضافہ کے بعد نئی صورت۔ بہرحال اس نبی اور رسول کی اپنی کتاب کے اندر ہوگی۔ کوئی نبی اور رسول بغیر کتاب کے نہیں آ سکتا۔

اور چونکہ قرآن کریم کے اندر دین مکمل ہو چکا ہے اور وہ دنیا میں اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔ اس لئے اب کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں۔ اور چونکہ کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں۔ اس لئے اب کوئی نبی نہیں آ سکتا۔ یہ مفہوم ہے خَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ کا جس کی تفصیل "ختم نبوت" کے عنوان میں (معراج انسانیت میں) ملے گی۔ نبوت کا سلسلہ نبی اکرمؐ کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اب کسی کو وحی نہیں مل سکتی۔ وحی کے ذریعے خدا نے جو کچھ دینا تھا وہ سب قرآن کے اندر آ چکا۔ اور قرآن کو قیامت تک کے لئے محفوظ کر دیا گیا۔ اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لے لیا۔ باقی رہا اس کتاب کے ذریعے ایسا معاشرہ متشکل کرنا جو وحی کا مقصود ہے، سو اس کی ذمہ داری اس امت کو سونپ دی گئی جسے اس کتاب کا وارث قرار دیا گیا ہے۔ ان دونوں کا نام ہے نظامِ خداوندی۔ یعنی وہ نظام جسے امتِ محمدیہ قرآن کی رو سے قائم کرے۔ اس نظام کی موجودگی میں دنیا کو نہ کسی نبی کی ضرورت ہوگی اور نہ رسول کی۔ وَذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ حضرات انبیاء کرام کا یہ سلسلہ کہاں سے شروع ہوا اور کن کن مراحل سے گزرتا ہوا

---

[1] جس طرح قرآن کریم میں بعض رسولوں کا ذکر ہے اور بعض کا نہیں۔ اسی طرح ان میں سے بعض کی کتابوں کا ذکر ہے اور بعض کا نہیں۔ لیکن کتاب ہر رسول کے ساتھ ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ حضرت ہارونؑ (جنہیں حضرت موسیٰؑ کا وزیر کہا گیا ہے ۲۵/۳۵) ان کے متعلق فرمایا کہ

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَاۤءً وَّ ذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ (۲۱/۴۸)

اور (دیکھو) بلاشبہ ہم نے موسیٰ اور ہارون کو (حق و باطل میں) تمیز کرنے والی کتاب اور سچائی کی روشنی اور متقی لوگوں کیلئے نصیحت کی چیز عطا کی۔

حضرت ہارونؑ کی رسالت کے متعلق حضرت موسیٰؑ کے عنوان کے ماتحت ذکر آئے گا۔

[2] تجدید کی ضرورت اسی وقت پڑتی ہے جب اصل کتاب (Original book) اپنی اصلی صورت میں باقی نہ رہے۔ (مزید تبصرہ جلد سوم باب "تکمیل از رسل" میں ملے گا)

کہاں تک پہنچا۔ اس کا تعلق تاریخ رسالت سے ہے۔ جو معارف القرآن کی اگلی دو جلدوں میں تکمیل پذیر ہو گی

وَاللّٰہُ الْمُسْتَعَانُ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْہِ اُنِیْبُ

خلاصۂ مبحث

اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسانی سے وعدہ کیا تھا کہ ان کی راہ نمائی کے لئے اس کی طرف سے ہدایت ملے گی۔ یہ ہدایت آسمانی حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے ملتی رہی۔ ان کے ذمہ انسانوں تک خدا کا پیغام پہنچانا تھا۔ یہ تمام رسول انسان تھے۔ مافوق البشر ہستیاں نہ تھے۔ ان رسولوں کے ذمہ صرف پیغام رسانی کا فریضہ ہی نہ تھا۔ بلکہ اس پیغام کو عملی طور پر متشکل بھی کرنا تھا۔ اور اس طرح سے ثابت کرنا تھا کہ وہ نظام جس کی طرف وہ دعوت دیتے ہیں ناممکن العمل نہیں۔ رسول سب سے پہلے خود اس وحی کی اتباع کرتا تھا جو اسے خدا کی طرف سے ملتی تھی۔ اس اتباعِ وحی سے وہ ایک نظام قائم کرتا تھا۔ جس کی بنیاد اللہ کی حاکمیت کے اقرار پر ہوتی تھی۔ وہ خود اس نظام کا اولین مرکز ہوتا تھا۔ لہٰذا اس نظام کی اطاعت کے لئے ضروری تھا کہ اس مرکز کی اطاعت کی جاتی۔ اس لئے خدا کی اطاعت بذریعہ رسول کی اطاعت کے ہوتی لازمی تھی۔ لیکن رسول کی اطاعت اس کی ذات کی اطاعت نہ تھی۔ یہ دراصل خدا ہی کی اطاعت تھی۔ کہ رسول خود خدا کی کتاب کی اطاعت کرتا تھا۔ رسول، ایک طبیبِ مشفق کی طرح ہمیشہ اس غم خواری میں گھلتا رہتا تھا کہ لوگ تباہی و بربادی کے جہنم سے بچ جائیں۔ لیکن اس کے ذمہ پیغام رسانی کا فریضہ تھا۔ ہدایت کو دلوں کے اندر اتار دینا اس کے بس میں نہ تھا۔

پھر ایک اور حقیقت کی طرف آیئے۔ آج عام طور پر دو قسم کے لوگ ملیں گے۔ ایک وہ جو کہتے ہیں کہ ان کا مذہب تو سچا ہے، لیکن باقی سب بانیانِ مذاہب (معاذ اللہ) جھوٹے تھے۔ دوسرا گروہ افراط کی طرف جا کر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ نہیں۔ دنیا کے تمام مذاہب بالکل سچے اور یکساں ہیں۔ یہ دونوں مسلک غلط اور قرآن کی رُو سے باطل ہیں۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ہر قوم کی طرف اپنے رسول بھیجے جن کی تعلیم اصولی اور بنیادی طور پر ایک تھی۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد وہ تعلیم اپنی اصلی شکل میں باقی نہ رہتی تھی۔ اس لئے اللہ کا ایک اور رسول آجاتا تھا۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہا۔ تا آنکہ بالآخر یہ تمام صداقتیں ایک جگہ جمع کر کے قرآن کے اندر محفوظ کر کے رکھ دی گئیں۔ اب دنیا میں خدا کی سچی تعلیم صرف قرآن کریم کے اندر ہے اور کہیں نہیں۔ اس لئے قرآن کی اطاعت ہی خدا کی اطاعت ہے۔

رسول اور نبی ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں ان میں کوئی فرق نہیں تھا۔

نگہِ بازگشت

[گذشتہ اوراق میں جو مباحث آپ کی نظروں سے گذرے ہیں وہ متعدد عنوانات پر مشتمل تھے اور ان میں قرآنی تعلیم کے بہت سے بنیادی گوشے آچکے ہیں۔ چونکہ یہ بنیادی اصول اس کے بعد بھی بار بار سامنے آئیں گے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان سب پر ایک تیرتی ہوئی نگہِ بازگشت ڈال لی جائے تاکہ ان سب کی یاد تازہ ہو جائے۔ اور آگے بڑھنے سے پیشتر اِن قطع کردہ منازل کی تفاصیل ایک ہی جگہ سمٹ کر سامنے آجائیں۔]

نظریۂ ارتقاء

دورِ حاضرہ کے علم طبیعیات کا معرکہ آراء کارنامہ تخلیق انسانی کے متعلق نظریۂ ارتقاء ہے۔ اس نظریہ کا ماحصل یہ ہے کہ انسان جس شکل میں آج ہمارے سامنے موجود ہے، از ابتدا اسی شکل میں وجود میں نہیں آگیا تھا۔ بلکہ اولیں جرثومۂ حیات، ارتقائی مراحل طے کرتے اور مختلف مراحل میں سے گزرتے گزرتے اس مقام تک پہنچا ہے۔ قرآن کریم سے بھی اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن اس تائید و توافق کے باوجود اس باب میں قرآنی تعلیم اور مغرب کے مادہ پرست علمائے طبیعیات کے نظریہ میں ایسا بنیادی فرق ہے جس کے پیش نظر ان دونوں کو کبھی ہم آہنگ نہیں قرار دیا جاسکتا۔ ہم آہنگی تو ایک طرف، ان دونوں کی رو سے حیات اور کائنات کے متعلق جو مختلف تصورات قائم ہوتے ہیں وہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ کائنات کے متعلق میکانکی تصور انیسویں صدی کے مادہ پرست (Materialist) علمائے طبیعیات کی تخلیق تھا۔ جو یورپ میں نظریۂ ارتقاء کے اولیں علمبردار ہیں۔ ان کے نزدیک، زندگی، غیر نامی (Inorganic) مادہ میں بعض کیمیائی اور طبیعیاتی تبدیلیوں سے خود بخود (محض اتفاقی طور پر) پیدا ہو گئی اور اس طرح کاروانِ حیات ارتقائی شاہراہ پر گامزن ہو گیا اور رفتہ رفتہ اولیں جرثومۂ حیات نے (میکانکی طور پر) حیوانی پیکر کی صورت اختیار کر لی۔ اس کے بعد، حیوانی دماغ میں بعض اسی قسم کی کیمیائی اور طبیعی تبدیلیوں سے شعور (Consciousness) پیدا ہو گیا۔ اور یوں خاک کے ذرے جیتے جاگتے باشعور انسان کی صورت میں متشکل ہو گئے۔ اس کے بعد جب یہ میکانکی ارتباط (Mechanical combination) منتشر (Disintegrate) ہو جائے گا تو زندگی اور شعور سب ختم ہو جائیں گے۔ لہٰذا زندگی یہی طبیعی زندگی (Phvsical life) ہے اور اسی کا تحفظ و استحکام، انسان کا نصب العین حیات۔ اس کے برعکس قرآنِ کریم کی رو سے نہ زندگی بے جان مادہ میں کیمیائی اور طبیعیاتی تبدیلیوں کا نتیجہ ہے اور نہ ہی انسانی شعور، حیوانی دماغ کے میکانکی ارتقاء کی اگلی منزل۔ زندگی اور شعور کا سرچشمہ وہ خدائے حی و قیوم اور حکیم و بصیر ہے جو اپنی حکمت بالغہ کے ماتحت اس کائنات کو وجود میں لایا اور اس کے بعد بایں

شانِ ربوبیت، اسے اس کے منتہیٰ کی طرف لیجارہا ہے۔ لہٰذا انسان کی موجودہ زندگی ارتقاء کے اس سلسلہ درازکی آخری کڑی نہیں بلکہ، یہ گویا تمہید ہے کتاب حیات کی جلد دوم کی۔ انسانی تخلیق کی ابتدائی کڑیاں تو اسی سلسلہ کی مظاہر ہیں جس کی رو سے دوسرے حیوانات کی پیدائش ہوتی ہے لیکن اس کے بعد، انسانی تخلیق ایک بالکل نئے دائرے میں داخل ہوتی ہے جو پچھلی کڑیوں کا طبعی نتیجہ نہیں۔ اس مقام پر اس میں روح خداوندی (Divine-energy-) کا شمہ ڈالا جاتا ہے اور اس طرح اسے صاحب شعور و بصیرت، اور اختیار و ارادہ کا مالک انسان بنا دیا جاتا ہے۔ یہی وہ روح خداوندی ہے جس سے انسان اپنی مستقل انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی کو انسانی ذات، نفس، خودی، انا یا ایغو، کہا جاتا ہے۔ انسانی تگ و تاز کا ماحصل اسی نفس (یا ذات) کی نشوونما اور تکمیل ہے۔ یہ انسانی خودی اپنی مناسب نشوونما (ربوبیت یا بالیدگی) سے ایسی مستحکم ہو جاتی ہے کہ موت بھی اسے فنا نہیں کر سکتی۔ اس طرح انسانی نفس حیات جاوید کا مستحق ہو جاتا ہے۔

مغرب کی غلط نگہی مغربی مادہ پرستوں کے میکانکی ارتقاء کے نظریہ کی بنیادیں اس قدر کمزور تھیں کہ انیسویں صدی کے اخیر میں خود مغرب ہی سے اس کی تردید و مخالفت میں آوازیں اٹھنی شروع ہو گئیں۔ چنانچہ گلاسگو یونیورسٹی کا پرنسپل اور وائس چانسلر، جون کیئرڈ (JOHN CAIRD) اپنے (سنہ ۱۸۷۸-۷۹ء کے) لیکچرز (خطبات) میں کہتا ہے:۔

> آج تک اس امر کی کوئی ایک مثال بھی نہیں پیش کی جاسکی کہ زندگی محض کیمیائی عناصر (Chemical-constituents-) سے پیدا ہو گئی ہو۔ لہٰذا یہ قیاس کہ زندگی کا ارتقاء کسی اور زندگی کے اثر کے بغیر بھی ممکن ہے، بلا دلیل ہے۔ (protoplasm) کو جسے مادہ حیات قرار دیا جاتا ہے محض کیمیائی مرکبات کی سطح پر نہیں رکھا جاسکتا۔ وہ مادہ حیات جس کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے اور جس کے کیمیائی اجزاء معلوم ہو سکتے ہیں زندہ نہیں بلکہ مردہ مادہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، وہ مادۂ حیات جسے زندہ کہا جاسکتا ہے، اگرچہ انہی اجزاء کا مجموعہ ہوتا ہے جو مردہ مادۂ حیات میں پائے جاتے ہیں لیکن اس سے ایسے خواص و اعمال کا ظہور ہوتا ہے جو بالکل جدید ہوتے ہیں اور جنہیں اس کے کیمیائی اور طبیعیاتی اجزاء کی طرف کبھی منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کوئی شے کسی ایک وقت میں ایسے خواص کا مظاہرہ کرتی ہے جو یکسر کیمیائی یا میکانکی ہوں اور دوسرے وقت میں ایسے خواص کا جن سے وہ اپنے آپ کو ایک جیتے جاگتے، بڑھنے پھولنے والے جسم میں تبدیل کر لے؛ یا ایسے افعال کا جن سے وہ دوسری چیزوں کو اپنا جزو بدن بنا سکے اور پھر اپنے جسم سے کچھ اور پیدا کر سکے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ دوسری صورت میں جو نئی چیزیں اس میں پیدا ہوئی ہیں ان کا سبب کوئی ایسا جدید عنصر ہے جو پہلی صورت میں اس میں موجود نہ تھا جبکہ اس سے محض کیمیائی یا میکانکی عمل ظہور میں آتا تھا۔

(Introduction to The Philosophy of Religion;)
P: 96

یہ "جدید عنصر" زندگی ہے جو مادہ کی پیداوار نہیں۔ رفتہ رفتہ وہاں کے علمائے طبیعیات میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا جس نے یہ دیکھا کہ سلسلۂ ارتقاء میں جو نئی چیز پیدا ہوتی ہے اس کے خواص ان عناصر کے خواص سے مختلف ہوتے ہیں جن کے امتزاج سے وہ نئی چیز پیدا ہوتی ہے۔ اس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ بے جان مادہ میں جب زندگی پیدا ہوئی ہے تو وہ مادہ کے میکانکی ارتقاء کا نتیجہ نہیں۔ زندگی کیسے وجود میں آجاتی ہے؟ اس کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اس لئے اس کا نام انہوں نے ہنگامی ارتقاء (Emergent evolution)[1] رکھ دیا۔ اسی قسم کے ہنگامی ارتقاء سے ان کے نزدیک شعور انسانی پیدا ہو گیا۔ ان میں اور پہلی قسم کے مادہ پرستوں میں البتہ اتنا فرق[2] ہے کہ ان کے نزدیک شعور (اس طرح وجود میں آکر) اپنی جداگانہ ہستی رکھتا ہے، اور کیمیا اور طبیعیات (chemistry and physics) کے ان قوانین سے جن کے تابع جسم انسانی ہوتا ہے، الگ قوانین کے ماتحت ہوتا ہے۔

لیکن یہ نظریہ بھی چونکہ اطمینان بخش نہ تھا اور اس پر مختلف قسم کے اعتراضات وارد ہوتے تھے اس لئے مغربی فکر اور آگے بڑھا اور اس نے تخلیقی ارتقاء (creative Evolution) کا نظریہ پیش کیا۔ اس نظریہ کے علمبردار جزئیات و تفاصیل میں باہمد گر متفق نہیں لیکن (جہاں تک ہمارے موضوع کا تعلق ہے) اس کا ماحصل یہ ہے کہ زندگی کی لہر، مادہ کے ساتھ شروع سے ہی موجود ہے لیکن خوابیدہ۔ کائنات تغیرات کی آماجگاہ ہے اس مسلسل تغیر سے زندگی میں بیداری پیدا ہوتی ہے اور جب زندگی مناسب جسم سے متمسک ہوتی ہے تو اس سے ہنگامی طور پر شعور پیدا ہو جاتا ہے[3]۔ شعور، پیدا تو اس طرح ہوتا ہے لیکن اس کے بعد زندگی اور جسم، دونوں سے الگ اپنا مستقل وجود رکھتا ہے مغربی محققین کی اب کثیر جماعت ایسی ہے جو میکانکی ارتقاء کے نظریہ کو ٹھکرا کر، نفس انسانی (Mind) کے جداگانہ وجود

---

[1] انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ بعض اوقات ارتقاء کے ایک ہی سلسلہ میں ایسی چیزیں ظہور میں آجاتی ہیں جو باقی چیزوں سے بالکل مختلف ہوتی ہیں۔ ایسی چیزوں کو (Mutations یا Sports) کہتے ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے یہ توجیہہ بیان کی کہ ارتقاء کا سلسلہ بعض اوقات جست لگا کر علت و معلول کی بہت سی کڑیوں کو پھاند جاتا ہے جس سے ایسی ایسی چیزیں ظہور میں آجاتی ہیں جن کی کوئی سائنٹفک توجیہہ سمجھ میں نہیں آتی۔

[2] ہکسلے کے نزدیک "شعور بھی اسی طرح مادہ کے ایک عمل کا نام ہے جس طرح حرکت" لیکن (Tyndall) لکھتا ہے کہ "یہ چیز تصور میں بھی نہیں آسکتی کہ دماغ کی طبیعی ہیئت، شعور پیدا کر سکتی ہے"۔ (Caird; P: 102 - 103)

[3] پروفیسر الیگزنڈر کے نزدیک شعور بھی زندگی کے اندر خوابیدہ ہوتا ہے اور زندگی کے تخلیقی ارتقاء سے پیدا ہو جاتا ہے۔

کی قائل ہے (ان کا تفصیلی ذکر وحی کے عنوان میں ہو چکا ہے)
آپ نے دیکھ لیا کہ مغرب کی مادہ پرستی (Materialism) خود وہیں کے محققین کے ہاتھوں کس طرح رفتہ رفتہ ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی ہے۔ لیکن چونکہ ان لوگوں کے سامنے وحی کی (بے رنگ، وبے لوث) روشنی نہیں اس لیئے وہ ظن وتخمین کی وادیوں میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ حقیقت تک ان کی رسائی نہیں۔
مغربی مفکرین انیسویں صدی کے کائنات کے میکانکی تصور کو چھوڑ کر بہت آگے نکل چکے ہیں۔ لیکن ان قوم کی اور ان کے ساتھ ساری دنیا کی بدبختی کہ ان کی جو تہذیب اس میکانکی تصور کی بنیادوں پر اٹھی تھی وہ بدستور ان ہی بنیادوں پر قائم رہی۔ اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ چونکہ یہ بنیاد ہی غلط تھی۔ اس لیئے اس پر اٹھی ہوئی عمارت

باطل بنیادوں پر تہذیب

بھی بے حد نازک اور کمزور تھی۔ چنانچہ جب زندگی کے ٹھوس حقائق کا سامنا ہوا تو وہ پہلے ہی دھچکے میں متزلزل ہو گئی اور اس کا نتیجہ آج اہل مغرب اور ان کے ساتھ اس ساری دنیا کے سامنے ہے جو اس تہذیب کے اثرات سے ملوث ہو چکی ہے۔ اس قسم کی تہذیب کبھی حقائق کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ "تاریخ تہذیب" کا مشہور عالم (BRIFFAULT) اپنی کتاب (The Making of Humanity) میں اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے کہ روما کی عظیم الشان سلطنت اور اس قدر درخشندہ تہذیب کیوں تباہ ہو گئی لکھتا ہے۔

> انسانی ہیئت اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل اصولوں پر ہو کبھی قائم نہیں رہ سکتا خواہ اس باطل نظام کو کیسے ہی تدبر اور دانشمندی سے کیوں نہ چلایا جائے۔ اس کی بنیادی کمزوری، خارجی نظم وضبط اور ادھر ادھر کی جزئی مرمت سے کبھی رفع نہیں ہو سکتی۔ جب تک اس کی اصل باقی ہے اس کے لیئے تباہی مقدر ہے۔ روما کی سلطنت، عام انسانوں کی لوٹ کھسوٹ سے ایک خاص جماعت کو متمول بنانے کا ذریعہ تھی۔ انہوں نے اس "سوداگری" کو نہایت قابلیت اور تدبر، خلوص اور دیانت داری سے چلایا لیکن (حسن انتظام کی) یہ تمام خوبیاں، بنیادی باطل کو اس کے فطری نتائج سے نہ بچا سکیں۔ غلط بنیادوں کے اثرات بلا رو رعایت نتیجہ خیز ہو کر رہے۔ (صفحہ ۱۵۹)

بقول علامہ اقبال ؒ ؎

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

اب ایک اور گوشے کو سامنے لایئے۔ غیر ذی حیات چیزوں کو اپنی ہستی کا احساس نہیں ہوتا اسی لیئے انہیں

اس کی حفاظت کی فکر نہیں ستاتی۔ اور جب کسی شئے کو اپنی حفاظت کی فکر نہ ہو تو پھر ان قوتوں سے جو اسے فنا کرنے پر آمادہ ہوں کسی قسم کی مزاحمت نہیں ہوتی۔ لہٰذا غیر ذی حیات (یا غیر نامی) چیزوں کو کسی قسم کے تزاحم و تصادم سے واسطہ نہیں پڑتا۔ وہ لذتِ کشمکش سے ناآشنا ہوتی ہیں۔ لیکن اس کے برعکس، ذی حیات (یا نامی اشیاء) میں اپنی ہستی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ دنیا میں اپنی خاطر زندہ رہنا چاہتی ہیں۔ انہیں اپنی جان پیاری ہوتی ہے۔ اس لئے وہ ہر مخالف قوت کا مقابلہ کرتی ہیں۔ لیکن زندگی کے ابتدائی مراحل میں) حفاظتِ خویش کا یہ تقاضا ان کے اندر جبلی طور پر (By instinct) ہوتا ہے۔ یعنی وہ اپنی زندگی کو محفوظ رکھنے کے لئے جد و جہد ضرور کرتی ہیں لیکن انہیں کچھ علم نہیں ہوتا کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہیں۔ بالفاظِ دیگر، ان کے سامنے زندگی کا مقصد، اپنی حیاتِ طبیعی کی حفاظت ہوتا ہے۔ اور کچھ نہیں۔ بنا بریں ان کی یہ تمام جد و جہد اور کشمکش صرف خارجی قوتوں سے ہوتی ہے۔ ان کی داخلی دنیا میں کوئی کشمکش نہیں ہوتی۔ حیوانات تک کی دنیا میں اسی قسم کی کشمکش ہوتی ہے۔

کشمکش کے مدارج

لیکن اس سے آگے جب انسان کی دنیا میں قدم رکھئے تو یہاں دو قسم کی کشمکشیں سامنے آتی ہیں۔ ایک تو وہی کشمکش جو حیوانی زندگی میں موجود تھی (اور جس کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے) یعنی اپنی طبیعی زندگی کی حفاظت کے لئے خارجی قوتوں سے تزاحم و تصادم۔ اور دوسرے خود اپنی داخلی دنیا میں ایک گہری کشمکش۔ اس داخلی دنیا میں انسان کی جنگ خود اپنی ذات کے خلاف ہوتی ہے جہاں اصول کا تقاضا کچھ اور ہوتا ہے اور مصلحتوں کا تقاضا کچھ اور۔ یہ جنگ ان دو دشمنوں میں ٹھنتی ہے جو نہ کبھی ایک دوسرے سے صلح کر سکتے ہیں اور نہ ہی الگ ہو سکتے ہیں۔

انسانی زندگی جب اپنے ابتدائی مراحل میں تھی اور اس کے تقاضے ہنوز طبیعی حوائج سے آگے نہیں بڑھے تھے تو اس منزل کو آدم کی ابتدائی زندگی سمجھئے۔ اس منزل میں انسانوں کی ضروریات بہت مختصر اور سامان نشو و نما بافراط تھا اس لئے ان میں باہمی مفاد کا تصادم پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس وقت ابھی انسان "انفرادی ملکیت" کے تصور سے ناآشنا تھا۔ کیونکہ اسے حفاظتِ خویش کے لئے رزق کو جمع کر کے رکھنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ لیکن جب انسان شعور و ادراک کی نشو و نما کے بعد کچھ آگے بڑھا تو عقل نے اسے یہ سکھایا کہ حصولِ رزق کے لئے مسلسل جد و جہد کی بجائے یہ بہتر ہے کہ تھوڑے سے وقت میں، مختلف حیلوں سے، بہت کچھ اکٹھا کر لیا جائے۔ اور اس طرح رزق کی طرف سے اطمینان حاصل کر لیا جائے۔ اس سے مختلف افراد کی عقلوں میں باہمی جنگ شروع ہوئی اور اس جنگ کا نتیجہ باہمی کشمکش ہو گیا۔ انسانیت کے مفادِ کلی کا تقاضا یہ تھا کہ رزق کے چشمے تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر کھلے رہیں۔ لیکن انفرادی عقل کا مطالبہ یہ تھا کہ رزق کے سرچشمے زیادہ سے زیادہ اس فرد کی ملکیت میں آ جائیں تاکہ وہ اس کے اور اس کی اولاد کے کام آئیں۔ اس سے دُہری کشمکش شروع ہو گئی۔ ایک، انسان اور اس کے خارجی ماحول کی۔ اور دوسری، انسان کے اپنے اندر کی۔ اسی کا نام "آدم اور ابلیس کی آویزش" ہے

اور انسان کی ساری داستان اسی آویزش کی کہانی ہے۔

انسان نے اس کشمکش سے نجات حاصل کرنے کے لئے بڑی جدوجہد کی ہے۔ اس ضمن میں ہمارے سامنے وہ منظم کوشش آتی ہے جو دنیا میں "فلاطونی حکمت" کے نام سے مشہور ہے اور جو دراصل تو فلاطونی تصورِ حیات ہے جسے

حکمتِ یونانی

فلاطینس (plotinus) نے پروان چڑھایا۔ اس حکمت نے رحم مختلف اوقات میں رہبانیت، ویدانت۔ عجمی تصوف وغیرہ کے نظر فریب نقاب اوڑھ کر سامنے آتی رہی)۔ اس کشمکش کا علاج آرزوؤں اور تقاضوں کے فنا و استہلاک میں سمجھا۔ گویا اس قسم کی ترکِ آرزو کی زندگی کا لازمی نتیجہ "انفرادی نجات" کا تصور تھا۔ یہ تصور، نوعِ انسانی کی اجتماعی فلاح و بہبود کے لئے کس درجہ سم قاتل کا اثر رکھتا ہے۔ اس کے متعلق تفصیل سے اس کے اصلی مقام پر لکھا جائے گا۔ اس وقت ہم (Briffault) کے ایک اقتباس پر اکتفا کرتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے:۔

> اخلاقیات کے متعلق یونان کے ابتدائی تصور کا رواقی اور ابیقوریت کے فلسفہ میں تبدیل ہو جانا ایسی خرابی کا موجب ہوا جس کی نظیر انسان کے اخلاقی تصور کی دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ اخلاق، جس سے مفہوم یہ ہے کہ انسانوں کے باہمی معاملات حق و صداقت پر مبنی ہونے چاہئیں اپنا حقیقی مفہوم کھو دیتا ہے اگر اس کا نتیجہ نوعِ انسانی کی بہبود نہیں۔ اس سے تو اخلاقیات کا مقصود ہی فنا ہو جاتا ہے۔ اخلاقیات کا مقصود ایک فرد کی ذاتی بہبود یا نجات نہیں (اگرچہ نوعِ انسانی کی بہبود میں یہ ذاتی بہبود بدرجۂ اتم موجود ہے) بلکہ یہ مقصود ہے کہ اس فرد کا اس نوعِ انسانی کے ساتھ جس کا یہ ایک جزو ہے کس قسم کا واسطہ ہے؟ اس (باہمی معاملات کے) ضابطۂ اخلاق کی بنیاد عدل ہے...
>
> .... عدل کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان پر مستبدانہ اور قاہرانہ قوت سے غالب نہ آسکے .... اگر دنیا میں باطل (wrong) کے کوئی معنی ہیں تو وہ یہی ہیں کہ ایک انسان کسی دوسرے انسان کو محض غرضی اقتدار کی بنیاد پر اپنا تابع فرمان بنا لے...... اس باطل کا استیصال، اخلاقیات کا اوّلین فریضہ ہے۔ آپ مثالی اخلاقیات کی کیسی ہی شاندار عمارت کیوں نہ تعمیر کر لیں، اگر وہ باطل کا استیصال کر کے اس کی جگہ حق کو قائم نہیں کرتی تو وہ یکسر بے معنی ہے۔ یہ اوپر کی عمارت اخلاقیات کی عمارت کہلا ہی نہیں سکتی...... رواقی فلسفہ کی رو سے نصب العین حیات، شر کا مقابلہ نہیں بلکہ اس کے سامنے جھک جانا رہ جاتا ہے۔ (صفحہ ۳۴۱ — ۳۴۲)

مغرب کی مادہ پرستی

یہ تو تھا رہبانیت (تصوف) کا مسلکِ زندگی۔ اس کے برعکس، مغرب کی مادہ پرستی نے یہ کہہ کر فرار کی راہ اختیار کر لی کہ زندگی بس یہی طبیعی زندگی ہے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اس لئے کشمکش صرف خارجی قوتوں سے ہے۔ جس نے تسخیرِ فطرت سے اپنی قوتوں میں اضافہ کر لیا۔ وہی آگے بڑھ گیا۔ کیا محض مادی ترقی کا نام "انسانی ترقی" ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب (Briffault) سے سنئے جس نے اقوام و تہاذیبِ عالم کے عروج

دزوال کی تاریخ سے نتائج مرتب کئے ہیں۔ وہ لکھتا ہے

اگر انسان بادلوں سے اونچا اڑنے لگ جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ انسانیت کی سطح بھی اتنی ہی بلند ہوگئی ہے۔ نہ ہی سو میل فی گھنٹہ کی رفتار کے معنی ترقی ہیں۔ انسان اگر ستاروں کو توڑنے کے قابل بھی ہو جائے اور علوم و فنون کے وسیع میدانوں میں گھوڑے دوڑانے لگ جائے تب بھی اس کے جوہر ذاتی میں قلبِ ماہیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ انسانی معاملات اس سے کہیں گہرے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔ قوت، تہذیب، کلچر بے معنی چیزیں ہیں۔ اگر ان کے ساتھ اخلاقی برائیاں شامل ہوں۔ وہ صحیح پیمانہ جس سے انسانی دنیا کی قدر و قیمت ماپی جاسکتی ہے۔ اخلاقی پیمانہ ہی ہے۔ (صفحہ ۲۵۹)

اس قسم کے نظامِ تمدن کے مآل کے متعلق یہی مؤرخ رقمطراز ہے۔

وہ نظامِ تہذیب جس میں حق و صداقت کو عادی طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہو آخر الامر تباہ ہو کر رہتا ہے۔ ناانصافی سے کوئی فرد کیسا ہی کامیاب کیوں نہ ہوتا چلا جائے وہ اجتماعی نظام جس کا وہ جزو ہے اور وہ جماعت جو اس ناانصافی کے ثمرات سے نفع اندوز ہوتی ہے اس ناانصافی کی وجہ سے انجام کار برباد ہو جاتی ہے۔ انتخابِ طبیعی کے اٹل قانون کی بنا پر گناہ کی اُجرت موت ہے۔ (صفحہ ۲۶۲)

کسی تہذیب کی تباہی سے یہ مراد نہیں کہ وہ قوم جو اس تہذیب کی حامل ہوتی ہے، امن و سلامتی میں رہتی ہے اور تہذیب فنا ہو جاتی ہے۔ کسی قوم کی تہذیب کی بربادی خود اس قوم کی موت ہوتی ہے۔ اور اس موت سے پہلے سکرات کی ہچکیاں اس قدر جاں گسل ہوتی ہیں کہ ہر قلبِ حساس اس کے نظارہ سے چیخ اٹھتا ہے۔ تہذیبِ مغرب کی اس جاں کنی کے عذاب کے متعلق ڈاکٹر جوڈ لکھتا ہے۔

انیسویں صدی، سائنس کی ظفرمندی کا زمانہ تھا۔ سائنس نے ہمیں سستا کوئلہ اور کپاس دی اور ذرائع رسل و رسائل میں انقلاب پیدا کر دیا گیا اور دیگر سینکڑوں طریق سے انسانی زندگی میں تبدیلیاں پیدا کر دیں۔ اور اس کی آسائش کے سامان مہیا کر دیئے۔ لیکن یہ سائنس ایک دو دھاری تلوار تھی جس نے انسان کو وہ قوتیں عطا کر دیں جن کا طریق استعمال وہ نہیں جانتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی قتل و خونریزی کی استعداد میں بہت اضافہ ہو گیا اور اس طرح اس کی تہذیب تباہی کے جہنم کے کنارے تک آپہنچی۔ انیسویں صدی نے صرف سائنس کی ترقی دیکھی اور یہ ہمارے لئے چھوڑ دیا کہ ہم دیکھیں کہ سائنس کی اس ترقی کے ساتھ ساتھ انسانیت میں کس طرح تنزل واقع ہوتا گیا۔

(God and evil, P: 114)

یہ تھا مغرب کا وہ نظامِ تمدن جس کی اساس اس غلط فکر پر تھی کہ زندگی بس یہی طبیعی زندگی ہے جس میں کشمکش صرف خارجی قوتوں سے ہوتی ہے۔

ان دونوں (یعنی حکمتِ یونان اور تہذیبِ مغرب) کے برعکس قرآن کریم ہمیں یہ بتاتا ہے کہ انسانی زندگی کی کشمکش کا علاج حقائق سے چشم پوشی میں نہیں بلکہ ان کا مردانہ وار مقابلہ کرنے میں ہے۔ طبیعی زندگی کی کشمکش کے لئے تسخیرِ فطرت

قرآنی تعلیمِ فطرت

ضروری ہے اور اندرونی کشمکش کے لئے انسانی خودی کا استحکام اور عروج وارتقاء لازمی۔ نہ ان سے فرار ہو سکتا ہے نہ اس سے گریز۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ اس باب میں داخلی اور خارجی کشمکش میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔ وہ ایک ایسا محیطِ کل نظام عطا کرتا ہے جس میں ایک ہی پروگرام کے ماتحت داخلی اور خارجی دونوں قوتیں انسان کو اس کے صحیح نصب العین کی طرف لیجاتی ہیں۔ جس قسم کے قلبی جہنم میں آج یورپ گرفتار ہے۔ بعینہٖ یہی حالت رومن تہذیب کے زمانہ میں ہو چکی تھی۔ اس جہنم سے کس چیز نے بچایا؟ یہ ہم سے نہیں بلکہ (Briffault) سے سنئے۔ وہ لکھتا ہے:-

> زندگی ایک الجھاؤ بن چکی تھی۔ برق رفتار لیکن بے سکون۔ فوری تبدیلیوں سے بھری ہوئی۔ انتہا درجہ کی غمناک۔ اندوہ گیں کشاکش میں مبتلا۔ بے پناہ خواہشات اور پھر مایوسیاں اور ناکامیاں۔ انسانیت اس مصیبت میں پھنسی ہوئی تھی کہ ایسے میں مشرق کی تصوراتی دنیا سے مذہب نے آکر ایک نئی روشنی اور نئے انکشافات دیئے۔ درماندہ انسانیت اسی کے لئے تڑپ رہی تھی۔ مشرق ایک نجات دہندہ کی صورت میں مسیحا بن کر آگیا۔ (صفحہ ۱۵۵)

آج بھی دنیا کو اگر اس جہنم سے کوئی چیز امن و سلامتی کی راہ دکھا سکتی ہے تو وہ صرف وحی کی روشنی ہے۔ وحی کی رو سے قائم شدہ نظام میں، سب سے پہلے ہوتا یہ ہے کہ انسانوں کے ہاتھ سے قوت و اقتدار چھین کر اس خدا کے سپرد کر دیا جاتا ہے جو رب العالمین ہے (رب کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ ہر شے کو اس کی ابتداء سے آخری نقطۂ ارتقاء تک بخیر و خوبی لے جاتا ہے) اس طرح وہ، علاماتِ مرض کا علاج کرنے کے بجائے، علّتِ مرض کو جڑ سے کاٹ دیتا ہے۔ انسانی قوت و اقتدار کی خرابیوں پر بحث کرتے ہوئے (Briffault) لکھتا ہے:-

> جو کچھ مطلق قوت کے متعلق درست ہے وہی کچھ ہر قوت اور اقتدار کے متعلق درست ہے خواہ وہ کسی شکل اور کسی درجے میں ہو۔ خواہ یہ اقتدار مراعات کا ہو یا قوتِ بازو کا۔ دولت کی وجہ سے ہو یا ذہنی تفوق کی بنا پر۔ حاکم کا ہو یا حکومت کے کارندوں کا۔ مُلّا کا ہو یا فتنہ انگیز خطیب کا۔ انسانی اقتدار کا لازمی نتیجہ ظلم ہوتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ انسان بد واقع ہوئے ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ قوت کا خاصہ ہے کہ وہ حق و انصاف کا فیصلہ کرنے کی صلاحیت میں خرابیاں پیدا کر دیتی ہے (صفحہ ۲۴۷)

انسانی حاکمیت کا استیصال

قرآن سب سے پہلے یہی کرتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس نظام میں بھی قوانین و ضوابط کی پابندیاں ضروری ہوتی ہیں (اور پابندیوں کے بغیر حقیقی آزادی میسر کیسے آسکتی ہے؟) لیکن انسانوں کے خود ساختہ نظام اور وحی کے متعین کردہ قوانین میں بہت بڑا فرق ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ وحی کے قوانین حیات کے تقاضوں کی آواز ہوتے ہیں۔ اس لئے انسان ان کی اطاعت و متابعت میں کسی خارجی قوت کی محکومیت

محسوس نہیں کرتا۔ پرنسپل کیئرڈ (caird) کے الفاظ میں:-

صداقتِ مطلق ..... کی زندگی، کوئی اجنبی زندگی نہیں ہوتی۔ اگر وہ ہم سے کہیں باہر ہوتی ہے تو خود ہمارے اندر بھی وہی ہوتی ہے۔ اس کے سامنے جھک جانے سے ہم کسی خارجی مستبد قانون یا کسی بیرونی قوت کی محکومیت اختیار نہیں کرتے بلکہ ایک ایسے قانون کی متابعت کرتے ہیں جو خود ہماری ذات کا قانون ہوتا ہے۔ ایک ایسے حکمران کی اطاعت جس کا تختِ حکومت خود ہمارا اعمقِ قلب ہوتا ہے۔ (صفحہ ۲۳)

اسی حقیقت کو علامہ اقبالؒ اس بصیرت افروز انداز میں بیان کرتے ہیں:-

اسلام بہ حیثیت ایک نظامِ سیاست کے اصولِ توحید کو انسان کی جذباتی اور ذہنی زندگی میں ایک زندہ عنصر بنانے کا عملی طریق ہے۔ اس کا مطالبہ وفاداری، خدا کے لئے ہے نہ کہ تخت و تاج کے لئے۔ اور چونکہ ذاتِ باری تمام زندگی کی روحانی اساس سے عبارت ہے اس لئے اس کی اطاعت کیشی کا درحقیقت مطلب یہ ہے کہ انسان خود اپنی سیاری فطرت کی اطاعت اختیار کرتا ہے (خطباتِ تشکیل جدید صفحہ ۱۴۷)

وحدتِ خلق

قرآنِ کریم نے جب اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ تمام نوعِ انسانی کی تخلیق ایک "نفسِ واحدہ" سے ہوئی ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ حیات ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے اور مختلف انسانی پیکر اس کی نمود کے ذرائع ہیں تو اس سے مقصود ایک سائنٹیفک مسئلہ سے تعارف نہیں بلکہ ایک عظیم الشان حقیقت کی طرف راہ نمائی ہے۔ یعنی اس حقیقت کی طرف کہ انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کی تشکیل وحدتِ خالق اور وحدتِ خلق کے محکم اصول پر ہونی چاہیئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب ایک فرد اس حقیقت پر ایمان لے آئے کہ اس کی اپنی ذات کی نشوونما، انفرادی طور پر نہیں ہو سکتی، بلکہ وہ کُلّ (انسانیت) کا ایک جزو ہے اور جب تک کل (انسانیت) کا ارتقاء نہیں ہوتا اس وقت تک جزو کا ارتقاء نہیں ہو سکتا، تو وہ اپنی محنت کے ماحصل کو کُلّ کی نشوو ارتقاء کے لئے وقف کر دے گا۔ اس کا نام قرآن کی اصطلاح میں نوعِ انسانی کی ربوبیتِ عامہ ہے جو خدا کی صفتِ ربّ العالمینی کا پرتو ہے۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ وحی کی رو سے قائم کردہ نظام میں تمام نوعِ انسانی کی بالیدگی اور فلاح کا راز مضمر ہو گا۔ نہ یہ کہ کسی قوم یا جماعت کے خون سے دوسری قوم یا جماعت کی پرورش کی جائے گی۔ یہی نظام صحیح نظامِ انسانیت کہلا سکتا ہے۔ بقول (Briffault) "انسانی ارتقاء سے مفہوم ہی نوعِ انسانی کی تشکیل ہے۔" نہ کہ افراد کی نجات و فلاح۔

فطرت کی میزان میں کسی ایسے بڑے مقدس اور نیک عمل کا وزن جو انسانیت کے ارتقاء میں مدنہ ہو کبھی اتنا نہیں ہو سکتا جتنا اس ایک عمل کا جو نوعِ انسانی کے ارتقاء کا موجب ہو۔ (صفحہ ۳۵۳)

اسی بنا پر قرآنِ کریم، نسل، رنگ۔ قوم۔ وطن۔ زبان کی بنا پر نوعِ انسانی کی تفریق و تقسیم کو غلط قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک نوعِ انسانی کی تقسیم صرف ایک معیار پر ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ وہ تمام انسان جو اُس نظامِ ربوبیت کو نصب العین حیات قرار دیں جو وحی کی رُو سے قائم ہوتا ہے۔ ایک جماعت کے افراد۔ اور ان کے علاوہ وہ تمام انسان جو انفرادی (یعنی طاغوتی) نظامہائے زندگی کو اپنا شعار بنا لیں۔ دوسری جماعت کے افراد۔ اوّل الذکر جماعت کا نام مومنین (یعنی اس نظام کے ماننے والے) اور دوسری کا کافرین (یعنی اس نظام سے انکار کرنے والے) ہے۔ لیکن اس تقسیم سے بھی یہ مفہوم نہیں کہ جماعتِ مومنین دوسری جماعت پر ظلم کرے گی اور ان سے ناانصافی برتے گی۔ قطعاً نہیں۔ جو نظام وحدتِ خلق کے عالمگیر اصول پر قائم ہو اس میں ظلم اور ناانصافی کا بھلا کیا دخل؟ وہ ان کے ساتھ بھی عدل کرے گی کہ ان کے نظام کی بنیاد ہی عدل پر ہے۔

وحی کے نظام کی ابتدا ایمان سے ہوتی ہے۔ یعنی اس حقیقت کے اعتراف سے کہ انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کی تشکیل۔ اس کے باہمی معاملات کے سلجھاؤ اور انسانیت کے ارتقاء کے لئے تنہا عقل کی راہ نمائی کافی نہیں۔ بلکہ خدا کی ہدایت یعنی وحی کی روشنی کی بھی ضرورت ہے۔ وحی کی کنہ و ماہیت کا ادراک عقل (یعنی علم استدلالی) کے بس کی بات نہیں۔ علمِ استدلالی کا دائرہ محسوسات کی حدود کے اندر ہے۔ اور وحی ان حدود سے باہر کی چیز ہے۔ محدود کے لئے لامحدود کا احاطہ ناممکن ہے۔ بقول پرنسپل (CAIRD):-

> کسی اعلیٰ فطرت کا (اپنے سے) ادنیٰ فطرت۔ یا لا محدود کا محدود پر اپنے آپ کو منکشف کر دینا تو ہماری سمجھ میں آ سکتا ہے۔ لیکن کسی محدود کا لا محدود کو ثابت کرنا یا اس کے اثبات کے دلائل لانا، ہمارے تصور میں نہیں آ سکتا۔ (صفحہ ۲)

وحی اور عقل

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وحی کی تعلیم، عقل کے خلاف ہوتی ہے۔ وحی، خلافِ عقل ہو نہیں سکتی لیکن ماورائے عقل ہو سکتی ہے۔ یعنی ہو سکتا ہے کہ کسی خاص زمانہ کی عقل، وحی کے کسی انکشاف کا احاطہ نہ کر سکے۔ ایسی صورت میں صحیح راہِ عمل یہی ہے کہ وحی کی پیش کردہ حقیقت پر ایمان رکھا جائے اور اس بات کا انتظار کیا جائے کہ جب زمانہ کی علمی اور عقلی سطح اور بلند ہو گی تو اُس وقت یہ بات بھی سمجھ میں آ جائے گی۔ پرنسپل کیئرڈ لکھتا ہے۔

> جو خلافِ عقل ہو وہ وحی نہیں ہو سکتی۔ لیکن وحی ہم تک ایسی چیزیں بھی تو پہنچاتی ہے جو عقل کی حدود سے بلند ہوتی ہیں وحی میں وہ اسرارِ الٰہیہ بھی شامل ہوتے ہیں جو انسانی فہم کی حدود سے ماوراء ہوتے ہیں .... محدود عقل ان اسرار کو دریافت نہیں کر سکتی۔ اور جب یہ دریافت بھی ہو جائیں تو ان کا احاطہ نہیں کر سکتی..... لہذا یہ بات تسلیم کی جا سکتی ہے کہ کسی مذہب میں ایسے تصورات بھی ہوں جو یقینی طور پر سچے ہوں لیکن دنیا کے عملی تجربہ میں ان کا علم بعد میں جا کر آئے اور اس وقت بھی نوعِ انسانی کے کسی خاص حصّہ کے علم میں (صفحہ ۶۶-۶۷)

انسان کی سب سے بڑی بھول یہ ہے کہ وہ اپنی انفرادی عقل اور اپنے زمانہ کی عقل کو ہمیشہ مکمل سمجھتا ہے حالانکہ یہ حقیقت کہ وہ اپنے سے پہلے زمانہ کی عقل پر ہنستا ہے خود اس امر کی دلیل ہے کہ بعد میں آنے والا زمانہ، اس کے زمانہ کی عقل پر اسی طرح ہنسے گا۔ اس لئے اس کے زمانہ کی عقل مکمل کیسے ہو سکتی ہے؟ ہم آج اپنے زمانہ کی سائنس کے انکشافات پر اس درجہ نازاں ہیں اور اس امر کے مدعی کہ صداقت وہی ہے جو اس سائنس کی رو سے صحیح ثابت ہو جائے۔ لیکن ہماری اس سائنس کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے متعلق (Briffault) کا فتویٰ سنئے۔ وہ لکھتا ہے کہ:۔

> ہمارے اپنے طبیعیاتی اور حیاتیاتی نظریے آنے والی نسلوں کو اسی طرح عجوبہ دکھائی دیں گے جس طرح آج ہمیں وہ نظریے دکھائی دیتے ہیں جن میں سائنس اپنے عہدِ طفولیت میں لپٹی ہوئی تھی۔ (صفحہ ۱۹۴)

جب انسان کے علم و عقل کی تدریجی ترقی کی یہ حالت ہے تو کسی حقیقت سے محض اس لئے انکار کر دینا کہ وہ آج کے زمانہ کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ عقلی حدود کے متعلق مبالغہ سے کام لینا ہے۔ وحی کی تعلیم کی صداقت اس کے عملی نتائج سے پہچانی جاتی ہے یعنی اس حقیقت سے کہ زمانہ، فطرت کے تقاضوں سے مجبور ہو کر کس طرح غیر وحی تصوراتِ حیات کو چھوڑتا جاتا اور ان کی جگہ قرآنی تصوراتِ زندگی کو ایک ایک کر کے قبول کرتا جاتا ہے۔

رسول کا منصب

جن نفوسِ قدسیہ پر حقیقت اپنے آپ کو بے نقاب کرتی ہے، انہیں دین کی اصطلاح میں رسول یا نبی کہا جاتا ہے۔ دین کا کام یہ نہیں کہ چند بنیادی صداقتیں (Fundamental-truths) نظری طور پر پیش کر دے اور بس۔ بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ عملی طور پر بتائے کہ انسانی معاملات کو ان صداقتوں کے قالب میں کس طرح ڈھالا جاتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ انسانی زندگی کے عملی مسائل (جنہیں تمدن کہا جاتا ہے) شروع سے ایک جسمِ نامی کی طرح ارتقائے زمانہ کے ساتھ ساتھ بڑھتے اور پھیلتے جاتے تھے اسی لئے وہ اسالیب و انداز جن میں یہ بنیادی صداقتیں پیش کی جاتی تھیں اس ماحول کے مقتضیات کے مطابق اختیار کئے جاتے تھے جس میں وہ تعلیم سامنے آتی تھی۔ انسانی تقاضوں کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ ان اسالیب و انداز میں بھی ارتقائی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ حتیٰ کہ یہ جسمِ نامی اپنے عہدِ شعور تک پہنچ گیا۔ جہاں اس تعلیم کو اس طرح مکمل کر دیا گیا کہ وہ انسان کے تمام تقاضوں کا اصولی حل اپنے اندر رکھتی ہے۔ یہ تعلیم قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ اس سلسلہ رشد و ہدایت کا انتظام یہ کیا گیا تھا کہ ایک رسول آتا اور وہ خدا کے پیغام کو اپنے زمانہ کی ضروریات کے مطابق متشکل کر کے دے دیتا۔ جب تک اس تعلیم کو علیٰ حالہ رکھنا مقصود ہوتا وہ باقی رہتی۔ اس کے بعد یا تو ضائع ہو جاتی یا تحریف و الحاق سے مسخ ہو جاتی۔ اس وقت ایک اور رسول آجاتا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ جب کسی سابقہ تعلیم کے ضائع۔ فراموش یا مسخ ہو جانے کے بعد، نئی تعلیم آتی، تو چونکہ یہ تعلیم بھی اسی سرچشمہ ہدایت کی طرف سے تھی جو سابقہ تعلیم کا منبع تھا، اس لئے اپنے آپ کو سابقہ تعلیم کی طرف منسوب

کرنے والے اس نئے پیغام پر لبیک کہتے۔ لیکن انسانی ضد اور ہٹ دھرمی ایسا نہ ہونے دیتی۔ سابقہ تعلیم کے وابستگانِ دامن الگ گروہ بن کر بیٹھ جاتے اور اس نئے پیغام کی تکذیب اور مخالفت میں سب سے بڑی سعادت محسوس کرتے۔ اس طرح مختلف مذاہب و ملل کا وجود عمل میں آگیا جو آج تک قائم ہے۔ چونکہ مذہب کا تعلق یکسر جذبات سے سمجھا جاتا ہے اس لئے کوئی فرقہ یا گروہ غور و فکر سے کام لینے کی کوشش نہیں کرتا۔ ورنہ اگر ذرا بہ نظرِ تعمق دیکھا جائے تو یہ معاملہ کچھ ایسا مشکل نہیں کہ سمجھ میں نہ آسکے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دنیا میں (آخری دین یعنی اسلام کے سوا) کسی کے ہاں ان کی آسمانی کتاب اپنی اصلی اور غیر محرف شکل میں موجود نہیں۔ تاریخی شہادات کے علاوہ خود ان کتابوں کی (موجودہ) تعلیم اور ایک دوسرے کا باہمی اختلاف اس حقیقت پر گواہ ہے۔

مذہبی فرقہ بندیاں

تھوڑا عرصہ گزرا، ایک کتاب شائع ہوئی ہے (Bible of The World)[1] اس کتاب میں مختلف مذاہب عالم کی مقدس کتابوں کے ان اقتباسات کو یکجا کیا گیا ہے جو مرتب کے نزدیک ان مذاہب کی بنیادی تعلیم کا حاصل ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اگر یہ دعویٰ صحیح ہو کہ تمام مذاہب کی مقدس کتابیں اپنی اصلی شکل میں دنیا میں موجود ہیں تو بائیبل آف دی ورلڈ میں پیش کردہ تعلیم میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ ایک ہی خدا کی طرف سے مختلف اور متضاد تعلیمات کا تصور باطل ہے۔ لیکن، پروفیسر جوڈ کے الفاظ میں بائیبل آف دی ورلڈ کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ "ان تعلیمات میں کس قدر باہمی اختلاف ہے۔ اور مباحث کو تو چھوڑیئے۔ صرف اس ایک مسئلہ میں کہ دنیا کا آغاز کس طرح ہوا۔ ایک تعلیم دوسرے سے نہیں ملتی"۔ (God and evil p. 30-31)

دو غلط راہیں

مذاہب عالم کے ان اختلافات سے گھبرا کر، لوگوں نے عام طور پر دو راہیں اختیار کر لیں۔ متشدد طبقہ نے تو یہ کہنا شروع کر دیا کہ ان کے بانی مذہب[2] کے علاوہ دیگر بانیانِ مذاہب اپنے دعوے میں (معاذ اللہ) جھوٹے تھے اس لئے آسمانی صداقت صرف انہی کے پاس ہے۔ دوسرے طبقہ نے (جو ہر دلعزیز رہنا چاہتا تھا) اس عقیدہ کو پھیلانے کی کوشش کی کہ عالمگیر صداقتیں تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہیں اس لئے کسی مذہب کو دوسرے مذہب پر فوقیت و افضلیت حاصل نہیں۔ قرآن کریم کی رو سے یہ دونوں مسلک باطل ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ تمام رسول خدا کی طرف سے سچی تعلیم لائے تھے اس لئے ان میں سے ہر ایک کے دعوے رسالت کی صداقت پر ایمان لانا ضروری ہے لیکن جن اسالیب و انداز میں وہ تعلیم پیش کی گئی تھی انہیں ہمیشہ کے لئے علیٰ حالہ رکھنا مقصود نہ تھا (اس لئے کہ وہ ہنگامی ضروریات

---

[1] اس کتاب کے بعض اقتباسات گزشتہ اوراق میں سامنے آچکے ہیں۔

[2] مذہب کے لئے بانی کا لفظ دیگر مذاہب کی مروجہ اصطلاح کی رو سے استعمال کیا گیا ہے ورنہ قرآن کریم کی رو سے رسول آسمانی دین کا بانی نہیں ہوتا۔ دین خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ رسول اس دین کو انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ دین اور مذہب میں کیا فرق ہے اس کے لئے دیکھئے میری مختصر سی کتاب۔ اسباب زوالِ امت۔

کے لئے اختیار کئے گئے تھے) اس لئے آپکی تعلیم اپنی اصلی شکل میں کہیں باقی نہیں رہی اپنی اصلی شکل میں صرف آخری تعلیم موجود ہے جسے اب ہمیشہ کے لئے انسانی زندگی کا نصب العین بنایا گیا ہے۔ لہٰذا یہ غلط ہے کہ آج تمام مذاہب میں عالمگیر صداقتیں یکساں طور پر موجود ہیں۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ دین کا کام محض چند صداقتوں کا نظری طور پر پیش کرنا نہیں بلکہ ایک نظامِ زندگی متعین کرنا ہے جو انسانی معاملات کے تمام انفرادی اور اجتماعی گوشوں کو محیط ہو۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا نظام ایک ہی ہو سکتا ہے۔

پھر اس حقیقت کو بھی سامنے رکھئے کہ مذہب کا یہ نظام (یعنی عالمگیر صداقتوں پر مشتمل عملی اسلوب) جسم نامی کی طرح بڑھتا رہا ہے۔ اس لئے اگر بفرضِ محال یہ مان بھی لیا جائے کہ آج سے چھ سات ہزار سال پیشتر کے انسانوں کے لئے دین کا جو نظام متعین کیا گیا تھا، وہ آج بھی اپنی اصلی شکل میں کہیں موجود ہے تو کیا وہ نظام اس نظام کے برابر ہو گا جو انسانیت کے عہد بلوغ میں، تمام نوعِ انسانی کا نصاب زندگی بننے کے لئے دیا گیا ہے؟

کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟

کیا یہ حقیقت کہ ان دونوں میں بنیادی صداقتیں ایک ہی ہیں، ان دونوں کو ایک ہی سطح پر کھڑا کر دے گی؟ درخت کی وہ پہلی سوئی جو بیج سے پھوٹتی ہے۔ اور پھولوں اور پھلوں سے لدا ہوا درخت دونوں میں ایک ہی بنیادی صداقت کارفرما ہوتی ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس اشتراک کے باوجود دونوں کا مقام ایک ہی نہیں ہوتا۔ ایک نوجوان صاحبِ عقل و شعور میں وہی بنیادی صداقتیں جلوہ پیرا ہوتی ہیں جو اُس میں اس وقت موجود تھیں جب وہ گھٹنیوں چلتا تھا۔ لیکن اس مشارکت سے جوان اور بچہ ایک جیسے کبھی نہیں ہو سکتے۔ یہ بھی واضح رہے کہ جو چیز ایک جسم نامی کی طرح ارتقائی طور پر آگے بڑھ رہی ہو اس کی پچھلی منزل کی خصوصیات، اگلی منزل میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ لیکن علیٰ حالہٖ قائم نہیں رہتیں بلکہ اگلی منزل انہیں اپنے اندر جذب کر کے ایک اور ہی رنگ دے دیتی ہے۔ جب شاخ، پھول بنتی ہے تو پھول میں شاخ موجود ہوتی ہے لیکن اپنی اصلی حالت میں نہیں۔ پھول اسے اپنے اندر جذب کر کے، اسے ایک اور ہی قبائے رنگین عطا کر دیتا ہے۔ پودا جن مختلف منازل میں سے گزرتا ہے وہ سب کی سب درخت کے اندر جذب ہوتی ہیں۔ لیکن اب ان کی شکل کچھ اور ہوتی ہے۔ ایک نوجوان میں، بچپن سے لے کر جوانی تک کے تمام مقامات (stages) یکجا موجود ہوتے ہیں لیکن ایک نرالے انداز میں۔ اسی طرح مذہب کی عالمگیر صداقتیں جب انداز و اسالیب کی مختلف ارتقائی منازل طے کر کے آگے بڑھتی ہیں تو ہر سابقہ منزل کی خصوصیت نئی منزل میں جذب ہو جاتی ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے حتیٰ کہ آخری منزل میں تمام سابقہ منازل کی خصوصیات جذب ہو کر انتہائی رعنائیاں اختیار کر لیتی ہیں۔ لہٰذا یہ تصور ہی غلط ہے کہ مختلف مذاہبِ عالم کی "مشترکہ خصوصیات" کو یکجا کر لیا جائے تو اس مجموعہ کا نام "عالمگیر صداقتیں" ہو گا جو "ہر مذہب میں یکساں طور پر موجود ہیں"۔ یہ مشترکہ خصوصیات، اخلاق کے چند مبادیات کے سوا اور کیا ہوں گی؟ دین ایک مکمل نظامِ زندگی عطا کرتا ہے لہٰذا نوعِ انسانی کی راہ نمائی کے لئے آخری

دین ہی واحد اور مکمل ضابطۂ حیات ہو سکتا ہے نہ کہ مختلف مذاہب اپنی موجودہ شکل میں۔ مکمل، ہر سابقہ نامکمل کو اپنے اندر لئے ہوتا ہے[1]۔ نامکمل، مکمل کو اپنے اندر نہیں رکھ سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام الجھاؤ پیدا اس لئے ہوتے ہیں کہ انسان شعوری یا غیر شعوری طور پر، سمجھ یہ بیٹھتا ہے کہ یہ "بانیان مذاہب" اپنے اپنے طور پر عام مصلحین کی حیثیت سے آگے بڑھ گئے تھے۔ وہ اگر یہ عقیدہ ہو کہ یہ تمام حضرات اللہ تعالیٰ کی ایک خاص تدبیر کے ماتحت ایک سلسلۂ دراز کی مختلف کڑیاں بن کر مبعوث ہوئے تھے تو پھر کسی قسم کا الجھاؤ پیدا نہیں ہوتا۔

حکومتِ الٰہیہ کا مفہوم

یہ نظام جو وحی کی رو سے قائم ہوتا ہے، اس کی تفصیلات و جزئیات طول طویل ہیں لیکن اس کا اصل الاصول یہ ہے کہ دنیا میں تمام انسانوں کی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما پورے پورے طور پر ہوتی چلی جائے اور اس طرح انسانیت من حیث الکل اپنی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی اور اوپر اٹھتی جائے (تفصیل ان امور کی میری تصنیف "قرآنی نظام ربوبیت" میں ملے گی) اس نظام کو بعض اوقات (بغرض تعارف) "حکومتِ الٰہیہ" بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ اس حکومت کی عملی تفصیل کیا ہے؟ اس کے متعلق تو شرح و بسط سے اپنے مقام پر لکھا جائے گا۔ سر دست اس کے متعلق ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ "حکومتِ الٰہیہ" سے ذہن فوراً (Theocracy) کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن قرآنی نظریۂ حکومتِ الٰہیہ تھیاکریسی سے بالکل الگ ہے۔ تھیاکریسی کی اصطلاح سب سے پہلے، قدیم یہودی مؤرخ جوزیفس نے وضع کی تھی اور اس سے مقصود وہ انداز حکومت تھا جو بنی اسرائیل کی ابتدائی زندگی میں مروج تھا۔ بنی اسرائیل کے ہاں یہوہ (خدا) کے متعلق یہ عقیدہ بھی موجود تھا کہ وہ ان پر حکومت کرتا ہے۔ شروع میں اس عقیدہ سے مفہوم کچھ ہی ہو لیکن رفتہ رفتہ "یہوہ کی حکومت" کچھ اور ہی صورت اختیار کر گئی۔ چنانچہ ان کے ہاں (۱) یہوہ کا مقدس ہیکل (۲) اس کی کتاب شریعت (جو در اصل فقہا کے فتاویٰ پر مشتمل تھی) اور (۳) خود احبار و رہبان۔ ان تینوں کے مجموعہ کا نام "حکومتِ خداوندی" تھا۔ ان کے ہاں اجتہاد کا تو تصور ہی نہ تھا۔ تورات کی تختیاں (جیسی کچھ بھی وہ تھیں) ایک مقدس صندوق میں بند، ایک مقدس مقام پر رکھی رہتی تھیں۔ اب "خدا کی کتاب شریعت" جس طرح مدون ہوتی تھی اس کی تفصیل بلنچلی کے الفاظ میں دیکھئے۔ وہ اپنی کتاب (Theory of the state) میں لکھتا ہے۔

> قانون الٰہی ایک سونا منڈھے ہوئے صندوق میں رکھا رہتا تھا جس کی دو کروبی حفاظت کرتے تھے اور جس کی تعظیم الہام ربانی کے مرکز کی حیثیت سے کی جاتی تھی۔ تابوت ہیکل کے اندر ایک پردہ کے پیچھے، قدس الاقداس میں رہتا تھا اور کاہنوں کی طرف سے پورے اہتمام سے اس کی نگرانی ہوتی تھی۔ یہیں کاہن اعظم یہوہ کے احکام معلوم

---

[1] اسی لئے قرآن کریم نے اپنے آپ کو تمام سابقہ ادیان کا مہیمن کہا ہے جس کے اندر تمام سابقہ ادیان محفوظ ہو گئے۔

کرتا اور لوگوں کو مطلع کرتا۔ قضاۃ جو قبائل میں شریعت کی تنفیذ پر مامور تھے، یہ کام خدا کے نام پر انجام دیتے تھے۔ کیونکہ حکم صرف اللہ کے لئے تھا۔ اگر ان کے سامنے کوئی معاملہ ایسا آجاتا جس کا فیصلہ ان کے لئے مشکل ہوتا تو اس میں ان کے لئے ضروری ہوتا کہ لاویوں کے ذریعے سے خدا کی مرضی معلوم کریں۔

یہ تو تھی احبار و رہبان کی حکومت۔ جب ان میں بادشاہت آگئی تو بادشاہ کے متعلق یہ عقیدہ قائم کیا گیا کہ وہ مامور من اللہ ہے اور خدا کی مرضی کا پورا کرنے والا۔ چنانچہ ہیکل کی برکات بادشاہ کے شاملِ حال اور مقدس راہبوں کی دعائیں اس کی محافظ و نگراں ہوتیں۔ اس طرح حکومت اور برہمنیت کے امتزاج سے ایک ایسا "خدائی نظامِ حکومت" وجود میں آگیا جو مقدس استبداد کا مجسمہ تھا۔ وہی نظام جو ہندوستان میں برہمن اور کھشتری راجاؤں کے تعامل سے وجود میں آیا۔ اس نظام میں راجہ کو ایشور کا اوتار قرار دیا جاتا تھا جس کی رکھشا (حفاظت) براہمنوں کی اشیرباد (دعا) کرتی تھی۔ یہی وہ روح تھی جو مسلمانوں کے دورِ حکومت میں بادشاہ کو ظلِ الٰہی قرار دینے کا موجب بنی۔

لیکن اس تخیل کو قرآنِ کریم کے حکومتِ خداوندی کے تصور سے کچھ واسطہ نہیں۔ قرآن ملوکیت اور براہمنیت دونوں کو مٹانے کے لئے آیا ہے۔ حکومتِ الٰہیہ کے اصولی قوانین قرآن کریم کے اندر منضبط ہیں۔ ان اصولی قوانین کی روشنی میں، ہر زمانہ میں ملتِ اسلامیہ باہمی مشورہ سے اپنے اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق، عقل و علم کی روشنی میں، جزئی قوانین خود مرتب کرتی ہے۔ وہ اصول تو غیر متبدل رہتے ہیں۔ لیکن ان کی روشنی میں مرتب کردہ جزئی قوانین زمانہ کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ عند الضرورت بدلے جاسکتے ہیں۔ اس نظام میں وحی، علمِ انسانی اور مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ تینوں دوش بدوش چلتے ہیں اور ایسا انتظام کرتے ہیں جس سے تمام افرادِ انسانیہ کی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی چلی جائے اور کسی انسان پر کسی دوسرے انسان کا کوئی حکم نہ چلے۔

حضرات انبیاء کرام اسی قسم کا نظامِ ربوبیت قائم کرنے کے لئے آتے تھے۔ اس مقصد کے لئے قرآن نے مختلف انبیاء کرامؑ کا ذکر کیا ہے اور ان کے ذکر کے ساتھ ہی اس کشمکش کا بھی ذکر کیا ہے جس سے انہیں اس قسم کے نظام کی تشکیل میں دوچار ہونا پڑتا تھا۔ اس لئے کہ مفاد پرست قوتیں کبھی نہیں چاہتی تھیں کہ رزق کے سرچشمے ان کے ہاتھ سے چھن کر نوعِ انسانی کی ربوبیت کے لئے عام ہو جائیں۔

ان انبیاء کرامؑ اور ان کے ہاتھوں سے لائے ہوئے انقلابات کا تذکرہ، سلسلۂ معارف القرآن کی اگلی دو کڑیوں میں ملے گا۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

اِدارۂ طلوعِ اسلام

آج کون سا حساس دل ہے جو مسلمانوں کی نکبت و بدحالی پر خونناب فشاں نہ ہو۔ ہر طرف مسلمانوں کی ذلّت و رسوائی کا رونا رویا جا رہا ہے۔ مگر کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس دلدل سے مسلمانوں کو کس طرح نکالا جائے۔

پورے عالمِ اسلام میں ادارۂ طلوعِ اسلام ہی وہ ادارہ ہے جس نے چاروں طرف سے چھائی ہوئی مایوسیوں میں مسلمانوں کو للکارا اور بتایا کہ ان کی ذلّت و رسوائی کا واحد سبب یہ ہے کہ وہ خدا کی دی ہوئی کتاب اور اس کی عطا کی ہوئی روشنی سے دور جا پڑے ہیں۔ مسلمانوں کی باز آفرینی کے لئے یہی ایک صورت ہو سکتی ہے کہ خدا کی دی ہوئی جس روشنی نے اس قوم کو آج سے چودہ سو سال پہلے ترقی اور عروج کے بامِ ثریا تک پہنچا دیا تھا یہ قوم پھر اسی مینارۂ نور سے کسبِ ضیا کرے اور اپنی زندگی کو اس کے قالب میں ڈھال لے۔

ادارۂ طلوعِ اسلام قریب سولہ سال سے قرآن کی آواز کو بلند کر رہا ہے اور بارگاہِ الٰہی میں سجدہ ریز ہے کہ جس نے طلوعِ اسلام کی آواز میں وہ برکت عطا کی ہے کہ اس نے مسلمانوں کے سنجیدہ اور تعلیم یافتہ طبقہ کے زاویۂ نگاہ میں امید افزا تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ ادارہ کا واحد آرگن "طلوعِ اسلام" اور اس کا شائع کردہ لٹریچر دن بدن قبولیتِ عامہ حاصل کرتا جا رہا ہے۔

اگر آپ کو بھی قرآن کی اس آواز سے دلچسپی ہے اور آپ نے ابتک طلوعِ اسلام اور اس کے شائع کردہ لٹریچر کو نہیں دیکھا تو اپنی پہلی فرصت میں اس کا مطالعہ فرمائیے۔ کیا بعید ہے کہ آپ بھی اس قرآنی کارواں کے رفیق بن جائیں اور آپ کی رفاقت باقی افرادِ کارواں کے لئے وجہ تقویت بن جائے۔

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام
پوسٹ بکس نمبر ۴۳۱۴ ۔ کراچی

اسلامی معاشرہ

دیکھنے میں تو یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے لیکن افادی حیثیت سے بڑی بڑی کتابوں پر بھاری ہے۔ مسلمان کی روزمرہ کی زندگی کس قسم کی ہونی چاہیئے؟ اس کے عادات و اخلاق کا خاکہ۔ اس کے رہنے سہنے کا ڈھنگ۔ اپنوں اور بیگانوں سے اس کے تعلقات۔ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات۔ غرضیکہ اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر انداز و اسلوب قرآنی آئینہ میں کیسا ہونا چاہیئے؟ اس مختصر سی کتاب میں یہ سب کچھ آگیا ہے۔

اگرچہ صحیح اسلامی زندگی اسی صورت میں بسر ہو سکتی ہے جبکہ قرآنی نظام قائم ہو، لیکن ان احکامات سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ معاشرتی اور معاملات کی دنیا میں ایک مسلمان کی زندگی کا انداز کیسا ہونا چاہیئے۔ پیرایۂ بیان نہایت سادہ اور دلنشین تاکہ بچے اور کم تعلیم یافتہ لوگ بھی سمجھ سکیں۔

اس کی کتابت بھی جلی اور کھلے کھلے لفظوں میں اس انداز سے کرائی گئی ہے کہ بچے اور کم تعلیم یافتہ لوگ بآسانی پڑھ سکیں۔

پاکستانی مدارس میں بطور نصاب داخل کر لیا جائے تو طلباء کے قلب و دماغ کی تعمیر صحیح اسلامی بنیادوں پر ہو جائے۔

اسکول سائز ۱۹۲ صفحات۔ قیمت مجلد مع ڈسٹ کور صرف دو روپے علاوہ محصول ڈاک

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام
پوسٹ بکس نمبر ۲۱۳۔ کراچی

سلسلہ معارف القرآن کی پانچویں کڑی

دنیا کے لٹریچر میں عظیم الشان اضافہ۔ انسانی زندگی کے مختلف گوشوں سے متعلق اہم معاملات کو سلجھانے کے لئے انسانی فکر ونظر کی جامع تاریخ کہ افلاطون سے لیکر اس وقت تک ان مسائل سے متعلق

انسان نے کیا سوچا؟

محترم پرویز صاحب کی وہ معرکہ آرا تصنیف جس نے اشاعت سے پہلے ہی سنجیدہ طبقوں میں مقبولیت حاصل کرلی ہے اور جس کے متعلق خود مصنف کا بیان ہے کہ جہاں تک انہیں معلوم ہے دنیا کی کسی زبان میں بھی اس انداز کی کوئی کتاب موجود نہیں۔ مفکرین عالم کی ان مساعی کی مسلسل داستان جو انسانی معاشرہ سے متعلق مشکلات کو حل کرنے کے لئے آج تک عمل میں آتی رہیں۔ اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ آج فکر انسانی کس مقام پر کھڑا ہے اور آج اسے وہ کونسی مشکل درپیش ہے جس کا کوئی حل اسے نظر نہیں آتا۔ اس کتاب کی دوسری جلد میں یہ بتایا جائے گا کہ ان مسائل کے متعلق جنہیں انسانی فکر آج تک حل نہیں کرسکا۔

یعنی قرآن ان کا حل کیا پیش کرتا ہے۔ پہلی جلد کی کتابت ہو چکی ہے اور پریس میں جانیکے لئے تیار رکھی ہے۔

امید ہے کہ جلد ہی یہ کتاب آپ کے ہاتھوں تک پہنچ جائے گی۔

کتاب بڑے سائز کے تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام
پوسٹ بکس نمبر ۶۳۱۴۔ کراچی

قرآن کا بلند پایہ معاشی منشور

ادارہ طلوع اسلام کی وہ گراں بہا پیش کش جس کی مثال کسی اور جگہ نہیں مل سکتی یعنی محترم پرویز صاحب کی وہ بلند پایہ تصنیف جو مصنف کے پچیس سالہ تدبر فی القرآن کا نچوڑ ہے اور جس پر انہیں بجا طور پر فخر ہے کہ انہیں خدا نے یہ توفیق ارزانی فرمائی کہ وہ قرآن کے اس معاشی نظام کو پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں جس کی نظیر دنیا کا کوئی معاشی نظام پیش نہیں کر سکتا۔

کارل مارکس نے کمیونزم کا معاشی منشور پیش کیا تھا۔ اس کے مقابلہ میں پرویز صاحب قرآن کا معاشی منشور یعنی ——————— یعنی

نظام ربوبیت

پیش کرتے ہیں۔ اسے مطالعہ فرما کر فیصلہ کیجئے کہ قرآن کے اس معاشی منشور کے پہلو میں مارکس کا معاشی منشور کہیں جگہ پانے کا مستحق ہو سکتا ہے؟

کمیونزم اپنا معاشی نظام طاقت اور قوت کے زور پر نافذ کرتی ہے۔ مگر قرآن انسان کی بصیرت کو اپیل کرتا ہے اور اس کا نظام اسکے دل کے سرچشمے سے پھوٹتا ہے۔ کمیونزم کا فلسفہ اپنے اندر کوئی محرک جذبہ نہیں رکھتا۔ مگر قرآن کا فلسفہ اپنے متبعین کو وہ جذبہ محرکہ عطا کرتا ہے جس کے بل پر آج سے چودہ سو سال پہلے انسانیت اس انقلاب عظیم کو جلوہ بار دیکھ چکی ہے جس کو دوبارہ دیکھنے کے لئے پوری کائنات آج تک چشم براہ ہے۔

نظام ربوبیت

اس معاشی نظام کو پیش کرتی ہے جو آج سے چودہ سو سال پہلے قرآن نے انسانیت کو عطا کیا تھا اور جسے محمد رسول اللہ والذین معہٗ نے عملاً متشکل کر کے دکھا دیا تھا مگر بعد میں جسے ملوکیت کی خود غرضانہ مفاد پرستیوں نے تو بر تو پردوں میں چھپا دیا تھا۔ "نظام ربوبیت" ان غلافوں کو قرآن سے اٹھا کر اس کے معاشی نظام کو دوبارہ آپ کے سامنے پیش کرتی ہے۔ کتاب بڑے سائز کے تین سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ پریس میں جا رہی ہے اور عنقریب آپ کے ہاتھوں تک پہنچ جائے گی۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳۔ کراچی

تعداد ۲۰۰۰ ۱۳ جولائی ۵۴ء